# پاکستانی اردو شاعری میں مِلّی نغمہ نگاری کی روایت

تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ-ڈی (اردو)


مقالہ نگار

انصر عباس

انرولمنٹ نمبر:162400112631

نگران

پروفیسر ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری

پرنسپل اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی،

لاہور





شعبۂ اردو

وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنس و ٹیکنالوجی، اسلام آباد


۲۰۱۹ء

# پاکستانی اردو شاعری میں مِلّی نغمہ نگاری کی روایت

مقالہ نگار: انصر عباس

انرولمنٹ نمبر:162400112631

تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ-ڈی (اردو)

وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنس و ٹیکنالوجی، اسلام آباد

**یہ مقالہ پی ایچ-ڈی اردو کی ڈگری کی تکمیل اور حصول کے لیے پیش کیا گیا**

**کلیہ فنون**

شعبۂ اردو

## وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنس و ٹیکنالوجی، اسلام آباد

**۲۰۱۹ء**

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

# مقالہ کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مقالہ ہذا کا تفصیلاً جائزہ لیا ہے اور مقالہ کے تحقیق و پیشکش کے مطلوبہ اسلوب و معیار کی جانچ پڑتال کی ہے۔ مزید یہ کہ مجموعی طور پر مقالہ نگار کی کارکردگی قابلِ اطمینان ہے لہٰذا کلیہ فنون کو اس مقالہ کی منظوری کی سفارش کی جاتی ہے۔

عنوانِ مقالہ: پاکستانی اردو شاعری میں مِلّی نغمہ نگاری کی روایت

پیش کنندہ: انصر عباس

رجسٹریشن نمبر:180-URD-Ph.D(Urdu)-SP-2016

ڈگری کا نام: ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ اردو:

نگرانِ مقالہ:

بیرونی ممتحن:

چیئر مین شعبۂ اردو:

ڈین کلیہ فنون:

تاریخ:

# اقرارنامہ

میں انصر عباس اس امر کی حلفاً تصدیق کرتا ہوں کہ مقالہ کے سلسلے میں کی گئی تحقیق میری ذاتی ہے جو جامعہ وفاقی اردو برائے فنون، سائنس و ٹیکنالوجی اسلام آباد کے پی ایچ۔ڈی اردو سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔مزید برآں میرا تحقیقی مقالہ جس کا عنوان **"پاکستانی اردو شاعری میں مِلّی نغمہ نگاری کی روایت"** ہے، کسی اور ادارے یا یونیورسٹی میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش کیا گیا ہے اور نہ آئندہ کیا جائے گا۔

دستخط مقالہ نگار:

نام مقالہ نگار: انصر عباس

وفاقی اُردو یونیورسٹی

برائے فنون، سائنس و ٹیکنالوجی، اسلام آباد

مقالہ جمع کرانے کی تاریخ: جون ۲۰۱۹ء

# تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ مقالہ نگار انصر عباس نے اپنا مقالہ بعنوان **"پاکستانی اردو شاعری میں ملّی نغمہ نگاری کی روایت"** میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ مقالہ نگار نے ذاتی کاوش اور انتہائی محنت سے اپنی تحقیق کو مکمل کیا ہے۔ میں مقالہ نگار کے تحقیقی و تنقیدی کام سے مطمئن ہوں اور سفارش کرتا ہوں کہ مقالے کو جانچ کے لیے بیرونی ممتحنین کی خدمت میں ارسال کر دیا جائے ۔

ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری

نگران مقالہ

دستخط:

تاریخ:

# انتساب

والدہ محترمہ، استاذہ محترمہ ڈاکٹر ناہید قمر صاحبہ اور
پیارے بھائی محترم محمد رضوان بلال صاحب

کی

لازوال محبتوں کی نذر

# ترتیبِ ابواب

# فہرست عنوانات مقالہ

| باب دوّم | صفحہ نمبر |
|---|---|

باب سوّم　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　صفحہ نمبر

| باب پنجم | صفحہ نمبر |
| --- | --- |

# پیش لفظ

اردو شعر و ادب کی تمام مقامی و بدیسی اصناف اور شعری ہیئتوں پر کئی پہلوؤں سے قابل قدر تحقیقی و تنقیدی کام ہو چکا ہے مگر حیران کن بات یہ ہے کہ مِلّی نغمہ جو پاکستان میں اردو زبان کی قومی صنف ہے، اس کے حوالے سے کام سامنے نہیں آیا اور اس سے بھی زیادہ اچنبھے کی بات یہ کہ ہمارے محققین و نقاد مِلّی نغمہ کو گیت ہی کا ایک ذیلی عنوان سمجھتے آ رہے ہیں اور مِلّی نغمہ کی جداگانہ صنفی حیثیت سے انکاری ہیں۔ تمام شعری اصناف اور ہیئتیں بلاشبہ اردو زبان میں مروّج ہونے کے بعد اس کا حصہ بن چکی ہیں۔ یہاں بدیسی کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کیونکہ یہ اصناف دوسری زبانوں سے اردو میں وارد ہوئیں اور تہذیبی اور عصری تقاضوں پر پورا اترنے کی بدولت باقاعدہ رواج پا گئیں جبکہ مِلّی نغمہ واحد صنف سخن ہے جو اردو اور پاکستان کی تخلیقی صنف ہے لیکن اہل دانش کی نظروں سے اوجھل ہے۔ البتہ شعرا نے اکثر جگہوں پر مِلّی نغمہ کا لفظ بطور صنف کے استعمال کیا ہے۔ اس کے باوجود مِلّی نغمہ کو محققین و نقاد کی توجہ کی ضرورت تھی۔

مِلّی نغمہ کو گیت کا ذیلی عنوان سمجھنا سمجھ سے بالاتر ہے کیونکہ گیت ایک نسوانی صنف سخن ہے۔ جس میں عورت کی طرف سے مرد سے اظہار محبت کیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں موضوع کے لحاظ سے گیت غزل کے برعکس ہے لیکن گیت کی کوئی مخصوص ہیئتی صورت متعیّن نہیں ہے اور نقاد اس کو چار و ناچار موضوعی صنف سخن تسلیم کرتے ہیں جس کا موضوع عورت کی آواز ہے لیکن مِلّی نغمہ اس سے قطعاً مختلف صنف ہے۔ بلاشبہ گیت کی طرح اس کی بھی کوئی مخصوص ہیئت نہیں ہے اور دیگر موضوعاتی اصناف سخن کی طرح اس میں ہیئتی تنوع پایا جاتا ہے لیکن اس کی جداگانہ شناخت کے ساتھ جس اظہاریہ پر منحصر ہے وہ اس کا موضوع ہے۔ مِلّی نغمہ ملت اسلامیہ سے منسوب وہ شعری صنف ہے جس میں عالم اسلام اور اس سے ملحقہ علاقوں اور تمام دنیا کے مسلمانوں کے مسائل و وسائل، عروج و زوال، خوشی و رنج، ماضی و حال کے واقعات اور مستقبل کے لائحہ عمل سمیت تمام پہلوؤں کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ مِلّی نغمہ اردو کی صنف سخن ہے اور اردو صرف پاکستان کی قومی زبان تسلیم کی جاتی ہے اس لیے اس کو پاکستان سے خصوصی تعلق حاصل ہے۔ پاکستان ایک خالص اسلامی نظریاتی ملک ہے جس کی ملت اسلامیہ کے ساتھ مکمل ہم آہنگی ہے اور پاکستان کے وسائل و مسائل ملت اسلامیہ کے وسائل و مسائل میں شمار ہوتے ہیں یعنی ملت اسلامیہ ایک جسم ہے تو پاکستان اس جسم کا حصہ ہے لہٰذا پاکستان میں ہونے والی تمام قومی و مِلّی شاعری کو مِلّی نغمہ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

اہل نقاد قومی وملّی شاعری کو ایک الگ موضوع تسلیم کر چکے ہیں اور قومی وملّی شاعری کے حوالے سے با قاعدہ تحقیقی و تجزیاتی کام بھی ہو چکا ہے لیکن قومی وملّی شاعری کو با قاعدہ صنف کا نام دینے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ملّی نغمہ میں بھی گیت کی طرح موسیقی کا عمل دخل زیادہ ہے لیکن ملّی نغمہ میں نغمگی کی کیفیت اس کی ضرورت ہے۔ صرف اس بنیاد پر ملّی نغمہ کو ایک نسوانی صنف سخن میں ضم نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کو ایک علیحدہ قومی صنف کے طور پر تسلیم کیا جانا نہایت ضروری ہے۔ صرف قومی وملّی شاعری کوئی صنف نہیں ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے کہ جیسے مرثیہ کی بجائے، "مرنے والے کی تعریف میں کی جانے والی شاعری" کہنا غیر مناسب ہے۔ اس طرح ملّی نغمہ کی بجائے قومی وملّی شاعری کی رٹ لگانا بھی کسی صورت مناسب نہیں ہے اور قومی وملّی موضوعات پر مبنی شعری سرمائے کو ملّی نغمہ کہنا بہر صورت مناسب اقدام تسلیم کیا جائے گا۔

زیر بحث موضوع جتنا سادہ محسوس ہوتا ہے اتنا ہی پیچیدہ بھی ہے کیونکہ کسی بھی زبان و ادب میں ایک نئی صنف متعارف کروانا اور اس پر تجزیہ کرنا میرے جیسے عام طالب علم کے لیے انتہائی کٹھن مرحلہ تھا کیوں کہ اس موضوع پر تخلیقی ادب تو موجود تھا لیکن تحقیقی اور تجزیاتی حوالے سے کام نہ ہونے کی وجہ سے کئی دشواریوں اور مسائل کا سامنا رہا۔

قومی وملّی نغمے اُس وقت سے میری روح میں رچ بس چکے تھے جب بچپن میں قرارداد پاکستان، یوم آزادی اور یوم دفاع کے مواقع پر قومی وملّی نغمات آڈیو اور ویڈیو کی صورت میں دیکھنے اور سننے کو ملتے۔ ملّی نغمات کو سننے سے ایک خاص قسم کا جوش اور حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہو جاتا اور چاہتے نہ چاہتے ملک و ملت کی خاطر کچھ کر گزرنے کا جنون بیدار ہو جاتا۔ لیکن اس وقت کیا معلوم تھا کہ ایک دن انھیں ملّی نغموں پر میں پی ایچ۔ڈی کی سطح کا کام کروں گا۔ اس حوالے سے میں خود کو خوش قسمت ترین انسان سمجھتا ہوں کہ اپنے ملک پاکستان کی قومی صنف یعنی ملّی نغمہ کو ایک الگ صنف کی حیثیت سے متعارف کروانے میں میری کاوش اولین مقام رکھتی ہے، جس کے لیے میں خدائے بزرگ و برتر کے سامنے سجدۂ شکر بجالاتا ہوں۔

میری ایک اور بھی خوش قسمتی ہے اور وہ عہدِ حاضر کے نہایت محترم و شفیق استاد جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری صاحب سے شرفِ تلمذ حاصل ہونے کی ہے کیونکہ ایسے گوہر نایاب محقق و نقاد اور معلم کے بغیر میرے تحقیقی کام کی تکمیل ناممکن تھی۔ میری دلی خواہش تھی کہ میں جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری صاحب کی نگرانی میں کام کروں، صد شکر کہ انھوں نے خصوصی شفقت اور علم دوستی کے پیش نظر میری درخواست پر مجھے اپنی نگرانی میں کام کرنے کی خواہش کو شرفِ قبولیت بخشا

اس مقالے کا بنیادی موضوع " پاکستانی اردو شاعری میں مِلّی نغمہ نگاری کی روایت " ہے لیکن مِلّی نغمہ کو اردو کی دیگر اصناف سخن کے برابر کھڑا کرنا سب سے اہم مرحلہ تھا جس کو میں نے اپنے اساتذہ اور نگران مقالہ کی رہنمائی میں بھرپور طریقے سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود میں اس بات کا مدعی نہیں ہوں کہ اس موضوع سے متعلق تحقیقی کام تکمیل کو پہنچا بلکہ یہ تو ایک آغاز ہے اور میں یقین سے کہتا ہوں کہ میری اس تحقیقی کاوش کے بعد اس موضوع پر مزید تحقیق کے کئی در وا ہوں گے۔

جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں، میرا بنیادی موضوع مِلّی نغموں کی روایت اور معیار پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالنا ہے۔ اس میں سب سے بڑی مشکل جو مجھے پیش آئی، وہ مِلّی نغموں کا حصول تھا جو آڈیو اور ویڈیو کی صورت میں تو میسر تھے لیکن کتابی صورت میں صرف قدیم اور بڑی لائبریریوں کی دھول میں پوشیدہ تھے۔ اس لیے مجھے ملک کے مختلف کتب خانوں تک رسائی حاصل کرنا پڑی اور مجھے کتب خانہ ادارہ فروغ قومی زبان، کتب خانہ اکادمی ادبیات، کتب خانہ جامعہ کراچی، پاکستان نیشنل لائبریری، کتب خانہ جامعہ وفاقی اردو، کتب خانہ اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی، آرمی سنٹرل لائبریری اور پاک فضائیہ کے کئی کتب خانوں سمیت متعدد ذاتی کتب خانوں کی خاک چھاننے کے بعد اس مقالہ کی تحقیق کا سامان میسر ہوا۔

دوران تحقیق جن اساتذۂ کرام نے کمال مہربانی سے میرے ساتھ تعاون کیا ان میں جامعہ وفاقی اردو اسلام آباد کے صدر شعبۂ اردو جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد وسیم انجم صاحب کی بے لوث رہنمائی اور تعاون کو سب سے اولین مقام حاصل ہے۔ جامعہ وفاقی کے دوسرے اساتذۂ کرام میں جناب پروفیسر ڈاکٹر سید عون ساجد نقوی صاحب، محترمہ پروفیسر ڈاکٹر فہمیدہ تبسم صاحبہ اور محترمہ پروفیسر ڈاکٹر ناہید قمر صاحبہ کی نوازشات ہمہ تن میرے ساتھ رہیں۔ جامعہ وفاقی سے باہر کے اساتذۂ کرام میں صدر شعبۂ اردو جناب پروفیسر ڈاکٹر سید اشفاق حسین بخاری (انٹرنیشنل قراقرم یونیورسٹی گلگت)، محترمہ پروفیسر ڈاکٹر سمیرا گل (ناردرن یونیورسٹی، نوشہرہ)، جناب پروفیسر ڈاکٹر ظفر حسین ہرل (گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد)، جناب پروفیسر ڈاکٹر فیض اکبر (گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ)، پروفیسر اظہر اقبال (گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ) اور سید فرحت عباس شاہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ دیگر معزز معاونین میں لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) جناب خالد مصطفٰی صاحب، ماہنامہ ہلال کے مدیر جناب یوسف عالمگیرین صاحب اور چیف مدیر بریگیڈیر طاہر محمود صاحب اور نیشنل لائبریری اسلام آباد کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر جناب محمد ریاض صاحب قابل ذکر ہیں، ان سب کا میں تہ دل سے شکر گزار ہوں۔

میں بطور خاص اپنے استاد محترم اور نگران مقالہ جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری صاحب کی نوازشات کا ازحد معترف ہوں جنھوں نے بھرپور توجہ اور شفقت سے میری بے معنی تحریروں کو حسن بخشا اور مجھے اپنی گراں قدر ہدایات سے نوازتے رہے۔ استادِ محترم کی ان بے پناہ مہربانیوں کے لیے مجھے شکریہ کا لفظ بہت ہیچ محسوس ہو رہا ہے کیونکہ ان کا رتبہ بڑا اور شکریہ کا لفظ بہت چھوٹا ہے لہٰذا میں صرف ان کی عنایات کا معترف ہو کر اپنے دل کو منور کر سکتا ہوں۔ استادِ محترم نے میرے مقالے کو لفظ بہ لفظ اور حرف بہ حرف پڑھا اور اپنی قیمتی آرا سے میری راہنمائی فرمائی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے مقالے کی تمام خوبیاں میرے استاد محترم کی راہنمائی کا حاصل ہیں اور اس میں جو خامیاں رہ گئی ہیں ان کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔

یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ملّی نغمہ نگاری کے بنیادی مباحث پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس میں قوم اور ملت کے بنیادی تصور، قومی و ملّی شاعری، ملّی نغمہ بطور صنف سخن اور ملّی نغمہ اور پاکستان کے خصوصی تعلق پر بحث کی گئی ہے کیونکہ ان بنیادی مباحث پر روشنی ڈالے بغیر ملّی نغمہ نگاری کی روایت بیان کرنا قدرے ادھورا ہوتا۔

دوسرے باب ”اردو میں قومی و ملّی شاعری---- آغاز تا قیامِ پاکستان“ میں قومی و ملّی شاعری کا پس منظر پیش کیا گیا ہے۔ اس کے پہلے حصے میں عالمی ادب میں قومی شاعری کی مختصر روایت بیان کی گئی ہے۔ جس کے بعد اردو ادب میں قومی و ملّی شاعری کے ابتدائی نقوش سے لے کر قیام پاکستان تک کا مختصر تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مقالہ کے تیسرے باب میں قیام پاکستان کے بعد کی ملّی نغمہ نگاری کے بنیادی موضوعات و افکار کی تحقیق و تجزیہ پیش کیا گیا ہے جبکہ مقالے کے چوتھے باب میں ملّی نغمہ نگاری کے سب سے اہم اور وسیع موضوع یعنی عسکری پس منظر میں ہونے والی ملّی نغمہ نگاری کو مختلف ادوار کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پانچویں اور آخری باب میں قومی و ملّی نغموں کا فنی و اسلوبی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں ہیئتی تنوع اور اسالیب کے تنوع کا الگ الگ مطالعہ شامل ہے۔ اور سب سے آخر میں اس مقالے میں پیش کیے گئے تمام مباحث کو سمیٹتے ہوئے ماحصل پیش کیا گیا ہے۔

ان تمام ابواب اور ماحصل کے بعد کتابیات کو موضوعات کے اعتبار سے الگ الگ منقسم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن میں تحقیق و تنقید کے موضوعات کی کتب، دواوین، کلیات، شعری مجموعے، لغات، اخبارات، اور رسائل وغیرہ شامل ہیں۔

پی ایچ ڈی کی سطح کا تحقیقی کام فردِ واحد کے بس کا نہیں ہے کیونکہ اس تحقیق میں اگر محقق کے ساتھ دوست، اساتذۂ کرام اور ماہرین موضوع کا تعاون شامل نہ ہو تو تحقیق کی راہیں دشوار تر ہوتی چلی جاتی ہیں، لہٰذا میں اپنے ان دوستوں کا شکریہ ادا کرنا لازمی سمجھتا ہوں جن کے تعاون سے تحقیق کی راہیں میرے لیے آسان ہوئیں۔ ان دوستوں میں میرے عزیز ترین دوست جناب ابن سبیل صفدر چدھڑ، شاہد فرمان، عامر اقبال، تہمینہ ممتاز، احسان اللہ، شوکت علی، عاصمہ مظہر، نائیلہ پرویز، اختر زیب، امتیاز حسین، قمر زمان، منہاج اور گل محمد خان مروت خاص طور سے شامل ہیں۔

میں خصوصی طور اپنے دوست اور عزیز جناب محمد وحید اقبال صاحب کی شبانہ روز محنت کا شکر گزار و معترف ہوں جنھوں نے میرے مقالے کو تمام فنی محاسن کے ساتھ کمپوز کیا اور جناب ذیشان توصیف صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے جامعہ کے معیار کے مطابق اس کی درستگی اور اصلاح سے اس مقالہ کو حسن بخشا۔

مقالے کی پروف ریڈنگ اور اس کی نوک پلک سنوارنے میں، مَیں اپنی بڑی بہن محترمہ عذرا پروین (مسز محمد رضوان بلال) اور نہایت قابل قدر اور بڑے بھائی جناب محمد رضوان بلال صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے اپنی خرابی صحت کی پروا کیے بغیر ہر طرح سے میرے ساتھ تعاون کیا اور میرے مقالے کو دوام بخشا۔ میں سمجھتا ہوں کہ محمد رضوان بلال صاحب کے تعاون کے بغیر میرا مقالہ لازماً تاخیر کا شکار ہو جاتا، اس کے لیے میں ان کی بے پناہ محبت اور بے لوث شبانہ روز تعاون کا بے حد ممنون ہوں۔

میں اپنی بڑی بہن اور ایم فل کی ہم جماعت محترمہ تقویم اختر (گولڈ میڈلسٹ) اور جناب شعیب صاحب کا بھی ممنون ہوں، جنھوں نے مقالہ کی تیاری اور تکمیل میں میرا بھرپور ساتھ دیا۔

آخر میں مَیں اپنی والدہ محترمہ کا از حد معترف ہوں جنھوں نے ہمیشہ مجھے بے لوث اور خاموش دعاؤں سے نوازا، کیونکہ میرے اس مقالے سمیت میری زندگی کی تمام کامیابیاں میری ماں کی دعاؤں کا نتیجہ ہیں۔

انصر عباس

۱۰ جون ۲۰۱۹ء

# ABSTRACT

## “Pakistani Urdu Sha’iri mein Milli Naghma Nigaari ki Rewayat”

## The tradition of national songs in Pakistani Urdu Poetry

The poetry, which deals with national aspects of a society, is called national poetry. When a nation becomes the part of a certain anthropological and religious paradigm, the poetry becomes the poetry of nation (millat). The harmony between Pakistan and Islam links its national poetry with “Milli” poetry. When this national poetry creates its magic and grandeur upon the musical strings and stirs the nationalism, it is called “Milli” song. But poetry is the musical expression of emotions and feelings, so national and “Milli” poetry can be called national song (Milli naghma).

Milli song is the genre of Urdu literature which has structural variations and emotions of patriotism, making it unique and distinguished. But unfortunately, it has been devoid of its literacy identity in Urdu literature and it has been considered the sub part of “Geet”. The reason for this was the similar usage of musical instruments in both genres. But it has its own identity due to its unique characteristics and national aspects.

National song is a powerful medium to express the national issues, grief and sorrows, courage and emotion, rhetorical and instructive and even all types of issues. Its range of topics is very vast which includes patriotism, civilization traditions, moral traditions, national leaders, the safeguard of religious principles and military aspects as well as all national issues.

National song, with different titles/names has been the part of Urdu literature and poetry. Because the poetry written for the awakening of national consciousness has been named differently. Among them Epic, shehr  ashob, national elegy and national song and are included. Pakistan made on the basis of Islamic ideology and these different poetic genres (epic, elegy, etc) have been associated with Islamic state/ummah, giving it the name of milli song. Milli song, through an evolutionary process, has been the part of Urdu literature as a specific genre of milli naghma.

Milli naghma can be specifically called as a Pakistan's literacy genre because Urdu is the national language of Pakistan only in all Muslim and non-Muslim countries. But there are different national languages in different Islamic and other countries respectively except Urdu.

Another distinction of Milli naghma has been that it is written in Urdu and other Pakistani languages. Other genres like elegy, qaseeda, sonnet, haiku, free verse and ghazal have been entered in Urdu literature from foreign literatures and monarchs. Milli naghma is the only genre which is sole production of Urdu and Pakistan is its only country. Milli naghma has the capability to represent the issues of Pakistan and Islamic countries all over the world. Therefore its topics are universal.

باب اول

# قومی و ملّی نغمہ نگاری.... بنیادی مباحث

صفحہ نمبر

## (الف) قوم اور ملت کا تصور

پس منظر:

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی ارتقا کے سفر کا آغاز فرد واحد سے ہوا۔ موجودہ دور کے اربوں انسانوں کی صرف ایک مرد حضرت آدمؑ اور ایک عورت حضرت حواؑ سے بڑھوتری ایک خاندان کی شکل میں شروع ہوئی۔ شاعر نے بھی کیا خوب کہا ہے:

طینتِ آدم میں تھی اللہ، کیا نشوونما
ایک مٹھی خاک یوں پھیلی کہ دنیا ہو گئی (۱)

جب اولاد آدم بڑھنا شروع ہوئی اور وہ ایک خاندان میں نہ سما سکی تو ایک خاندان سے نکل کر کئی خاندانوں میں منقسم ہو گئی۔ مرورِ ایام کے ساتھ جب ان خاندانوں کی تعداد بڑھی تو یہ خاندان قبائل میں منقسم ہو گئے۔ ازاں بعد ان کے لیے ایک جگہ متحد ہو کر رہنا دشوار ہوتا گیا جس کے نتیجے میں انھوں نے نقل مکانی اختیار کی اور جہاں خوراک اور پانی میسر آیا وہاں پڑاؤ ڈال دیا۔ اولادِ آدم کی پہچان پانے والے یہ لوگ خاندان کے سربراہ کے نام سے پہچانے جانے لگے۔ اولادِ آدم میں مزید اضافہ کے بعد جب یہ خاندان، قبائل کی شکل اختیار کر گئے تو قبیلہ کے کسی بڑے یا پہلے فرد کی نسبت سے قبائل کے ناموں کی پہچان ہوئی۔ اس طرح قبائل میں نسل در نسل مزید تقسیم ہوتی گئی۔ پھر یہ قبائل آگے چل کر ایک علاقے یا ایک پیروکار کی نسبت سے قوم کی شکل اختیار کر گئے۔ اس طرح خاندان اور قبائل جہاں جہاں آباد ہوتے گئے وہاں کی آب و ہوا کی نسبت سے ان کی زبان و معاشرت میں تبدیلی آتی گئی۔ حقیقتاً یہ اللہ کا بنایا ہوا نظام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اور اس کی نشانیوں سے ہے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمھاری زبانوں
اور رنگوں کا اختلاف، بے شک اس میں نشانیاں ہیں جاننے والوں کے لیے"(۲)

وقت گزرتا رہا اور بنی آدم نے جہاں پڑاؤ ڈالا تھا وہاں اس نے مستقل سکونت اختیار کرنا شروع کی تو شہر آباد ہونا شروع ہوئے۔ مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد علاقہ سے محبت بھی اس کے خون میں شامل ہو گئی جس سے انسانی رشتے کمزور ہوئے اور یہ رشتے کمزور پڑ جانے سے انسان علاقہ سے جس کو بعد میں وطن کا نام ملا،

الحاق کرنے لگا۔ اسی طرح انسان جب کسی بستی یا شہر میں آباد ہوا تو وہ مختلف طبقات میں بھی تقسیم ہو تا چلا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ارتقائی قوانین کے تحت تمام کام ایک انسان کے بس میں نہیں ہوتے۔ ابتدا میں اس نے اپنی آسانی کی خاطر خود کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا جن میں بڑھئی، مستری، مزدور، شکاری، مزارع، سپاہ گر اور بہت سے دیگر طبقات شامل تھے۔ اس طرح ایک گروہ یا یوں کہیے کہ ایک قبیلہ کئی طبقات میں تقسیم ہوا اور ہر طبقہ کو اس کے کام کی نسبت سے پکارا جانے لگا۔ تمام گروہوں کے اندر ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس کو قبیلے کا حکمران ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس طبقے کا سربراہ اپنی فراست، اہلیت اور قابلیت کی بنیاد پر سردار مانا گیا، یعنی ایک فرد کی وجہ سے اس طبقہ کو پورے قبیلے کے افراد پہ سبقت حاصل ہو گئی۔ اقتدار کا نشہ بڑھا تو سرداروں نے زیادہ سے زیادہ لوگوں اور علاقے کو اپنے زیر اثر کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اسی طرح گروہوں اور قبیلوں کے درمیان چھوٹی موٹی لڑائی سے بڑی جنگوں کا آغاز بھی ہوا۔ ہر قبیلہ، گروہ یا قوم ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے اپنے ہی ہم نسلوں کا خون بہانے لگا۔

انسانی فطرت میں جب حکمرانی اور اقتدار کے نشہ نے جوش مارا تو وہ اپنی اصل سے بھی بھٹک گیا اور وہ اپنے ہی ہم نسلوں اور قبیلے یا گروہ کے لوگوں سے سجدہ کروانے کی ابتدا کر بیٹھا۔ اس طرح اس اقتدار کے نشے نے غلامی کو جنم دیا۔ جس سے تاجر طبقے کے اندر ایک ذیلی طبقہ کی ابتدا ہوئی۔ اس طبقہ نے انسانوں کی تجارت کا قصد کیا۔ اس طرح انسانی فطرت کے ایک اور پہلو کا ظہور ہوا۔ انسانی خصلت میں شامل ہے کہ وہ ہمیشہ دوسرے انسانوں پر حکمرانی کرنا چاہتا ہے۔ اسی خصلت کے تحت کئی ایک حضرات نے انسانی آزادی پر قابض ہونے کی سعی کی اور بہت سے اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ اس طرح حاکمیت وجود میں آئی اور حاکمیت ہمیشہ لوگوں کو اپنا غلام دیکھنا چاہتی ہے خواہ زمانہ قدیم یعنی پتھر کے دور سے مثال لے لیں یا موجودہ ترقی یافتہ دور پر نظر دوڑائیں۔ یہ حاکمیت کے مزاج کے خلاف ہے کہ لوگ آزادی اور اپنی منشاء کے مطابق زندگی گزاریں کیونکہ ایسا ہونے سے ان کی حاکمیت کی بقاء کو خطرات لاحق ہوتے ہیں۔ حاکمیت کے پیاسوں نے اللہ کے آزاد بندوں جن میں وہ ہستی (عورت) جس کو انسان کے سکون اور راحت کے لیے پیدا کیا گیا، کو بھی غلام بنانے سے باز نہ آیا بلکہ صنف نازک تو مردوں سے زیادہ غلامی کی چکی میں پستی رہی ہے۔ ظلم کی انتہا تو یہ ہے کہ انسانوں کی خرید و فروخت کے لیے بھی قوانین بنائے گئے۔ ابن آدم اور بنت حوا کو غلام رکھنے کے لیے تمام اقوام کے اپنے قوانین تھے جن کے مطابق ان میں خرید و فروخت ہوتی ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے کو سزا کا مستحق ٹھہرایا جاتا۔

## قوم کا عمومی مفہوم:

انسان جب خاندان سے قبیلہ اور پڑاو سے شہروں میں آباد ہوا تو اس کی ثقافت، فکر اور سماج میں خاطر خواہ تبدیلی ہوئی۔ اس کی پہچان خاندان، قبیلہ یا نسل کی بجائے ایک قوم کے طور پر ہوئی۔ جہاں تک قوم کے مفہوم کا تعلق ہے تو ہر دور اور زبان میں اس کا مفہوم الگ رہا ہے۔ اگر قدیم دور میں چلے جائیں تو قوم ایک گروہ یا قبیلے کو کہا جاتا تھا جس کا تعلق ایک مخصوص زمانے سے تھا (قوم نوحِ، قوم ابراہیم، قوم بنی اسرائیل وغیرہ) لیکن قوم کے جدید تصور کو دیکھا جائے تو اس کے معانی اہل فکر و دانش نے اپنے اپنے خیالات کے مطابق اس طرح سے وضع کیے ہیں۔

انگریزی زبان میں قوم کی بجائے Nation (نیشن) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ برنارڈ جوزف کے بقول "قوم کی اصطلاح ایک لاطینی لفظ 'نیٹیو' سے ماخوذ ہے جو عام طور پر پیدائشی یا نسل کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔" (۳) قوم سے مراد ایک ایسا قبیلہ یا سماجی گروہ بھی ہوتا ہے جو حقیقتاً یا خیالی طور پر ایک نسل کا ہونے کی بنا پر متحد ہو۔ سترہویں صدی سے یہ لفظ ایک مملکت کی آبادی کے لیے بلا تفریق نسل استعمال ہونے لگا اور آج یہ وسیع تر معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق:

> "People who common identity creates a psychological bond and a political community. Their political identity usually comprises such characteristics as a common language, culture, ethnicity and history. More then one nation may comprises a state, but the terms nation, state and country are often used interchangeability." (4)

آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے مطابق:

> "Nation, distinct race or people characterized by common descents, languages; or history use organized as a separate political state and occupying a definite territory." (5)

بقول سٹالن: ”قوم انسانوں کے ایک ایسے پائیدار، مضبوط گروہ کا نام ہے، جس کے ارتقاو عروج میں تاریخ نے ہاتھ بٹایا ہو اور جس کے اندر اشتراکِ زبان، اشتراکِ ارض، اور اشتراکِ معاش پایا جاتا ہو اور ساتھ ہی اس کی نفسیاتی ساخت بھی ایک جیسی ہو.....وہ نفسیاتی ساخت جس کا اظہار تہذیبی اتحاد و اشتراک کی صورت میں ہوتا ہے۔“(٦)

قوم کے اس تصور سے مراد کسی ملک، ریاست یا قبیلے کے وہ لوگ جن میں ذہنی ہم آہنگی، ثقافت، زبان یا تاریخی مماثلت پائی جائے ان لوگوں کو ایک قوم کہا گیا ہے اور اس قوم کے لوگوں میں سیاسی وشعوری رشتے کو قومیت کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔ قوم اور قومیت کے اس فرق کو جیلانی کامران اس طرح واضح کرتے ہیں:

”قوم سے وہ بے شمار لوگ مراد ہیں جو خاندان اور قبیلے کے پرے رہتے ہیں اور قصبے اور شہر کی سرحدوں کے پرے وسیع و عریض ملک میں آباد ہوتے ہیں۔ ان بے شمار لوگوں کے ساتھ اور وسیع و عریض ملک کے ساتھ انسان جس شعوری رشتے کو قائم کرتا ہے اسے جدید زمانے میں قومیت کہا گیا ہے۔“(٧)

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں قومیت کی اصطلاح کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

"Nationalism is a state of mind in which the supreme loyalty of the individuals is felt to be due to the nation state.....The term nationality is frequently used as synonymous with citizen. " (٨)

یعنی قوم یا قومیت اس ذہنی سطح کو کہتے ہیں جس میں کسی شخصیت کی تمام تر اطاعت کے حقوق قومی ریاست کے ساتھ وابستہ ہوں دوسرے معنوں میں قومیت کی اصطلاح لا مذاہب ذہنوں کی پیداوار ہے جن کا مقصد مذہبی شعار سے آزادی یا چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔

انگریزی زبان کا لفظ Nation جس کے لیے اردو زبان میں ”قوم“ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اردو زبان میں قوم کا لفظ عربی سے آیا ہے اور عربی میں اس کے معانی مفتاح الغات کے مطابق: ”انسانوں کا گروہ“(٩)

القاموس الجدید کے مطابق: ”امت، امم، ملت اور جنس“(١٠) کے ہیں۔

اردو کی مشہور لغت فرہنگ آصفیہ کے مطابق قوم کے معنی:

”آدمیوں کا گروہ، فرقہ، خاندان، نسل اور ذات کے ہیں۔“(١١)

فیروز اللغات کے مطابق: ”آدمیوں کا گروہ، کسی ایک ملک کے پکے شہری، فرقہ، خاندان، نسل اور ذات کے ہیں۔“ (۱۲)

قومی انگریزی اردو لغت کے مطابق:

> ” "Nation" کا اردو مترادف قوم ہے اور قوم کے معنی: کسی علاقے میں آباد لوگ جو مشترکہ سیاسی اداروں کی بدولت متحد ہوں: علاقہ یا ملک ایسے لوگوں کا گروہ جو ایک جیسی یا ملتی جلتی زبان بولتے ہوں اور جن کی عموماً ایک ہی نسل ہو۔“(۱۳)

متنوع النوع اردو اور انگریزی لغات کے مطالعہ سے قوم کا مطلب و مفہوم معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قوم بنیادی طور پر ایک گروہ کا نام ہے، ایک ایسا گروہ جس کے خیالات و فکر اور زبان و ثقافت ایک جیسے ہوں اور وہ ایک ملک یا ریاست سے تعلق رکھتے ہوں۔

قومیت کا جدید مغربی تصور جس میں کسی قوم کے انحصار کے لیے ملک ہی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور قوموں کی بنیاد وطن ہے، اس تصور کا آغاز اُس وقت ہوا جب سلطنت روما کا شیرازہ بکھر گیا اور کئی چھوٹی بڑی ریاستیں وجود میں آئیں جو آنے والے ادوار میں جدید تصورِ قومیت کی بنیاد بنیں۔ رومی سلطنت کے دور میں کلیساؤ ں اور پاپائیت کو عوام اور حکمرانوں پر مکمل سبقت حاصل تھی اور عوام کے تمام فیصلوں کا حق بھی انھیں کے پاس تھا۔ جدید قومیت کا تصور دراصل کلیساؤ ں اور جاگیر درانہ نظام سے بغاوت اور سرمایہ درانہ نظام کی پیداوار تھی جو ”تحریک اصلاحِ مذہب“ کے نام سے شروع ہوئی جس کا حقیقت میں مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا اور مذہب واہلِ مذہب سے شدید نفرت کا ردِ عمل تھا اور وہ حقیقی معنوں میں مذہب سے چھٹکارا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب سولھویں صدی عیسویں میں مارٹن لوتھر نے پوپ کی ذہنی و سماجی اجارہ داری کے خلاف آواز آٹھائی تو آمرانہ قوتوں کی طرف سے جابرانہ تشدد کے باوجود عوام کی کثیر تعداد نے ان کا ساتھ دیا۔ اس جدید تصور میں وطن اور اہل وطن کے نام سے کئی قومیتوں کی بنیاد پڑی جس میں حکومت اور طاقت کا سرچشمہ عوام تھے۔ اس جدید قومی تصور کو باقاعدہ تقویت اس وقت مِلّی جب سترھویں صدی عیسوی میں فرانس میں عوامی انقلاب رونما ہوا۔ انقلابِ فرانس سیاسی تاریخ میں ایک ایسا موڑ تھا جس نے آمرانہ قوتوں کے اوسان خطا کر دیے اور مستقبل میں خطرے کی پیش گوئی کی۔ اسی طرح برطانیہ میں بھی جدید وطنی قومیت کا آغاز سترھویں صدی میں ہوا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں جدید قومیت نے مغرب میں غالب عوامی پذیرائی حاصل کر لی۔ امریکہ اور مغربی یورپ میں جدید وطنی تصور اسی صدی کی پیداوار ہے۔ نو آبادیاتی نظام کے قائم ہونے کے بعد انیسویں صدی میں اس وطنی تصور نے پوری دنیا

کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ قومیت کے جدید تصور کے بانیوں میں سٹالن، روسو اور میکاولی وغیرہ شامل ہیں، انھوں نے اپنے نظریات میں کلیساؤں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد ہر چیز کو مادہ سے جوڑ دیا اور روحانیت نام کی کوئی چیز باقی نہ رہی۔ بقول ایوب صابر "اٹھارہویں صدی میں کلیساؤں اور لادینی عقائد کے درمیان فکری جنگ کا خاتمہ ہوا جس میں لادینی عقائد والوں کو فتح ہوئی۔ ریاست کے ہاتھوں کلیسا کی شکست کے بعد نیشنلزم کو اعلیٰ ترین نصب العین کا درجہ حاصل ہو گیا۔"(۱۴) یوں نظریہ قومیت جس کی بنیاد لوتھر نے رکھی تھی، اس نے عالمگیر عیسائیت کو قوموں میں تقسیم کر دیا۔

اہل یورپ کا جدید نظریہ قومیت جس کی بنیاد دنیا کے تمام افراد کی بجائے مخصوص علاقہ یا ملک سے تعلق رکھنے والے افراد کا مفاد تھا اس کی وجوہات بقول اسٹالن:

> "جس زمانے میں وہاں (یورپ) جاگیرداری نظام کو زوال ہو رہا تھا اور مختلف قومیں وجود میں آرہی تھیں، اسی زمانے میں ان ملکوں میں مضبوط مرکز والی ریاستیں قائم ہوئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ الگ الگ قومیں الگ الگ ریاستوں میں شکل پذیر ہو گئیں اور اسی شکل میں ترقی کی منزلیں طے کرنے لگیں ان میں سے کسی بھی ریاست کے اندر کسی بڑی غیر ملکی یا غیر قومی جماعت یا اقلیت کا وجود نہیں تھا چنانچہ ریاست کے اندر ایک قوم پر دوسری قوم کے ظلم و تشدد کا وجود نہ رہا۔ مثلاً فرانس میں کوئی غیر فرانسیسی اقلیت نہیں تھی اور نہ برطانیہ میں کوئی غیر برطانوی اقلیت۔"(۱۵)

بیسویں صدی تک وطنی قومیت کا یہ پودا اس قدر تناور اور مضبوط ہو گیا کہ آس پاس کے وطنی پودوں سے اس کی شاخیں الجھنے لگیں یہ وطنی قوم پرستی کا نتیجہ تھا جس کی بنا پر بیسویں صدی میں دو عظیم جنگیں ہوئیں جن میں انسانوں کی کثیر تعداد لقمۂ اجل بن گئی۔ جاپان کے دو بڑے شہروں پر ایٹم بم گرائے گئے جن کے اثرات تا حال باقی ہیں۔ اقبال نے انھیں حالات کو دیکھ کر جنگ عظیم اول سے سات سال پہلے ۱۹۰۷ء میں پیشن گوئی کی تھی جو سچ ثابت ہوئی۔

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ، نا پائیدار ہو گا (۱۶)

قومیت کے اس جدید لادینی تصور کا اطلاق مغربی یورپ میں مکمل طور پر ہوا اور برصغیر پاک و ہند میں بھی اس کا اثر منڈلانے لگا حتیٰ کہ قیام پاکستان سے پہلے نیشنلسٹ علماء بھی اسی تصور کے گن گانے لگے بقول ایوب

صابر ”یورپ میں میکاولی کے نظریہ وطنیت سے مادہ پرستی کو فروغ حاصل ہوا، حسی تہذیب اور مادہ پرستی کے ضمن میں ڈارون کا نظریہ ارتقا، میکڈونل کا نظریہ جبلت اور فرائڈ کا نظریہ لاشعور یا جنسیت بھی اہمیت کے حامل ہیں.... انیسویں صدی میں وطنی قوم پرستی کا تصور روئے زمین پر پھیل گیا، چنانچہ انیسویں صدی یورپ میں وطنی قوم پرستی کا عہد کہلائی“ (۱۷) جبکہ ایشیا میں اس کی جڑیں بیسویں میں مضبوط ہوئیں۔

اہل یورپ نے اہل اسلام کی طاقت کے خاتمے کے لئے اسی فارمولا پر عمل کیا اور عثمانیہ سلطنت کا خاتمہ کر کے چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا جس سے مغرب پر اسلام کے صدیوں سے چھائے ہوئے رعب کا خاتمہ ہوا۔

## قوم کا اسلامی مفہوم:

اسلام کا نظریہ قوم و قومیت ایک نظریہ سے زیادہ ایک ضابطہ ہے جس کو ضابطۂ حیات کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں نہ تو زبان کے اختلاف کا مسئلہ ہے اور نہ علاقائی حدود کی پابندی۔ امیر و غریب، چھوٹا و بڑا، کالا و گورا سب برابر ہیں۔ اسلام میں اقتدار اعلیٰ کی ذات اللہ تعالیٰ ہے اس لیے اسلام مغرب کے اس لادینی نظریہ قومیت سے مکمل اختلاف رکھتا ہے کیوں کہ اسلام کے نزدیک قومیت کی بنیاد وطن نہیں بلکہ مذہب ہے۔ جدید دنیا جو علاقائی یا وطنی قومیت کے نقصانات سامنے آنے کے بعد اب جس انسانیت کا واویلا کر رہی ہے۔ اس انسانیت کا درس آج سے چودہ سو سال پہلے حضرت محمد مصطفی ﷺ نے دیا تھا۔ اسلام قومیت کے اس مفہوم کی یکسر نفی کرتا ہے جو انسانوں کے درمیان علاقائی یا وطنی تقسیم کی بنیاد پر تعصب پیدا کرے بلکہ اسلام تو خدا کی وحدانیت کے بعد ”انما المومنون اخوۃ“ (۱۸) کا حکم دیتا ہے اور ایسے لازوال اور آفاقی رشتے میں منسلک کرتا ہے جس کی مثال دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔ اس لیے اسلام میں قوم کی بجائے ”ملت“ یا ”امت“ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں قوم کا لفظ جن معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس کی بنیادی طور پر چار اقسام بنتی ہیں۔

- ☆ نسلی اقوام
- ☆ لسانی اقوام
- ☆ علاقائی اقوام
- ☆ مذہبی اقوام

نسلی اقوام: نسلی قوم سے مراد ایسے لوگوں کا گروہ جو ایک ہی فرد یعنی خاندان سے ہوں۔ اس کو عام طور پر ذات، برادری یا گوت بھی کہتے ہیں۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو پاکستان میں کئی اقوام ہیں۔ جن میں گجر، جٹ، آرائیں، راجپوت، خٹک، مروت، میمن اور بلوچ وغیرہ شامل ہیں۔

علاقائی اقوام: علاقائی اقوام سے مراد ایسے لوگوں کا گروہ جو ایک علاقہ کی نسبت سے پہچانے جاتے ہیں۔ جیسے پاکستان میں رہنے والے پاکستانی، ایران والے ایرانی یا اس طرح دوسرے ممالک میں اپنے علاقے سے منسوب ہیں۔ میر امن دہلوی، اقبال لاہوری وغیرہ بھی علاقائی قومیت کی نسبت سے پکارے جاتے ہیں۔

لسانی اقوام: ایک زبان کی نسبت سے ایک قوم کہلاتی ہے جیسے پشتو بولنے والے جہاں بھی ہوں ان کو پٹھان، پنجابی بولنے والوں کو پنجابی، سندھی بولنے والوں کو سندھی، سرائیکی یا ہند کو وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی زبان کی نسبت سے ایک قوم کی پہچان ہوتی ہے۔

مذہبی اقوام: ایک لفظ قوم مذہب کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جس کا ذکر قرآن پاک میں بھی کثرت سے آیا ہے یعنی یہود کی قوم، قومِ شعیب، قومِ عاد، قومِ بنی اسرائیل یا مسلمان قوم وغیرہ۔ اسلام میں بنیادی طور پر یہ لفظ ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس کے لیے ملت کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ اسلامی انسائیکلوپیڈیا کے مطابق:

> "اسلام میں قوم کا تصور صرف اور صرف مذہبی یگانگت ہے۔ اسلام ناجائز طریقے سے اپنے قبیلہ، ہم زبان یا ہم قوم کی حمایت کو غلط سمجھتا ہے۔ اسلام کسی شخص یا قوم کو طاقت یا حسب و نسب یا قومیت کی بنا پر خصوصی حقوق نہیں دیتا بلکہ اسلام کا ایک معیار ہے کہ "ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز" اس مقدس مذہبی رشتہ پر مسلمانوں کی ایک قوم بنتی ہے چاہے ان کی زبان مختلف ہو یا ان کے رنگ مختلف ہوں۔" (۱۹)

اسلام میں قوم نیشن کا مترادف نہیں ہے۔ اسلام انسانوں کی علاقائی اور لسانی تقسیم کے خلاف ہے بلکہ اسلام میں تمام انسان برابر ہیں اور تمام لوگوں کو برابر کے حقوق بھی حاصل ہیں۔ اس لیے اسلام مغرب کے تصور قومیت کی بجائے تصور ملت کا درس دیتا ہے۔

جہاں تک قیام پاکستان کا تعلق ہے تو اس کے قیام کا اصل محرک مسلمانوں کا ملّی تشخص ہے (۲۰) وہ تشخص جس کی بنیاد اسلامی تصور ملت پر رکھی گئی۔ یہ اس دو قومی نظریہ کا حصہ ہے جو حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے کے وقت پیدا ہوا یعنی ایک مسلمان قوم تھی جو اللہ اور اس کے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی پیروکار تھی

اور دوسری ہندو قوم جو وحدانیت کی منکر اور کئی خداؤں اور بتوں کی پوجا کرتی تھی۔ برصغیر کے مسلمانوں نے طویل حکومت کے بعد جب نشاۃ ثانیہ کے دور میں آنکھ کھولی تو احساس ہوا کہ اس کو اپنے تشخص کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ بقول خلیفہ عبدالحکیم:

> ”اس وسیع کرۂ ارض میں مسلمان ایک ایسی ملت کی اکثریت میں گھر گئے تھے جس کی ثقافت کی بنیاد ہی ذات پات اور چھوت چھات پر تھی۔ مسلمانوں نے دیکھا کہ ہزار کوشش سے بھی اس متحدہ وطن میں انھیں کوئی مساوات کے حقوق حاصل نہیں ہوسکتے۔ پاکستان کا نعرہ وحدت اسلامیہ کا نعرہ تھا کہ جہاں مسلماں جس گوشے میں بھی ہیں وہ ایک مخصوص تہذیب کی قوم ہیں۔ وہ سب اس وسیع براعظم میں کچھ ایسے خطے حاصل کرنا چاہتے ہیں جہاں وہ اس تہذیب کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔“(۲۱)

ہندوستان میں جب مسلمانوں کے اقتدار کا سورج غروب ہوا تو انھیں معلوم ہوا کہ اب وہ اُس دور میں جی رہے ہیں جس میں ان کے لیے پورے برصغیر میں دوبارہ اقتدار حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے تو انھوں نے اس میں عافیت جانی کہ وہ اپنے تشخص کو محفوظ کریں کیونکہ جدید دنیا میں وطنی قومیت کے مطابق وہ ہندوستان میں اقلیت میں تھے اور انگریز کے چلے جانے کے بعد وہ ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہوتے۔ جس سے نہ تو ان کا ملّی تشخص محفوظ ہوتا اور نہ ہی تہذیب و ثقافت محفوظ ہوتی۔

## ملت کا خصوصی مفہوم:

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدمؑ میں اپنی روح پھونکی اور اپنی تمام مخلوق یعنی فرشتوں اور جنوں کو آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو اس دوران ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ بنیادی طور پر دو قومی نظریہ کی ابتدا اسی وقت ہوگئی تھی۔ یعنی ایک گروہ خدا کا حکم ماننے والا اور دوسرا گروہ خدا کے حکم کا انکاری۔ یہ تقسیم اس وقت سے چلی آرہی ہے۔ اب بھی دنیا میں دو گروہ یا امتیں ہیں جن میں ایک امت کفر پر قائم ہے اور خدا کی وحدانیت سے انکاری ہے۔ دوسری امّتِ جو خدا کی وحدانیت اور اس کے بھیجے ہوئے انبیائے کرام اور ان کے احکامات پر عمل پیرا ہے۔ امت مسلمہ اس سلسلے کی آخری کڑی ہے جو اللہ کی وحدانیت کے ساتھ آخری رسول ﷺ پر یقین رکھتی ہے۔ اس کا کام دنیا میں امن، سلامتی اور بھلائی قائم کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ اسلام کو کرۂ ارض پر بھیجا تو انھیں زندگی گزارنے کے اصول و احکامات اور ہدایت و رہنمائی عطا فرمائی۔ حضرت آدمؑ پہلے انسان تھے اور اللہ نے انھیں نبوت بھی عطا کی تھی۔ انبیاء کو یہ کام تفویض کیا گیا کہ وہ عام لوگوں تک اللہ تعالیٰ کا حکم پہنچائیں۔ حضرت آدمؑ نے اپنی اولاد کو ایک اللہ کا حکم ماننے اور صرف اُسی کی ذاتِ اقدس کی عبادت کرنے کی تعلیم دی۔ چونکہ اس وقت انسان ارتقاء کی منازل طے کر رہا تھا اور انسان کا شعور بھی بالکل ابتدائی مرحلے میں تھا اس لیے نبوت کی ضرورت بھی زیادہ تھی۔ انسانی ذہن ارتقاء کی ابتدائی منزل پر ہونے کی وجہ سے قابیل کو ہابیل کی لاش ٹھکانے لگانے کے لیے بھی دشواری پیش آئی "تو اللہ نے ایک کوّا بھیجا جو زمین کرید تا تاکہ اسے دکھائے کیونکہ اپنے بھائی کی لاش چھپائے "(۲۲) اولاد آدمؑ کی تعداد جوں جوں بڑھی وہ خاندانوں، گروہوں اور قبیلوں کی شکل میں تقسیم ہو کر دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلتی چلی گئی۔ بنی آدم کی تربیت اور راہِ راست پر لانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں گروہوں یا قبائل کے اندر ہی سے کسی ایک کو یا چند افراد کو مبعوث فرمایا اور ان پر وحی نازل فرمائی کہ وہ ان لوگوں کو اللہ کا پیغام پہنچائیں۔ ابتدائی ادوار میں لگ بھگ ہر قوم لیے ایک پیغمبر بھیجا گیا۔ بسا اوقات ایک وقت میں ایک سے زیادہ پیغمبر بھی ایک قوم کے لیے بھیجے گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انسان کے ارتقاء کی طرح انسانی شعور بھی ارتقائی مدارج طے کر رہا تھا۔ جب نبی کی وفات ہوتی تو اس کے پیروکار اور آنے والی نسل بجائے اس کے کہ خدا کے احکامات پر عمل درآمد کرتی رہتی، اپنے بزرگوں کے بت بنا کر ان کی عبادت شروع کر دیتی اور یوں وہ اللہ کے بتائے ہوئے راستے سے بھٹک جاتی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اس قوم میں دوبارہ کوئی نبی بھیجتا اور جب وہ قوم اس نبی کو جھٹلاتی اور اس کی تعلیمات پر عمل نہ کرتی تو اس پر خدا کا عذاب نازل ہوتا۔ اللہ کی نافرمانی کرنے پر کئی طاقتور قومیں خدا کے عذاب میں گرفتار ہوئیں۔

انسان اور اس کے ذہنی ارتقا کے دوران اللہ تعالیٰ اقوام کے گمراہ، سرکش اور مشرک لوگوں کی رہنمائی کے لیے پیغمبر بھیجتا رہا۔ جب جب کسی گمراہ، سرکش اور مشرک قوم یا اس کے افراد نے خدا کے پیغمبر کی بات سننے اور خدا کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور سرکشی پر قائم رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان قوموں کو عذاب کا مزہ چکھایا۔ بستیوں کی بستیاں اور پوری قومیں تباہ کر دی گئیں حتیٰ کہ کچھ قوموں کو خدا نے آنے والی نسلوں کے لیے ہمیشہ باعث عبرت رکھنے کے لیے انسان سے جانور بھی بنایا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ہم نے ان سے فرمایا کہ ہو جاؤ بندر دھتکارے ہوئے "(۲۳) ان مشرک قوموں کی موت بندر کی صورت میں ہوئی اور وہ قومیں آج کے انسان کے لیے باعثِ عبرت ہیں۔

مرورِایام کے ساتھ انسانی عقل اپنے ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے تقویت اختیار کرتی چلی گئی اور اس کی تنقیدی فکر بھی نشو نما پاتے ہوئے بڑھوتری کے مراحل طے کرنے لگی۔ ایک وقت ایسا آیا جب اس میں وہ شعور پیدا ہونے لگا جو اس کی عقل استقرائی کا مرہون منت ہے۔(۲۴)انسانی شعور کی بڑھوتری سے انبیاء کرام علیہ اسلام کی تعداد میں کمی اور وقفہ بڑھتا گیا اور انسانی زندگی ارتقاء کی اس نہج پر پہنچ گئی جہاں انسان کو راہ راست پر لانے کے لیے نبی کی اتنی ضرورت نہ تھی جتنی انسانیت کی پیدائش کے ابتدائی ایام میں تھی تو پھر استقرائی عقل اور قوتِ تنقید کی پیدائش کے بعد زندگی کا مفاد اسی میں تھا کہ وہ شعور کے ان ماورائے عقل دھاروں کی مزید تشکیل و فروغ کو روک دے، جن کے ذریعے نفسی توانائی انسانی ارتقا کے ابتدائی مرحلے میں اظہار پاتی رہی۔"(۲۵)اس طرح حضرت محمد ﷺ اللہ کے آخری نبی تھے ان کے بعد انسان کو کسی نبی اور رسول کی ضرورت باقی نہیں رہی اور یوں نبوت کا سلسلہ ختم ہوا اور وحی اللہ کی آخری کتاب یعنی قرآن مجید پر منتج ہوئی۔ قرآن سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں کو انسان محفوظ نہ کر سکا تو اللہ نے اپنے طے شدہ منصوبہ کے مطابق فیصلہ کیا کہ کتاب کو اتارنے کے ساتھ وہ اس کی حفاظت بھی اپنے ذمے لے (۲۶) جس طرح انسان کے اوپر مادی نعمتوں کی تکمیل ہو چکی ہے تو نعمت ہدایت کو بھی اس کے اوپر یقینی اہتمام ہو جائے کیونکہ قرآنِ پاک عقل اور وحی کے ذریعے انسان کے لیے تسخیرِ کائنات کی تعبیر پیش کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتا ہے "اسی (اللہ) نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا ہے کہ اسے اور تمام مذہبوں پر غالب کر دے اگرچہ مشرک برا مانیں۔"(۲۷)غالب سے مراد اس کی پشت پر ایسی طاقت جمع کر دینا ہے جو اس کی تعریف و تبدیلی کی ہر ممکن کوشش کو ناکام بنا دے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرکین و منکرین کی مکارانہ چالوں کے باوجود دوسری الہامی کتابوں کے برعکس قرآن پاک میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

ختم نبوت اور حضرت محمد ﷺ کے بارے اقبال فرماتے ہیں "پیغمبر اسلام کی ذات گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک سنگم کی سی ہے لیکن باعتبار اپنے سرچشمہ وحی کے، آپ ﷺ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے لیکن باعتبار اس کی روح کے دنیائے جدید سے۔"(۲۸)یعنی آپ ﷺ کی ذات مبارکہ کی حیثیت جدید اور قدیم انسان کے درمیان ایک پل کی ہے اس لیے کہ حضرت محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے آخری نبی بنا کر بھیجا اور ساتھ ہی اپنی وہ نعمتیں بھی عطا کر دی جو پہلے انبیائے کرام کو عطا نہ ہوئیں۔ آپ کی ذات قیامت تک کے لیے آخری نبی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اللہ خود فرماتا ہے کہ آج میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور تم پر

اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔"(۲۹) اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج انسان کی عقل اس مقام تک پہنچ چکی ہے کہ وہ دین اسلام کی روشنی میں اپنے اصول وضوابط مرتب کرتے ہوئے زندگی گزار سکتا ہے اور اب اس کو کسی اور دین یا پیغمبر کی ضرورت قیامت تک کے لیے نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر وحی کے ذریعے جو کلام یعنی قرآن نازل کیا اس کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "یہ ایک کتاب ہے کہ ہم نے اتاری تمہاری طرف برکت والی تاکہ اس کی آیات کو سوچیں اور عقل مند نصیحت مانیں"(۳۰) اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو سوچنے اور نصیحت ماننے کا درس دیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسانی عقل کا دین اسلام کی تکمیل کے ساتھ ہی اس کا استقرائی ظہور مکمل ہوا اور اللہ نے انسانی عقل کو وہ شعور عطا کر دیا جس سے وہ تجربات اور مشاہدات کے ذریعے تمام دنیا کی تسخیر کر سکتا ہے بقول پروفیسر محمد عثمان:

> "صبح، شام، دن، رات بدلتے موسموں، سورج، ستاروں، پہاڑوں، گرجتے ہوئے بادلوں، زمیں کی تہ سے نکلنے والے خزانوں، سمندر میں پائی جانے والی مخلوق اور اس پر چلنے والی کشتیوں، حتیٰ کہ قدرت کے تمام مظاہر کی طرف قرآن پاک نے ہماری توجہ دلا کر اس کی تسخیر پر آمادہ کیا ہے۔"(۳۱)

مسلمانوں نے اللہ کے حکم کی تعمیل کے سلسلے یا اس کے روحانی اثر کے نتیجے میں جس طرح تحقیق و تنقید کا آغاز کیا وہ تمام "اقبال کی نظر میں اسی روح (اسلام) کا اثر تھا کہ مسلمانوں کو قانونِ فطرت کا مشاہدہ کرنے اور اس پر غور وفکر کی ترغیب ہوئی .... جس کے باعث مسلمانوں نے علومِ جدیدہ کی بنیاد ڈالی۔"(۳۲) دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جدید سائنسی علوم کا حصول جس کی بنیاد انسانی عقل سے تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہے اس کا منبع اول اللہ کے حکم سے رسول کی ذات مبارکہ ہے اور اس کا وسیلہ وحی کی صورت میں قرآن پاک ہے اور اللہ نے اس کے مفاہیم کو تاقیامت آفاقی بنا دیا۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ اب جو کچھ بھی ہے وہ دین اسلام میں ہی ہے اور دین اسلام کے روحانی پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے ارض و سما کی بہتری اور خوشحالی کے لیے دریافت و ایجادات کے تمام پہلوؤں کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔

اسلام چونکہ اللہ کا آخری دین ہے اور اللہ نے اس کو مکمل کر کے بھیجا ہے۔ تجربات اور مشاہدات کا حکم خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اس لحاظ سے اسلام ایک سائنسی ضابطہ حیات ہے اور اسلام کے قوانین فطرت کے عین مطابق ہیں یعنی محمد ﷺ کے دیے ہوئے دین کا تعلق قوانین فطرت سے ہے اور انسان بھی انھیں قوانین فطرت کا ایک مقصد ہے اور یہ قوانین بھی عالم فطرت کے قوانین کی طرح عالمگیر، لازمی و ابدی ہیں۔ دین اسلام کے

قوانین عین فطری ہونے کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "دین (حق) کی طرف رخ کرو۔ اللہ کی اس فطرت کی اتباع کرو جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں۔ یہی ہے سیدھا دین لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کا) علم نہیں رکھتے۔" (۳۳) یعنی دین اسلام حق کا دین ہے اور قوانینِ فطرت کے عین مطابق ہے۔ قوانینِ فطرت کی طرف رجوع اللہ کی طرف رجوع ہے اور اسی فطرت پر اللہ نے انسان کو پیدا کیا۔ مزید یہ کہ قیامت تک کے لیے اس فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی، یہ خدا کا حکم ہے۔ ماہیت اور نوعیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو قوانین فطرت اور قوانین اسلام میں کوئی فرق نہیں ہے اور صرف سمجھنے والوں کا قصور ہے۔ اب جو لوگ قوانین فطرت کی خلاف ورزی کریں گے ان کو اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑے گا اور چونکہ اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ اس نے انسان میں اپنی روح پھونکی (۳۴) تو انسان کے کردار کی روح خدائے فطرت ساز کی طرح عین قوانین فطرت پر مبنی ہونی چاہئے۔ اس لحاظ سے دین اسلام فطرت پر مبنی ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس کا عمل سائنسی ہے اور فکر روحانی ہے۔

اب یہ بات واضح ہو گئی کہ دین اسلام فطرت پر مبنی ایک برحق اور مکمل ضابطہ حیات ہے اور قوانین فطرت کی طرح اس کے قوانین بھی عالمگیر، لازمی اور ابدی ہیں۔ بقول اقبال "اگر ہم نے ختم نبوت کو مان لیا تو گویا عقیدۃً یہ بھی مان لیا کہ اب کسی شخص کو اس دعوے کا حق نہیں پہنچتا کہ اس کے علم کا تعلق کسی فوق الفطرت (وحی) سر چشمے سے ہے۔" (۳۵) حضرت محمد ﷺ کی ذات مبارکہ تمام اقوام عالم کے لیے چشمۂ نور ہیں۔ وہ صرف عرب قوم کے لیے یا کسی مخصوص زمانہ کے نبی نہیں ہیں بلکہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے سلسلہ نبوت کی تکمیل کی ہے اور قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کی انسانوں کے لیے بار بار تجربات و مشاہدات اور تحقیق کی تلقین اس امر کی متقاضی ہے کہ آپ کی تعلیمات کی روشنی میں تمام انسان قانون فطرت کے مطابق رہنمائی حاصل کریں گے۔ اس کے علاوہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور نہ کوئی کتاب۔ اللہ تعالیٰ نے اس آخری نبی کے پیروکاروں کے لیے "کان الناس امة واحدة" (۳۶) کے الفاظ استعمال کیے ہے جس کی رو سے دنیا کے تمام انسان برابر ہیں اور غیر مسلم اقوام کے برعکس اسلام میں انسانوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں رہتی۔ رنگ، نسل یا علاقہ کا فرق مٹ گیا اور تمام انسانوں کے حقوق برابری کی سطح پر قائم ہوئے۔

قرآن کریم کی رو سے تمام انسان ایک آدم کی اولاد ہیں تو اس کے لیے لفظ "امت" استعمال کیا گیا ہے۔ امت کا لفظ امّ سے نکلا ہے اور امّ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معانی ماں کے ہیں (۳۷) یعنی تمام انسانوں کی حیثیت ایک ماں جائے بھائی کی ہے اور لفظ قوم خلیفہ عبدالحکیم کی رائے میں "آج کل دنیا جنھیں اقوام کہتی ہے۔ قرآنی

زبان میں ان کو شعوب اور قبائل کہا گیا ہے"(۳۸)اور یہ صرف انسانوں کے درمیان پہچان کے لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اے لوگو ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھیں
شاخیں اور قبیلے کیا تا کہ آپس میں پہچان رکھو۔ بے شک اللہ کے یہاں تم میں
زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیز گار ہے۔" (۳۹)

یعنی شاخوں، قبیلوں، نسلوں اور گروہوں کی تقسیم صرف انسان کی پہچان کے لیے ہے نہ کہ انسانوں کی قدر و اہمیت کے لیے۔ لیکن افسوس کہ یہ تقسیم انسان میں اختلافات کا سبب بنتی چلی گئی اور یہ اختلافات اس قدر بڑھے کہ کہیں زبان کے اختلاف اور کہیں قبیلہ یا گروہ کے اختلاف کی وجہ سے انسان ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہو گیا۔

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ جب عرب کی سرزمین مکہ میں اللہ کی طرف سے نبی مبعوث ہوئے تو اس وقت عرب قبائل کی حالت اس قدر دگرگوں تھی کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے دشمنی پیدا ہو جاتی اور قبیلوں میں سالوں تک خون بہتا رہتا اور کئی قیمتی جانیں ضائع ہوتی جاتیں لیکن وہ اخلاقی پستی سے باہر نکلنے کو تیار نہ تھے۔ کہیں زبان کے معمولی اختلاف پر اور کہیں قبیلے کے الگ ہونے کی وجہ سے اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ تعصب اور ظلم و ستم کی روایت عام تھی۔ اپنے قبیلے یا گروہ اور دوسرے قبیلے یا گروہ کے افراد، اسی طرح امیر اور غریب کے لیے عدل و انصاف کے الگ قوانین تھے۔ ظہور اسلام کے بعد وہ اپنی دیرینہ عداوتوں کو بھول کر دوبارہ سے ماں جائے بھائی کی طرح ہو گئے۔ یہ تھا اسلام کا بنیادی مقصد جس کے تحت تمام انسان اسلام کے دائرہ میں داخل ہو کر ایک ملّی وحدت بن جائیں اور اللہ کے احکامات کے مطابق اپنا نصب العین متعین کر لیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے اسی بلند نصب العین کے بارے فرمایا:

"(اے مسلمانوں) تم بہتر ہو ان سب امتوں میں جو لوگوں میں ظاہر
ہوئیں، بھلائی (حسن خیر اور حسن عمل) کا حکم دیتے ہو اور برائی (شرک، جرم
اور ظلم و گناہ) سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھو۔"(۴۰)

حضرت محمد ﷺ نے مدینہ میں اخوت اور بھائی چارے کی بدولت ایسی ریاست کی بنیاد رکھی جس میں علاقہ، رنگ، نسل کے لحاظ سے کئی اقوام شامل تھیں۔ ان تمام اقوام کو ایک ملت میں متحد و منظم کر کے عالم گیر انسانیت کا اصول قائم کیا جس کے تحت نسل، زبان اور علاقے کے اشتراک کی بجائے مشترکہ روحانی آرزو پر زور

دیا۔ اسلام نے اپنے مفہوم (۴۱) کے مطابق خونریزی و ظلم و ستم کا خاتمہ کر کے امن و سلامتی اور بھائی چارے کی بنیاد رکھی۔ مولانا مودودی اسلام کا مفہوم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے جاہلیت کی ان تمام محدود مادی و حسی اور وہمی بنیادوں کو، جن پر دنیا کی مختلف قومیتوں کی عمارتیں قائم کی گئی تھیں، ڈھا دیا.... اس تخریب کے ساتھ اس نے خالص عقلی بنیادوں پر نئی قومیت کی تعمیر کی۔ تعمیر کی اس قومیت کی بنا بھی امتیاز پر تھی، مگر مادی و فرضی امتیاز پر نہیں، بلکہ روحانی اور جوہری امتیاز پر، اس نے انسان کے سامنے ایک فطری صداقت پیش کی جس کا نام اسلام ہے۔" (۴۲)

اس ملت اسلامیہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مسلم اور غیر مسلم سب کو برابر کے حقوق حاصل ہیں۔ عدل و انصاف کا معاملہ ہو یا کاروبار زندگی، سب کو ایک جیسا مقام حاصل ہے اور کسی کو کسی کی حق تلفی کی اجازت نہیں ہے۔ غیر مسلموں کو بھی مکمل مذہبی آزادی حاصل ہے۔ اہل کتاب سے کھانا پینا بھی جائز اور اہل کتاب عورتوں سے شادی بھی جائز ہے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ مسلم ملت مدینہ سے ہوتی ہوئی عرب سے نکلی اور شام، عراق اور ایران، حتیٰ کہ برصغیر، یورپ اور افریقہ میں بھی ظلم و ستم کی جگہ امن اور سلامتی کی نئی تاریخ رقم کر گئی۔

اسلام کسی ایک قوم، علاقہ یا دور کا مذہب نہیں ہے بلکہ یہ ایک آفاقی دین اور ضابطہ حیات ہے اور عدل اس کی بڑی خوبی ہے۔ اسلام صرف اپنے گروہ، قوم یا مذہب سے عدل کا حکم نہیں دیتا بلکہ دینِ اسلام کی طرح اس کا عدل بھی پوری عالم انسانیت کے لیے ہے، اس میں چاہے کسی بھی قوم گروہ یا مذہب سے تعلق رکھنے والے افراد ہوں۔ سب کے ساتھ برابری کا حکم ہے کسی کے ساتھ نرمی یا برتری کا حکم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم ہو جاؤ اللہ کے لیے گواہی دیتے رہو۔ چاہے اس میں تمھارا اپنا نقصان ہو یا ماں باپ کا یا رشتہ داروں کا" (۴۳) انسان کی اپنی ذات یا رشتے داروں سے جھکاؤ قدرتی امر ہے لیکن اسلام میں جب کسی معاملے میں اپنی ذات شامل ہو یا قریبی تعلق والے شامل ہو جائیں تب بھی انصاف کا ترازو متوازن و برابر رکھنے کا حکم ہے اور اس میں ذرا برابر جھکاؤ کی گنجائش نہیں ہے اسی طرح کسی سے تعصب یا دشمنی اُس کو حق و انصاف دینے میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ اس کے برعکس امریکہ جیسے سب سے آزاد خیال اور مہذب سمجھے جانے والے ممالک (۴۴) میں آج بھی وہاں کے مقامی باشندوں (کالے لوگوں) کو وہ حقوق حاصل نہیں ہیں جو وہاں کے گورے لوگوں (یورپی نسل) کو ہیں۔ یہی حالت آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ سمیت دنیا کے بہت سے دوسرے ممالک میں بھی ہے۔

لیکن افسوس کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ مسلمان بھی اپنی پہچان یعنی ملّی اتحاد کو بھول کر دوبارہ قبیلوں، گروہوں اور نسل ورنگ کے تعصب میں بٹ گئے۔ جن کا مقصد دنیا میں امن قائم کرنا اور اللہ کے حکم سے پوری دنیا کو دارالاسلام بنانا تھا وہ اپنا مقصد چھوڑ کر مادی مقاصد اور وقتی لذتوں میں پڑ گئے جس کی وجہ سے ان کا زوال لازمی تھا اور ان میں تقسیم بھی یقینی تھی۔ اس صورت حال سے دنیائے کفر اور اہل مغرب نے خوب فائدہ اٹھایا اور وہ دنیا میں اثر ورسوخ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ نتیجتاً وہ مسلمان جن کی ہیبت سے یورپ کانپتا تھا، استعماری قوتوں کی غلامی میں آ گئے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ اٹھارھویں صدی میں مغربی دانشوروں نے کلیساؤں کو ریاست کے سیاسی عوامل سے بے دخل کر کے خالص مادہ پرستی پر مبنی وطنی ریاستوں کی بنیاد رکھی۔ پہلی جنگِ عظیم یعنی ۱۹۱۴ء تک مغرب دنیا کے ۸۷ فی صد رقبے پر قابض ہو چکا تھا(۴۵) اہلِ مغرب نے یہی وطنی تصور مغربی دنیا سے ساری دنیا میں پھیلا دیا حتیٰ کہ مسلم ممالک بھی اس کی زد میں آ کر یورپ کی طرح پارہ پارہ ہو گئے یا دوسرے لفظوں میں مغرب مسلمان ممالک کو تقسیم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

برصغیر میں ۱۸۵۷ء تک تقریباً آٹھ سو سال تک کسی نہ کسی صورت میں مسلمانوں کی حکومت قائم رہی تھی یہ حکومت شخصی حکومت تھی لیکن اس میں اسلام کے ساتھ دوسرے مذاہب کو بھی مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ مسلمان حکمرانوں نے محکوم طبقہ کے ساتھ مساوات اور رواداری کی کئی مثالیں قائم کیں حتیٰ کہ اکبر بادشاہ نے غیر مسلموں خاص کر ہندوؤں کو مراعات واختیارات میں اس حد تک نوازا کہ مذہب اسلام میں تبدیلی کر کے ہندوؤں کی خوشنودی کے لیے "دین الٰہی" کے نام سے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی۔ "اکبر نے مذہب کا فرق جو اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا، دور کرنے کی کوشش کی اور پہلی بار قومیت کا مرکز مذہب کی بجائے ریاست اور دیگر عوامل و لسانی عوامل کو قرار دیا۔"(۴۶) جس کے خلاف مسلمان علماو اکابرین نے آواز بلند کی جن میں مجدد الف ثانیؒ سر فہرست تھے۔ یوں ہندوستان میں پہلی دفعہ دو قومی نظریہ کی بنیاد پڑی۔ اس سے پہلے "اسلام ہر ملک اور ہر دور میں مسلمانوں کی قومیت کی اساس رہا ہے۔"(۴۷) اکبر بادشاہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے جہانگیر نے اسلامی قومیت کی اساس کو بحال کیا جبکہ اورنگزیب عالمگیر نے برصغیر پاک وہند میں مسلم تشخص کو تقویت بخشی۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے پہلے عشرے میں جب اورنگزیب عالمگیر نے وفات پائی تو ان کی نااہل اولاد کی ناقص حکمت عملیوں اور عیاشیوں سے غیر مسلم اقوام نے سر اٹھانا شروع کیا اور اسلام کے مقابلے میں خود کو

سیاسی، سماجی اور مذہبی سطح پر مضبوط کرنے لگے۔ برصغیر میں انگریز کی آمد پہلے سے ہو چکی تھی۔ انھوں نے مسلم حکمرانوں کی آپس کی ناچاکیوں سے فائدہ اٹھا کر برصغیر میں ہر طرح سے قدم جمانے شروع کر دیے۔ ان حالات میں جس مذہبی شخصیت نے مسلمانوں کے تشخص کو برقرار رکھنے کا فریضہ انجام دیا وہ ذات شاہ ولی اللہؒ کی تھی ”شاہ ولی اللہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان برعظیم کے ماحول کا جزو بن جائیں وہ اس کو پسند کرتے تھے کہ مسلمانانِ ہند عالم اسلامی کا رکن رہیں۔“(۴۸) انھوں نے مسلمانوں کو ہندو اور دیگر غیر مسلم تنظیموں و تحریکوں کے اثرات سے بچانے کی سعی کی۔ اس دور میں مرہٹے اس قدر طاقت پکڑ گئے تھے کہ عوام و حکمران کوئی بھی ان کے شر سے محفوظ نہ تھا۔ شاہ ولی اللہ نے افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ ابدالی کو قائل کیا کہ وہ ہندوستان پر حملہ کر کے مرہٹوں کی سرکوبی کرے کیونکہ مغلیہ حکمران اس قابل نہیں رہے تھے کہ مرہٹوں کی ریشہ دوانیوں پر قابو پا سکیں۔ شاہ ولی اللہ کے شاگرد سید احمد شہید بریلویؒ نے مسلمانوں کو جمع کر کے غیر مسلم اقوام کے خلاف جہاد بلند کیا۔ بقول شیخ محمد اکرم ”مولانا سید احمد بریلوی نے پہلی دفعہ مسلمانان ہند کو دوسری قوموں کے مقابلہ میں جمع کیا اور ان کے ایک طبقہ کو آزادی دلانے کے لیے اپنی جان قربان کر دی تو یہ ماننا پڑے گا کہ مسلمانانِ ہند کی جداگانہ قومیت کا اظہار سب سے پہلے انھوں نے کیا۔“(۴۹) لیکن نو آبادیاتی دور میں جب مغرب کے حکمرانوں نے یہاں قدم جمانے چاہے تو ان کے دانشوروں نے غور کیا کہ برصغیر میں مذہب اور زبان کے لحاظ سے کئی قومیں آباد ہیں اس طرح ان اقوام کو تقسیم کرو اور حکومت کرو، کا فارمولا اپنایا گیا۔ ایک طرف تو وہ مسلم اور ہندو میں تفریق پیدا کر کے ان کو لڑانے میں کامیاب ہو گئے، دوسری طرف وہ اس بات سے خوفزدہ تھے کہ کہیں مسلمان دوبارہ برسرِ اقتدار نہ آ جائیں۔ وہ ہندوؤں کو برسرِ اقتدار دیکھنا چاہتے تھے اور برصغیر کے مسلمانوں کا ملّی تشخص مٹانا چاہتے تھے۔ اہم بات یہ کہ جس وطنی قومیت کا بیج انھوں نے بویا تھا اس میں مذہب شامل نہیں تھا اور روح سے عاری تھا۔

جدید زمانے میں قومیت کی اصطلاح کے لیے تین بنیادی تقاضے اہم ہیں جن میں پہلا قوم کا تشخص اور وجود ہے دوسرا قومی زبان اور تیسرا خطہ کی موجودگی ہے(۵۰) ہندوستان میں عہد مسلم میں قومیت کے اس تصور کا وجود نہیں تھا لیکن برصغیر کے مسلمانوں سے اقتدار چھن جانے کے بعد وطنی قومیت کے بیج نے مسلمانوں کے تشخص کو خطرے میں ڈال دیا کیونکہ گاندھی نے کہا تھا:

> ”مذہب کی بنا پر کسی گروہ کو الگ قوم کا درجہ نہیں دیا جا سکتا کیونکہ مذہب ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے اور ریاست اور سیاست کے ساتھ اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے، علاوہ ازیں تبدیلی مذہب سے کوئی قوم رونما نہیں ہو سکتی اور چونکہ اس برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت نو

مسلموں پر مشتمل رہی ہے اس لیے مذہب کی بنا پر ان کے نسلی رشتے کو ہندو معاشرے سے
الگ نہیں کیا جا سکتا اس اعتبار سے بھارت ورش ان کی جنم بھومی ہے۔ کانگریس ان کی
ترجمان ہے اور انڈین نیشنلزم ہی ان کا سیاسی مسلک ہے۔ تاہم جو لوگ ایسے استدلال سے
اتفاق نہیں کرتے، ان کے لیے اس خطۂ زمین میں قیام کسی طرح جائز نہیں ہے کیونکہ یہ ان
کا وطن نہیں ہے۔"(۵۱)

ایسی صورت حال میں برصغیر کے مسلمانوں کا الگ ملّی تشخص کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔ ان کا مذہب، تہذیب اور ثقافت غیر مسلم قوم کے مرہونِ منت تھی۔ دراصل مسلم تشخص کو مٹانا، دنیا کے سب سے زیادہ مسلم آبادی والے ملک میں اسلام کا صفایا کرنا تھا۔ کانگریسی رہنما برصغیر کے مسلمانوں کے وجود سے بھی انکاری تھے۔ بقول نہرو "مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پروازِ خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے۔"(۵۲) خواہ برصغیر کے مسلمانوں کا ہندوستان کے خطہ زمین سے کوئی تعلق تھا یا نہیں تھا، لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اصولوں، روایات اور عقائد کی بناء پر ان کا اپنا ایک تشخص ضرور تھا اور وہ کانگریس یا گاندھی کے دیے ہوئے قومیت کے تشخص پر کبھی تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ بقول اشتیاق حسین قریشی:

"جذبہ انفرادیت اور اس کی بقا کی خواہش ہی دراصل ہماری قومیت کی بنیادیں ہیں۔ اس
برِصغیر کے مسلمان چودہ سو سال سے ساتھ رہنے، ایک ضابطہ حیات کے پابند ہونے، عروج و
زوال، ترقی و انحطاط میں شراکت کی وجہ سے ایک قوم بن گئے اور تمام ذیلی اختلافات کے
باوجود ان میں صدیوں میں جذبہ قومیت پرورش پا کر مستحکم ہو گیا۔ اگر یہ جذبہ قومیت استوار
نہ ہوتا تو برعظیم کے مسلمان کبھی کے ہندوؤں میں مدغم ہو گئے ہوتے۔"(۵۳)

اس صورت حال میں جب ہندو قوم نے یہ دعوٰی کیا کہ وہ ہی برصغیر کے اصل نمائندے ہیں اور ہندوستان صرف ان کا ملک ہے، تو برصغیر کے مسلمانوں کے لیے اسلامی تشخص قائم رکھنا نہ صرف مشکل ہو گیا بلکہ بادی النظر میں برصغیر سے مسلمانوں کا تشخص مٹ جانے کے برابر ہو گیا۔ اسلام اور مسلم تشخص کی حفاظت کے لیے جنگ آزادی کے بعد اس کی پہلی کاوش سر سید احمد خان اور ان کے رفقاکار سے شروع ہوتی ہے۔ الطاف حسین حالی نے " مسدس حالی" سے ملت اسلامیہ کے سنہری دور کو پھر سے زندہ کیا تا کہ برصغیر کے مسلمان اپنے سنہری ادوار کو یاد کر کے غیرت و حمیت کا مظاہرہ کریں۔ علامہ اقبال نے شعری و نثری تحاریر و تقاریر سے مسلم تشخص کو اجاگر کیا اور برصغیر کے مسلمانوں میں ملّی اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے مسلمانوں کو ان کا الگ تشخص

اجاگر کرنے کے لیے مغربی تصور قومیت پرستی کے خلاف آواز بلند کی اور "سید جمال الدین افغانی کے وفاق اسلام کے تصور کے پر شوق ہم نواء کی حیثیت سے انھوں نے بین الاقوامی اسلام کے موضوع پر دو فارسی مثنویاں پیش کیں، یعنی اسرار خودی اور رموز بے خودی" (۵۴) ان مثنویوں میں اقبال نے پہلی مثنوی "اسرارِ خودی" میں مسلمانوں کو ایک دفعہ پھر سے جگانے کی کوشش کی اور ان کو ان کے وقار کا احساس دلایا۔ اقبال کی یہ شاہکار مثنوی ۱۹۱۵ء میں اس وقت شائع ہوئی جب اقبال اس بات سے پوری طرح آگاہ ہو چکے تھے کہ مسلمانوں کے زوال کی وجہ بد اعتمادی اور ان کی روح میں غیر مسلم عقائد داخل ہو کر وہ سستی اور کاہلی کا شکار ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں ان کی دوسری شاہکار مثنوی "رموز بے خودی" شائع ہوئی جس میں انھوں نے مسلمانوں کو آپس میں اتحاد و اتفاق قائم کرنے پر زور دیا۔ وہ اس تشخص کو ملت بیضا اور امت محمدیہ ﷺ کی اصطلاح کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔

اقبال نے تمام مسلمانوں اور خاص کر برصغیر کے مسلمانوں میں دوبارہ ملّی اتحاد قائم کرنے کے لیے اپنی تمام توانائیاں صرف کیں اور ان کو وطنیت کے جدید تصور سے انحراف کر کے اس ملت کی طرف لوٹانا چاہا جس کی بنیاد روحانی ہے اور چودہ سو سال پہلے مدینہ میں حضرت محمد ﷺ نے رکھی تھی۔ بقول جاوید اقبال "اقبال کا استدلال یہ تھا کہ اسلام تمام خونی رشتوں اور تمام وطنی وابستگیوں سے بلند و ماوراہے۔ اسلام خدا سے خالص وفاداری کا تقاضا کرتا ہے نہ کہ حکمرانوں سے وفاداری کا۔ اقبال کی اصطلاح میں یوں کہا جائے گا کہ خدا سے وفاداری کا مطلب ہے۔ اپنی خودی سے وفاداری۔" (۵۵) اسلام چونکہ دین فطرت ہے اور فطرت جغرافیائی اصطلاحوں کو نہیں مانتی اس لیے مسلمان بھی کسی وطن یا علاقے کی بنا پر الگ قوم نہیں ہو سکتے تھے۔

جاوید اقبال مزید لکھتے ہیں "براعظم ہند میں علاقائی یا وطنی قومیت کی حمایت کا مطلب یہ ہوتا کہ مسلم اقلیت جداگانہ سیاسی وجود کو فنا کر کے اکثریتی فرقے میں مدغم ہو جاتے۔ لہٰذا اقبال نے علاقائی قومیت اور وطنیت کی تردید کے لیے مذہبی فلسفے کے دلائل دیے۔" (۵٦) وطنی قومیت کے تصور کی ابتدا چونکہ مغرب میں اہل کلیساء اور ملحدانہ عقائد رکھنے والوں کی طویل کشمکش کے بعد رکھی گئی تھی اس کی وجہ بقول اقبال یہ تھی کہ " مسیحیت کی بنیاد ایک سول معاشرے پر نہیں، بلکہ ایک لادینی دنیا میں خانقاہی نظام پر رکھی گئی اس نے سول معاملات میں روحی حکومت کا اختیار تسلیم کیا۔ چنانچہ جب ریاست مسیحیت کے زیر اثر آئی تو کلیسا اور ریاست کے درمیان اختیارات کی تقسیم پر تنازع اٹھ کھڑا ہوا" (۵۷) اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملحدانہ ذہنیت کے لوگوں نے اہل کلیسا کی برتری کو قبول نہ کیا اور کلیسا کو ریاست و سیاست سے بالکل الگ کر دیا گیا۔ کلیسا کی علیحدگی سے اخلاقی و قانونی

نظاموں کی تشکیل قومیت کی بنیاد پر ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ یورپ میں مذہب کی علیحدگی سے نسلی اور جغرافیائی حدود کی بنیاد پر حریف ریاستیں وجود میں آئیں، جنھوں نے مذہب کو ذاتی معاملہ قرار دے کر ریاست کے آئین و قوانین سے خارج کر دیا۔

جب مسلمانانِ برصغیر مغرب کی طرز پر قوم پرستی اختیار کرتے تو ظاہر ہے اس کا اثر ان کے مذہب پر بھی پڑنا تھا بلکہ ان کی طرز کی ریاست ایک سیکولر ریاست ہوتی جس میں مذہب ایک ذاتی معاملہ کی چیز رہ جاتا۔ یعنی بادی النظر میں برصغیر کے مسلمانوں کی بطور مسلمان پہچان داؤ پر لگ جاتی اور اس سے اس خطہ میں اسلام کا خاتمہ ہو جاتا یا برائے نام رہ جاتا۔ اس خطرے کے پیش نظر اقبال نے فرمایا" میں یورپ میں رائج قوم پرستی کے خلاف ہوں، اس لیے نہیں کہ اگر یہ ہندوستان میں رائج ہونے دی گئی تو اس سے مسلمانوں کو فائدہ کم پہنچے گا، بلکہ اس لیے خلاف ہوں کہ مجھے اس میں ملحدانہ مادہ پرستی کے جراثیم نظر آتے ہیں، جو جدید انسانیت کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں"(۵۸) اس کے برعکس اگر اسلام کو دیکھا جائے تو رسول اکرم ﷺ نے مدینہ میں انصار و مہاجرین کی ایک امت تشکیل دے کر نسلی، علاقائی اور گروہی فرق کو مٹا کر ایک خالص روحانی معاشرے کی بنیاد رکھی تھی۔ یعنی اسلام شروع ہی سے ایک سول معاشرے کی بنیاد پر قائم ہوا تھا۔ اس طرح قرآن مجید اور حدیث رسول میں جو قوانین وضع کیے گئے ہیں وہ آفاقی ہیں اور تفسیر و تشریح کے ذریعے ارتقاء کے امکانات رکھتے ہیں لہٰذا"اسلام میں روح اور مادے یا دین اور دنیا کی ثانویت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام کا مذہبی نصب العین اور معاشرتی نظام ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔"(۵۹) حضور ﷺ کی کفار مکہ سے کئی دفعہ معرکہ آرائی ہوئی جس میں بھائی بھائی کے ساتھ اور باپ بیٹے کے ساتھ برسرِپیکار رہا۔ اس کی وجہ حق و باطل کی لڑائی تھی اسلامی تصور کے مطابق "ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے"(۶۰) یعنی اگر بھائی بھی کفر پر قائم ہے اور وہ دوسرے مسلمانوں یا انسانوں کو نقصان پہنچاتا ہے تو اس سے جنگ جائز ہے۔ غزوہ بدر، احد، اور فتح مکہ میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن اگر موجودہ قومیتوں کی طرز کے مطابق آپ ﷺ کفار مکہ سے رنگ، نسل، زبان، اور علاقہ کی نسبت سے سمجھوتہ کر لیتے اور ان کی ناجائز کو بھی جائز سمجھ لیتے، بتوں کی پوجا کی اجازت دے دیتے، دوسری اقوام کا مال لوٹنا اور ان پر ظلم و ستم کو قبول کر لیتے اور یہ کہتے کہ تم اپنی برائی پر قائم رہو اور ہم اپنے ذاتی عقائد کے مطابق عبادت کرتے رہیں تو حضور اکرم ﷺ خدا کے پیغمبر نہ ہوتے بلکہ ایک جغرافیائی ملک عرب کے ایک قوم پرست ہوتے۔ لیکن پیغمبر اسلام نے ہر قوم، ہر نسل اور ہر رنگ و علاقہ کے لیے برابری کے حقوق وضع کر کے ایک روحانی رشتہ قائم کر دیا۔ ایسا روحانی رشتہ جو آج چودہ سو سال بعد بھی قائم و دائم ہے۔ اس طرح

نہرو کے اس قول کی بھی نفی ہوتی ہے جس میں اس نے کہا تھا "مذہبی نقطہ نظر کسی قوم کی اخلاقی اور روحانی ترقی میں مدد نہیں دیتا بلکہ اس میں حائل ہی ہوتا ہے۔"(٦١) حالانکہ مذہب روحانی اور اخلاقی ترقی کی تمام رکاوٹوں کو زائل کر دیتا ہے۔

قرآن کریم میں اسلام قبول کرنے والوں کے لیے 'امت' یا 'ملت' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ یہ تصور ظاہر ہے اس لیے اختیار کیا گیا کہ متعدد قومیں مل کر ایک امت بن سکتی ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ امت واحدہ ایک قوم پر مشتمل ہو۔ قوم لوگوں کا ایسا گروہ ہے جو مشترک قبیلے، نسل، رنگ یا علاقے کی بنیاد پر وجود میں آگیا ہو۔ ایسا گروہ مختلف مقامات پر مختلف صورتیں اختیار کر سکتا ہے اس کے برعکس "امت" ایسے مختلف النوع گروہوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ پھر ان کو یعنی جس قومیت کی مغرب تشریح کرتا ہے اسلام ایسی کئی قومیتوں کو ملا کر تمام انسانوں کو ایک چھت تلے جمع کرتا ہے اور ان کے مابین باہمی تفریق کو ختم کر کے ایک جسم، ایک جان اور ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔ بقول اقبال "اسلام ایک نسلی یا غیر لسانی، اور غیر علاقائی عقیدہ ہونے کی حیثیت سے انسانی وحدت و اتحاد کے لیے ایک مثالی نمونہ فراہم کرتا ہے۔"(٦٢) اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال جہاں ملت اسلامیہ کے اتنے بڑے داعی ہیں وہاں وہ ملت کے ساتھ اور اس کے ہم معنوں میں لفظ قوم بھی استعمال کرتے ہیں؟ دراصل جہاں تک اقبال کے تصورات کا تعلق ہے تو وہ قوم کو اس معنی میں نہیں لیتے جس معنی میں اہل مغرب نے اس کی تشریح کی ہے۔ اقبال کے بقول:

اپنی مِلّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی (مذہب، بانگِ درا)

اب ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پاکستانی قوم، ایرانی قوم، ترکی قوم، عرب قوم یا دوسرے اسلامی ممالک جن کا تشخص اسلامی بھی ہے اور وطنی بھی۔ وہ رسول اکرم ﷺ کی امت واحدہ سے مطابقت رکھتے ہیں یا مخاصمت؟

اہل مغرب کے برعکس مسلمان ممالک کے باشندے پہلے مسلمان ہیں اور ایک وحدت یا امت ہیں اور بعد میں وہ پاکستانی، ایرانی، ترکش یا افغانی ہیں۔ اسلام وطن سے محبت ضرور سکھاتا ہے لیکن مغرب کی طرح پوجا نہیں سکھاتا۔ تمام آزاد اسلامی ممالک جغرافیائی طور پر تو اپنا تشخص الگ کر سکتے ہیں لیکن روحانی طور پر سب ایک ہیں۔ مغربی تصورِ قوم کے مطابق وطن سے محبت عبادت کی حد تک ہے یعنی وہ اپنے ملک کی پرستش کرنا اپنے منشور کا حصہ مانتے ہیں اس کے برعکس اسلام میں پرستش کی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ وطن سے محبت ایمان کا حصہ

ضرور ہے(٦٣) لیکن ایمانِ کامل نہیں ہے۔ کامل ایمان اسلام میں ہے۔ مسلمان دنیا کے جس کونے میں اور جس ملک میں بھی رہے وہ ہی اس کا وطن ہے۔ وہ کسی خاص علاقے یا ملک کو اپنا ایمانِ کل نہیں سمجھتا بلکہ پوری دنیا کو اللہ کی زمین اور خود کو اللہ کا بندہ اور خلیفہ سمجھتا ہے اس لیے وہ جہاں بھی رہے اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال حضرت محمد ﷺ کی اپنے آبائی علاقے مکہ مکرمہ کو اللہ کی راہ میں چھوڑ کر مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہونا ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک سب سے احترام والی جگہ خانہ کعبہ یعنی مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ ہیں۔ ان دونوں مقامات سے مسلمانوں کی محبت کا درجہ اپنے ملک سے بھی بڑھ کر ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے ملک پر جان بھی قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ چونکہ تمام مسلمانوں کا عقیدہ یہی ہے اس لیے مسلمانوں کے نزدیک اقتدارِ اعلیٰ اور مقدس ذات صرف اور صرف اللہ کی ہے اور باقی تمام ہستیاں احترام کے درجے میں آتی ہیں اور حضرت محمد ﷺ کی ذات مبارکہ احترام کے سب سے بلند درجے پر فائز ہے۔ تمام مسلمانوں کے نزدیک اقتدارِاعلیٰ چونکہ خدا کی ذات ہے تو عقیدۂ اسلامی تمام مسلمانوں کو ایک ملّی وحدت بناتا ہے۔ دوسری اہم مثال یہ کہ مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں جن جن علاقوں کو فتح کیا وہاں مستقل سکونت اختیار کی اور خود کو وہاں کا باقاعدہ شہری بنایا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے وہاں شادیاں کی اور ان کی آنے والی نسل اپنے آباؤ اجداد کے علاقہ کو چھوڑ اس علاقہ یا ملک کی مکیں ہو گئی۔ بقول اقبال:

چین و عرب ہمارا ، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم ، وطن ہے سارا جہاں ہمارا (ترانۂ ملّی، بانگِ درا)

مسلمان جہاں بھی مسندِ حکومت پر فائز ہوئے انھوں نے اپنے اعلیٰ اوصاف اور اخلاق و کردار کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہاں کے مقامی باشندوں کو برابری کے حقوق دیے اور مذہب و تہذیب کی مکمل آزادی دی۔ انھوں نے مقامی لوگوں میں شادیاں بھی کیں جس کا مقصد بھی غیر مسلم آبادی کو اسلامی بھائی چارے کا پیغام دینا تھا۔ اس کے ساتھ انھوں نے اپنی آبائی زبان کے بجائے مقامی باشندوں کی زبان اور ثقافت کو اپنایا (قطب شاہی، عادل شاہی وغیرہ)۔ مسلمان اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ایک دن اللہ تعالیٰ کے نام لیوا پوری دنیا میں ہوں گے یعنی پوری دنیا میں ایک خالص اسلامی حکومت قائم ہو گی جس کے اقتدار کا مرکزِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس اور اس ریاست کا حکمران خدا کا نائب یعنی خلیفہ ہو گا جو خدا کے حکم کی تعمیل کرے گا۔ اس طرح پوری دنیا ایک امت واحدہ اور ملت اسلامیہ کی شکل میں تعبیر ہو گی۔

اقبال مسلم ممالک کے باشندوں جن میں ایران، افغانستان، ترکی یا عرب کو ان کا ملکی قومی تشخص تسلیم کرتے ہیں اور اس سے انکار نہیں کرتے کیونکہ موجودہ دور کی ضروریات کے مطابق اتنی بڑی اسلامی ریاست کا قائم ہونا اور پھر اس ریاست کے تمام باشندوں کے حقوق کا برابری کی سطح پر خیال رکھنا بہت مشکل ہے اس لیے وہ ان اسلامی ملکوں کی الگ شناخت کے حق میں ہیں۔ اقبال کی نظر میں دوسرے غیر اسلامی ممالک کے برعکس اسلامی ممالک کے باشندوں کی قومیت کی تعریف مختلف ہے۔ ان کے خیال میں تمام اسلامی ممالک جغرافیائی سطح پر اپنا الگ تشخص بنوا سکتے ہیں لیکن روحانی طور پر وہ سب ایک ہیں۔ سب کا خدا ایک، رسول ایک اور وہ ایک قرآن کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں اس لیے تمام مسلم ممالک کے باشندے ایک وحدت اسلامی ہیں اور اُمت مسلمہ یا ملت اسلامیہ کے زمرے میں آتے ہیں۔ یہ عقیدہ حضرت محمد ﷺ کی امت واحدہ سے مطابقت رکھتا ہے۔

اس کے برعکس اہل مغرب کی مثال لیں تو سکندر اعظم نے تین سو قبل مسیح میں تقریباً آدھی دنیا فتح کی لیکن وہ خود یا اس کی فوج یا علاقے کے لوگوں نے کسی بھی مقبوضہ علاقے میں مستقل سکونت اختیار کر کے اس کو اپنا وطن یا آنے والی نسل کو اپنا مستقل وطن نہ بنانے دیا۔ اسی طرح برطانوی سامراج کے دور میں جب اہل یورپ دنیا کے بیشتر علاقوں پر قابض تھے تو انھوں نے بھی سوائے مقبوضہ علاقوں کو لوٹنے اور وہاں کا خام مال اپنے ملک پہنچانے اور مقبوضہ علاقے کے لوگوں کو اپنا غلام بنانے کے علاوہ کچھ نہ کیا اور ہمیشہ اس ملک یا علاقہ کو اپنی ایک محکوم ریاست سمجھا۔ اپنے آبائی وطن کو مستقل طور پر کبھی نہ چھوڑا۔ (اس میں اگر ہم امریکہ یا آسٹریلیا کی مثال لیں تو وہاں پر ایسے لوگوں کو سزا کے طور پر بھیجا جاتا جو یورپ میں تخریب کاری کے باعث ناپسندیدہ ہوتے)

تیسری اہم بات یہ کہ مغربی تصور قوم میں وطن سے محبت عبادت کی حد تک ہے اور کچھ ریاستوں کے باشندے جو لادینی عقائد رکھتے ہیں، ان کے مطابق ان کے ملک کا قانون ہی ان کا مذہب ہے اور ملک کی پرستش کرنا اور تمام Loyalty وطن کے ساتھ ہے جبکہ اسلام میں ایسا نہیں ہے اسلام میں پرستش کی ذات صرف اور صرف خدا واحد کی ذات ہے اس کے علاوہ کسی کی عبادت کرنا کفر اور شرک کے زمرے میں آتا ہے۔ نسلی اور وطنی قومیتیں ہمیں جغرافیائی سطح پر جدا ضرور کرتی ہیں لیکن اسلامی قومیت ہمیں پھر سے یکجا کرتی ہے۔ مغربی تصور قومیت کے نزدیک مذہب ایک پرائیویٹ یا ذاتی چیز ہے اور اس کا ملک سے کوئی تعلق نہیں ہے اس کے برعکس اسلام میں مذہب کے بغیر ملک کی مثال ایسی ہے جیسے نور کے بغیر آنکھیں۔

ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان ممالک چونکہ جغرافیائی سطح پر تقسیم ہو چکے ہیں لہٰذا مسلم باشندے جو ان ممالک میں رہتے ہیں جہاں مسلم حکومت نہیں ہے، وہ مسلمان قوم یا ملت کے زمرے میں کس

طرح آتے ہیں؟ مزید یہ کہ ایسے ممالک جن میں اسلامی حکومت قائم ہے وہ قومی یا مِلّی سطح کے لحاظ سے کس زمرے میں آتے ہیں؟

ایسا ملک جہاں پر مسلمان اکثریت میں ہیں اور وہاں کی حکومت بھی مسلمانوں کی ہے۔ وہاں وطنی قومیت اور اسلامی قومیت ایک ہو جاتی ہیں اور وہاں بقول اقبال ''قومیت کے معنی اپنے وطن سے محبت کرنے اور ناموس وطن کے لیے جان تک قربان کرنے کے ہیں۔ ایسی قومیت مسلمان کے لیے جزو ایمان ہے۔ قومیت، اسلام سے اس وقت متصادم ہوتی ہے جب وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے۔''(٦٤) یعنی دنیا میں جو مسلم ممالک آزاد ہیں اور وہاں اسلامی حکومت قائم ہے تو ان کی وطنی قومیت بھی جائز ہے۔ پاکستان کا وجود وفاتِ اقبال سے نو سال بعد ظہور پذیر ہوا۔ لیکن اس جیسے دوسرے اسلامی ممالک جن میں عرب، عراق، ایران، ترکی وغیرہ شامل ہیں وہاں مسلم اکثریت کی وجہ سے اقبال نے ملکی قومیت کو جائز قرار دیا کیونکہ بقول اقبال ''مسلم اکثریت والے ملکوں میں اسلام قومیت سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے کیونکہ وہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی چیز ہیں''(٦٥) اس کے برعکس ایسے ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں معاملہ الگ ہے اور بقول ڈاکٹر ایوب صابر ''بھارت کے مسلمان وطنی اعتبار سے ہندی اور مِلّی اعتبار سے مسلمان ہیں لیکن اس خطرے سے دو چار ہیں جو اقلیت میں ہونے کے باعث انھیں لاحق ہے''(٦٦) ہندوستان میں چونکہ ہندو اکثریت میں ہیں اور مسلمان اقلیت میں تو وہاں کی قومیت ہندو مذہب کی وطنی قومیت کے ساتھ تو ہم آہنگی کرتی ہے، مسلمان قوم کے ساتھ نہیں۔ وہاں کے مسلمانوں کا روحانی لحاظ سے دوسری دنیا کے مسلمانوں کے ساتھ مِلّی وحدت کا رشتہ قائم ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو پاکستان کی وطنی قومیت اور اسلامی قومیت ایک ہی چیز ہیں۔ جب تمام اسلامی ممالک کا مِلّی اتحاد قائم ہو گا تو پاکستان ایک مسلم ملک ہونے کی وجہ سے اس اتحاد کا حصہ بن سکتا ہے اس طرح پاکستان کے مسلمان اور دوسرے اتحادی مسلم ممالک کے مسلمان دوبارہ ایک عالمگیر قوت بن سکتے ہیں جبکہ بھارت ہندو اکثریت ہونے کے باعث اس اسلامی اتحاد کا حصہ نہیں بن سکتا اور وہاں کے مسلمان بھی اس اسلامی اتحاد کا حصہ بننے سے محروم رہیں گے۔

دیکھا جائے تو پوری دنیا کے اسلامی ممالک کی مثال ایسی ہے جیسے اسلام ایک عمارت ہو اور تمام اسلامی ممالک اس عمارت کے ستون ہوں اور کلمہ طیبہ ان تمام ستونوں کی چھت ہو۔ اگر ایک یا دو ستون کمزور ہوں یا گر جائیں گے تو اس سے عمارت قائم تو رہے گی لیکن کمزور ضرور پڑ جائے گی۔ پاکستان بھی اس اسلامی عمارت کا ایک اہم ستون ہے۔ اگر پاکستان اس عمارت سے الگ کر دیا جائے تو عمارت قائم تو رہے گی لیکن کہیں نہ کہیں اس میں کمزوری ضرور آئے گی۔ بعض اوقات ایک ستون کی اہمیت اس قدر ہوتی ہے کہ اس کے بغیر عمارت کا ایک حصہ گر

سکتا ہے یا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ پاکستان کی اہمیت بھی اس بنیادی ستون جیسی ہے۔ تمام ستون جتنا اتحاد و اتفاق سے قائم رہیں گے عمارت اتنی ہی مضبوط رہے گی۔ ایک ستون کو نقصان پہنچانے کی کوشش کا مطلب پوری عمارت کو نقصان پہنچانا ہے۔ جب سب مل کر اس ستون کا دفاع کریں گے تو کسی کی کیا مجال کہ وہ آنکھ اٹھا کر بھی اس عمارت کی طرف دیکھے۔ اسی طرح جب کوئی ستون عمارت سے الگ ہو کر ایک نئی عمارت بنانے کی کوشش کرے گا تو اس سے پہلی عمارت پر اتنا فرق نہیں پڑے گا جتنا خود ستون پر۔ اس کی اہمیت و قدر میں کمی بھی ہو جائے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ موسمی حالات کے تغیر کو برداشت نہ کر سکے اور صفحہ ہستی سے مٹ جائے۔ مطلب اس کی اہمیت و قدر دوسرے ستونوں کے ساتھ مل کر رہنے میں ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے ہم خیال کچھ دوسرے علمائے کرام اس بات پر زور دے رہے تھے کہ ”قومیں اوطان سے بنتی ہیں“(٦٧) اور ہندوستان کے ہندو مسلمان ایک قوم ہیں تو اس کے جواب میں اقبال نے مثنوی ”ارمغانِ حجاز“ میں ”حسین احمد“ کے نام سے ایک قطعہ لکھا ہے۔(٦٨) جس میں انھوں نے یہ کہا ہے کہ قومیں اوطان سے بنتی تو آپ کبھی بھی اہل عرب سے جنگ نہ کرتے بلکہ ابولہب کو اپنا ہم قوم سمجھتے لیکن ایسا نہیں کیا کیوں کہ اگر آپؐ کی ذات مبارک مسلمانوں کے لیے ایک الگ ریاست قائم نہ کرتی اور وہ کفار مکہ کے رحم و کرم پر ہوتے تو آج ہم تک اسلام نہ پہنچتا۔ تقریباً یہی صورت حال متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تھی۔ یہاں ہندو اکثریت میں تھے تو اس کا مطلب ہے کہ مسلمان ہمیشہ ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہوتے اور بقول ڈاکٹر ایوب صابر ”ہندی وطنی قومیت ہمیں ہندوؤں میں شامل کرتی جہاں ہم بھارتی مسلمانوں کی طرح معتوب، مشکوک اور محکوم رہتے۔“(٦٩) ہندوستان میں بسنے والے کروڑوں مسلمان ہمیشہ کے لیے ہندو قوم کے غلام بن کر رہتے۔ جب کہ عرب یا دوسرے اسلامی ممالک کسی بھی غیر اسلامی اقوام سے آزاد ہیں اور وہ مسلم اکثریتی ممالک ہیں اس لیے ان ممالک میں وطنی قومیت جائز ہے اور بقول اقبال ”قومیت کا مسئلہ مسلمانوں کو صرف ان ممالک میں درپیش ہے جہاں وہ اقلیت میں ہیں اور جہاں قومیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی ہستی کو بالکل مٹا دیں۔“(٧٠) اگر اقبال ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے الگ قوم کی حیثیت سے ان کا الگ تشخص نہ منواتے تو آج پاکستان کی صورت میں ایک الگ ریاست جو خالص اسلامی ہے اور مسلم اکثریتی بھی، کبھی وجود میں نہ آتی اور یوں پاکستان کے مسلمان اس آزادی سے زندگی بسر نہ کر سکتے جیسا کہ ابھی کر رہے ہیں اور ہندوستان کے مسلمانوں کی طرح وہ ہمیشہ ایک پنچ قوم ہی تصور کیے جاتے۔ بقول جیلانی کامران ”فکر اقبال کے بغیر برصغیر میں مسلمانوں کی قومیت اور اس کی تشکیل ممکن نہ تھی۔ اقبال کے فلسفے نے مسلمانوں کے مِلّی وجود کو قومیت کے تصور میں بدل کر جہاں اسے سیاسی عمل کا محور بنایا

وہیں اس سیاسی عمل کو نظریاتی جہت فراہم کر کے مستقبل کے ساتھ وابستہ بھی کیا ہے۔ اس اعتبار سے مسلم قومیت کا تصور نظریاتی تصور ہے۔"(۷۱) اور پاکستان کا قیام اس نظریاتی نظریے کا مرہوں منّت ہے۔

اقبال نے باوجود شدید مخالفت کے جس عزم کا ارادہ کیا اسی میں برصغیر کے مسلمانوں کی بھلائی تھی۔ اس کے بغیر پاکستان کے مسلمان اسلامی تشخص سے ہمیشہ کے لیے محروم رہتے۔ اقبال کی دور اندیشی جو آنے والے حالات کو دیکھ رہی تھی اس کو کچھ تقلید پرست علماء دیکھنے سے محروم تھے۔ اقبال کا شعر جس میں وطن کو سب سے بڑا کفر (۷۲) کہتے ہیں وہ متحدہ ہندوستان کے لیے تھا نہ کہ پاکستان کے لیے۔ متحدہ ہندوستان کی قومیت سے مراد اس مغربی قومیت کی طرف اشارہ ہے جس میں تمام Loyalty وطن کے ساتھ ہے اور مذہب کا دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہے۔

## قومی شاعری کا تصور:

مشہور یونانی فلسفی افلاطون نے کہا تھا کہ شاعری جذبات کو ابھارتی ہے (۷۳) اس لیے انھوں نے شاعری کو اپنی مثالی ریاست سے خارج کر دیا تھا۔ افلاطون کے اس قول سے شاعری پر تنقید کی ایسی ابتدا ہوئی کہ جسے کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ کہا جا سکتا ہے۔ اگر جذبات کو انسانی زندگی سے بے دخل کر دیا جائے تو اس زندگی اور انسان کو روبوٹ سے تشبیہ دیا جا سکتا ہے لیکن انسان نہیں کہہ سکتے۔ انسان کا لفظ انس سے نکلا ہے اور اُنس کے معنی محبت، پیار اور الفت کے ہیں۔ (۷۴) محبت و پیار کا تعلق انسانی جذبات سے ہے اور اگر جذبات ہی نہ ہوں گے تو باقی کیا رہ جاتا ہے صرف ایک چلنے والی مشین، یہ انسانی جذبات ہی تو تھے جس نے اس کو تسخیر کائنات کی طرف گامزن کیا۔ آج کا جدید انسان ترقی کی جس منزل پر چل رہا ہے اس کے پیچھے جذبات کا ہی ہاتھ ہے۔

افلاطون کے اس فلسفے کی سب سے پہلی مخالفت اور اعتراضات کی بنیاد ان کے ہی شاگرد اور مشہور یونانی نقاد اور سائنسدان ارسطو نے بوطیقا لکھ کر ڈالی۔ جیسا کہ افلاطون نے شاعری کے بارے کہا تھا یہ جذبات کو برانگیختہ کر کے انسان کو عقل مند کی بجائے جذباتی بناتی ہے تو اس کے جواب میں ارسطو نے یہ کہا کہ "ٹریجڈی، ترس اور خوف کے جذبات کو ابھار کر ایسے مقام پر لے آتی ہے کہ جہاں وہ جذبات نہ صرف تھک کر ختم ہو جاتے ہیں بلکہ امید و ہمت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور اس عمل کے لیے وہ 'کتھارسس' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔"(۷۵) افلاطون نہ صرف شاعری بلکہ تمام علوم و فنون کو نقالی قرار دیتا ہے تو ارسطو اس کے جواب میں لکھتا ہے کہ "نقل کرنے کی جبلت انسان میں ازل سے موجود ہے۔ وہ دوسری مخلوق سے اس لیے مختلف ہے کہ وہ ساری مخلوق میں سے سب سے زیادہ 'نقال' ہے اور اپنے ابتدائی سبق نقل ہی کے ذریعے سیکھتا ہے۔ پھر ہم سب میں

نقل سے وجود میں آئے ہوئے کاموں سے لطف اندوز ہونے کی جبلت بھی موجود ہے۔ نقل کرنے کی جبلت ہمارے لیے اسی طرح فطری ہے جس طرح موسیقی اور وزن کا احساس۔ ان فطری اور جبلی رجحانات سے شروع ہو کر اور اپنی ابتدائی کوششوں سے رفتہ رفتہ ترقی کر کے انسان نے آخر کار اپنی جدت اور برجستگی سے شاعری ایجاد کر لی(۷۶) اس طرح ارسطو شاعری کی صداقت اور تاریخ کی صداقت کے بارے لکھتا ہے کہ "شاعر اور مؤرخ میں یہ فرق نہیں ہے کہ ایک نظم میں لکھتا ہے اور دوسرا نثر میں، تاریخ اس چیز کو بیان کرتی ہے جو ہو چکی ہے جبکہ شاعری اس چیز کو سامنے لاتی ہے جو ہو سکتی ہے۔"(۷۷) اس حوالے سے دیکھا جائے تو شاعری کی اہمیت تاریخ سے زیادہ ہے۔ جس افلاطون نے شاعری کو ناپسندیدہ قرار دے کر اپنی مثالی ریاست سے شعرا کو نکال دیا تھا وہی افلاطون زندگی کے آخر میں شاعری کے قائل نظر آتے ہیں حتیٰ کہ افلاطون نے اپنی کتاب Republic کے دسویں باب میں شاعری کا ذکر اس لحاظ سے کیا ہے کہ وہ شاعری کی اہمیت کا اقرار کرتے ہوئے ۵۰ سال سے زائد عمر کے شاعروں کو ریاست میں آنے کی اجازت دے دیتا ہے۔ لیکن شرط یہ عائد کرتا ہے کہ وہ نیک، بااخلاق اور شریف ہوں اور ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اخلاق کے دائرے میں رہ کر شاعری کریں"(۷۸) افلاطون نے فلسفی کی سوچ سے شعرا کو بے کار سمجھا اور ارسطو نے ایک سائنسدان اور نقاد ہونے کے ناطے شعرا اور شاعری کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے دنیائے ادب کی پہلی تنقیدی کتاب Poetics لکھ دی۔ ڈاکٹر اقبال نے فلسفہ اور شاعری کے فرق کے بارے لکھا ہے کہ فلسفہ بوڑھا بنا دیتا ہے، شاعری تجدید شباب کرتی ہے"(۷۹) اقبال کے قول کی روشنی میں دیکھا جائے تو افلاطون نے ایک فلسفی ہونے کے ناطے شاعری کو بے کار سمجھا اور ارسطو نے سائنسدان ہونے پر شاعری کی اہمیت کو سمجھا اور آنے والے شعرا اور شاعری کے لیے بوطیقا لکھ کر ایک گرہ کھول دی۔

انسانی جذبات کوئی بری چیز نہیں ہیں لیکن اگر ان کو عقل کے تابع کر کے ان سے افادیت حاصل کی جائے۔ شاعری جذبات کو ابھارتی ہے اور جو کام ایک نارمل حالت میں ناممکن ہے وہ شاعری کروالیتی ہے۔ "شعر و ادب کی تخلیق انسان کی اس فطری خواہش کے تابع ہے کہ اپنے جذبات و احساسات سے دوسروں کو آگاہ کرے"(۸۰) شاعری جذبات کا مجموعہ ہے اور جذبات کو جب الفاظ میں ڈھالا جائے اور وہ الفاظ کسی خاص ہیئت میں ہوں تو ان کو شعر کہا جاتا ہے۔ بقول حسن رضوی ادیب "موزوں اور بااثر کلام کو شعر کہتے ہیں"(۸۱)

شاعری کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ کچھ لوگ شاعری کو بے کار اور فالتو قسم کی چیز کہتے ہیں انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ شاعری سے شاعر کو باقی فنون کی طرح وقتی فائدہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ "شاعری صلے و انعام سے بلند تر چیز کا نام ہے"(۸۲) اور بقول حالی "شاعری اکتساب سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ جس میں شاعری کا

مادہ ہوتا ہے وہی شاعر بنتا ہے۔"(۸۳) شاعری خدا کی طرف سے عطیہ ہے اور یہ عطیہ تمام لوگوں کو حاصل نہیں ہوتا بلکہ معاشرے میں چند لوگ ہی اس عطیہ سے معزوز ہوتے ہیں۔ اگر شاعری کا استعمال مثبت ہو تو شاعری اخلاق کو سنوارنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ انسانی ذہن کی ترقی کے لیے جو کردار شاعری کر سکتی ہے اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں کر سکتی۔ بقول حسن رضوی "قوت متخیلہ کی ترقی اور جذبات کی تربیت کا شعر سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں.... قوت متخیلہ کی ترقی صرف شعر و شاعری ہی کے لیے ضروری نہیں ہے، تمام ایجادات و اختراعات اس قوت کے کرشمے ہیں۔"(۸۴) جس معاشرے کے لوگ شاعری کی افادیت سے بے بہرہ ہیں ان میں خود غرضی، بے مروتی اور جوش سے کمی جیسے رجحان جنم لیتے ہیں۔ ایک یورپی محقق کے بقول "شعر کا اثر محض عقل کے ذریعہ سے نہیں بلکہ زیادہ تر دینی اور ادراک کے ذریعے اخلاق پر ہوتا ہے۔"(۸۵) جو تعلیم انسان میں ایسی قوت پیدا کرنے سے محروم کر دے جس سے انسان میں بڑھنے کا ولولہ اور جذبات کو تقویت مل سکے ایسی تعلیم بھی بے کار ہے۔ شاعری کے جن مخالف قدامت پرستوں کو یہ اعتراضات ہوں کہ شاعری جذبات کو ابھار کر بے راہ روی پر ڈال دیتی ہے اور وہ جذبات کو خواہش نفسانی کے مترادف خیال کرتے ہیں تو بقول رضوی ادیب "لفظ 'جذبات' خواہش نفسانی کا مترادف نہیں ہے، بلکہ انفعالاتِ نفسانی، یا کیفیاتی وجدانی کا۔ اور ہمدردی، ایثار، تعظیم، حب وطن، قوم پرستی وغیرہ بھی جذبات میں داخل ہیں۔"(۸۶) شاعری کا کام تمام جذبات کو متحرک کرنا اور ان میں قوت پیدا کرنا ہے محض قنوطی شاعری سے چند جذبات تک محروم کر دینا بہت بڑی غلطی ہے اور ایسی شاعری بے فائدہ کے ساتھ نقصان دہ بھی ہے۔

شاعری خدا کی طرف سے ایک خاص عطیہ ہے جس کی افادیت سے انکار ممکن نہیں ہے شاعری نے ایسے ایسے کرشمے کر دکھائے ہیں جس کی نظیر نہیں ملتی۔ بقول حسن رضوی ادیب "شاعری بے حس قوتوں کو چونکاتی ہے، سوتے کو جگاتی ہے، مردہ جذبات کو جلاتی ہے، دلوں کو گرماتی ہے، حوصلوں کو بڑھاتی ہے، مصیبت میں تسکین دیتی ہے، مشکل میں استقلال سکھاتی ہے، بگڑے ہوئے اخلاق کو سنوارتی ہے اور گری ہوئی قوموں کو ابھارتی ہے۔"(۸۷) جب بات گری قوموں کو ابھارنے کی آتی ہے تو تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ شعرا نے اپنی شاعری کے جادو سے شکستہ قوموں کی تقدیر بدل دی۔ شعرا نے زوال شدہ معاشرے اور قوم کو ایک نئی راہ پر گامزن کیا۔ لہٰذا ایسی شاعری جو کسی بھی قوم کے پریشان زبوں حالی کے لیے لکھی جائے 'قومی شاعری' کہلاتی ہے۔

قومی شاعری بقول ڈاکٹر مظفر عباس:

”قومی شاعری وہ شاعری ہے جس میں یا تو قوم کی زبوں حالی کا رونا رویا گیا ہو یا
قوم کے پر شکوہ ماضی کا تذکرہ ہو یا قوم کے مسائل پیش کیے گئے ہوں یا قومی
نوعیت کے معاملات پر بحث کی گئی ہو۔“(۸۸)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی بھی قوم کے ماضی اور حال کے مسائل پر شعری نوعیت کی بحث قومی شاعری کہلاتی ہے لیکن قومی شاعری کی یہ تعریف ناکافی ہے کیونکہ قومی شاعری وہ شاعری ہے جس میں قوم کی اخلاقی تربیت، ماضی کا تذکرہ، حال کی نوعیت کے ساتھ ساتھ اس قوم کے مستقبل میں آنے والے مسائل کا بھی ذکر ہو اور جو قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرے، اخلاق اور تعمیری کردار سے دوسری ترقی یافتہ اقوام کے مقابلے میں لا کھڑا کرے، وہ تمام شاعری قومی شاعری کے زمرے میں آتی ہے۔ قومی شاعری کی تعریف بقول طاہرہ نیر ”جس شعری تجربہ میں قوم کی نفسی کیفیت، عمومی انداز فکر، طرز عمل، ملّی جذبہ، اور اسلوب خیال کا عکس موجود ہو وہ قومی شاعری ہے“(۸۹) اگر ماضی کے ادوار میں قومی شاعری کی اہمیت اور افادیت پر نظر دوڑائیں تو اس نے ملکوں اور قوموں کی تقدیر بدل کر رکھ دی۔ یہ قومی شاعری ہی ہوتی ہے جو میدان جنگ میں سپاہ کے دل کو حد سے زیادہ مضبوط کرتی ہے حتیٰ کہ سپاہ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے اپنی ریاست یا قوم کی حفاظت کرتے ہیں۔

دنیا کا کوئی بھی خطہ ہو وہاں کے باشندوں کی قومی شاعری نہ صرف میدان جنگ میں سپاہ کے حوصلے بڑھاتی ہے بلکہ ان کی تعمیر و ترقی میں بھی مدد ثابت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے قومی شاعری سے مراد ایسی شاعری جو اس قوم کے پر شکوہ ماضی کے قصوں کا ذکر، حال میں قوم کی تمام خوبیوں اور خامیوں سے پردہ اٹھاتے ہوئے، تعمیر و ترقی، بلند اخلاق، ہمت و جذبہ، جذبہ حب الوطنی، حریتِ فکر کے جذبات اور مستقبل کے لیے قوم کو اعلیٰ نصب العین مہیا کرتی ہے۔

قومی شاعری میں ادبی لطافت سے زیادہ اہم مقصد قوم کو واضح پیغام دینا ہوتا ہے اور اس پیغام کی خاطر شاعر فلسفیانہ، خطیبانہ اور طنز و مزاح سمیت تمام حربے استعمال کرتا ہے۔ قومی شاعری میں سیاسی، سماجی یا اقتصادی مقاصد چھپے ہوتے ہیں (علمی، ادبی، ثقافتی اور ذہنی و قلبی رجحانات اور مقاصد) جو قوم کی ترقی میں مدد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں اور بقول انعام الحق کوثر ”قومی شاعری سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر کو راہ ملّی، مسلک ملا اور وہ آدرش دستیاب ہوا جس کا وہ متلاشی تھا“(۹۰) اسی طرح حریت پسند جذبات ابھارنے اور اعلیٰ قومی و ملّی نصب العین کی تکمیل کے لیے شاعری سب سے اعلیٰ وسیلۂ اظہار ہے۔

جہاں تک قومی شاعری کی افادیت کا تعلق ہے تو ماضی میں تمام قوموں نے قومی شاعری سے استفادہ کیا ہے اور قومی شاعری کی ابتدا بھی شعر کی ابتدا کے ساتھ ہوئی۔ دنیا کی ہر قوم اور ہر زبان میں قومی شاعری کی روایت موجود ہے۔ اہل مغرب نے خاص کر اس قسم کی شاعری سے فائدہ اٹھایا ہے بقول حالی " یورپ میں لوگوں نے شعر سے بہت بڑے کام لیے ہیں خصوصاً ڈریمیٹک پوئٹری نے یورپ کو جس قدر فائدہ پہنچایا ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔"(۹۱) یورپ کے علاوہ دنیا کے دوسرے خطے بھی اس کی افادیت سے قطعی محروم نہیں ہیں۔ اس میں ایرانی شاعر رودکی کا قصیدہ ہو یا عمر خیام کی رباعی ہو یا زمانہ جاہلیت کے عرب شاعر عشٰی کا کلام ہو یا ہومر کی ایلیڈ ہو، ہر ایک نے اپنی قوم کے احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ حسان بن ثابت کی عقیدت بھی قومی شاعری کے زمرے میں آتی ہے۔ جدید دنیا میں انقلابِ چین، فرانس اور ایران میں قومی شاعری کا بڑا دخل ہے۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے تو اس میں قومی شاعری کی ابتدائی کڑیاں کلامِ خسرو میں پائی جاتی ہیں(۹۲) کیونکہ قومی و وطنی محبت کا اظہار ان کی شاعری میں بکثرت پایا جاتا ہے اس کے بعد دکنی ادب میں قومی شاعری کا خمیر داخل ہوا اور یہیں سے قومی شاعری کی باقاعدہ ابتدا ہوئی (لیکن یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس وقت کی قومی شاعری سے مراد موجودہ قومی شاعری نہیں ہے) دکن میں اس کی ابتدا و ارتقا کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو دکنی سلاطین خود بھی شاعر تھے اور شعرا کی عزت و حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔ دوسرا ان کو آئے روز نئے نئے معرکوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا جس کا اظہار بھی لازمی امر تھا۔ دکنی ادب کے بعد شمالی ہند میں قومی شاعری اردو زبان میں شعری ذریعہ اظہار کے ساتھ آئی یعنی جب شمالی ہند میں ولی کی آمد کے ساتھ شعرا کا رخ فارسی سے اردو کی طرف آیا تو گل و بلبل کے بعد قومی شاعری کو راہ ملّی۔ اورنگزیب کی وفات کے بعد جب مغلیہ شہنشاہیت کا زوال شروع ہوا اور آئے روز شکست خوردہ حالات پیدا ہونے لگے تو شمالی ہند کے شعرائے کمال کس طرح اُن عناصر کا شعری اظہار نہ کرتے؟ میر تقی میر کے شہر آشوب قومی زبوں حالی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اسی طرح شمالی ہند سے جب اردو زبان اور اردو شعرا لکھنؤ کی زرخیز اور پر امن فضا میں پہنچے تو لکھنؤ کے ایوان عشرت میں شعرا نے اپنے وطن سے محبت کا اظہار شاعری میں بھی بیان کیا۔ اردو میں قومی شاعری کی مزید ترویج ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس کے بعد شروع ہوئی جب ہندوستان کے باسیوں نے حب الوطنی کے جذبے سے سرشاری اور انگریزوں کی سامراجیت اور غلامی سے چھٹکارا پانے کے لیے قومی شاعری کو وسیلہ اظہار بنایا۔ اس لحاظ سے قومی شاعری کا کردار قیام پاکستان میں بھی اہم ہے۔ اگر قیام پاکستان کے بعد اردو میں قومی شاعری کی اہمیت و افادیت پر نظر ڈالی جائے تو پاکستان کا ۱۹۶۵ء کی جنگ جیتنے میں قومی شاعری کا کردار بہت اہم ہے۔

## مِلّی شاعری کا تصور:

ایسی شاعری جو کسی قوم یا ملک کے سیاسی، سماجی، مذہبی، معاشی، معاشرتی اور نفسیاتی پہلوؤں کی عکاس ہو، چاہے اس میں حب الوطنی کے عناصر ہوں یا حکمرانوں کی ظلم و بربریت کا ذکر ہو، جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے لیے عوام و سپاہ کے جذبات کو تقویت دینے کا معاملہ ہو یا ملک میں امن و امان کی بات ہو، قوم کے فوجی رہنماؤں کی بات ہو یا بہادر جوانوں کے قصوں کا ذکر، یا قوم کو مستقبل کے لیے ایک نیا عزم اور اعلیٰ نصب العین دینے کا معاملہ ہو ایسی تمام شاعری قومی شاعری کے زمرے میں آتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک پوری قوم کی ترجمان شاعری کو قومی شاعری اور ملت کی ترجمان شاعری کو مِلّی شاعری کہا جاسکتا ہے۔ اس وقت قومی شاعری بھی مِلّی شاعری کا روپ دھار لیتی ہے جب اس ملک و قوم کا کسی خاص ملت کے ساتھ ربط ہو۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ جب وطنی قومیت اور مذہبی قومیت میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے تو وہ وطنی قومیت کے ساتھ مِلّی یا مذہبی قومیت بھی کہلاتی ہے۔ اس طرح اگر یہ کہا جائے کہ پاکستانی قوم کی ترجمان شاعری پوری ملت اسلامیہ کی ترجمان شاعری بھی کہلاتی ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ کیونکہ پاکستان کی سربلندی ملت اسلامیہ کی سربلندی ہے اور پاکستان کے مسائل و مصائب ملت اسلامیہ کے مسائل و مصائب ہیں۔ پاکستان کو اسلام سے کسی صورت جدا نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس صورت میں پاکستانی قومیت کا تشخص اپنی اصلی حالت کھو دے گا۔ اس لحاظ سے پاکستانی قومی شاعری کو مِلّی شاعری کہنا زیادہ بہتر اور افضل ہے۔ اس کے برعکس کوئی ایسا ملک جہاں بہت سے مذاہب ہوں اور اس ملک کا مذہب کے لحاظ سے کوئی ربط یا تسلسل دنیا کے دوسرے ممالک سے نہ ہو یا پھر اس ملک میں لادینی قسم کی حکومت ہو اور اس ملک میں قومیت کا تصور مغربی تصور ہو تو وہاں کی قومی شاعری صرف قومی شاعری کہلائے گی۔ وہ مِلّی شاعری کے زمرے میں نہیں آتی۔ جیسا کہ متحدہ ہندوستان میں بہت سے شعرا نے حب الوطنی شاعری، ملکی مصائب یا سامراج سے آزادی کے لیے شاعری کی اور ان کی شاعری کا تعلق کسی بھی مذہب یا ملت سے نہیں تھا تو وہ قومی شاعری کہلاتی ہے۔ اقبال سمیت بہت سے دوسرے مسلمان شعرا نے بھی ابتدا میں ہندوستان کو حرف آخر جان کر قومی شاعری کی ہے۔ جیسا کہ اقبال کا مشہور ''ترانہ ہندی'' ہے جو آج بھی ہندوستان میں پڑھا جاتا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی، دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا، ہمسایہ آسماں کا

وہ سنتری ہمارا ، وہ پاسباں ہمارا (ترانہ ہندی، بانگِ درا)

اقبال اس نظم میں ہندو مسلم اتحاد کو لازمی سمجھتے ہیں کیونکہ اس وقت اقبال کے لیے مذہب بنیادی معاملہ نہیں بلکہ وطن کی محبت اہم تھی اور وطن کی آزادی کے لیے ہندو مسلم سمیت تمام مذاہب کا اتحاد لازم تھا:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا (ترانہ ہندی، بانگِ درا)

اقبال کو وطن کی محبت نے اس قدر گرویدہ بنالیا تھا کہ انھوں نے مذہب سے بڑھ کر وطن کی بڑائی بیان کی اور اس ہندو مسلم اتحاد کو اپنی شاعری میں اہم جگہ دی۔ "نیا شوالہ" میں فرماتے ہیں:

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے

تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا

جنگ وجدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا

واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے (نیا شوالہ، بانگِ درا)

اقبال کو وطن کی محبت نے اس قدر گرویدہ بنالیا تھا کہ انھوں نے مذہب سے بڑھ کر وطن کی بڑائی بیان کی اور ہندو مسلم اتحاد کو اپنی شاعری میں اہم جگہ دی۔ اقبال کا وطن سے محبت کا یہ انوکھا اور منفرد اظہار تھا۔ اقبال کی طرح دوسرے شعرا جن میں حالی، شبلی، ظفر علی خان، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا محمد حسین آزاد بھی ہندوستان کے نمائندہ مسلمان قومی شعرا ہیں لیکن جب ان کو یہ احساس ہوا کہ ہندوستان میں ہندو اکثریت میں ہیں اور مسلم اقلیت میں، متحدہ ہندوستان میں قومیت کے جدید تناظر میں مسلمانوں کا تشخص مٹ جائے گا تو انھوں نے الگ وطن کا مطالبہ کیا تا کہ ایک ایسا ملک ہو جس میں مسلمان اکثریت میں ہوں اور ان کا تشخص خالص اسلامی ہو، وہ ملک ملت اسلامیہ کے ایک رکن کی حیثیت رکھتا ہو۔ اس ملک کے قانون اور اسلامی اقدار میں ہم آہنگی ہو۔ مسلمانوں کی مسلسل کوششوں سے وہ ملک پاکستان کی صورت میں خدا تعالیٰ نے عطا کر دیا۔ متحدہ ہندوستان چاہے

مسلمانوں کو جتنے بھی حقوق دے دیتا لیکن وہ ایک ہندی اکثریتی ملک تھا اور ملت اسلامیہ کے ساتھ اس کا ربط اور ہم آہنگی کبھی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔

پاکستان ہو یا ایران یا کوئی بھی مسلم اکثریتی ملک، چھوٹی بڑی عداوتوں کے باوجود وہ ملت اسلامیہ کے رکن ہیں۔ ان میں ہر ملک کی قومی شاعری ملّی شاعری کہلاتی ہے۔ ان ممالک کا بچہ بچہ اور ذرہ ذرہ اسلامی ملت کی اقدار سے منور ہے۔ تمام اسلامی ممالک وحدت اسلامی پر یقین رکھتے ہیں۔ جب بھی کبھی باطل قوتوں کے خلاف مسلمان متحد ہوئے تو تمام مسلم ممالک اس اتحاد کا حصہ ہوں گے۔ اب بھی مسلم ممالک کی حکومتوں میں نفاق ہونے کے باوجود تمام اسلامی ممالک کے مسلمان خود کو ایک ملّی یگانگت تصور کرتے ہیں اور تمام مسلم ممالک سے دلی وابستگی رکھتے ہیں۔ ان کی قومی شاعری بھی ملّی شاعری ہوتی ہے کیونکہ اگر ایک مسلم ملک اور غیر مسلم ملک کے درمیان جنگ ہوتی ہے تو مسلم ملک کی فتح اسلام کی فتح ہے اور مسلم ملک کا نقصان اسلام کا نقصان ہے۔ جیسا کہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے اور ایٹمی قوت رکھتا ہے۔ تمام مسلم ممالک اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ پاکستان کی ایٹمی قوت ہماری ایٹمی قوت ہے۔ اس طرح کشمیر، فلسطین، صومالیہ، عراق اور شام جیسے اسلامی ملکوں میں ہونے والی تباہی سے تمام عالم اسلام کے باشندوں کا دل دکھتا ہے اور وہ تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ الغرض مسلم ممالک کی مثال ایسے ہے جیسے وہ ایک جسم کے مختلف حصے ہوں کہ اگر کسی بھی حصہ میں تکلیف ہو تو پورا جسم کانپ اٹھتا ہے۔

## (ب) ملّی نغمہ.... بطور صنف سخن:

ادب تخیل کی وہ بلند ترین سطح ہے کہ جب اس کو الفاظ میں ڈھالا جائے تو قاری متاثر ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسی تحریر جو پڑھنے والے کو متاثر کرے، ادب کے زمرے میں آئے گی۔ بقول غلام حسین ذوالفقار ''شعر و ادب کی تخلیق انسان کی فطری خواہش کی تابع ہے کہ وہ اپنے جذبات و احساسات سے دوسروں کو آگاہ کرے۔'' (۹۳)
ادب کس وقت جنم لیتا ہے اور ادب کیسا ہونا چاہیے۔ ان سوالوں کا جواب یہ ہے کہ ادب اُس وقت جنم لیتا ہے جب کوئی انسان اپنی ذاتی زندگی یا معاشرے میں ہونے والی ناانصافی، خوشی، غمی، پریشانی یا دکھ درد کا اثر لے اور یہ اثر اتنا بڑھ جائے کہ اُس میں لطیف جذبات شامل ہو جائیں جن کے کتھارسس کے لیے اُس کو الفاظ کا سہارا لینا پڑے اور ان الفاظ کو کسی خاص صورت میں اس طرح ڈھالا جائے کہ اس کو پڑھنے والے دوسرے افراد بھی اس سے متاثر ہوں اور یوں محسوس کریں کہ جیسے یہ ان کے دل کی بات ہے۔ ان الفاظ کو جذبات کے اظہار کی بہترین صورت کہا جا سکتا ہے جو لفظوں کی صورت میں تحریر کا حصہ بنیں اور ادب کے زمرے میں داخل ہو جائیں۔ دریں

اثنا انسانی جذبات کے اظہار کی اور بھی صورتیں ہیں جن میں لڑائی جھگڑا، دنگا فساد، لوٹ مار وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن ادب ان تمام میں اظہار کی سب سے بہترین صورت ہے۔ ادب انسانی جذبات کے ایسے اظہار کا نام ہے جس سے قاری یا معاشرے پہ اچھا اور مثبت اثر پڑے۔ علاوہ ازیں لطیف جذبات کو ادا کرنے کی تمام مثبت صورتوں کو فنونِ لطیفہ کہا جاتا ہے، اور ادب اس کی ایک شاخ ہے جس میں انسانی جذبات کا بہترین اظہار پایا جاتا ہے۔

گویا ادب انسانی اظہار کی ایک بہترین صورت ہے۔ ادب کو بیان کرنے کے لیے الفاظ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ الفاظ کی صورت میں انسانی جذبات کے اظہار کی بھی کئی صورتیں ہیں جن کو اصناف ادب کہا جاتا ہے۔ اصناف صنف کی جمع ہے۔ اردو زبان میں ہیئت یا فکر کے لحاظ سے ادب میں اظہار کی کسی ایک صورت کو صنف کہتے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند شعری اصناف کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں "صنف سے مراد نظم کا وہ گروہ ہے جس کے مختلف نمونوں میں ہیئت، موضوع اور ادبی روایت میں سے کسی ایک یا دو یا تینوں کی بنا پر اشتراک یا مماثلت ہو۔" (۹۴) یعنی ان تین شرائط میں سے تینوں یا کوئی ایک شرط پر بھی پورا اترنے والا شعر پارہ ایک الگ صنف کے زمرے میں آسکتا ہے۔ اس کے لیے کسی دوسری زبان و ادب کے اصولوں کی پابندی لازمی نہیں ہے کیونکہ بقول ابو الاعجاز حفیظ صدیقی "مختلف زبانوں اور مختلف خطہ ہائے ارض میں اصناف ادب بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں" (۹۵) اور جب بھی کوئی نئی صنفِ ادب وجود میں آتی ہے تو اس کے پیچھے وسیع پس منظر کارفرما ہوتا ہے۔ وقت کے تقاضوں سے کوئی شعری یا نثری صنف ادب کسی دوسری زبان سے نقل ہو کر آجاتی ہے اور کبھی اہل زبان ایک نئی صنف کو جنم دینے کا مؤجب بنتے ہیں۔ اردو ادب میں شعری اصناف کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی بلحاظ ہیئت اور بلحاظ موضوع۔ لیکن شعری ادب میں ہیئت اور موضوع کے علاوہ ایک تیسری صورت بھی ہے جس کا ذکر اوپر گیان چند نے کیا ہے۔ اس تیسری قسم میں گیت شامل ہیں جبکہ رفیع الدین ہاشمی نے اس تیسری قسم میں نظم جدید (پابند نظم، معریٰ نظم، آزاد نظم اور سانیٹ) کو شامل کیا ہے جبکہ گیت کو ہیئتی اصناف میں شامل کیا ہے (۹۶) دیکھا جائے تو گیت کا دائرہ ہیئت اور موضوع کی بجائے ادبی روایت پر منحصر ہے۔ یعنی اصناف ادب کا صنفی معیار موضوع و ہیئت کے ساتھ عصری و تہذیبی عناصر کا بھی مرہون منت ہے۔

شعر اور نثر میں بنیادی فرق غنائیت کا ہے یعنی شعری اصناف کا تعلق خاص انداز سے پڑھنے یا گانے سے ہے اور بقول قیصر جہاں "شاعری محسوسات کا غنائی اظہار ہے۔" (۹۷) یعنی شاعری کا بنیادی مقصد اس کو سروں اور سازندوں سے ادا کرنے کا نام ہے۔ اس میں چاہے ہیئتی صنف یعنی غزل، مثنوی، رباعی وغیرہ ہو یا موضوعاتی صنف مرثیہ، قصیدہ، نعت اور حمد کا تعلق ہو یا گیت جیسی کوئی تیسری صورت ہو۔

## مِلّی نغمہ.... موضوعاتی صنف:

جہاں تک موضوعاتی اصناف کا تعلق ہے تو ان کا دائرہ کافی وسیع ہے اور ایک موضوع کا اظہار کئی شعری ہیئتوں میں کیا جاسکتا ہے جیسے حمد یعنی اللہ تعالیٰ کی تعریف۔ حمد اردو کی ایسی صنف ہے جو ابتدائے اردو سے ہی مقبول رہی ہے اور آج بھی پوری آب و تاب سے جاری ہے۔ شعرائے اردو نے اپنی محبت و عقیدت کے لحاظ سے ہر ہیئت میں حمد لکھی ہیں۔ اسی طرح نعت یعنی رسولِ مقبول ﷺ کی تعریف بھی موضوعاتی صنف ہے اور حمد کی طرح ہی مقبول اور اردو کی تمام شعری ہیئتوں میں اس کا اظہار ہوتا آرہا ہے۔ منقبت یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اولیااللہ کی تعریف و فضائل کا تعلق بھی مندرجہ بالا اصناف جیسا ہے۔ قصیدہ بھی اردو شاعری کی موضوعاتی صنف کے زمرے میں آتا ہے اور کئی ادوار میں اردو کی بڑی مقبول صنف ادب رہی ہے۔ مرثیہ کا تعلق بھی موضوعاتی صنف ادب ہے۔ مرثیے کو مزید شخصی مرثیہ، مذہبی یا فقہی مرثیہ، ملکی مرثیہ وغیرہ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے لیکن اس کا بنیادی تعلق موضوع سے ہی ہے۔

مندرجہ بالا بحث کا مقصد یہ ہے کہ کسی خاص موضوع کو لے کر دیکھیں تو ایک الگ صنف کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ مِلّی نغمہ بھی ایک ایسی ہی صنف ادب ہے جس کا تعلق موضوع سے ہے اور یہ بھی حمد، نعت، قصیدہ و مرثیہ کی طرح کئی ہیئتوں میں لکھا گیا ہے۔

محبوب کی زلفوں کا ذکر ہو تو غزل بنتی ہے اور اگر محبوب کی بے رخی کی وجہ سے اسے جلی کٹی سنانی ہوں تو واسوخت، اسی طرح مرنے والی / والے کی تعریف مرثیہ، اور کسی کی تعریف یا طنز کرنا ہو تو قصیدہ یا ہجو۔ خدا کی تعریف ہو تو حمد، رسول ﷺ کی تعریف نعت اور اہل بیت یا صحابہ کرام کا ذکر سلام اور منقبت۔ اسی طرح جس شاعری میں ملک و ملت کی تعریف و توصیف یا زبوں حالی کا ذکر ہو تو وہ قومی و مِلّی شاعری کہلاتی ہے۔ اردو زبان میں قومی و مِلّی شاعری کو ایک الگ صنف "مِلّی نغمہ" کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ یہ روایت ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے شروع ہو کر ابھی تک پورے آب و تاب سے چلی آرہی ہے۔

پاکستان کی سب سے جدید اور مستند لغت جو حال ہی میں کراچی لغت بورڈ نے آن لائن پیش کی ہے، اس کے مطابق "مِلّی" کا لفظ مِلّت سے منسوب ہے (۹۸) اور "نغمہ" سے مراد "وہ آواز جو گلے یا کسی آلۂ موسیقی سے باقاعدہ جنم لے اور ترنم کے ساتھ نکلے۔ موسیقی کی بندش کی طرز پر گائے گئے الفاظ یا بول، موسیقی کے لیے ڈھالے ہوئے بول۔"(۹۹) جبکہ "مِلّی نغمہ" سے مراد "قوم و ملک سے والہانہ جذبات پر مبنی نغمہ۔ وہ نغمہ جس میں قوم کی تعریف، ترقی اور تحفظ وغیرہ کے جذبات کا اظہار ہو۔"(۱۰۰) ان تعریفوں سے مِلّی نغمہ کی باقاعدہ یہ

تعریف لی جاسکتی ہے کہ" وہ شاعری جو ملک وملت سے والہانہ جذبات پر مبنی ہو اور جس میں قوم، ملک وملت کی تعریف، ترقی اور تحفظ کا ذکر ہو، اس کو ملّی یا قومی نغمہ کہہ سکتے ہیں۔" اس حوالے سے دیکھا جائے تو وہ تمام شاعری جس کو قومی و ملّی شاعری کہا جاتا ہے اردو کی شعری صنف "ملّی نغمہ" کے زمرے میں آتی ہے۔

پاکستان ایک اسلامی ملک ہے اس کا قیام، وجود اور مستقبل اسلام کے ساتھ وابستہ ہے۔ پاکستان کی سالمیت اسلام کے ساتھ بالواسطہ منسلک ہے اور اسلام ایک بین الاقوامی بلکہ ابدی اور آفاقی دین ومذہب اور سلیقہ ہائے زندگی ہے اس لیے اردو شاعری میں جہاں بھی اسلام اور پاکستان کی خیر خواہی کا ذکر ہو گا اس کو" قومی و ملّی نغمہ" میں تسلیم کیا جائے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نغمہ کا تعلق تو صرف موسیقی یا نغمگی سے ہے اس طرح ایسی شاعری جو کتابوں میں بند پڑی ہے اور ابھی تک کسی موسیقار یا گلوکار کی ادائیگی کی زینت نہیں بنی یا نہیں بن سکتی اس کو کیونکر ملّی نغمہ کہا جاسکتا ہے؟

ملّی سے مراد ملت اسلامیہ (پاکستان اسی ملت اسلامیہ کا رکن ہے) اور نغمہ سے مراد وہ شاعری جو نغمگی کی کیفیت پیدا کرے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو پوری شاعری ہی نغمگی کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے لکھی جاتی ہے اگر کوئی موسیقار یا گلوکار اس کو موسیقی میں نہیں ڈھال سکتا یا وہ کلام اس قابل نہیں کہ موسیقی کے معیار پر پورا اتر سکے تو وہ شاعر یا موسیقار کی کمزوری ہو سکتی ہے اس سے صنف ادب کو کمزور نہیں کہا جاسکتا۔

رزمیہ، ساگا، ایپک، حماسہ، جنگ نامہ وغیرہ کا تعلق قومی شاعری سے ہے اور قومی شاعری کو ملّی نغمہ کہا جا سکتا ہے۔ ایسی شاعری کو صرف قومی شاعری یا ملّی شاعری یا حب الوطنی شاعری کہہ دینا کافی نہیں ہے۔ باقی موضوعاتی اصناف جیسے حمد، نعت، منقبت، قصیدہ اور مرثیہ کی طرح یہ بھی ایک الگ صنف ہے، جس کا موضوع الگ ہے تو اس کو باقی موضوعاتی اصناف کی طرح الگ صنف کہنا کوئی حرج نہیں ہے۔

ادبی حلقوں میں ایک اور غلط تاثر پایا جاتا ہے کہ ملّی نغمہ گیت کی ذیلی قسم ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ گیت کا تعلق گائیگی سے ہے اور ملّی نغمہ کا تعلق بھی گائیگی سے، اس لیے ملّی نغمہ گیت ہی کی ذیلی قسم ہے۔ ان واجب التعظیم محققین وناقدین کے لیے گیت کی تشریح بھی ضروری سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر گیان چند نے مذہبی یا وطنی شاعری کو گیت ہی کی ایک ذیلی قسم کہا ہے۔(۱۰۱) انھوں نے گیت کی اتنی ذیلی اقسام لکھی ہیں کہ جیسے پوری شاعری کو ایک ہی صنف "گیت" میں رکھا جائے تو اُن کے معیار کے مطابق گیت پر پوری اترتی ہیں۔ ایسا ہی کچھ قیصر جہاں نے اپنے مقالے میں لکھا ہے۔ اشرف کمال نے گیت کی تعریف میں

لکھا ہے کہ ''اصولاً جو گائی جانے کے لیے لکھی جائے''(۱۰۲) گیان چند، قیصر جہاں اور اشرف کمال نے گیت کی تعریف اظہر علی فاروقی کی کتاب ''اتر پردیش کے لوک گیت'' سے لی ہے لیکن ان کی تعریفوں کو دیکھا جائے تو پوری کی پوری شاعری گیت ہی کہلاتی ہے۔اس کو کسی اور صنف کا نام دینے کی ضرورت نہیں۔

یہ درست ہے کہ گیت گانے کے لیے ہی لکھا جاتا ہے لیکن دوسری شاعری بھی تو گائے جانے کے لیے ہی کی جاتی ہے۔ نغمگی اس میں بھی پائی جاتی ہے اور بقول ابوالاعجاز صدیقی ''گیت میں موسیقی کا دخل دوسری اصناف سے زیادہ ہے اس لیے گیت کہا جاتا ہے۔''(۱۰۳) گیت کی مربوط معنوں میں تعریف وزیر آغا نے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''گیت 'عورت' کے جسم کی پکار ہے، اس لیے اس میں نہ صرف جذبات کی فراوانی ہے بلکہ یہ کسی مثالی یا تخیلاتی محبوب کے بجائے گوشت پوشت کے بت کو اپنی نگاہ کا مرکز بناتا ہے''(۱۰۴) شمیم احمد نے اردو گیت کو موضوعاتی اور ہیئتی صنف سے بڑھ کر ایک الگ درجہ دیا ہے۔بقول شمیم احمد ''صنف کے لحاظ سے گیت بھی موضوعات کا تنوع رکھتا ہے۔اس لیے نظم کی طرح اسے بھی کسی خاص موضوع تک محدود نہیں رکھا جا سکتا۔''(۱۰۵) لیکن گیت کی تعریف میں شمیم احمد بھی ایک نقطے پر اٹک جاتے ہیں بقول شمیم احمد ''اصلاً گیت کا مزاج ان کیفیات کا آئینہ دار ہے جنہیں نسوانی کہا جاتا ہے۔''(۱۰۶) اس تعریف سے وزیر آغا کے خیالات کو تقویت ملتی ہے۔ وزیر آغا مزید لکھتے ہیں کہ ''گیت وہ نئی روح ہے جس نے رحم مادر کے اندر جنم لیا ہے۔ جب یہ (روح) تکمیل کے ایک خاص مقام پر پہنچنے کے بعد رحم مادر سے الگ ہو جاتی ہے تو گیت کے حربے کو چھوڑ کر ایک نئی صنفِ شعر کو اپنا لیتی ہے۔''(۱۰۷) یہ نئی صنف شعر کون سی ہے؟ یہ وہ اصناف ہیں جنھوں نے گیت کے بعد جنم لیا جن میں غزل، مرثیہ و قصیدہ وغیرہ شامل ہیں۔

## مِلّی نغمہ.....ہیئتی تنوع:

مِلّی نغمہ بھی گیت کے بعد جنم لینے والی صنف شعر ہے جس میں باقی موضوعاتی اصناف سخن کی طرح ہیئتی تنوع پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کا بنیادی وصف موضوع ہے۔ البتہ یہ بات واضح ہو گئی کہ گیت عورت کا مرد سے اظہار محبت ہے جبکہ مِلّی نغمہ کے معنی ساز اور سازندوں سے بھرپور ترانہ ہے اور جو کسی خاص مذہب سے تعلق رکھنے والی قوم و ملت کا اپنے ملک و ملت سے محبت کا ایسا اظہار جو آلاتِ موسیقی کے ساتھ پڑھا/ گایا جائے۔(اس کی مزید وضاحت آنے والے ابواب میں آئے گی)

اب یہ بات واضح ہو گئی کہ مِلّی نغمہ ایک موضوعاتی صنف شاعری ہے اور اس میں باقی موضوعاتی اصنافِ شاعری کی طرح اسلوبِ بیاں میں تنوع پایا جاتا ہے یعنی مِلّی نغمے اردو شاعری کی مختلف ہیئتوں میں لکھے گئے ہیں۔

ادا جعفری اردو ادب کی معروف شاعرہ ہیں ان کا کلام پاکستانی قوم کے دل کی آواز ہے۔ وہ شاعری کے ذریعے پاکستانی قوم کو بیدار کرنے کا فریضہ احسن طریقے سے ادا کرتے ہوئے شعری ادب میں ہیئتی تنوع کے کامیاب تجربات سے گزرتی ہیں۔ ان کی یہ نظم آزاد نظم (Free Verse) کی ہیئت میں ہے۔ آزاد نظم کے مزید تجربات دوسرے شعرا کے کلام میں بھی شامل ہیں:

مرے بچو!
تم آنے والے موسم کی دعا ہو
تمھیں ورثے میں ہم نے کیا دیا
کیا دے سکتے ہیں
گزر گاہوں پہ بہتا خون
ہوائیں شعلہ ساماں
خوف اور نفرت سے آلودہ (نوجوان نسل کے نام، حرفِ شناسائی)

اسی طرح مسرور انور کا ملّی نغمہ "سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے" مخمس کی شعری ہیئت میں ہے اور ایسا لگتا ہے کہ مسرور انور نے اس نغمہ میں وطن کی محبت میں الفاظ خون سے ڈبو کر درج کیے ہیں کیونکہ ایسے موتی خونِ جگر نچھاور کیے بغیر معرضِ وجود میں نہیں آتے۔ اقتباس ہے:

سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے
تیرا ہر اک ذرہ ہم کو اپنی جان سے پیارا
تیرے دم سے شان ہماری تجھ سے نام ہمارا
جب تک ہے یہ دنیا باقی ہم دیکھیں آزاد تجھے
سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے (سوہنی دھرتی، قومی نظمیں)

ملّی نغمہ میں ہیئتی تنوع کی یہ چند مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ مثنوی، رباعی، قطعہ، مخمس، مسدس، ترکیب بند، نظم معریٰ، نثری نظم، سانیٹ، ہائیکو، دوہا، اور ماہیا سمیت تمام اہم اصناف میں ملّی نغموں کا اظہار ہوا ہے۔ (ان کی تفصیل باب پنجم میں آئے گی)

## ملّی نغمہ.... اہم موضوعاتی دائرے:

ملّی نغمہ کی وسعت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ ہیئتی تنوع کے ساتھ متنوع موضوعات میں بھی لکھے گئے ہیں۔ متنوع موضوعات سے قطعاً یہ مراد نہیں کہ ملّی نغمہ اپنی اصل تعریف سے نکل کر کسی اور

موضوع کے بارے لکھا جائے بلکہ اپنے موضوعاتی دائرے میں رہتے ہوئے کئی موضوعات کو شعرا نے اپنے قلم کی زینت بنایا ہے۔ قومی و ملّی شاعری اتنا وسیع موضوع ہے کہ اس میں مزید کئی موضوعات ہیں اور وہ تمام ملّی نغمہ کا حصہ ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد ہجرت سے لے کر ردالفساد اور ضربِ عزب تک بے شمار موضوع ہماری قومی و ملّی شاعری میں شامل ہیں جن میں ہجرت، پاک بھارت جنگیں، مارشل لاء، قومی و ملّی رہنماؤں، شہدائے وطن، ایٹمی دھماکے، مسلم ممالک کی طرف سے بننے والی او آئی سی، اس کی قرارداد اور مقاصد سے لے کر مسلم ممالک اور پاکستان کو درپیش چیلنج، دہشت گردی، غربت سمیت اہم موضوعات ملّی و قومی نغمہ نگاری کے دائرہ میں شامل ہیں۔(ملّی نغمہ کے موضوعات کی تفصیل اس مقالہ کے باب ۳ میں آئے گی)۔

### بطور صنف.... ملّی نغمہ کا مقام:

مرور ایام کے ساتھ کسی زبان کی طرح اصناف سخن بھی ارتقا کے مراحل سے گزرتی رہتی ہیں۔ زمانے اور معاشرتی لحاظ سے اصناف ادب جنم لیتی اور معدوم و متروک ہوتی آئی ہیں۔ کچھ اصناف ایسی بھی ہیں جن کا تعلق ایک خاص زمانے سے رہا ہے اور وہ اپنے دور کی بہت اہم اصنافِ ادب میں شمار ہوتی تھیں۔ اردو میں قصیدہ کی مثال لے لیتے ہیں۔ دورِ نوابین میں اس صنف ادب پر عروج رہا ہے اس کی اہمیت کا اندازہ بقول شمیم احمد ''ہیئتی نقطہ نظر سے قصیدے کی اہمیت اس بات میں ضرور مضمر ہے کہ غزل جیسی شاندار صنف سخن اس کے بطن سے پیدا ہوئی۔''(۱۰۸) بادشاہی دور میں اردو اور فارسی کے مقبول شعرا میں بہت ہی کم شعرا ایسے ہوں گے جنھوں نے اس میں کم طبع آزمائی کی ہو اور بقول ابوالاعجاز حفیظ صدیقی ''قصیدہ عربی کی ایک اہم صنف سخن ہے جس میں مدح و ہجو، رزم و بزم، عرفان و اخلاق سبھی کچھ بیان ہوتا رہا ہے''(۱۰۹) حالات نے پلٹا کھایا اور قصیدہ معدوم ہوتا گیا۔ موجودہ ترقی یافتہ دور میں قصیدہ صرف کتابوں کا حصہ اور حوالہ کے طور پر رہ گیا ہے۔ اسی طرح مثنوی بھی قدیم صنف سخن ہے جو نہ صرف فارسی ادب کی مقبول بلکہ اردو زبان ادب کی مقبول ترین اور اہم صنف رہی ہے۔ مولانا روم کی مثنوی معنوی اور حفیظ جالندھری کا 'شاہنامہ اسلام' کی اہمیت مُسلّم ہے۔ مولانا حالی نے مثنوی کو اردو شعرا کی پسندیدہ صنف 'غزل' پر ترجیح دی ہے۔ ان کے بقول ''مثنوی اصناف سخن میں سب سے زیادہ مفید اور کار آمد صنف ہے''(۱۱۰) اس کے علاوہ قدیم شعرا نے قصے کہانیاں مثنویوں میں بیان کر کے بادشاہوں سے بھاری انعام وصول کیے ہیں لیکن موجودہ دور میں مثنوی کی قدر و منزلت میں کمی آچکی ہے۔ مثنوی کی طرح مرثیہ کی حالت بھی خطرے سے دوچار ہے۔ موجودہ مادی دور میں مرثیہ کی اہمیت کم تر ہوتی جارہی ہے۔ دورِ جدید میں لوگوں کے پاس وقت کی قلّت کے باعث مختصر اصنافِ سخن کی اہمیت بڑھ گئی ہے جیسے نظمانہ اور ہائیکو وغیرہ۔

ملّی نغمہ ایک ایسی صنف ہے جو ہر دور میں اور ہر زبان میں ویسی ہی مقبول رہی ہے جیسی آج کے ترقی یافتہ دور میں اس کی اہمیت ہے۔ اس کی نوعیت سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن اہمیت سے قطعی اختلاف ممکن نہیں رہا۔

اردو میں زیادہ تر اصناف ایسی ہیں جو دوسری زبانوں سے بطور خاص شعرانے مستعار لے کر اردو شاعری میں ان کو مقبولیت کے اہم درجے پر پہنچا دیا جن میں قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، آزاد نظم، معرٰی نظم، سانیٹ اور ہائیکو وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں فارسی سے اردو میں آنے والی اصناف قصیدہ، غزل، سلام، نوحہ زاری وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح عربی سے فارسی اور پھر اردو میں آنے والی اصناف مثنوی، رباعی، مرثیہ، شہادت، ساقی نامہ وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

ہندی سے اردو میں آنے والی اصناف دوہا، کنڈلیا، چوبولا، جھولنا، پہیلی، بارہ ماسہ، ساکھی، گیت اور ڈرامہ وغیرہ ہیں۔

پنجابی سے سہ حرفی، ماہیا، ٹپہ وغیرہ ہیں۔

پشتو سے چاربت۔

جاپان سے ہائیکو وغیرہ۔

انگریزی سے سانیٹ، ترائیلے، آزاد نظم، معرٰی نظم اور نثری نظم وغیرہ ہیں۔

اردو کی اپنی اصناف: نعت، جکری، سہیلا، شہر آشوب، ریختی، نظمانہ اور ملّی نغمہ وغیرہ (۱۱۱)

کچھ اصناف ایسی بھی ہیں جو ایک شخص سے شروع ہوئیں اور اسی پر ختم ہو گئیں۔ ان اصناف کو کوئی ترقی نہ مل سکی اور وہ صرف کتابوں میں حوالے کے طور پر محفوظ ہو کر رہ گئی۔ مکرنی یا کہہ مکرنی کا تعلق امیر خسرو سے ہے۔ خسرو کے علاوہ شان الحق حقی نے اس کو زندہ کیا بقول ابوالاعجاز حفیظ صدیقی ”بیسویں صدی میں کہہ مکرنی تقریباً ایک متروک صنف سخن سمجھی جاتی تھی مگر شان الحق حقی نے ۱۹۷۲ء میں چند مکرنیاں کہہ کر اسے حیات نو بخشی“(۱۱۲) مکرنی کو موجودہ دور کی ایک متروک صنف سخن کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح کینٹو کو جعفر طاہر سے منسوب کیا جاتا ہے جن کا مجموعہ ”ہفت کشور“ ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ ان کے بعد کسی شاعر نے اس صنف کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی اور اب یہ بھی تقریباً متروک سمجھی جانے والی صنف ادب ہے۔ واویلا کا تعلق بھی افرادی صنف سے ہے جو اب متروک ہو چکی ہے۔

اسی طرح کچھ اردو اصناف ادب ایسی ہیں جن کا تعلق ایک مخصوص علاقے سے رہا۔ وہ جس علاقے سے شروع ہوئیں وہیں ختم بھی ہو گئیں اور اب متروک اصناف سخن میں شامل ہیں مثلاً زاری، فال نامہ وغیرہ۔ زاری کا تعلق حیدرآباد (بھارت) سے ہے اور یہ وہیں پر شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی۔

مندرجہ بالا اصناف کی طرح اردو کی بہت سی ایسی اصناف ہیں جو مقبولیت سے پہلے ہی نامقبول ہو گئیں یا اپنے زمانے، علاقے اور مخصوص افراد میں مقبول بھی رہی ہوں لیکن موجودہ دور میں ان اصناف کو متروک اصناف سمجھا جاتا ہے جن میں اشلوک، اینٹی غزل، جھولنا، بارہ ماسہ، سکہ، مناجات اور لوری نامہ وغیرہ شامل ہیں۔

مِلّی نغمہ اردو کی ایک ایسی صنف سخن ہے جو شروع سے مقبول ہے۔ ہر زمانے اور ہر زبان میں اس کی اہمیت مسلّم رہی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے زمانے اور زبانوں یا ملکوں کے تنوع سے اسے کسی اور نام سے پکارا جاتا ہو لیکن اس کے وجود سے انکار ممکن نہیں ہے۔ حیرانگی اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اس اہم اور مقبول صنف سخن کو ہمارے دانشور گیت کا حصہ سمجھتے ہیں لیکن وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ گیت بھی کوئی ہیئتی صنف نہیں ہے گیت میں باقی موضوعاتی اصناف کی طرح ہیئتی تنوع پایا جاتا ہے اور یہ بنیادی طور پر موضوعاتی صنف سخن ہے جس میں عورت کی طرف سے مرد سے اظہار محبت ہے۔ لیکن مِلّی نغمہ کا موضوع بالکل الگ ہے یہ قوم وملت کے ساتھ اظہار محبت و یکجہتی کا لفظی اظہار ہے۔

دوسری اہم بات یہ کہ مِلّی نغمہ خالص اردو کی صنف سخن ہے یہ نہ تو کسی زبان سے آئی ہے اور نہ کسی مخصوص زمانے سے متعلق ہے بلکہ یہ ہر دور کی مقبول صنف سخن ہے ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس کو "مِلّی نغمہ" کا نام قیام پاکستان کے بعد ملا۔ پہلے کسی اور نام یعنی "جنگ نامہ"، "رزمیہ شاعری" یا "حماسہ" وغیرہ سے پکاری جاتی رہیں۔ بعض اوقات قصیدہ، مرثیہ اور شہر آشوب میں قومی و مِلّی اظہار پایا جاتا ہے۔ لیکن اگر ان تمام حب الوطنی اور مِلّی جذبات پر مبنی شاعری کو "مِلّی نغمہ" کی صنف کے طور پر لیں تو کچھ برا نہ ہو گا اور اس کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہو گا۔

مِلّی نغمہ کو اردو کی سب سے مقبول اور اہم صنف سخن غزل کے برابر مقام دیا جا سکتا ہے کیونکہ اردو غزل بھی نشیب و فراز سے گزرنے کے باوجود اردو شاعری میں مقبول اور اہم صنف سخن سمجھی جاتی ہے تقریباً تمام شعرائے اردو نے (چاہے ان کا تعلق کسی خاص صنف یا دور سے ہو) منہ کا ذائقہ بدلنے کی خاطر ہی سہی اس میں اپنا حصہ ضرور ڈالا ہے۔ یہی حال مِلّی نغمہ کا بھی ہے کیونکہ اللہ نے مٹی سے محبت انسان کے خون میں شامل کر رکھی ہے۔ مٹی کے ساتھ دین بھی شامل ہو جائے تو اس موضوع پر انمول شعر پاروں کا تخلیق ہونا قدرتی امر ہے۔

## (ج) ملّی نغمہ اور پاکستان.... خصوصی تعلق

ہندو رہنماؤں کا خیال تھا کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کی ملکیت ہے اور وہ اس سرزمین میں کسی اور مذہب یا قوم کا حق تسلیم کرنے سے مسلسل انکاری رہے۔ بفضلِ خدا پاکستان کے وجود کا ظہور تو ہو گیا لیکن اس کے قیام کے بعد بھی ہندو ذہنیت نے اس کو تسلیم نہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ موقع ملتے ہی اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا اور اب تک پاکستانی اور بھارتی فوجوں کا چار دفعہ کھلے میدان جنگ میں آمنا سامنا ہو چکا ہے لیکن ان کی فوج ہمارے بہادر جوانوں کے سامنے ٹھہرنے سے قاصر رہی ہے۔ پاکستانی فوج کے اندر ایمان کی طاقت، جذبہ حب الوطنی، خلوص نیت اور توکل علی اللہ ایسے بنیادی عناصر ہیں کہ مخالف فوج کثیر تعداد اور بھاری سامان کے ساتھ بھی ہمارے ان مجاہدین کا مقابلہ نہ کر سکی۔ اسلام کے نام پر قائم ہونے والے ہمارے پیارے ملک پر جب بھی کوئی مشکل وقت آیا تو نہ صرف فوج بلکہ پوری پاکستانی قوم جذبہ حریت سے سرشار ہو کر میدانِ عمل میں آگئی۔ قوم کے ہر بہادر سپوت نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر اس جنگ میں حصہ لیا اور پاکستانی قوم بلکہ پورا عالم اسلام افواجِ پاکستان کے ساتھ تعاون میں امڈ آیا۔ یوں ایک طرف تو دشمن کے دانت کھٹے کرنے کا موقع ملتا اور دوسری طرف ملت اسلامیہ تمام ناچاکیوں کو بھلا کر متحد ہو جاتی جس کو دیکھتے ہی دشمن کے پاؤں اکھڑ جاتے۔

ملک و ملت پر ایسے مشکل وقت میں ہمارے ادبا اور شعرا بھی کیسے سکون سے رہتے۔ خاص کر ہمارے شعرا قومی امنگوں کو اجاگر کرنے اور قوم میں جذبہ حریت تیز کرنے کی غرض سے میدان میں آتے اور ایسے ملّی نغمے تخلیق کرتے کہ ہر آنکھ اشکبار ہو جاتی اور بچے، بوڑھے، جوان، اور عورتوں سمیت ہر پاکستانی کی یہ خواہش ہوتی کہ دشمن کے خلاف جنگ میں اپنی فوج کے شانہ بشانہ لڑے۔ ان مواقع پر نہ صرف شعرا بلکہ گلوگار اور موسیقار حضرات نے بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے۔

قیام پاکستان سے پہلے "پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ" ایسے خوبصورت ملّی نغمے تھے جس نے نہ صرف پاکستان بننے کی وجوہات بیان کر دیں بلکہ اس کا نصب العین بھی واضح کر دیا مزید یہ کہ ملّی نغموں نے پاکستان کے مخالف عناصر کے دل میں خوف بھی پیدا کرتے ہوئے اپنی بہتر ساکھ قائم کی۔

قیام پاکستان کے بعد پاکستان کا پہلا جنگی معرکہ ۱۹۴۸ء میں کشمیر کا میدان تھا۔ کشمیری مجاہدین نے بھارتی فوجیوں سے اپنا حق چھیننے کے لیے ہتھیار اٹھا لیے۔ اس معرکہ کے پس منظر اور پیش منظر حالات و واقعات کو

شعرا نے اپنے الفاظ میں قلم بند کیا ہے۔ کشمیر اردو شاعری کا ایک ایسا موضوع ہے جس میں ابھی تک شعرا کے قلم نہیں رکے اور ان شاءاللہ کشمیر کی پاکستان میں شمولیت تک یہ قلم رکیں گے بھی نہیں کیونکہ شعرا ان قلموں سے تلواروں کا کام لے رہے ہیں اور کشمیر کی آزادی تک یہ جنگ جاری رہے گی۔

دوسرا اہم جنگی معرکہ ۱۹۶۵ء کا ہے جس میں بھارتی فوج نے لاہور اور سیالکوٹ پر قبضہ کا منصوبہ بنا کر حملہ کر دیا لیکن ہماری پوری پاکستانی قوم نے متحد ہو کر بھارت کا یہ منصوبہ ناکام بنا دیا اور اس کو بھاری جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ معرکہ ایک ایسی جنگ تھی جو نہ صرف دو ملکوں بلکہ دو مذاہب کا امتحان ثابت ہوئی۔ جس میں ملت اسلامیہ متحد ہو کر دشمن کو شکست دینے پہ آمادہ ہو گئی۔ اس جنگ میں اسلامی ممالک کے اتحاد و اتفاق میں جتنا اہم کردار اردو شعرا نے ادا کیا وہ عالمی سطح پر ایک مثال ہے۔ برصغیر کی تاریخ میں ایسی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔ اس جنگ کے دوران اور بعد میں جتنی کثرت سے قومی و مِلّی شاعری کی گئی اتنی تعداد قیام پاکستان سے پہلے یا بعد میں نہیں کی گئی۔ بقول ساجد امجد "پاک و بھارت جنگ (۱۹۶۵ء) میں اس قافلے میں اتنی بڑی تعداد میں شعرا شریک ہوئے کہ معلوم ہوتا تھا خطہ پاک بازار عکاز ہے کہ جہاں ہر اہل زباں اہلیت شعر بھی رکھتا ہے "(۱۱۳) پاک فوج کی شجاعت، بہادری، اور جرأت کو شعرا نے شعری اسلوب کا جامہ پہنایا، موسیقار نے دھنیں بنائیں اور گلوکاروں نے ایسے درد سے گایا کہ ہر آنکھ نم ہو جاتی۔ سخت سے سخت دل بھی پگھل کر موم ہو جاتا۔ یہ ایک ایسا مقام تھا جس میں شعری سطح پر جذبہ قومیت کے اشتراک سے قومی شاعری کو ایک الگ صنف کے طور پر متعارف کروانے کا موقع ملا۔ ان میں جمیل الدین عالی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، احسان دانش، رئیس امروہی، منیر نیازی، احمد ندیم قاسمی، بشیر فاروق، سید ضمیر جعفری اور صبا اکبر آبادی جیسے شعرا قابل ذکر ہیں۔

۱۹۶۵ء کے بعد ۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ کے موقع پر بھی شعرا نے اس واقعے کو درد بھرے لفظوں میں ڈھالا۔ سیاچین، کارگل سمیت تمام معرکے قومی و مِلّی شاعری کا موضوع رہے ہیں حتیٰ کہ موجود دور میں ہونے والی اندرونی خلفشار اور اس کے نتیجے میں ہونے والے سانحات کو شعرا نے مِلّی نغموں کا حصہ بنایا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مِلّی نغمہ اردو کی ایک ایسی صنف ہے جس کا تعلق خاص کر پاکستان سے ہے اور یہ پاکستان کی ترقی و خوشحالی اور تحفظ پاکستان میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔

## حوالہ جات وحواشی


۱۔ثاقب،ذاکر حسین لکھنوی۔دیوان ثاقب۔لکھنؤ:نظامی پریس،۱۹۳۶ء۔ص۱۸۱

۲۔احمد رضا خان بریلوی ،مولانا۔مترجم ؛کنزالایمان فی ترجمة القرآن۔لاہور: پاک کمپنی، ۲۰۰۱ء۔ ص۴۸۸

۳۔بحوالہ مظفر عباس،ڈاکٹر۔اردو میں قومی شاعری۔لاہور: گوہر پبلشرز،س ن۔ص۲۰

۴۔انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا۔امریکہ:۲۰۰۶ء،ص۱۳۳۰

۵۔آکسفورڈ انگلش ڈکشنری۔لندن:آکسفورڈ پریس۔۲۰۰۱ء۔ص۱۳۱۱

۶۔اسٹالن۔قوم اور قومیت۔لاہور:مکتبۂ فکرودانش۔س-ن۔ص۱۳

۷۔جیلانی کامران۔قومیت کی تشکیل اور اردو زبان۔ اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء۔ ص۱۱

۸۔ا نسائیکلو پیڈیا برٹانیکا۔جلد۱۶،۱۹۷۰ء۔ص۶۱

۹۔ابوالفتح عزیزی،مولانا۔مؤلف؛مفتاح اللغات۔کراچی: محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب،س ن۔ص۶۷۷

۱۰۔وحیدالزماں کیرانوی،مولانا۔مؤلف؛القاموس الجدید۔دہلی:مکتبہ اشاعت القرآن،۱۹۷۹ء۔ص۶۰۱

۱۱۔احمد دہلوی،سید۔مؤلف؛فرہنگ آصفیہ، جلد سوم۔لاہور:اردوسائنس بورڈ،۲۰۱۰ء۔ص۴۰۲

۱۲۔فیروزالدین،مولوی۔مؤلف؛فیروز اللغات( اردو)۔لاہور:فیروز سنز،۲۰۱۲ء۔ص۱۰۲۴

۱۳۔جمیل جالبی،ڈاکٹر۔مؤلف؛قومی انگریزی اردو لغت۔اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۲۰۰۲ء۔ ص۱۲۰۶

۱۴۔ایوب صابر،ڈاکٹر۔تصور پاکستان۔اسلام آباد:نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۰۴ء۔ص۴۵۔۴۶

۱۵۔اسٹالن۔قوم اور قومیت۔ص۱۵۔۱۶

۱۶۔اقبال،علامہ۔کلیات اقبال اردو۔اسلام آباد:نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۱۷ء۔ص۱۶۷

۱۷۔ایوب صابر،ڈاکٹر۔تصور پاکستان۔ص۴۷

۱۸۔قرآن مجید۔۴۹:۱۰

۱۹۔ قاسم محمود،سید۔شاہکار اسلامی انسائیکلو پیڈیا، جلد دوم۔لاہور:الفیصل ناشران، ۲۰۱۳ء۔ص۱۳۴۶۔۱۳۴۷

۲۰۔خالد علوی،ڈاکٹر۔نظریۂ پاکستان۔اسلام آباد:دعوت اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی،۲۰۱۵ء۔ ص۲۱

۲۱۔خلیفہ عبدالحکیم۔وحدتِ ملّی۔مشمولہ،مقالاتِ حکیم،جلد سوم۔(مرتبہ شاہد حسین رزاقی)۔ لاہور:ادارہ ثقافتِ اسلامیہ،۱۹۶۹ء۔ص۳۷

۲۲۔احمد رضا خان بریلوی،مولانا۔مترجم؛ کنزالایمان فی ترجمة القرآن۔ص۱۳۶

۲۳۔ایضاً۔ص۱۳

۲۴۔عبدالقیوم۔اقبال کا تصورِ ختم نبوت۔مشمولہ، اقبالیات کے سو سال....منتخب مضامین۔(مرتبین؛رفیع الدین ہاشمی، محمد سہیل عمر،وحید عشرت)۔لاہور:اقبال اکادمی،۲۰۱۲ء۔ص۴۵۴

۲۵۔محمد عثمان۔فکرِ اسلامی کی تشکیل نو۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۱ء۔ص۱۲۷

۲۶۔احمد رضا خان بریلوی،مولانا۔مترجم؛ کنزالایمان فی ترجمة القرآن۔ص۳۱۵

۲۷۔حافظ محمد جوناگڑھی۔مترجم؛تفسیر ابن کثیر، جلد دوم۔لاہور:مکتبہ قدوسیہ۲۰۰۶ء۔ص۶۰۳

۲۸۔محمد عثمان۔فکرِ اسلامی کی تشکیل نو۔ص۱۲۸

۲۹۔احمد رضا خان بریلوی،مولانا۔مترجم؛ کنزالایمان فی ترجمة القرآن۔ص۱۲۹

۳۰۔ایضاً۔ص۵۴۷

۳۱۔محمد عثمان۔فکرِ اسلامی کی تشکیل نو۔ص۴۴

۳۲۔ عبدالقیوم۔اقبال کا تصورِ ختم نبوت۔مشمولہ، اقبالیات کے سو سال....منتخب مضامین۔ص۴۳۶

۳۳۔حافظ محمد جوناگڑھی۔مترجم؛تفسیر ابن کثیر، جلد دوم۔ص۶۰۳

۳۴۔احمد رضا خان بریلوی،مولانا۔مترجم؛ کنزالایمان فی ترجمة القرآن۔ص۳۱۷

۳۵۔محمد عثمان۔فکرِ اسلامی کی تشکیل نو۔ص۱۲۹

۳۶۔القرآن۔۲:۲۱۳

۳۷۔فیروزالدین، مولوی۔فیروز الغات (اردو )۔ص۱۲۰

۳۸۔خلیفہ عبدالحکیم۔وحدتِ ملّی۔مشمولہ، مقالاتِ حکیم، جلد سوم۔(مرتبہ شاہد حسین رزاقی)۔ ص۳۵

۳۹۔احمد رضاخان بریلوی، مولانا۔مترجم؛ کنزالایمان فی ترجمۃ القرآن۔ص۶۲۱

۴۰۔ایضاً۔ص۷۷

۴۱۔لفظ اسلام، سلم سے ماخوذ ہے جس کے معنی امن و سلامتی اور خیر وعافیت کے ہیں، گویا امن و سلامتی کا معنی اس کے اندر ہی موجود ہے۔لہٰذا اپنے معنی کے اعتبار سے اسلام ایک ایسا دین ہے جو خود بھی سراپا سلامتی ہے اور دوسروں کو بھی امن و سلامتی، محبت ورواداری، اعتدال وتوازن اور صبر و تحمل کی تعلیم دیتا ہے۔

طاہر القادری، ڈاکٹر۔دہشت گردی اور فتنہ خوارج۔لاہور: منہاج القرآن پبلیکیشنز، ۲۰۱۲ء۔ ص۴۳۔۴۴

۴۲۔مودودی، ابوالاعلیٰ۔مسئلہ قومیت۔جمال پور: مکتبہ جماعت اسلامی، ۱۹۶۷ء۔ص۲۰

۴۳۔احمد رضاخان بریلوی، مولانا۔مترجم؛ کنزالایمان فی ترجمۃ القرآن۔ص۱۲۰

۴۴۔یورپ کے ممالک اور امریکہ جن کی بنیاد ملکی وطنی قومیت پر پڑی اور یہ خود کو معاشرہ کی آزادی کے سب سے بڑے علمبردار سمجھتے ہیں لیکن حقیقی معنوں میں انسانیت کی سب سے بڑی تضحیک بھی ان ممالک میں ہوتی ہے۔

۴۵۔ایڈورڈ سعید۔ثقافت اور سامراج۔(مترجمہ یاسر جواد)۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۹ء۔ ص۲۱

۴۶۔عابد حسین، سید۔قومی تہذیب کا مسئلہ۔علی گڑھ: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۵۵ء۔ص۱۲۵

۴۷۔کشفی، ڈاکٹر سید ابوالخیر۔اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر۔کراچی: ادبی پبلشرز، ۱۹۷۵ء۔ص۳۵۳

۴۸۔اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر سید۔برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ۔(مترجمہ بلال احمد زبیری)۔کراچی: شعبہ تصنیف وتالیف جامعہ کراچی: ۱۹۶۷ء۔ص۲۴۶

۴۹۔اکرم، شیخ محمد۔موجِ کوثر۔طبع دوم، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۶۶ء۔ص۴۲۔۴۳

۵۰۔ جیلانی کامران۔قومیت کی تشکیل اور اردو زبان۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء۔ ص ۴۰

۵۱۔ بحوالہ ایضاً۔ ص ۴۰

۵۲۔ نہرو، جواہر لعل۔میری کہانی ،جلد دوم۔دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۵۰ء۔ ص ۳۳۲

۵۳۔ اشتیاق حسین قریشی ،ڈاکٹر سید۔نظریۂ پاکستان کے تاریخی،سیاسی اور معاشرتی پہلو۔لاہور: نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن۔ ۱۹۹۹ء، ص ۱۲

۵۴۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر۔اسلام اور پاکستانی تشخص۔(مترجمہ سید قاسم محمود)۔لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۱۲ء۔ ص ۳۱۱

۵۵۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر۔اسلام اور پاکستانی تشخص۔ص ۳۱۳

۵۶۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر۔ مرتب؛شذرات فکر اقبال۔(مترجمہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی)۔لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۳ء۔ ص ۵۴

۵۷۔ بحوالہ ڈاکٹر جاوید اقبال۔اسلام اور پاکستانی تشخص۔ص ۳۱۴

۵۸۔ ایضاً۔ ص ۳۱۴

۵۹۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر۔اسلام اور پاکستانی تشخص۔ص ۳۱۵

۶۰۔ ترمذی۔ ۱۹۲۷ء۔ ص ۶۷۰۷

۶۱۔ نہرو، جواہر لعل۔میری کہانی، جلد دوم۔ص ۱۶۷

۶۲۔ بحوالہ جاوید اقبال، ڈاکٹر،اسلام اور پاکستانی تشخص۔ص ۳۱۶

۶۳۔ اس حدیث کا کوئی مستند حوالہ نہیں ملتا اس لیے اکثر علما نے اس حدیث کو ماننے سے انکار کیا ہے۔ بلکہ اس کو ایک روایت تسلیم کیا ہے۔

۶۴۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر۔ مرتب؛شذرات فکر اقبال۔(مترجمہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی)۔ ص ۵۴۔۵۵

۶۵۔ بحوالہ ایضاً۔ ص ۵۵

۶۶۔ ایوب صابر، ڈاکٹر۔تصور پاکستان۔ص ۳۶۹

۶۷۔اقبال،علامہ۔مقالات اقبال۔(مرتبہ سید عبدالواحد معینی)۔لاہور: آئینہ ادب،۱۹۸۸ء، ص۲۶۲

۶۸۔اقبال نے قطعہ کا نام 'حسین احمد' لکھا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں، ورنہ

ز دیو بند حسین احمد! ایں چہ بوالعجبی است

سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است

چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر بہ او نرسیدی ، تمام بولہبی است

۶۹۔ایوب صابر،ڈاکٹر۔تصور پاکستان۔ص۳۶۹

۷۰۔بحوالہ جاوید اقبال،ڈاکٹر۔مرتبہ؛شذرات فکر اقبال۔(مترجمہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی)۔ص۵۵

۷۱۔جیلانی کامران۔قومیت کی تشکیل اور اردو زبان۔ص۱۲۵

۷۲۔اقبال نیشنلسٹ علما کی وطنی قومیت کے بارے لکھتے ہیں:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیرہن اس کا ہے، وہ ملت کا کفن ہے

۷۳۔بحوالہ احمد عقیل روبی۔علم و دانش کے معمار۔اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۱۵ء۔ص۷۹

۷۴۔شاہد دہلوی،سید۔مؤلف؛فرہنگ آصفیہ، جلد سوم۔لاہور:اردو سائنس بورڈ،۲۰۱۰ء۔ص۲۴۹

۷۵۔جمیل جالبی، ڈاکٹر۔مشمولہ،بوطیقا۔از ارسطو۔(مترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی)۔اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۱۲ء۔ص۱۵

۷۶۔ارسطو۔بوطیقا۔(مترجمہ جمیل جالبی)۔ص۳۴۔۳۵

۷۷۔ایضاً۔ص۴۷

۷۸۔بحوالہ احمد عقیل روبی۔علم و دانش کے معمار۔ص۸۴

۷۹۔جاوید اقبال،ڈاکٹر۔مرتبہ؛شذرات فکر اقبال۔(مترجمہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی)۔ص۱۵۹

۸۰۔ ذوالفقار،ڈاکٹر غلام حسین۔ اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پسِ منظر۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء۔ ص۹

۸۱۔ ادیب، مسعود حسن رضوی۔ہماری شاعری..... معیار و مسائل۔اسلام آباد:پورب اکادمی، ۲۰۱۵ء۔ ص۲۹

۸۲۔ ذوالفقار،ڈاکٹر غلام حسین۔ اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پسِ منظر۔ص۹

۸۳۔ حالی،الطاف حسین۔مقدمہ شعرو شاعری۔لاہور:پاپولر پبلشنگ ہاؤس،۱۹۸۴ء۔ ص۳۷

۸۴۔ ادیب، مسعود حسن رضوی۔ ہماری شاعری..... معیار و مسائل۔ص۲۳

۸۵۔ بحوالہ حالی،الطاف حسین۔مقدمہ شعرو شاعری۔ص۴۸

۸۶۔ ادیب، مسعود حسن رضوی۔ ہماری شاعری..... معیار و مسائل۔ص۲۴

۸۷۔ ایضاً۔ص۲۲

۸۸۔ مظفر عباس،ڈاکٹر۔ اردو میں قومی شاعری۔ص۲۱۔۲۲

۸۹۔ طاہرہ نیّر،ڈاکٹر۔اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار۔کراچی: انجمن ترقی اردو،۱۹۹۹ء۔ ص۵۴

۹۰۔ کوثر،ڈاکٹر انعام الحق۔اردو قومی شاعری۔مشمولہ،قلم قبیلہ(سہ ماہی)۔کوئٹہ: جلد۳،شمارہ۱، جنوری تامارچ ۱۹۹۳ء۔ ص۳۳

۹۱۔ حالی،الطاف حسین۔مقدمہ شعرو شاعری۔ص۴۲

۹۲۔ سید صباح الدین عبد الرحمن لکھتے ہیں "امیر خسرو اپنی مثنوی ُدر صفت دہلیٔ میں اپنے وطن دہلی کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ اس کے دین و انصاف کی شہرت ہر طرف پھیلی ہوئی ہے یہ عدن کی جنت ہے ، اپنی صفات اور خصوصیات کے لحاظ سے باغ ارم ہے، ایک راسخ مسلمان ہونے کے باوجود اس شہر کی محبت میں اس کو مکہ اور مدینہ پر ترجیح دی ہے۔ دہلی کی تعریف میں لکھتے ہیں:

چرخ بہ زیر ست و حصارش بہ زبر

(آسمان کا دائرہ نیچے رہ گیا اور اس قلعے کی دیوار اوپر)

سید صباح الدین عبدالرحمن۔وطن اور حبِ وطن ۔مشمولہ،خسرو شناسی۔مرتبین:ظ۔انصاری،
ابوالفیض سحر۔ نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان،۲۰۱۰ء۔ص۸۰
۹۳۔ذوالفقار،ڈاکٹرغلام حسین۔اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر۔ص۹
۹۴۔گیان چند،ڈاکٹر۔ادبی اصناف۔گاندھی نگر:گجرات اردواکادمی،۱۹۸۹ء۔ص۲۲
۹۵۔حفیظ،ابوالاعجاز صدیقی۔ اصناف ادب۔لاہور:سنگت پبلشرز،۲۰۱۶ء۔ص۲
۹۶۔رفیع الدین ہاشمی،ڈاکٹر۔اصنافِ ادب۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء۔ص۱۱۔۱۲
۹۷۔قیصر جہاں،ڈاکٹر۔اردو گیت۔نئی دہلی:مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،۱۹۷۷ء۔ص۱۳
۹۸۔اردو لغت(تاریخی اصولوں پر)،جلد۱۸۔کراچی:اردولغت بورڈ،۲۰۰۷ء۔ص۶۶۶
۹۹۔ایضاً۔جلد۲۰۔ص۱۷۳
۱۰۰۔ایضاً۔جلد۱۸۔ص۶۶۷
۱۰۱۔گیان چند،ڈاکٹر۔ادبی اصناف۔ص۹۰۔۹۱
۱۰۲۔اشرف کمال،ڈاکٹر۔تاریخ اصناف نظم و نثر۔کراچی:سٹی بک پوائنٹ،۲۰۱۷ء۔ص۱۲۱
۱۰۳۔حفیظ،ابوالاعجاز صدیقی۔کشاف تنقیدی اصطلاحات ۔اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۱۹۸۵ء۔
ص۱۵۲
۱۰۴۔وزیر آغا،ڈاکٹر۔اردو شاعری کا مزاج۔لاہور:مجلس ترقی ادب،۲۰۱۶ء۔ص۱۴۸
۱۰۵۔شمیم احمد۔اصناف سخن اور شعری ہیئتیں۔بھوپال:انڈیا بک امپوریم،۱۹۸۱ء۔ص۱۰۱۔۱۰۲
۱۰۶۔ایضاً۔ص۱۰۲
۱۰۷۔وزیر آغا،ڈاکٹر۔اردو شاعری کا مزاج۔ص۱۵۱
۱۰۸۔شمیم احمد۔اصناف سخن اور شعری ہیئتیں۔ص۴۳
۱۰۹۔حفیظ،ابوالاعجاز صدیقی۔کشاف تنقیدی اصطلاحات۔ص۱۴۱
۱۱۰۔حالی،مولاناالطاف حسین۔مقدمہ شعرو شاعری۔ص۱۹۱
۱۱۱۔گیان چند،ڈاکٹر۔ادبی اصناف۔ص۱۰۸۔۱۰۹

۱۱۲۔ حفیظ، ابوالاعجاز صدیقی۔ اصناف ادب۔ ص۲۲۹

۱۱۳۔ ساجد امجد، ڈاکٹر۔ اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات۔ لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔ ص۴۶۸

باب دوّم　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　صفحہ نمبر

## (الف) عالمی ادب میں قومی شاعری

انسان کی ابتداء سے لے کر موجودہ مادہ پرستی کے دور تک کا جائزہ لیا جائے تو ہر قوم و نسل و قبیلے اور مذہب میں قومی شاعری پائی جاتی ہے۔ تمام قبائل و اقوام میں جنگ و جدل ہوتا رہا ہے۔ دوسرے انسان یا قبیلے و قوم کو مات دینے کے لیے اور اپنی فتح و سربلندی ظاہر کرنے کے لیے قوموں نے جنگ کے علاوہ کچھ ایسے اقدامات کا سہارا لینا شروع کیا جس سے نہ صرف ان کی سالمیت قائم رہ سکتی تھی بلکہ ان کے عزائم اور اس کی قوم کے ارادوں میں بھی پختگی کا سبب بن سکتے تھے۔ ان اقدامات میں ایک اہم قدم قومی شاعری ہے۔ شاعری ایک ایسا فعل ہے جس میں داخلیت اور خارجیت دونوں پہلو کار فرما ہیں۔ شاعری انسانی جذبات کے اظہار کے ساتھ قوموں کا سرمایہ بھی ہے اور اچھی شاعری نے کئی اقوام کی کایا پلٹ دی۔ قومی شاعری کا تعلق صرف ان موضوعات کے ساتھ ہے جو صرف قوم کے ساتھ وابستہ ہوں۔

عالمی ادب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کا ہر ادب سماجی و تہذیبی عمل کا پروردہ ہے۔ شاعری بھی سماج و تہذیب کے خیالات و جذبات کا عکس ہے۔ تہذیب اور ادب کی ترقی اکثر بالواسطہ رہی ہے۔ ہر قوم میں چند شعرا ایسے بھی رہے ہیں جنھوں نے اس قوم کی حقیقی معنوں میں ترجمانی کی اور ایسا ادب تخلیق کیا جو لاثانی و ابدی ہو گیا ایسی شاعری نے قوم کو سنوارا بھی اور قوم نے دوسری قوموں پر فتح بھی حاصل کی۔ ایسے شعرا اور شاعری قوم کے لیے افتخار کا باعث بنیں۔ چونکہ قومی شاعری سے جذبہ حب الوطنی میں اضافہ ہوتا ہے لہٰذا ایسے شاعر اور شاعری قوم کا ورثہ ٹھہرے۔

قومی جذبات کو شعری صورت میں بیان کرنے کے لیے کئی اصناف کا سہارا لیا جاتا اور بعض اوقات کسی بھی صنف سخن میں اظہار کے ساتھ قومی شاعری یا قومی رجحان شامل ہو جاتا۔ جیسے قصیدہ، مثنوی، یا مرثیہ یا رزم نامہ لکھتے وقت اپنی قوم و ملک کی تعریف اور حوصلہ افزائی کو اس انداز میں بیان کیا جاتا جس کو موجودہ دور کی قومی شاعری کہہ سکتے ہیں البتہ قدیم دور میں ان قومی جذبات کو بیان کرنے کے لیے الگ سے کوئی صنف سخن میسر نظر نہیں آتی۔

عالمی ادب میں قومی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ قدیم ادب میں قومی شاعری اور جدید ادب میں قومی شاعری۔ قوم و ملک سے محبت کے اظہار میں تمام ملکی و قومی مسائل، سالمیت، بقا، سربلندی اور تحفظ وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جن پہ قلم اٹھانا اپنی قوم و ملت اور اپنے وطن سے خاص لگاؤ کا اظہار کرتا ہے۔ یہ خصوصیت کسی ایک قوم، ملک یا ملت میں نہیں پائی جاتی بلکہ تمام انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے ودیعت کی ہے۔ اس ضمن

میں جو شاعری کی جائے اسے کو قومی وملّی شاعری کہا جاتا ہے۔ قومی وملّی شاعری ایک ایسا آفاقی موضوع ہے جس پر دنیا کی ہر زبان وادب میں اظہار ملتا ہے۔

## قدیم ادب میں قومی شاعری:

قومی شاعری کے آغاز میں قوم کے بہادر سپوتوں کے کارناموں کو گیتوں یا چند اچھے الفاظ کی صورت میں اچھے طریقے سے بیان کیا جاتا رہا۔ خاص طور پر کسی جنگ میں اعلیٰ کارکردگی کا عملی ثبوت پیش کرنے والوں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ان الفاظ کا سہارا لیا جاتا جن کو عرف عام میں قومی شاعری کہا جاتا ہے۔ یہ قومی شاعری جنگ سے پہلے یا جنگ کے دوران بھی افواج کا حوصلہ بلند کرتی۔ اس کے علاوہ بادشاہ وامرا کی تسکین قلبی کے لیے عوامی اجتماعات پر بادشاہ وامراءاور بہادر سپوتوں کے لیے کارنامے اس طرح بیان کیے جاتے کہ جس سے قوم میں فخر وانبساط کے جذبات کے رحجان میں اضافہ ہو۔ موجودہ دور کے برعکس اس قومی رحجان کے عالمی منظر نامے میں دنیا کی جس تہذیب کو قدیم ترین تسلیم کیا گیا ہے وہ "سومیری تہذیب" کہلاتی ہے جس میں دنیا کے سب سے قدیم تحریری ادب کی نشاندہی ہوئی ہے بقول ابن حنیف " جہاں تک تحریری قدامت کا سوال ہے تو سومیریوں نے یہی رزمیہ ادب دنیا میں سب سے پہلے تحریر بھی کیا"(۱) سومیری تہذیب آج سے تین ہزار سے پانچ ہزار سال قبل مسیح پر مشتمل ہے اور یہ موجودہ جنوبی عراق میں واقع تھی اور کھدائی کے دوران قدیم کھنڈرات سے جو نمونے بر آمد ہوئے ہیں ان میں سومیری قوم کے کارناموں پر مشتمل منظوم ادب بر آمد ہوا ہے۔ گلگاش کی داستان پر مشتمل نظم The Hittite کو قدیم ترین رزمیہ نظم قرار دیا گیا ہے۔ (۲)رزمیہ نظموں کے علاوہ دیوتاؤں کی تعریف اور بادشاہ کی تعریف پر مبنی منظوم ادب موجود ہے جو قومی شاعری کی قدیم ترین صورت میں اولیت کا درجہ رکھتا ہے۔

سومیری ادب کے بعد یونانی ادب کو فوقیت حاصل ہے۔ یونانی ادب میں بھی قومی شاعری رزمیہ ادب کی صورت میں ملتی ہے۔ کیوں کہ قدیم دور زیادہ تر جنگوں پر مشتمل تھا اور ہر قوم کے شعرا اپنے جنگی کارناموں کو ہی قومی شاعری کی صورت میں بیان کرتے تھے۔ یونانی ادب میں ہومر کو قدیم شاعر تسلیم کیا جاتا ہے جن کی نظموں کی بدولت اہل یونان نے فتح حاصل کی۔ ہومر کی نظموں میں ایلیڈ اور اوڈیسی کا شمار قدیم اور قومی نظموں میں کیا جاتا ہے۔ ایلیڈ کی نظم میں ہومر نے ایک جنگ کے واقعات وحالات کا منظر پیش کیا ہے۔ اس میں انھوں نے جنگ اپنی اور مخالف فوج کے بہادروں کی جوانمردی کو بیان کیا ہے۔ وہ،ہیکٹر کی جوانمردی کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"Hector at bay stands like a brave lion
surrounded by yelping hounds and exited

neither hunters but himself confused nor afraid." (3)

ہومر کی دوسری بڑی نظم اوڈیسی بھی رزمیہ قومی شاعری کا شاہکار ہے جس کو محمد سلیم الرحمان نے اردو میں منتقل کیا۔ ہومر کے بعد آنے والے شعرانے بھی قومی شاعری کو جاری رکھا جن کا وجود موجودہ زمانے میں ناپید ہے۔

یونانی ادب کی طرح لاطینی رزمیہ ادب میں قومی شاعری کی مشہور داستان "ورجل(Virgil )" کی اینیڈ (Aeneid)ہے۔ اس نظم کی کہانی کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے جہاں ہومر کی ایلیڈ کا اختتام ہوتا ہے۔(۴)اس نظم کا ہیرو اٹلی اور رومن قوم کا آقااور بادشاہ بن جاتا ہے جس میں وہ ایک نئی دنیا آباد کرتا ہے۔ لاطینی ادب کی دوسری مثال گوئٹے کی "فاوسٹ" ہے جو رزمیہ ادب کے ساتھ قومی حمیت کی عمدہ مثال ہے۔

سنسکرت ادب دنیاکے قدیم ادب میں شمار ہوتا ہے۔ ہندوستانی تہذیب قدیم ترین تہذیبوں میں شامل ہونے کے باوجود یہ ہمیشہ بیرونی حملہ آوروں کی آماج گاہ رہی ہے۔ آریاؤں کے ہندوستان آمد کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ہندوستان کی قدیم تہذیبیں یعنی وادی سندھ کے کنارے آباد موہنجودڑو اور ہڑپہ جیسی تہذیبیں اپنے دور کے لحاظ سے بہترین تہذیبوں میں شمار ہوتی ہیں لیکن زمانے کے جبر و تشدد کا شکار ہو کر ختم ہو گئیں۔ رامائن اور مہابھارت ہندوستانی سرزمین اور زبان کی شاہکار تصنیفات ہیں جو ہندو مذہب کے ساتھ قدیم ہندوستان کی تہذیب و ثقافت اور سماج کا عکس ہیں اور بقول قاسم یعقوب "ہندی ادب کی مشہور نظمیں رامائن اور مہابھارت اس دور کے واحد تاریخی مآخذ ہیں جو بیک وقت مذہبی تعلیمات کے ساتھ ساتھ تاریخ کے چھپے گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں"(۵)ہندوستان کی تاریخ میں یہ دو نظمیں مذہبی، سیاسی، ثقافتی اور قومی لحاظ سے قدیم اہم ورثہ کی اہمیت رکھتی ہیں۔ اسی اہمیت کے پیش نظر ان نظموں کے کئی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ مہابھارت اپنی طوالت کے سبب بھی خاصی شہرت رکھتی ہے۔ کیوں کہ بقول نعیم احسن "یہ غالباً دنیاکے ادب میں اکیلی طویل ترین نظم ہے جو اسی قبیل کی دوسری دو داستانوں اوڈیسی اور اے لیڈ دونوں کو یکجا کرنے کے بعد بھی ان سے آٹھ گنا بڑی ہے" (۶) اس کی طوالت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ اٹھارہ کتابوں پر مشتمل ہے اور اس میں دولاکھ بائیس ہزار مصرعے ہیں۔

جرمنی کا شمار بھی قدیم ممالک میں ہوتا ہے جو یورپ کا اہم اور بڑا ملک ہونے کے ساتھ ساتھ علم و ہنر، دولت اور صنعت و حرفت کے لحاظ سے پوری دنیامیں مشہور ہے۔ قدیم ادب میں جرمنی ادب کا شمار بھی کیا جاتا ہے جس کا بیشتر حصہ رزمیہ یا قومی شاعری پر مشتمل ہے۔ قدیم جرمنی ادب میں نبیلنگ انلائیڈ(The Nibelung

(Enlied) اور گدرن (Gudrun) مشہور اور رزمیہ نظمیں ہیں ان میں نبیلنگ انلائیڈ چودھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی اور بقول منظور طاہر "یہ نظم اپنے دور کے تہذیب و ثقافت اور رسوم وروایات کی بھرپور تصویر کشی کرتی ہے"(۷) اسی طرح گورن تیرھویں صدی میں لکھی گئی ایک رزمیہ داستان ہے جس میں گورن ایک لڑکی کا کردار ہے جس کے گرد پوری کہانی گھومتی ہے۔

واسکوڈے گاما یورپی سرزمین کی ایک مشہور شخصیت کے ساتھ اہم اور قومی ہیرو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جدید یورپ کی ترقی میں واسکوڈے گاما کی سیاحت کا کافی عمل دخل ہے۔ واسکوڈے گامانے پورے یورپ کے لیے ہندوستان کا آسان بحری راستہ تلاش کر کے ایک نئی دنیا میں تجارت و سیاحت کے دروازے کھول دیے۔ انھی راستوں نے آنے والے وقتوں میں برصغیر پاک وہند کے تاج کا سہرا ابھی تاج برطانیہ کے سر رکھا۔ واسکوڈے گاما کی ہندوستان کے بحری راستے کی دریافت نے دنیا کے کئی ممالک کی تقدیر بدل دی جن میں پرتگال بھی شامل ہے۔ جو جنوبی یورپ میں واقع ہے اور منظور طاہر کے بقول "واسکوڈے گامانے ہندوستان کے بحری راستے کو تلاش کیا جو پرتگال کی ترقی کا باعث بنا۔ اس دور میں قومی سطح کا ادب تخلیق کیا گیا جس میں اوسلوڈاس (Oslusiadas) رزمیہ ادب کی نمائندگی کرتی ہے"(۸) اس سے پہلے پرتگال کو یورپ میں وہ مقام حاصل نہ تھا جو واسکوڈے گاما نے دلایا۔ اوسلوڈاس میں واسکوڈے گاما کے سفر، کارناموں اور پرتگال کے تاریخی کارناموں کا تذکرہ شامل ہے۔ پرتگال کی طرح یورپ کی دوسری زبانوں جن میں اطالوی ادب میں یروشلم بریٹا (Gerusalemme Liberata) از Torquato Tasso سولہویں صدی کی تخلیق ہے۔ صلیبی جنگوں کے دوران لکھی جانے والی مسیحی قومی رزمیہ داستان ہے۔

بنگالی ادب کی بات کی جائے تو گیان جلی از رابندر ناتھ ٹیگور بنگالی قومی شاعری کا بہترین سرمایہ ہے۔ جبکہ قاضی نذر الاسلام کو بنگلہ دیش کا قومی شاعر کہا جاتا ہے جنھوں نے مسلم نشاۃ ثانیہ کے دور میں قومی نظمیں لکھیں اور فاشنزم کے خلاف تحریک چلوائی۔ ان کا نمایاں کلام قومی گیت، نظر ال گیتی، اور دھرم کیتو و دیگر ہیں۔

اگر ہندوستان کی بات کی جائے تو اس کی قومی شاعری ہندوستان کی تمام زبانوں پر مشتمل ہے۔ جب ہندی ادب کا تذکرہ آتا ہے تو "بندے ماترم" کا خیال ذہن میں آتا ہے، بندے ماترم الگ سے کوئی نظم نہیں ہے۔ یہ دراصل بابو بنکم چندر چیٹرجی کے ناول میں موجود گیت ہیں جو ناول کا ہیرو بھوانند ہندوستان ماتا کو مسلمانوں سے آزادی حاصل کرنے کی خاطر گاتا ہے۔ ناول میں مسلمانوں کی تذلیل کی گئی ہے لیکن ہندو قوم کے لیے اس کی اہمیت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔

دنیا کی باقی زبانوں کے ادب کی طرح پنجابی ادب میں بھی قومی شاعری کا فروغ پانا انوکھی بات نہیں ہے۔ ہر علاقے اور ملک کے رسم و رواج مختلف ہونے کی وجہ سے ادب میں بھی یہ تبدیلی درآتی ہے۔ پنجاب میں وڈیرا شاہی اور جاگیر دارانہ نظام صدیوں سے قائم ہے جس کا اثر مقامی سطح کے ادب پر بھی پڑتا ہے۔ پنجابی میں لوک داستانوں کے ساتھ رزمیہ اور قومی حب الوطنی کی شاعری بھی پروان چڑھتی رہی ہے۔ چونکہ پنجاب کی ثقافت میں وڈیرا شاہی اور جاگیر دارانہ نظام ہونے کی وجہ سے نچلے طبقے کی عوام کو ان کی رعایا سے زیادہ مقام حاصل نہ تھا اور یہ ان وڈیروں، جاگیر داروں کو خوش کرنے کے لیے ان کی شان میں قصے کہانیاں جو شعری، نثری صورت میں ہوتے تھے، عوام میں مقبول ہو جاتے۔ اسی طرح ان وڈیروں کی معرکہ آرائیوں کو بھی شعری صورت میں قلم بند کیا جاتا تھا بقول ساحر تنویر بخاری "پرانے زمانے وچ بہادراں تے سورمیاں دے کارنامے بیان کرن لئی کئی پیشہ ور قوماں مثلاً بھاٹ، ڈوم، مراثی وغیرہ موجود سن، ایہہ لوک کسے زمیدار یا چودھری دے کمین ہوندے سن۔ انہاں دا کم انہاں دیاں پیڑھیاں تے اوہناں دے وڈکیاں دی شوبھا کرنا سی" (۹) یہ پنجاب کی سرزمین کی قدیم روایت تھی لیکن موجودہ دور میں بھی اسے مکمل خارج نہیں کہہ سکتے بلکہ اب بھی جنوبی پنجاب کے دیہاتوں میں ایسا ہو رہا ہے۔ تحریک پاکستان اور قیامِ پاکستان کے بعد پنجابی زبان نے شعری صورت میں قومی و ملّی اظہار کے موتی پروئے ہیں جن میں خاص کر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کا نغمہ "اہیہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے "پوری پاکستانی قوم میں حرفِ زباں بن چکا ہے۔ اس کے علاوہ کئی دیگر پنجابی شعرا نے قومی و ملّی گیت لکھ کر اپنی دھرتی سے یکجہتی کا اظہار کیا ہے۔

انگریزی زبان کو موجود دور کی ترقی یافتہ اور مہذب لوگوں کی زبان کہا جاتا ہے اور یورپی دنیا میں رابطے کی زبان بھی قرار پاتی ہے۔ یہ قدرتی امر ہے کہ کسی بھی قوم کی ترقی کے ساتھ اس کی زبان میں بھی ترقی اور قوم کے عروج کے ساتھ اس کی زبان کو بھی عروج حاصل ہوتا ہے۔ کسی دور میں مسلمانوں کو عسکری، علمی اور ادبی لحاظ سے پوری دنیا پر فوقیت رہی ہے تو ان کی زبان یعنی عربی کو یورپ کے تعلیمی اداروں میں اہم مقام حاصل رہا ہے۔ یورپی جب عرب ممالک میں زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو رہے تھے تو وہ تمام علوم عربی میں تھے۔ عربی کو یورپی زبانوں پر ہر لحاظ سے فوقیت حاصل تھی۔ حالات نے پلٹا کھایا اور مغربی دنیا نے جب دنیا کا اقتدار و کنٹرول سنبھالا تو انگریزوں کی زبان یعنی انگریزی کو عربی سمیت دیگر زبانوں پر برتری حاصل ہو گئی۔

دنیا کے دوسرے زبان و ادب کی طرح انگریزی زبان میں بھی علم و ادب کا ضخیم سرمایہ موجود ہے جس میں قومی شاعری بھی شامل ہے۔ انگریزی کی مشہور قومی نظموں میں دی پری لیوڈ (The Pre Lude) از ولیم

ورڈ ورتھ ۱۸۰۸ء، ڈون جو آن (Don Juan) از گورڈن لارڈ بائیرن ۱۸۲۴ء، سہراب اور رستم (Sohrab and Rustam) از میتھیو آرنلڈ ۱۸۵۳ء اور کینٹوس (Kentos) از عذرا پاؤ نڈ انگریزی زبان و ادب کی اہم نظمیں ہیں جو رزم ناموں کی صورت میں وطنی محبت اور قومیت کی بہترین عکاس ہیں ۔ پیرا ڈائیز لاسٹ (Paradise Lost) از ملٹن انگریزی زبان و ادب کی مقبول نظم ہے بقول قاسم یعقوب "جان ملٹن کی پیراڈائیز لاسٹ (1667ء) سترھویں صدی کی ایک عظیم رزمیہ نظم مربوط اور مکمل خیالات سے مزین ہے۔ پیراڈائیز لاسٹ نہ صرف ملٹن کی بلکہ انگریزی ادب کی شاہکار نظموں میں سے ایک ہے جو روایتی رزمیہ سے مختلف قصوں پر مشتمل ہے۔"(۱۰)

فارسی ادب میں قومی شعور کا رواج قبل از اسلام سے ہے کیوں کہ اسلام سے قبل ایرانی سلطنت کا شمار طاقتور ریاستوں میں ہوتا تھا اور وہ آتش کی پوجا کرتے تھے۔ خلیفہ دوم کے زمانے میں ایرانی سلطنت کو مسلم فوجوں نے اسلامی حدود میں شامل کر لیا۔ یوں صدیوں سے ایرانی زمین پہ آتش کدوں کا خاتمہ ہوا اور خدا تعالیٰ کی وحدانیت قائم ہوئی۔

فارسی ادب میں قومی شاعری کو عام طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(i) اسلام سے قبل فارسی شعری ادب میں قومی شاعری

(ii) بعد از اسلام سرزمین ایران میں قومی شاعری

(iii) سرزمین برصغیر اور فارسی میں قومی شاعری

چونکہ قدیم دور میں قومی شاعری کا زیادہ تر اظہار رزمیہ داستانوں میں ہوتا تھا اس لیے قبل از اسلام کی ایرانی فارسی قومی شاعری میں بادشاہوں، بہادروں، سپہ سالاروں اور قومی رہنماؤں کے کارنامے لکھے گئے ہیں جن میں مشہور نظمیں داستان رستم و اسفندیار، بہرام چوبیں، داستان پیران ویسہ، گاہنامہ، خدائے نامہ، یادگار زریراں قابل ذکر ہیں۔ ان میں ایران کا مذہب، بادشاہوں کے قصے اور بہادروں کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔

فارسی قومی شاعری کا دوسرا دور اسلام کے بعد سرزمین ایران میں شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں قومی رہنماؤں اور ملکی و قومی صورت حال و ایرانی تاریخ لکھنے کا رواج پہلے سے بڑھ گیا اور کئی شاہکار قومی نظمیں تخلیق ہوئیں ۔ اسلام کی آمد سے کچھ شعرا نے اسلامی سپہ سالاروں کے کارناموں کو اپنی شاعری کا حصہ بھی بنایا لیکن فارسی کی قومی نظموں میں شاہنامہ فردوسی کا شمار دنیا کے چند شاہکار شعری قصوں میں کیا جاتا ہے جس کا موضوع خالص قومی ہے۔ اس میں ایرانی تاریخ قبل از اسلام کے بادشاہوں، بہادروں، اور سپہ سالاروں کے واقعات سے

لے کر عہد یزد گرد ساسانی تک کی تاریخ کو قلم بند کیا گیا ہے جس میں فردوسی نے ایران کی تہذیب و تمدن، مذہب و اخلاق اور ایرانی بہادروں کے کارناموں اور جنگوں کو اس اعلیٰ انداز میں بیان کیا ہے کہ اس میں ایرانی سرزمین کی عظمت اجاگر ہوئی جس سے شاہنامہ فردوسی کی شہرت اور عظمت نے بلندیوں کو چھولیا۔

اہل ایران کے نزدیک شاہنامہ فردوسی کا رتبہ کسی مقدس کتاب سے کم نہیں ہے شاید یہی وجہ تھی کہ علامہ ابن الاثیر نے اپنی کتاب "مثل السائر" میں اسے "قرآن عجم" کہا ہے۔(۱۱) اہل ایران اس نظم کو اپنی تقریروں اور تحریروں میں شامل کرنا مقدس قومی فریضہ سمجھتے ہیں۔ شاہنامہ فردوسی ایرانی زندگی کی اعلیٰ قدروں کی ترجمان اور فنی و ادبی معیار کے لحاظ سے عالمی ادبی دنیا میں ایک شاہکار کا مقام رکھتا ہے۔

فارسی زبان میں قومی شاعری کا تیسرا دور برصغیر پاک و ہند کی سرزمین میں وقوع پذیر ہوا۔ چونکہ ہندوستان کی سرزمین پر آنے والے مسلمانوں کا تعلق زیادہ تر فارس اور خلیجی ممالک سے تھا اور وہ اپنی زبان کے ساتھ برصغیر میں وارد ہوئے۔ مسلمان جب ہندوستان میں مسندِ حکمرانی پر بیٹھے تو ابتدا میں انھوں نے اپنی آبائی زبان کو ترویج و ترقی دی اور اس طرح ان کی سلطنت میں سرکاری زبان بھی فارسی ہی ٹھہری۔ ویسے بھی برصغیر میں مسلمانوں کے ایام اول میں اردو زبان ابھی ارتقا کی ابتدائی سیڑھیاں طے کر رہی تھی اس لیے قومی شاعری کا وسیلہ اظہار بھی فارسی ہی تھا۔ فارسی کو سرکاری سرپرستی حاصل ہونے کی وجہ سے شعرا و ادبا نے اسی زبان کو وسیلہ اظہار بنایا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ برصغیر کے شمال مغربی علاقے کسی دور میں اہل فارس کے قبضے میں رہ چکے تھے۔ اس لیے فارسی زبان مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی کسی حد تک برصغیر میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ مسلمانوں کی آمد سے یہ کام مزید آسان ہو گیا۔ نویں صدی عیسوی میں ایرانی نژاد یعقوب بن لیث سندھ کا حکمران بنا اور یوں برصغیر کی قومی زبان فارسی کہلائی۔

سلطان محمود غزنوی، غوری یا ان کے بعد کے حکمرانوں کی مادری یا آبائی زبان فارسی تھی اور انھوں نے جب ہندوستان پر حکومت قائم کی تو فارسی زبان کو سرکاری مقام عطا کیا۔

مسلمانوں کے دور میں عادل شاہی اور قطب شاہی دور میں پہلی دفعہ اردو زبان کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی لیکن ان کے سامنے مغلیہ بادشاہوں کی عظیم سلطنت قائم تھی جن کی سرکاری زبان فارسی تھی۔

عہد غزنوی اور غوری سے عہد مغلیہ تک کے طویل عرصے میں فارسی زبان کو سرکاری سرپرستی حاصل رہی۔ یوں اس دور میں تخلیق ہونے والے ادب کا تعلق بھی زیادہ تر فارسی زبان سے تھا لہٰذا یہ بھی لازمی امر تھا کہ قومی شاعری بھی فارسی زبان میں ہو۔

اس وسیع دور میں برصغیر کی سرزمین میں فارسی زبان و ادب میں قومی شاعری کے حوالے سے تمام حکمرانوں کے ادوار میں ادب تخلیق ہوتا رہا ہے جن میں رزم نامے، قصیدے، مرثیے اور شہر آشوب وغیرہ شامل ہیں۔ فارسی کے اسی غلبہ کے باعث اردو کی غزل جیسی اہم اصناف کا تعلق فارسی زبان وادب سے ہے۔

اردو زبان کے دو اہم شاعر غالب اور علامہ اقبال کا زیادہ شعری سرمایہ بھی فارسی میں ہے اور انھوں نے قومی شاعری کے حوالے سے بھی فارسی زبان و ادب کو وسیلہ اظہار بنایا ہے۔ بلاشبہ ان دونوں عظیم شعرا کا اردو سرمایہ قدر و منزلت میں فارسی سے کسی قدر کم نہیں ہے حتیٰ کہ غالب کے اردو دیوان کو عبدالرحمٰن بجنوری نے ہندوستان کی دوسری الہامی کتاب کا درجہ عطا کیا لیکن غالب اپنے فارسی کلام کو ہی گرانقدر سرمایہ سمجھتے تھے۔ غالب کے فارسی کلام کے بارے ڈاکٹر سید عابد تقی عابدی لکھتے ہیں " اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کے فارسی کلام کو فارسی کے درجہ اول کے شعرا کے کلام کی صف میں رکھا جا سکتا ہے۔ غالب کے فارسی کلام کی بعض اصناف میں ہندوستانی، خراسانی اور تورانی، فارسی کے عظیم شعرا کے ہم پلہ ہیں۔"(۱۲) غالب ان فارسی شعرا کی طرح بڑے وطن پرست تھے۔ وطن کی محبت میں لکھی جانے والی فارسی نظم میں وہ برصغیر کے اہم شہروں کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

گفتم اکنون بگو کہ دھلی چیست
گفت جان است و این جہانش تن
گفتم اش چیست این بنارس ، گفت
شاہدِ مست محوِ گُل چیدن
گفتم اش چون بود عظیم آباد
گفت رنگین تر از فضائی چمن
گفتم اش سلسبیل خوش باشد
گفت خوشتر نہ باشد از سوہن
حالِ کلکتہ باز جستم ، گفت
باید اقلیمِ ہشتمش گفتن (۱۳)

غالب کے آباؤ اجداد دہقان سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے اور فارسی ان کی گھریلو زبان تھی اس لیے غالب نے ہندوستان کی زمین اور وطن کو سامنے رکھ کر فارسی میں عظیم ادب تخلیق کیا۔

غالب کی طرح اقبال نے بھی شاہکار فارسی ادب تخلیق کیا۔ قومی شاعری کے حوالے سے ان کا فارسی کلام کا غفیر سرمایہ موجود ہے۔ علامہ اقبال کے فارسی کلام میں اسرار خودی، رموز بے خودی، پیام مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق اور ارمغان حجاز (حصہ فارسی) کے مجموعے شامل ہیں۔ ویسے تو اقبال کی پوری شاعری اردو اور فارسی قوم وملت کی ترجمان اور قومی وملّی شاعری کے زمرے میں آتی ہے لیکن اقبال کے ابتدائی اردو کلام سے قطع نظر فارسی شاعری مسلمان قوم وملت کی ترجمان شاعری کہلاتی ہے۔ انھوں نے مسلمان قوم کو جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کی کوشش کی۔ وہ فارسی نظم "مردِ حر" میں فرماتے ہیں:

مرد حُر محکم ز وردِ "لاتحف"

ما بمیدان سر بجیب او سر بکف

مرد حُر از لااِلٰہ روشن ضمیر

می نگردد بندہ سلطان و میر

مردِ حُر چون اشتران باری برد

مردِ حُر باری برد خاری خورد

(مرد حُر محکم زوردِ "لاتحف"، پس چہ بایداے اقوامِ مشرق)

عربی زبان کا شمار موجودہ دور کی قدیم زبانوں میں ہوتا ہے جبکہ عربی ادب کی تاریخ کو مؤرخین مختلف ادوار میں تقسیم کرتے ہیں جن میں قبل از اسلام کے دور جاہلیت سے لے کر موجودہ دور شامل ہیں۔ دور جاہلیت میں عرب کے لوگ مختلف قبائل میں منقسم تھے اور آئے روز آپس میں جھگڑتے رہتے تھے۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کو نیچا دکھانے کے نئے نئے حربے اختیار کرتا۔ اپنے قبیلے کے فضائل اور مخالف قبیلے کی خامیاں بیان کرنا معمول تھا اس مقصد کے لیے شاعری سب سے بہترین حربہ تھی اور وہ شاعری کے دلدادہ بھی تھے۔ عربوں کو شاعری سے خاص لگاؤ تھا۔ محمد کاظم "عربی ادب کی تاریخ" میں دور جاہلیت میں شاعری اور شعرا کی قدر و منزلت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاعر کو جو مقام عربوں کے جاہل معاشرے میں حاصل تھا اس کی مثال دوسری قوموں اور دوسرے معاشروں میں نہیں ملتی۔ عربوں کے ہاں زمانہ جاہلیت میں شاعر کو وہ اہمیت حاصل تھی جو آج کے زمانے میں تمام ذرائع ابلاغ (Media) کی ہوتی ہے۔ وہ اپنے قبیلے کے محاسن بیان کر کے اسے سربلند کر سکتا تھا اور مخالف قبیلے کی ہجو کہہ کر اسے ذلیل وخوار بھی کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب کسی قبیلے میں

بڑے شاعر کا ظہور ہوتا تو اسے ہر طرف سے مبارک باد ملتی تھی اور اس کی قسمت پہ رشک کیا جاتا تھا"(۱۴) دور جاہلیت کے نامور شعرا میں امراؤ القیس، زہیر، بسید، طرفہ، اعشیٰ، عنترۃ بن شداد، اور امیہ بن ابی صلت و دیگر شامل ہیں۔

آمدِ اسلام سے عربوں کی فکر، سماجیت اور سیاسی حوالے سے یکسر بدل گئے تو موضوعاتِ شاعری میں بھی تبدیلی آگئی لیکن جاہلیت کے دور میں بھی شعرا کے بھی اصول وضوابط تھے جن سے ہٹ کر وہ سخن گوئی کرنا توہین سمجھتے تھے۔ ان خصوصیات میں پہلی اور بنیادی خصوصیت حقیقت پسندی تھی۔ عبدالحمید ندوی لکھتے ہیں" عہد جاہلیت میں شعرا حقیقت کے مطابق ہی شعر کہا کرتے تھے، ان کی شاعری حقیقت کی عکاس تھی چنانچہ ان کے اشعار میں غلو اور مبالغہ آرائی نہیں ملتی۔ جس طرح کی مبالغہ آرائی اور تکلف بعد کے شعرا میں ملتا ہے۔"(۱۵) بعد کے عہد سے مراد امیہ، عباسیہ، اور بعد کے ادوار سے ہے جس میں عربی شاعری پر عجم کا رنگ غالب آتا ہے اور حقائق کی بجائے مبالغہ آرائی اور خوشامد سبقت لے جاتی ہے۔ عہد نبوی ان خصائص سے پاک ہے۔ عہد نبوی میں جاہلیت کے دور کی خصوصیت یعنی حقیقت پسندی تو قائم رہی لیکن اس دور میں قرآن پاک اور آپ کی تعلیمات کا شعرا پر بھی خاص اثر ہوا۔ رزمیہ اور قومی موضوعات پر لکھی جانے والی شاعری کا مفہوم یکسر بدل گیا بقول عبدالحمید ندوی:

> "دور جاہلی میں جنگوں کے اندر نفری، تعداد اور تیاری کی کیفیت، قبیلے کی بہترین کارکردگی، دشمنوں کے مال کا حصول اور دشمنوں کو قید کرنے وغیرہ کا تذکرہ کر کے فخر کیا جاتا تھا، لیکن مسلمانوں کے اشعار میں اللہ کے راستے میں شہادت کا حصول، اللہ کے دشمن مشرکین کے خلاف لشکر الٰہی کے فتح نصرت سے ہمکنار ہونے پر فخر کیا جانے لگا۔ غنیمت کا مفہوم بدل گیا، غنیمت اور جنگ کا مقصد اللہ کی خوشنودی اور رسول اللہ کی رضا کا حصول بن گیا، نہ کہ اونٹ اور بکریوں کا حصول، جیسا کہ دور جاہلی کا مقصد تھا اور اس کا تذکرہ ان کی شاعری میں ملتا ہے۔"(۱۶)

عہد نبوی اور خلفائے راشدین کے زمانے میں عربی شاعری پر اسلامی اور جاہلی رنگ غالب رہا لیکن شخصی حکومت کے شروع ہونے اور خلافت کے خاتمہ کے بعد عربی شاعری اپنی اصلیت کھو بیٹھی اس میں خوشامد، غلو اور مبالغہ آرائی میں بتدریج اضافہ ہونے لگا۔ قومی موضوعات بھی شخصی دائرے میں گم ہونے لگے۔ اموی دور حکومت میں حضرت امام حسینؑ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا جس کے بعد موضوع واقعہ کربلا پر اسلامی قومی شاعری کے ایک ایسے دور کا آغاز ہوا جو بتدریج بڑھتا گیا اور عرب سے نکل کر عجم اور برصغیر پاک وہند میں بھی بلند مقام

حاصل کر گیا اور آج بھی پورے آب و تاب سے شعرانہ صرف عربی زبان بلکہ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی اسلامی تاریخ کے اس سیاہ واقعہ پر خصوصیت سے قلم آزمائی کرتے ہیں۔

سولھویں صدی تک مسلمان ایک ترقی یافتہ اور طاقتور ملت کے طور پر دنیا میں قائم رہے لیکن سولھویں صدی کے بعد مسلمانوں کا زوال شروع ہو جاتا ہے اور وہ مسلم ریاستیں جو اسلامی اقتدار و خلافت کا حصہ تھیں، آہستہ آہستہ ہاتھ سے جانے لگیں حتیٰ کہ اسلامی مملکت سکڑ کر چند ممالک تک رہ گئی۔ بہت سے ایسے ممالک جو مسلمانوں کا گڑھ سمجھے جاتے تھے، وہ بھی غیر مسلموں کے تسلط میں آ گئے۔ اسی دور میں عربی زبان سے قومی شاعری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا جس کو محکوم دور کہا جائے تو زیادہ بہتر ہو گا۔ عربی زبان کے اس دور کی ابتدا اٹھارھویں صدی عیسوی میں مصر سے ہوئی جب ۱۷۹۷ء میں فرانس کے نپولین بوناپارٹ نے مصر پر قبضہ کیا(۱۷) اس دور میں عربی شعر و ادب کو کافی ترقی حاصل ہوئی اور عربی زبان و ادب پر طویل عرصے سے چھائے ہوئے بادل چھٹنے لگے۔ مزید بر آں دوسری جنگ عظیم کے بعد عربی زبان و ادب کے لیے اس وقت موسم صاف و خوشگوار ہو گیا جب عرب ممالک کی ایک ریاست انگریزوں نے یہودیوں کے سپرد کر دی یعنی فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کر دیا گیا تو عربی زبان و ادب میں قومی شاعری کی ایک ایسی ابتدا ہوئی جس نے عربوں کی شاعری کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس دور کی قومی شاعری کے مثال حسب ذیل ہے۔

احمد شوقی مصر کا ایک شاعر اور مفکر تھا۔ انھوں نے قومی رزمیہ شاعری میں ''دول العرب'' اور ''وادی النیل'' جیسی طویل نظمیں لکھیں۔ وہ دمشق کی تباہی دیکھ کر پکار اٹھتا ہے۔

بالامس كنتُ على الزهراء اندبهم
واليوم دمعى على الفيحاء هتّان

(کل میں اندلس کے قصر زہراء میں کھڑا اسلاف کا نوحہ کرتا تھا اور آج میری آنکھیں دمشق کی زبوں حالی پر اشک بار ہیں)(۱۸)

احمد شوقی مصری قومیت کا شاعر تھا۔ لیکن وہ مقامیت سے بلند ہو کر پورے مشرق کا شاعر بن گیا اور اہل مشرق کے پر شکوہ ماضی اور ان کے عظیم اسلاف کے گن گا کر انھیں اسی بات پر ابھارتا رہا کہ وہ مغرب کے مقابلے میں اپنے آپ کو کم تر نہ سمجھیں بلکہ آزادی اور ترقی کی راہ میں دوسری قوموں کے ہم قدم چلنے کی کوشش کریں۔

عربی، ترکی، فرانسیسی، انگریزی اور فارسی زبان کی طرح اردو زبان میں بھی قومی شاعری کا ضخیم سرمایہ موجود ہے جو اردو شعرا کی وطن و ملت سے محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

## اقوامِ عالم میں قومی ترانوں کا سلسلہ:

قومی و ملّی شاعری قوم و ملک کی نمائندگی کرتی ہے جو کسی بھی شاعر کی تخلیق ہو سکتی ہے لیکن ایک نظم ایسی بھی ہوتی ہے جو قوم و ملک کی عالمی سطح پر نمائندگی کرتی ہے اور اس نظم کو سرکاری سرپرستی بھی حاصل ہو تو اس کو قومی ترانہ یا قومی نغمہ کہا جاتا ہے جس کے لیے انگریزی الفاظ کا National Anthem استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی کسی قوم یا ملک کا سرکاری طور پر اختیار کیا ہوا ایسا نغمہ جو خاص موقعوں پر ساز کے ساتھ گایا جائے۔ وہ نغمہ پوری قوم کے احساسات اور اس کی روایات کا ترجمان ہو اور جس کا احترام اور تقدس اجتماعی اور قانونی طور پر لازم ہو۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات کے مطابق:

> " وہ نظم جو کسی ملک کے عوام کی قومی اور اجتماعی امنگوں کی مظہر اور عظمتوں کی علامت ہو اور اسے سرکاری سطح پر اپنے ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل ہو قومی ترانہ کہلاتی ہے۔ قومی ترانے میں موسیقی کی ضروریات کا بھی پورا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ قومی ترانہ قومی پرچم کی طرح مقدس و محترم سمجھا جاتا ہے اور قومی پرچم کی طرح اس کا بھی احترام کیا جاتا ہے۔"(۱۹)

نشاط ثانیہ کے دور میں، جب دنیا وطنی قومیت میں تقسیم ہوئی تو قومی شاعری کے ساتھ قومی نغمہ کی روایت فروغ پا گئی اس وقت دنیا کے تقریباً تمام ممالک کے قومی ترانے اور ان کی دھنیں ان ممالک کے سربراہان کی دوسرے ممالک کے دوروں کے رخصتی کے مواقع یا دوسرے ممالک کے سربراہان کی اپنے ملک میں آمد کے مواقع پر یا قومی دنوں کے مواقع پر خاص طور پر بجائی جاتی ہیں۔ قومی ترانہ اور اس کی دھن کے حوالے سے چند ممالک کا ذکر حسب ذیل ہے۔

افغانستان کی سرزمین جغرافیائی طور پر ایران، روس، چین، اور پاکستان جیسے ممالک سے منسلک ہے۔ سمندر کے ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے یہ ملک برطانوی راج سے محفوظ رہا۔ اس کے باوجود اس ملک پر کئی طاقتوں نے حملے کر کے افغانستان کی عوام کو زیر کرنے کی کوشش کی لیکن افغانستان کی عوام کے آہنی حوصلے، ہمت، استقلال اور جذبۂ ایمانی نے ہمیشہ افغان قوم کو پر عزم رکھا۔ ۱۹۷۹ء میں روس اور ۲۰۰۱ء میں امریکی حملوں کی وجہ سے یہ کوئی آزاد ریاست تو نہیں کہلاتی لیکن اس کے باوجود امریکہ کے زیر اثر برائے نام عوامی حکومت قائم ہے جس کی اپنی کابینہ اور صدر مملکت ہے۔

افغانستان میں آئے روز حکومتی انقلاب سے اس کے قومی ترانہ بھی تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ ہر دورِ حکومت نے اپنے نظریات و خیالات کے مطابق ترانہ تبدیل کیا۔ موجودہ حکومتی نظام جو امریکہ اور نیٹو ممالک کے

زیر اثر ہے، اس کا رائج الوقت ترانہ پشتو زبان میں ہے اور پشتو میں اسے "ملّی سرود" کہا جاتا ہے۔ اس کو عبد البادی جہانی نے تخلیق کیا اور ببرک واسانے اس کی دھن تیار کی۔ اس قومی ترانہ میں افغانستان کی عظمت و سربلندی کے ساتھ امن کی خواہش کا اظہار اور خدا تعالیٰ کی بڑائی پیش کی گئی ہے۔

ایران کا قومی ترانہ کسی ایک شاعر کی تخلیق نہیں بلکہ مختلف شعرا کے کلام سے حاصل کیے گئے اشعار پر مشتمل ہے۔ اور اس کی دھن حسن ریاہی نے تیار کی۔ "قومی ترانہ اسلامی جمہوریہ ایران"، کا عنوان پانے والے اس ترانے کو ۱۹۹۰ء میں انقلابی رہنماء آیت اللہ خمینی کے انتقال کے بعد قومی ترانہ قرار دیا گیا۔ ایران میں بھی افغانستان کی طرح صرف حکومتوں کے بدلنے سے ترانہ تبدیل کیا جاتا رہا۔ انقلاب ایران سے پہلے بادشاہی دور میں "سلامت رہے شاہ" کے عنوان سے لکھا گیا بادشاہ کی تعریف و توصیف پر مبنی ترانہ، قومی ترانہ تھا۔

برطانیہ ایک ایسا ملک ہے جس کا ترانہ سب سے قدیم ہونے کے ساتھ شاعر اور موسیقار کے بارے معلومات اندھیروں میں گم گشتہ ہیں۔ "اس ترانے کا پہلا مطبوعہ ریکارڈ ۱۷۴۴ء کا ہے۔ جس پر شاعر کا نام درج نہیں ہے۔ چنانچہ ماہرین کا خیال ہے کہ ترانہ مختلف ادوار میں مختلف شعرا کی طرف سے کی جانے والی مختلف کوششوں کا نتیجہ ہے۔ جسے اب ایک مکمل ترانے کی شکل دے دی گئی ہے۔"(۲۰) اس ترانے کا پہلا مصرعہ یعنی God Save The King Queen سے شروع ہوتا ہے۔ برطانیہ کے ترانہ کی ایک اور بات یہ کہ پورا ترانہ خاصا طویل ہونے کی وجہ سے دور جدید میں صرف برطانیہ میں پڑھا جاتا ہے اور باقی ممالک میں ایک یا دو پہلے بند ہی گائے جاتے ہیں۔ اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ دنیا کا واحد ترانہ ہے جس کی اب تک دنیا بھر میں ۱۴۰ دھنیں تیار ہو چکی ہیں۔

جاپان کے قومی ترانہ کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ یہ دنیا کا مختصر اور شاعری کے اعتبار سے قدیم ترین ہے۔ ترانہ کا نام "Ki miga yo" یعنی "آپ کا راج تا ابد رہے" ہے۔ یہ ترانہ قدیم ہیان (Heian) شہنشاہیت (۷۹۴۔۱۱۸۵)ء کے دور میں لکھی جانے والی کلاسیکی شاعری کی صنف Waka سے ماخوذ ہے.... طویل عرصے تک غیر سرکاری قومی ترانے کی حیثیت سے پڑھے جانے کے بعد ۹ اگست ۱۹۹۹ء کو "کی می گایو" کو جاپان کا قومی ترانہ قرار دیا گیا(۲۱) جاپان کا یہ ترانہ صرف چار لائنوں پر مشتمل ہے جس کی دھن فوج کے جرمن موسیقار فرانز ایسرٹ نے ترتیب دی تھی۔ چونکہ جاپان کا یہ ترانہ قدیم شہنشاہیت کی پیداوار اور یادگار ہے اس لیے جدید جمہوریت پسند طبقے اس پر تنقید کرتے ہیں۔

"March of the Volunteers" عوامی جمہوریہ چین کا قومی ترانہ ہے جو ۱۹۳۵ء میں تائی ہاں (Tian Han) نے لکھا اور اس کی موسیقی نوجوان موسیقار نی ار (Nie Er) نے ترتیب دی۔ چین کا یہ قومی ترانہ

آزادی کے چھپن سال یعنی ۲۰۰۴ء میں اپنی اصل حالت میں بحال ہوا۔ اس سے پہلے اس کو وہ مقام حاصل نہ تھا۔ مارچ آف والنٹیر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ ترانہ ایک وقت میں چین، ہانگ کانگ اور مکاؤ (چینی زیر انتظام) کا مشترکہ قومی ترانہ ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا قومی ترانہ "The Star-Spongled Banner" ہے جو امریکہ کے مشہور شاعر فرانسس سکاٹ کے Francis Scott key نے ۱۸۱۴ء میں لکھا۔ اس ترانہ لکھنے کے پیچھے اصل کہانی کچھ یوں ہے کہ ۱۸۱۲ء میں جنگ بائی مور کے دوران جب ستارے کو شکل کے قلعۂ میک ہنری پر برطانوی افواج نے بمباری کی، تو اس واقعہ سے متاثر ہو کر ۱۸۱۴ء میں مشہور شاعر Francis Scott key نے قلعہ میک ہنری کا دفاع کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ بنیادی طور پر امریکہ کا قومی ترانہ اس نظم سے اخذ کیا گیا ہے۔(۲۲) اس ترانے کی دھن برطانوی موسیقار کے تیار کردہ لوک نغمے کی نقل ہے اس لیے امریکی قومی ترانہ برطانوی موسیقار Jottn stafford Smith سے منسوب کیا جاتا ہے۔ خوبصورت اور دلکش دھن کے باعث اس نغمے کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہو گئی حتیٰ کہ مارچ ۱۹۳۱ء میں امریکہ کے صدر نے اس ترانے کو قومی ترانہ کا اعزاز عطا کیا۔

ملائیشیا اسلامی دنیا کا ایک ایسا ملک ہے جو گیارہ جزیروں پر مشتمل ہے جب کہ اس کا ملّی ترانہ Negaraku ہے جس کا مطلب "میرا ملک" ہے۔ اس ترانے کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کی تخلیق میں اس کے وزیر اعظم کی شاعری بھی شامل ہے۔ جب ۱۸۵۷ء میں ملائیشیا آزاد ہوا تو اس کی تمام ریاستوں کو ملا کر "فیڈریشن آف ملایا" قائم ہوئی۔ اس فیڈریشن کے سربراہ وزیر اعظم تنکو عبدالرحمٰن نے قومی ترانہ کی تخلیق کے لیے مقابلہ کا انعقاد کیا۔ لیکن اس مقابلہ میں حصہ لینے والے کسی بھی ممبر کا نغمہ ججوں کو پسند نہیں آیا تو انھوں نے یہ نغمہ خود تخلیق کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۵ اگست ۱۹۵۷ء کو Perak ریاست کے ترانے کی طرز کو پیش نظر رکھتے ہوئے ترانے کے بول لکھے گئے جس میں مرکزی کردار تنکو عبدالرحمن کی شاعری کا تھا۔ اس ترانے کی دھن فرانس کے ایک قومی ترانے La Rosalie سے حاصل کی گئی ہے جس کو Perre-Jean De Garanger نے ترتیب دیا تھا۔ اس لحاظ سے ملائیشیا کے ترانے کی دھن بھی انھی سے منسوب کی جاتی ہے۔

بھارت کے قومی ترانہ کے خالق رابندر ناتھ ٹیگور ہیں جو ایک نوبل انعام یافتہ بنگالی شاعر ہیں۔ ٹیگور نے ہندوستان کا قومی ترانہ بھی بنگالی زبان میں لکھا اور سنسکرت کی طرز پر اس کی دھن تیار کی۔ اس نے ہندوستان کا قومی ترانہ جس کا نام "جن، گھن، من" ہے، اس کا انگریزی ترجمہ بھی کیا۔ ٹیگور نے اس نغمہ کی دھن بھی آئر لینڈ کی خاتون مارگریٹ کے ساتھ مل کر خود تیار کی لیکن اس ترانہ پر بے پناہ تنقید ہونے کی وجہ سے یہ نغمہ ٹیگور کی زندگی

میں ہندوستان کا قومی ترانہ نہ بن سکا۔ ”جن، من، گھن“ پر روز اول سے تنقید کی جاتی رہی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نظم دسمبر ۱۹۱۱ء کو اس وقت منظر عام پر آئی تھی جب ہندوستان پر برطانوی راج قائم تھا اور دہلی میں برطانوی بادشاہ جارج پنجم کی رسم تاج پوشی کی جارہی تھی، جس کے دوران اس سلسلے میں ہونے والے اجلاس کے دوسرے دن رابندر ناتھ ٹیگور نے یہ نظم پڑھی تھی۔ اس دن اجلاس کا ایجنڈا بادشاہ کو خوش آمدید کہنے اور اس سے خلوص کے اظہار پر مشتمل تھا۔ چنانچہ ناقدین کے مطابق ٹیگور نے یہ نظم بادشاہ کی شان میں لکھی تھی۔ ٹیگور پر تنقید کے بعد انھوں نے اپنی صفائی پیش کی لیکن اس وقت ان کی پیش کی گئی صفائی پر توجہ کم دی گئی۔ ہندوستان جب آزاد ہوا تو ہندوستان کا قومی ترانہ ”بندے ماترم“ کہلایا لیکن دوسرے مذاہب جن میں مسلمان، عیسائی وغیرہ شامل تھے، نے بندے ماترم کو قومی ترانہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان مذاہب کے احتجاج کے بعد ”بندے ماترم“ کی جگہ ٹیگور کے ”جن، گن، من“ کو انڈیا کا قومی ترانہ بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔

## بیسویں صدی کے عالمی ادب میں قومی شاعری:

بیسویں صدی دو عظیم عالمی جنگوں کے ساتھ کئی ممالک کی آزادی کی صدی ہے جس میں قومی شاعری کو قدیم دور کی نسبت زیادہ وسعت عطا ہوئی۔ بیسویں صدی کے عالمی ادب کو ترجمہ کے ساتھ اشاعت کے حوالے سے اکادمی ادبیات اسلام آباد کا کردار بھی اہم ہے۔ اکادمی ادبیات کی طرف سے شائع ہونے والے چھ شماروں میں عالمی ادبی قومی شاعری کا بہترین سرمایہ بھی موجود ہے۔ جن میں چند ممالک کی قومی شاعری کا تذکرہ ضروری ہے۔

پولینڈ کی آزادی کے موضوع پر لکھی جانے والی نظم ”بھائیو آؤ“ جس کو ” روسپ منڈل سٹام “ نے لکھا اور احمد سلیم نے اس کا ترجمہ کیا۔

او سورج! او منصف! اور اے لوگو!
آؤ اس مقررہ بوری کا رجز گائیں
جو عوام کے رہنما۔ بھری آنکھوں اٹھائے پھرتے ہیں
اور طاقت کی کالی بوری کا بھی رجز گائیں
بوری۔۔۔ جسے اٹھانا بہت مشکل ہے (۲۳)

نو آبادیاتی دور میں لکھی نظم میں پولینڈ کی غلامی کا ذکر ہے جس میں اپنے وطن میں رہتے ہوئے بھی اس قدر ڈر ہو کہ انسان اپنی پہچان چھپاتا پھرے اور آزادی کو ترس رہا ہو۔ پولینڈ کے ادب کی خوبصورت نظم ”رہائی“ سے اقتباس ہے:

وہ مجھے اندر لائے
اور شناختی کارڈ پر نقش
میرے نام کے پہلے اور آخری حصے کو غور سے پڑھا
اور پھر مجھے جانے کی اجازت دے دی
۔۔۔۔ گویا میں خطاوار نہیں تھا
وہ دونوں رنگروٹ تھے
یقیناانھوں نے غور سے نہیں دیکھا(۲۴)

غلامی کا دور ایسا ہوتا ہے کہ غلام ملک کا باشندہ ہونا ہی سب سے بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح پولینڈ بھی نو آبادیاتی نظام کا حصہ رہا ہے تو اس دوران پولینڈ کے باشندوں پر ظلم و ستم بھی برابر جاری رہا۔ گویا پولینڈ کا باشندہ ہونا اس دورِ غلامی کی سب سے بڑی خرابی تھی۔

ترکی کی تاریخ بھی نشیب و فراز کا محور رہی ہے۔ جہاں ایک طرف ترکی کے مسلمان بادشاہ پوری خلافت اسلامیہ کے وارث تھے پھر وہ وقت بھی آیا جب ترکی کو اپنی آزادی قائم رکھنا مشکل ہو گئی تھی۔ اس دوران کمال اتاترک اور ترکی کی عوام نے کئی قربانیوں کے بعد آزادی کو محفوظ بنایا۔ شاعر ان قربانیوں کو اپنی نظم ”وطن کی خاطر“ میں بیان کرتا ہے:

ہم نے کیا کیا نہ کیا اپنے وطن کی خاطر
ہم میں کچھ لوگ تھے جو جان پہ بھی کھیل گئے
اور کچھ ایسے تھے جو مر گئے تقریریں کرتے (۲۵)

ترکی کے قومی شاعر محمد عاکف ہیں جن کی نظم استقلال مارشی (ترانہ آزادی) مشہور و مقبول نظم ہے جس میں محمد عاکف نے حب الوطنی کے ساتھ اسلام کے نمایاں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس نظم کو جدید ترکی کا قومی ترانہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر خلیل طوقار ”محمد عاکف ترکی کا ایک ایسا عظیم نام ہے جس کا ترکی میں بڑے چھوٹے سب کے دلوں میں ایک عظیم مرتبہ ہے۔ وہ سب کے لیے عزیز ہیں۔ وہ سب کے لیے قابل احترام ہیں کیوں کہ وہ ترکی کے قومی شاعر اور ترکی کے قومی ترانہ ”استقلال مارشی“ (آزادی کا ترانہ) کے خالق ہیں۔“ (۲۶) ترکی میں محمد عاکف کو وہی مقام حاصل ہے جو پاکستان میں علامہ اقبال کو حاصل ہے یہ الگ بات ہے کہ اقبال کو پوری دنیا میں پذیرائی نصیب ہوئی جبکہ محمد عاکف کو ترکی کی سطح پر بلند مقام حاصل ہے لیکن دونوں شاعر ہم عصر اور عہد ساز ہیں۔ اہم بات یہ کہ دونوں کے خیالات و نظریات میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ محمد عاکف

کی شاعری ترک عوام اور ملت اسلامیہ کے لیے بیش بہا خزانہ ہے لیکن ان کی جس نظم کو خاص فوقیت حاصل ہے وہ "استقلال مارشی" (آزادی کا ترانہ) ہے۔ اقتباس ہے:

مت ڈر! یہ لال سرخ پرچم جو ہے وہ تب تک اس شفق کی رنگ لی ہوئی فضاء پر
لہراتا رہے گا جب تک اس وطن میں جیتے آخری خاندان کا چراغِ حیات گُل نہ ہو
جائے گا۔
وہ پرچم میری ملّت کا چمکتا ستارہ ہے، وہ چمکتا رہے گا۔ وہ صرف میرا ہے اور وہ
میری ملّت کا ہے اور یوں ہی رہے گا۔(۲۷)

محمد عاکف کی شاعری اس نظم کی طرح ترکی اور اسلامی نظریات کی نمائندہ تحریریں ہیں۔

تھائی لینڈ کے شاعر پھاؤ وارن وطن کو ماں تصور کرتے ہیں ان کی نظم "سرزمین وطن ماں ہے"، تھائی لینڈ کے قومی ادب میں قومی ورثہ کا مقام رکھتی ہے۔

اگر تمھیں اپنی ماں سے پیار ہے تو سرزمین وطن سے بھی ہونا چاہیے
ماں کا دودھ محبت بھرے دریاؤں کی طرح بہتا ہے
اور ماں کی ممتا اس بارش کی طرح وسیع ہے جو آسمانوں کو تر کر دیتی ہے
اے میرے بیٹے طویل سفر کے لیے تیار ہو جا۔(۲۸)

جاپان کا ملک تاریخی سطح پر اہمیت کا حامل ہے جس نے جنگِ عظیم دوّم میں اتحادی فوجوں کو ناکوں چنے چبوائے تھے لیکن اس کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی حملہ کے بعد جو تباہی ہوئی اس نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ جاپان کے شعرا اس خونی منظر کو شعری صورت میں بیان کرتے ہیں۔ کشتی روتنا کی نظم "خزاں کی بارش کی رات" سے اقتباس ہے:

انساں کا بدترین خواب جو آج تک دیکھا گیا
پورا شہر بدبودار لاشوں کے سمندر میں تبدیل ہو گیا
مظلوم انسان مغلوب ہو کر زندگی اور موت کا خام مال بن گئے
سر، کان اور چھاتیاں اڑ گئیں
ہاتھ، انتڑیاں اور آنکھوں کے ڈھیلے بکھر گئے
جسموں پر خون کے دھبے پڑ گئے
بال بھورے اور سفید ہو گئے(۲۹)

اسی طرح روس کی قومی شاعری کے حوالے سے انیا اخمتووا کی نظم "یہ روسی زمین" سے اقتباس ہے:

پوری دنیا میں کہیں ایسے لوگ نہیں ہیں

آنسوؤں سے خالی، اتنے دلیر اور

اس قدر سادہ۔ جتنے کریم ہیں (۳۰)

نیلسن منڈیلا جنوبی افریقہ کے نہ صرف ایک بڑے قومی رہنما تھے بلکہ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے جن کی شاعری جنوبی افریقہ کی تحریکِ آزادی میں اہم مقام رکھتی ہے۔ ان کی نظم "مادر وطن افریقہ کے لیے اعلان نامہ" ایک معروف قومی نظم ہے۔ اس نظم سے اقتباس ہے:

کہو نا، سیاہ فام ماؤں کے بیٹے بھی آدم کی اولاد ہیں

کہو نا، ہمارے لیے جھونپڑوں اور کچے گھروں کی سکونت

کی اندھی روایت کا الہام، سچا نہیں ہے

کہو نا، ہمارے عقیدوں میں

کالک نہیں ہے

کہو نا، غلامی ہمارا مقدر نہیں ہے

کہو نا، مسلسل غریبی ہمارے نصیبوں میں شامل نہیں ہے

کہو نا، ہمارا خدا بھی خدا ہے (۳۱)

بیسویں صدی میں فلسطین کے باشندوں کے ساتھ برطانوی استعماریت نے ظلم و ستم کی ایک نئی تاریخ رقم کی جب وہاں کے باشندوں کو آزادی دینے کی بجائے ان کے ملک کا یہودیوں کے ہاتھوں سودا کر دیا۔ یہودی فلسطین میں قابض ہونے کے بعد مقامی باشندوں کو ملک سے نکال کر ان کی املاک پر بھی قبضہ کرنے لگے۔ اس صورت حال میں فلسطینی شعرا نے شاعری میں بہترین قومی شاہ پارے تخلیق کیے۔ سمیح القاسم کی نظم "فلسطین! تو میری ماں ہے" سے اقتباس ہے:

فلسطین! تو تو کرائے کا جگنو نہیں ہے

مری آنکھ کی روشنی ہے

تو کیا میں تجھے قتل کرنے کی سازش کو

ناکام کرنے میں ناکام رہ جاؤں گا

غیر ممکن۔ نہیں

غیر ممکن۔ نہیں
فلسطین !تو تو میرے بازوؤں میں (تقدس) بھرا خون ہے
جو ترے دشمنوں کے لیے موت ہے اور
میری زندگی ہے (۳۲)

بیسویں صدی کی ابتدائی دور کی قومی و وطنی شاعری کا زیادہ تر تعلق آزادی کی تحریکوں اور استعماریت کے خلاف مزاحمت سے ہے جس کی روایت تمام غلام ممالک کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔ لیکن بیسویں صدی میں جہاں وطنی قومیت کو فروغ ملا وہیں شعرا کے ہاں عالمی مسائل بھی زیرِ بحث آنے لگے جس سے ادب کا دائرہ وسعت اختیار کر گیا۔

## (ب)اردو ادب میں قومی شاعری

### ابتدائی نقوش:

اردو ادب میں قومی و ملّی شاعری کے نقوش اتنے ہی پرانے ہیں جتنا بذات خود اردو ادب، کیونکہ شاعری معاشرے کا عکس ہے اور معاشرہ کی تکمیل قوم، وطن یا قبیلہ کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ابتدا میں قومی و ملّی شاعری کی نوعیت وہ نہیں تھی جو موجودہ دور میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو ادب نے ایک ایسے معاشرے میں جنم لیا جو شخصی حکومت پر مبنی تھا۔ اس میں وطن، قوم یا ملت کا تصور موجودہ دور سے یکسر مختلف تھا۔البتہ شعرا جس قبیلے، گروہ یا معاشرے میں پلتے رہے، اس سے محبت کا اظہار ان کی تحریروں میں ضرور ملتا ہے۔ اردو ادب نے اس وقت جنم لیا تھا جب ہندوستان پر ایرانی و تورانی تہذیب کے اثرات نمایاں تھے، جب کہ اردو مقامی پیداوار تھی۔ اس لیے ابتدا میں اردو کو وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جس کی وہ حق دار تھی لیکن دیر آید درست آید کے مصداق اردو زبان و ادب کو اس کا صحیح مقام حاصل ہو گیا اور وقت نے یہ ثابت کر دیا کہ برصغیر پاک وہند کی اصل زبان اردو ہے۔

جنگ آزادی سے پہلے کی اردو شاعری کو عام طور پر صرف ”مضامین عاشقانہ“ اور ”گل مستانہ“ کی داستان رنگین سمجھ لیا گیا ہے۔(۳۳) اس کی وجہ وہ حالات تھے جس میں اس نے پرورش پائی، بادشاہ سے لے کر عام آدمی تک ان امور میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ لیکن مکمل طور پر یہ کہہ دینا کہ جنگ آزادی سے پہلے کی شاعری میں

صرف گل و بلبل کے مضامین ہی شامل ہیں، کسی طور پر درست نہیں ہے۔ اردو شاعری کے ابتدائی نقوش میں بھی ایسے لاتعداد مضامین شامل ہیں جو قومی شعور کی عکاسی کرتے ہیں۔

ابتدائی نقوش سے قطع نظر برصغیر پاک و ہند میں جب اردو شاعری نے باقاعدہ آنکھ کھولی تو ہندوستان دو تہذیبوں میں بٹا ہوا تھا۔ جن میں ایک شمالی ہند کی تہذیب اور دوسری جنوبی ہند کی تہذیب۔ شمالی ہند پر مغلیہ سلطنت کا راج تھا اور یہاں کی تہذیب ایرانی اور درباری تھی جبکہ زبان فارسی تھی۔ اس کے برعکس جنوبی ہند میں مقامیت کو زیادہ رواج دیا گیا۔ بادشاہوں کو چونکہ زیادہ خطرہ مغلیہ حملوں کا رہتا تھا اس لیے انھوں نے مقامی زبان اور تہذیب کو پروان چڑھایا اور رعایا کی خوشنودی و حمایت حاصل کی۔ شمالی اور جنوبی ہند کی یہی خانہ جنگی اردو زبان و ادب کی ابتدائی ترویج کا سبب بنی۔ دوسری اہم وجہ یہ تھی دکن کے بادشاہ خود بھی شاعر تھے اور وہ شعرا کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے کے ساتھ ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔ اور بقول ڈاکٹر مظفر عباس "سرزمین دکن اردو شعر و ادب اور خصوصاً اردو شاعری کے لیے بہت زرخیز ثابت ہوئی ہے اور اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ ہو گا کہ اردو شاعری کی مختلف اصناف اسی سرزمین میں پل کر جوان ہوئیں اور پھر انھوں نے شمالی ہند کا رخ کیا۔" (۳۴) جنوبی ہند میں سے اردو کے ابتدائی شعرا کا کلام میسر ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شمالی ہند میں اردو شاعری جنوبی ہند کی مرہون منت ہے بلکہ جب جنوبی ہند میں اردو یعنی دکنی زبان کو شاہی سرپرستی حاصل تھی۔ اس وقت شمالی ہند میں فارسی زبان کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی لیکن اردو زبان عوام کی زبان تھی اور شعرا منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے مقامی زبان میں شاعری کر لیا کرتے تھے بلکہ بقول ڈاکٹر غلام مصطفی خان "جنگ پانی پت ۹۳۲ھ (۱۵۲۶ء) میں جب بابر نے سلطان ابراہیم لودھی کو شکست دی تو کسی نے فی البدیہ یہ شعر پڑھے:

نو سے اوپر تھا بتیسا پانی پت میں بھارت دیسا
انھیں رجب سکر وارا ابر جیتا براہم ہارا (۳۵)

مغلیہ شہنشاہ ہوں یا دکن کی ریاستوں کے بادشاہ، ان تمام کا تعلق ہندوستان سے نہیں تھا بلکہ وہ پٹھان، ایرانی اور ترکش تھے جنھوں نے ہندوستان میں آ کر اپنی حکومت قائم کی۔ ان کی آمد کے مقاصد تو کچھ اور تھے لیکن ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ہندوستان کو ہی اپنا وطن سمجھا اور انھوں نے ہندوستان کی تہذیب کو اپنایا اور اپنے مذہب یعنی اسلام کو سرکاری مذہب کا درجہ دیا۔ اس وقت وطن، قوم یا ملت اسلام کا تصور قائم نہیں ہوا تھا بلکہ جس کے پاس جتنا علاقہ قبضے میں ہوتا وہی اس کا وطن ٹھہرتا اور بقول عبادت بریلوی" اس وقت کے سارے ہندوستان میں قومیت اور وطنیت کا کوئی واضح تصور موجود نہیں تھا۔ زندگی کی نوعیت انفرادی تھی۔

جاگیر دارانہ دور نے افراد کے فکر و خیال پر ایسے پہرے بٹھا دیے تھے کہ انھیں قومیت اور وطنیت کے اجتماعی تصور کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔"(۳۶) شخصی حکومت نے رعایا کی فکر کو اس قابل نہیں ہونے دیا کہ وہ پورے ہندوستان کو اجتماعی طور پر اپنا وطن سمجھ سکیں یا تمام مسلم اور ہندو اپنی اپنی ملت بن سکیں۔ وہ اپنے بادشاہ کے لیے لڑتے اور مرتے تھے، علاقہ یا مذہب سے کوئی خاص سروکار نہیں تھا۔ تمام بادشاہوں کی فوج میں ہر مذہب اور فرقے کے لوگ شامل تھے۔ اس نظام نے ان کو ایک قوم بننے سے باز رکھا۔

شخصی حکومت اور جاگیر دارانہ نظام ہونے کے باوجود اردو شاعری میں قومیت کے ابتدائی نقوش ڈھونڈنے سے مل جاتے ہیں اوراس شاعری میں قومیت کا جذبہ آنکھیں کھولتا نظر آتا ہے۔ جنوبی ہند پر مغلیہ فوجوں کا حملہ اس جذبے میں ایک چنگاری کی حیثیت رکھتا ہے اور آنے والے ادوار میں یہی چنگاری ایک شعلہ کی صورت اختیار کر گئی۔

اردو شاعری کی ابتدائی حالت میں قومی جذبہ و خیالات کہیں بھی اجتماعی صورت میں نہیں ملتے بلکہ بکھرے ہوئے ہیں۔ ان میں باقاعدہ قومی شاعری بہت کم ہے لیکن اس کے باوجود متنوع شعری اصناف میں قومی و ملّی رجحان پایا جاتا ہے۔

اردو شاعری میں قومی یا ملّی رجحان کا آغاز بھی اردو شاعری کی طرح دکن سے ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دکنی فوجیں مغلوں سے لڑ رہی تھیں اور ساتھ ان کا مقابلہ ہندو اقوام سے بھی تھا جو وقتاً فوقتاً اپنی ریشہ دوانیوں سے باز نہیں آتے تھے۔ چونکہ اردو کے پہلے دیوان شاعر کا سہرا قلی قطب شاہ کے سر ہے تو قومی شاعری کا رجحان بھی ان کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ قلی قطب شاہ نے تقریباً ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے جس میں جنگ و جدل سے لے کر مقامی رسمیں اور اپنی محبوباؤں کے تذکرے ہیں۔ ان نظموں میں اجتماعی قومی شعور پر مبنی شاعری شامل بھی ہے جس کے موضوعات عید، شب برات، حمد، نعت سمیت تمام امور زندگی ہیں اور بقول مظفر عباس "یہ تمام نظمیں قومی و اجتماعی شعور کی عکاسی کرتی ہیں اور ان میں ہمیں قومی شاعری کے ابتدائی نقوش ابھرتے دکھائی دیتے ہیں۔"(۳۷) اردو شاعری میں اس کو باقاعدہ قومی شاعری نہ بھی سمجھا جائے تو آنے والے ادوار کے لیے یہ نظمیں سیڑھی کا درجہ ضرور رکھتی ہیں۔

دکن کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں دکنی فوجیں مغلیہ فوجوں سے لڑ رہی تھیں وہاں دکن کے شعرا بھی اس میدان میں حصہ ڈالتے ہوئے ان جنگوں کو شعری لفظوں میں قلم بند کر رہے تھے۔ بقول ابوالخیر کشفی "ایک طرف دکن کے سپاہی مغلوں سے لڑتے رہے اور دوسری طرف دکن کے شاعروں نے نیم

فراموش شدہ داستانوں میں نہیں بلکہ اپنے سپاہیوں کے کارناموں اور بادشاہوں کے سوانح میں ایک قوم کی رُوح کو تلاش کرنے کی کوشش کی"(۳۸) یہ قوم کوئی مسلمان یا ہندو قوم کی تقسیم نہیں تھی بلکہ دکن اور مغلائی قوموں کی حیثیت سے اپنی پہچان کروا رہے تھے۔ جب دو ممالک مسلمان حکمرانوں کے زیر تسلط ہوں اور ان میں باہمی چپقلش پائی جائے تو اس کو ملّی تعصب نہیں بلکہ قومی تعصب کہا جائے گا جس کا تعلق مذہب سے نہیں بلکہ علاقے اور حکمران سے وابستگی سے ہے۔ اُس وقت برِ صغیر کی دو مسلمان ریاستیں آپس میں بر سرِ پے کار تھیں تو اُسی دور میں اردو میں قومی شاعری نے جنم لیا۔ وہ قومی شاعری جس کی ابتدا فردوسی کے شاہنامہ سے ہو چکی تھی۔ جس میں مذہب کی بجائے جغرافیائی، لسانی اور وطنی پہلوؤں کو مد نظر رکھا گیا تھا۔ اس قسم کے ثبوت اردو ادب میں دکنی ادب کی شاعری میں بھی ملتے ہیں اور بقول ابوالخیر کشفی "اس کی اہم مثال نصرتی کی شاعری ہے۔ اس نے علی نامہ میں اپنی شکستوں کو بھی فتح میں بدل دیا ہے۔ قومیت تاریخ کو یوں ہی مسخ کرتی ہے اور اپنی بنیادوں پر ایک ہی ریاست اور جغرافیائی وحدت کے رہنے والوں کو تقسیم کرتی ہے۔ دکن میں بھی ہمیں یہ تقسیم نظر آتی ہے۔"(۳۹) علی عادل شاہ کی شکست کو نصرتی فتح میں تبدیل کر کے اس کی شان میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دراصل یہ علی عادل شاہ کی مغل فوجوں سے شکست کا رزم نامہ ہے۔ اس مثنوی کے بارے عبد الحق لکھتے ہیں "نصرتی کا بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب، بڑی احتیاط اور صحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ رزمیہ مثنوی ہر لحاظ سے ہماری زبان میں بے نظیر ہے۔"(۴۰) کوئی شک نہیں کہ نصرتی ایک بڑا شاعر تھا لیکن اس کی وابستگی عادل شاہ کے دربار سے تھی اس لیے اس نے واقعات کو توڑ مروڑ کر حقائق کو مسخ کر ڈالا۔ اس لحاظ سے مولوی عبد الحق کے بیان میں کسی حد تک نفی بھی پائی جاتی ہے۔

نصرتی عادل شاہی دربار کا بڑا شاعر تھا جس نے علی نامہ میں دکن میں پیدا ہونے والی جنگوں کے اثر سے عوام میں خوراک کی کمی، بھوک، اور غربت کا بھی ذکر کیا ہے۔ معاشی بدحالی کو ان الفاظ میں رقم کیا ہے:

خیالوں پکانے نہ لکڑی ملے

ہڈان تے دھڑک اک درونا جلے (۴۱)

گویا یہ مثنوی دکن سلطنت میں قائم شاہی نظام کے زوال کی داستان ہے اس کے چند سال بعد دکن میں شاہی حکومت کا مکمل خاتمہ ہو گیا اور مغلیہ فوج قابض ہو گئی۔

مغلوں کے علاوہ ان دکنی ریاستوں کو ایک اور گروہ سے بھی لڑائی کا سامنا رہتا تھا اور وہ تھے مرہٹے۔ مرہٹے ہندو لوگ تھے جو دکن میں اپنی ریشہ دوانیوں سے باز نہیں آتے تھے اور کبھی کسی ایک ریاست کے ساتھ

مل کر دوسری پر حملہ کر دیتے اور کبھی اکیلے ہی ہتھیار اٹھا لیتے۔ اس طرح دکنی ادب میں جہاں مغلوں سے لڑائی کا ذکر ملتا ہے وہیں ہندو گروہوں یعنی مرہٹوں سے بھی لڑائی کا ذکر موجود ہے جس کی اہم مثال "فتح نامہ نظام شاہ" حسن شوقی کی مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں ایک ہندو سردار رام راج کی موت کا بیان ہے جس میں دکن کی مسلم ریاستیں اور ہندو ریاست کے سردار برسرپیکار تھے۔ مثنوی میں وجیا نگر یعنی ہندو ریاست کے خاتمے اور مسلم ریاستوں کی فتح کا ذکر ہے لیکن اس میں باقاعدہ مسلم قومیت یا ملّی جذبے کا اظہار موجود نہیں۔ اس جنگ میں دکن کی مسلمان ریاستوں کے بادشاہوں اور خاص کر نظام شاہی خاندان کے بادشاہ نے ہمت و جوانمردی کے جوہر دکھائے۔ دونوں طرف سے بہت سا جانی و مالی نقصان بھی ہوا لیکن فتح مسلم فوجوں کو ہوئی اور چونکہ اس فتح کا زیادہ انحصار نظام شاہ کو جاتا تھا اس لیے اس رزمیہ مثنوی کا نام بھی فتح نامہ نظام شاہ رکھا گیا۔ یہ فتح نامہ ۱۵۶۴ء میں لکھا گیا(۴۲) ملّی جذبے کا باقاعدہ اظہار محمد قطب شاہ کی شاعری سے ہوتا ہے جب رام راج کا بیٹا مسلم ریاستوں کے خلاف بغاوت کرنے لگا اور وجیا نگر کے ہندوؤں کا حوصلہ بڑھ گیا تو قلی قطب شاہ نے ونیکٹ پتی کو سبق سکھانے کے لیے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ بقول ابوالخیر کشفی "بارش کے شدائد کی وجہ سے محمد قلی قطب شاہ کو واپس لوٹنا پڑا اس سے ونیکٹ پتی کی ہمت بڑھ گئی۔ کئی چھوٹے چھوٹے معرکے ہوئے۔ کبھی کبھی تو ہندو فوجیں سلطنت کی سرحد میں گھس آئیں۔ ایسے ہی ایک موقع پر محمد قلی نے اپنے عساکر سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

محمد دین قائم ہے، ہندو بھاران بھگا دو تم
سیاہی کفر کی بھانو، اجالا جگمگا دو تم
اجالے دین میں فوجاں جو آویں ڈاٹ کر غم کی
تو حیدر کی کٹاریاں سوہیا ان کا چڑا دو تم (۴۳)

محمد قلی شاہ کے ان اشعار سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو میں ملّی شاعری کے پہلے خالق کون ہیں؟ محمد قلی شاہ کو اردو کے پہلے صاحب دیوان ہونے کے ساتھ پہلا ملّی شاعر ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دکن کی شاعری میں زیادہ جذبات قومی نوعیت کے ہیں لیکن جب کہیں کفر سے برسرپیکار ہونا پڑا تو دین محمدیؐ اور حضرت علی شیر خدا کی یاد تازہ ہو گئی۔ ان اوقات میں قومی و ملّی شاعری کے اظہار کے لیے مثنوی، مرثیے یا قصیدے کی صورت میں اظہار ملتا ہے جو جنگوں کے حوالے سے بھی ہیں اور وطن و مذہب سے محبت بھی شامل ہے۔

قطب شاہی سلطنت کے درباری شاعر ملا وجہی کی شاعری بھی قومی جذبات سے عاری نہیں ہے اس کا سب سے بڑا کارنامہ "سب رس" ہے جو ایک تمثیلی کہانی اور اردو کی پہلی نثری ادبی تحریر ہے۔ "سب رس" دکنی ادب کا شاہکار ہے جس نے شاعری کے ساتھ نثر کی ابتدا کا سہرا دکن کے سر باندھ دیا ہے۔ سب رس کے علاوہ وجہی کا اہم کارنامہ ان کی مثنوی "قطب مشتری" ہے۔ اس مثنوی میں دکن کے اخلاقی و سماجی حالات کا تذکرہ ملتا ہے۔ اصل میں یہ بادشاہ کی داستان عشق ہے اور بقول ابوالخیر کشفی "اس عہد میں عشق کو گناہ ابن آدم نہیں بلکہ توفیق سمجھا جاتا تھا۔"(۴۴) دکن کی عظمت اور ایک علیحدہ ملک ہونے کا احساس گولکنڈہ کے پہلے ملک الشعرا ملا وجہی کو شدت سے تھا۔

دکنی شاعری کا آخری وقت شکست و ریخت کا دور ہے جس میں دکنی ریاستوں کو ایک وقت میں کئی محاذوں پر جنگ لڑنی پڑ رہی تھی۔ دکنی اقوام مسلسل جنگ کی وجہ سے بھوک و افلاس کا شکار ہو گئیں۔ دکنی ریاستوں کے لیے سب سے بڑا محاذ مغلیہ فوج سے لڑائی تھا جس میں شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر خود فوج کی کمان کر رہا تھا۔ اس صورت حال میں شعرا نے واقعہ کربلا یعنی مرثیہ کی آڑ میں دکنی صورت حال کا تذکرہ کیا ہے اور اس عہد کے شعرا نے امام حسینؓ کے مرثیوں کے پردے میں وطن کے مرثیے کہے ہیں۔ ان مرثیوں میں دکن کے بادشاہوں جن میں قطب شاہ اور تاناشاہ شامل ہیں، کی مظلومیت کا ذکر ہے اور "یہ نوحہ گری اردو شاعری میں قومی جذبات کی نمائندگی کا پہلا عکس ہے۔"(۴۵) حقیقت یہ ہے کہ اس عہد کے شعرا دکن کے بادشاہوں کی شکست اور اورنگزیب عالمگیر کی فتح کو دل سے تسلیم کر چکے تھے۔ اس صورت میں دکن کے اہم شعرا نے مرکز یعنی دہلی کا رخ کیا۔ دہلی کا رخ کرنے والوں میں سب سے اہم شاعر ولی دکنی ہیں کیونکہ ولی دکنی کے دلی پہنچنے کے بعد وہاں کی ادبی صورت حال یکسر بدل گئی۔

اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد شمالی ہند میں سیاسی اور ادبی لحاظ سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ولی دکنی کی اپنے کلام کے ساتھ دہلی آمد ہوتی ہے تو ان کے کلام کو شمالی ہند میں کافی پذیرائی ملّی اور شمالی ہند کے شعرا نے ولی کے اسلوب کی پیروی میں لکھنے کا آغاز کیا۔ ولی سے پہلے شمالی ہند میں فارسی تہذیبی ادب کو سرکاری و درباری پذیرائی حاصل تھی، اردو یا ہندی کلام کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اگر کوئی شاعر مقامی زبان یعنی اردو یا ریختہ میں منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے شعر کہتا تو وہ صرف عوام تک ہی محدود رہتا۔ امرا تک رسائی حاصل نہ ہو سکتی۔ بقول ڈاکٹر تبسم کاشمیری "شمالی ہند کے شرفا اٹھارھویں صدی سے قبل اس زبان کو ادبی لحاظ سے بہت کم تر درجہ دیتے تھے کہ یہ زبان ان کی برتر تہذیبی سطح سے بہت نیچی تھی۔ وہ اس زبان میں قصباتی اور دیہاتی اثرات

دیکھتے تھے جبکہ ان کی فارسی زبان شہری تہذیب وتمدن کے اعلیٰ معیارات کی حامل تھی"(۴۶)۱۷۰۷ء کے بعد شمالی ہند میں یکسر انقلاب آیا۔ مغلیہ سلطنت سیاسی طور پر کمزور ہو جانے سے فارسی زبان و ادب بھی اپنی برتری کھونے لگا۔ یہ وہ دور ہے جب اردو شعر و ادب کا ستارہ چمکنے لگتا ہے اور شمالی ہند کی سر زمین میں اردو کے ایسے پائے کے شاعر پیدا ہوئے جنھوں نے ہندوستان کی تاریخ میں شعری انقلاب برپا کر دیا۔ ان شاعروں کا نام رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔

لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ اس سے پہلے شمالی ہند میں اچھے اردو شعرا موجود نہیں تھے۔ بیدل، قبول کشمیری، سعد اللہ گلشن، قزلباش خاں امید، نواب امیر خان انجام اور آرزو ایسے شعرا ہیں جو ولی کی آمد سے پہلے شمالی ہندوستان میں ریختہ شاعری کے لیے زمین ہموار کر چکے تھے۔ شمالی ہندستان میں اردو کے فروغ کا سبب صرف ولی دکنی ہی نہیں بلکہ یہ تمام شعرا اور دلی کا زوال ہے۔

ولی سے پہلے شمالی ہند میں میر جعفر زٹلی وہ شاعر تھا جس نے سماجی و معاشی بدحالی اور سیاسی صورتحال کو بیان کیا۔ میر جعفر زٹلی اورنگزیب کی حکومت اور ان کی شخصیت کو اچھا سمجھتا ہے کیونکہ انھوں نے اورنگزیب کی مدح میں شعر گوئی کی ہے اور بقول ابو الخیر کشفی "مجموعی طور پر عالمگیر کی شخصیت کے سامنے انھوں نے بھی سر جھکایا۔ عالمگیر کے باب میں ایسے آدمی کا احساس ذمہ داری "ہمارے ترکش کے آخری تیر" کی عظمت کا ایک ثبوت ہے۔"(۴۷) میر جعفر بنیادی طور پر زٹل تھا اور زٹلی کا کام عام و خواص سے لے کر بادشاہ تک نقل و نشتر کے تیر چلانا ہے لیکن میر جعفر زٹلی کی شاعری میں ادبی چاشنی بھی موجود ہے۔ جعفر زٹلی کے وار سے اپنے دور کے حکما و امرا میں کوئی بھی محفوظ نہ تھا لیکن اورنگزیب سے میر جعفر بھی مرعوب و متاثر معلوم ہوتے ہیں کہ وہ ان کی وفات پر لکھتے ہیں:

اورنگزیب مر گئے، نیکی جگت میں کر گئے
تخت اور چھپر کٹ کو دھر گئے، آخر فنا ، آخر فنا
مواخدا کی یاد میں، رکھا اورنگ آباد میں
خبریں گئیں بغداد میں، آخر فنا، آخر فنا (۴۸)

آخر فنا، آخر فنا، ایسے الفاظ ہیں جس سے یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی دقت محسوس نہیں ہوتی کہ میر جعفر نہ صرف ایک زٹل شاعر تھے بلکہ اپنے زمانے کے مبصر اور دانشور بھی تھے۔ جن کو دنیا کی بے ثباتی کا پورا یقین تھا۔ دوسری بات یہ کہ اس سے جعفر کی اسلام سے وابستگی اور خدا پر پختہ یقین کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میر جعفر

اورنگزیب کازمانہ بھی دیکھ چکے تھے جن کی وفات کے بعد سیاسی واخلاقی زوال شروع ہوا۔ جس میں ہنر مندوں کی رسوائی اور بے قدری بڑھ جاتی ہے، بادشاہوں میں عدل وانصاف کا تصور نہ رہا، ایسے دور میں میر جعفر کی شاعری اجتماعی معاشرہ کی نمائندگی کرتی ہے۔ میر جعفر زٹلی اس وقت غیر سنجیدہ سے ایک سنجیدہ شاعر معلوم ہوتے ہیں جن کو معاشرے کی ناہمواریوں اور عوام کی ظلم وزیادتی کا پورا احساس تھا۔ اردو ادب کی تاریخ میں جعفر زٹلی وہ پہلا شاعر تھا جن کو حق بولنے کی پاداش میں قتل کروادیا گیا تھا۔ بقول ابوالخیر کشفی "کہا جاتا ہے کہ میر جعفر زٹلی کو ان کی 'سکہ نویسی' کے جرم میں فرخ سیر نے قتل کرادیا تھا۔ ہمیں اس روایت کی کوئی حتمی شہادت نہیں مل سکی، مگر بیشتر مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے یہ روایت دہرائی ہے"۔(۴۹)

عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ بادشاہ اس حد تک سیاسی زوال کا شکار ہوگئے کہ ہر طرف سے بغاوتوں اور شورشوں سے رعایا پر ان کی گرفت کمزور ہوگئی تھی۔ آئے روز بادشاہ بدلنے اور شہزادوں کے نابینا کیے جانے کی وجہ سے کئی ریاستیں مرکز سے الگ ہو کر خود مختار ہوگئیں جس سے سرکاری خزانے میں خاطر خواہ کمی ہوگئی، افواج تنخواہوں سے محروم رہنے لگیں۔ بادشاہ انتہائی اخلاقی زوال کا شکار ہو کر ہر وقت طوائف الملوکی میں وقت گزارنے لگے۔ ایسے دور میں اردو شاعری اپنے عروج کی طرف سفر کرتی نظر آتی ہے۔ جہاں تک قومی شاعری کا تعلق ہے تو ان حالات میں قومی شعور کا احساس ہونا لازمی امر ہے لہٰذا اس عہد کے تقریباً تمام شعرا کے ہاں قومی رجحان مرثیہ ،مثنوی اور شہر آشوب جیسی اصناف کی صورت میں نظر آتا ہے۔

میر جعفر زٹلی کے دور میں ہی دکن سے دہلی آنے والے ولی دکنی کی شاعری میں قومی و اجتماعی شعور کی جھلک نظر آتی ہے۔ یعنی ولی دکنی نے اردو شاعری میں قومی شعور کو آگے بڑھانے میں اپنا کردار نبھایا ہے۔ ولی دکنی کی شاعری میں اجتماعی قومی احساس اور وطن سے محبت پائی جاتی ہے۔ وہ مختلف شہروں میں جاتے اور وہاں دل لگا بیٹھتے تھے۔

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین
جا کہے کوئی محمد شاہ سوں (۵۰)

شمالی ہند میں دیوان ولی پہنچنے کے بعد اردو زبان کے ارتقا میں تیزی آئی جبکہ فارسی کا ہندوستان میں زوال شروع ہوا۔ مغلیہ بادشاہ جو فارسی زبان کی سرپرستی کر رہے تھے، وہ خود جب زوال کا شکار ہوگئے تو ہندوستان میں فارسی زبان تقریباً لاوارث بنتی چلی گئی اور عوام کی زبان یعنی اردو کی قسمت کھل اٹھی۔ یہ وہ دور تھا جب بادشاہ محمد شاہ رنگیلا مغلیہ سلطنت کا چشم و چراغ ہندوستان کی سلطنت پر براجمان تھا۔ ملک کے معاشی حالات آئے دن ابتر

ہوتے جارہے تھے، لیکن جب بادشاہ لہو ولعب میں مشغول تھا تو رعایا بھی اس لعنت میں کسی قدر پیچھے نہ تھے، یعنی پورا معاشرہ ہی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے میں مصروف تھا۔ اس صورت حال میں بغاوتوں اور شورشوں کا پیدا ہونا قدرتی تھا کیونکہ ”شمشیر وسناں اول طاؤس رباب آخر“ کے متضاد یعنی طاؤس رباب اول والی صورت حال پیدا ہو جائے تو اس قوم کا زوال آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ مغلیہ سلطنت کے خلاف شورشوں، بغاوتوں اور منصوبہ بندیوں کا جال بچھ گیا۔ ہندوستان کی مقامی قوتوں کے ساتھ ایک اور ایسی قوت پیدا ہو گئی جو غیر ملکی بھی تھے اور تہذیب یافتہ بھی۔ انھوں نے ہندوستان میں اپنے مکر و فریب کے جال بننے شروع کر رکھے تھے۔ مزید یہ کہ ان کی منصوبہ بندی آنے والے دور میں پورے ہندوستان پر حکومت کرنا تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہندوستان کو کسی صورت اکٹھے نہ ہونے دیں۔ ہندوستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ جانے اور مرکز کے کمزور ہونے سے ہی ان کے لیے راستہ کا صاف ہونا ممکن تھا۔ اس کشمکش کو شاہ ظہورالدین حاتم یوں بیان کرتے ہیں:

جن کے ہاتھی تھے سواری کو سو اب ننگے پاؤں
پھرے ہیں جوتے کو محتاج پڑے سرگرداں
جن کے پوشاک سے معمور تھے توشے خانے
سو وہ پیوند کو پھرتے ہیں ترستے عریاں
کیا زمانے کی ہوا ہوگئی سبحان اللہ
زندگانی ہوئی ہر ایک کی اب دشمن جاں

(ویرانیِ عالم، نشیدِ حریت)

شاہ حاتم خود بھی سپاہ گری کے پیشے سے وابستہ تھے۔ سپہ گری کے ساتھ شاعری ان کی اصل پہچان ثابت ہوئی۔ شاہ ظہور حاتم کی شاعری ان حالات و واقعات کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔ یہ دور اردو ادب کی تحریک میں ایہام گوئی کا دور کہلاتا ہے اور اس ایہام گوئی کی سواری میں حاتم، مبارک، آبرو، ناجی وغیرہ اولین سواروں میں شامل تھے۔ ایہام گوئی میں شاعری کا اردو ادب کو بے پناہ فائدہ ہوا اور اردو الفاظ کی ایک ضخیم مقدار جمع ہو گئی جو آنے والے ادوار کے لیے معاون ثابت ہوئی۔ البتہ اس دور میں بادشاہ و امرا، امرد پرستی کا شکار نظر آتے ہیں جس کا اثر اردو شاعری میں بھی پایا جاتا ہے جو کہ کسی معاشرہ کے اخلاقی زوال کی نشانی ہے لیکن آنے والے ادوار میں مرزا مظہر جانِ جاناں جیسے شعرانے ایہام گوئی کے خلاف آواز بلند کی اور اردو ادب میں اس وبا کا خاتمہ ہوا یوں اردو ادب کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا جسے میر اور سودا کا دور کہا جاتا ہے۔ سیاسی حوالے سے دیکھا جائے تو ہندوستان کی تاریخ میں یہ دور معاشی، اخلاقی، اقتصادی و سماجی لحاظ سے زوال اور کسمپرسی کا دور کہلاتا ہے لیکن اردو

شعر و ادب کے لحاظ سے سنہرا دور ہے جس میں اردو غزل ایک آزاد اور طاقتور صنف کے طور پر ابھری۔ یہ دور محمد شاہ رنگیلا، احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کے ادوار پر محیط ہے۔ اس دور میں احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ نے دلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ لوٹ مار، قتل و غارت کے بازار خوب گرم ہوئے۔ ان کے علاوہ جاٹوں، روہیلوں، سکھوں اور مرہٹوں نے ملکی دولت کو خوب لوٹا۔ مغل بادشاہ صرف عیش و عشرت اور سست روی کا شکار تھے۔ ان کی عاقبت نا اندیشی سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی خوب فائدہ اٹھایا۔

۱۷۳۷ء میں نادر شاہ کے قتل و غارت کا بازار ابھی پوری طرح ٹھنڈا نہیں ہوا تھا کہ ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی نے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے مقام پر غیر مسلم فوجوں کو شکست دے کر مغلیہ سلطنت کا وقار بحال کیا۔ لیکن ۱۷۶۴ء میں انگریزوں سے جنگ بکسر میں شکست کھانے کے بعد ۱۷۶۵ء میں انگریزوں نے شاہ عالم ثانی سے ریاست بنگال اور بہار کے فوجداری اختیار حاصل کر لیے۔ یوں کمپنی باقاعدہ طور پر ہندوستان کی سرزمین پر اپنی مملکت بنانے میں کامیاب ہوئی۔ غلام قادر روہیلہ نے دہلی پر حملہ کر کے خاص کر مغل فرماں رواؤں کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔ سکھوں نے پنجاب کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ یوں مغلیہ سلطنت سکڑنے لگی اور جو موجود تھی اس میں بھی بغاوتوں اور لوٹ مار سے برا حال تھا۔ کوئی بھی محفوظ نہ تھا۔ جب وطن کی صورت انتہائی تشویش صورت حال اختیار کر جائے تو اس عہد کے شعرا اور ادبا کی تحریروں میں ان حالات کا تذکرہ ناگزیر ہوتا ہے۔ کئی شعرا دہلی کو خیر باد کہنے پر مجبور ہو گئے جن میں مرزا رفیع سودا، میر تقی اور دیگر شامل ہیں۔ مرزا رفیع سودا دہلی کو خیر باد کہہ کر فرخ آباد چلے گئے لیکن فرخ آباد میں بھی دل نہ لگا اور فیض آباد پہنچے جہاں نواب شجاع الدولہ بر سر اقتدار تھے اور جنھوں نے وظیفہ مقرر کیا لیکن سودا دہلی کو کسی صورت نہ بھلا سکے۔ وہ دہلی کی نسبت اودھ میں شاہانہ زندگی گزار رہے تھے لیکن آبائی وطن تو ماں کا درجہ رکھتا ہے۔

سودا کی شاعری میں ہجو اور قصیدوں کے ساتھ شہر آشوب بھی ہیں۔ ان کا مشہور شہر آشوب ”قصیدہ تضحیک روزگار“ کو قومی مسائل میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس قصیدہ میں سودا نے مغلیہ سلطنت کی بدحالی اور مغلوں کی نااہلی کو ہجو کی صورت حال میں بیان کیا ہے اور بقول ابوالخیر کشفی ”اس عنوان سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کسی ایک گھوڑے کی ہجو نہیں ہے بلکہ مغلوں کی عسکری طاقت کی موت کا نوحہ ہے۔ اس عہد میں گھوڑا ایک اشارہ کی حیثیت رکھتا ہے۔“(۵۱) بلاشبہ سودا کا یہ ہجو اپنے عہد اور مغلوں کے زوال کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ گھوڑا تو ایک تمثیل کے طور پر پیش کیا گیا لیکن حقیقت میں یہ مغلوں اور ان کی اشرافیہ کی توہین ہے۔ بقول سودا:

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی
تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ نشاں ہے
قاضی کی جو مسجد ہے گدھا باندھ کے اُسمیں
بیٹھا ہوا اُس شکل سے ہر پیرو جواں ہے
ملا جو آذان دیوے تو منھ موند کے اُس کا
کہتے ہیں کہ خاموش مسلمانی کہاں ہے

(قصیدہ شہر آشوب، کلیات سودا، جلد اول)

مرزا رفیع سودا کا یہ شہر آشوب نہ صرف مغلیہ زوال کی معاشی، معاشرتی، سیاسی اور سماجی حالات کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ فنی لحاظ سے بھی بہترین کاوش ہے جس میں انھوں نے اس وقت کے تمام پیشہ وروں جن میں ملا، کاتب، شاعر، تاجر اور سرکاری ملازم سمیت سب لوگوں کے حالات زندگی کو بیان کیا ہے۔ بقول تبسم کاشمیری:

> ''سودا کا 'شہر آشوب' ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی زوال پر لکھا جانے والا پر درد نوحہ ہے۔ یہ 'شہر آشوب' سودا کی سماجی بصیرت کی ایک یادگار ہے۔ انھوں نے اپنے عہد زوال کی پستیوں کے جو مشاہدے کیے تھے وہ اس نظم میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے ہیں۔ سماج کے مختلف طبقات جس تباہی اور زبوں حالی کا شکار تھے، اس کی تصویریں سودا کے 'شہر آشوب' میں دیکھی جا سکتی ہے۔'' (۵۲)

مغلیہ سلطنت اور عوام کی بدحالی کا ذکر نہ صرف سودا کے اس شہر آشوب میں ملتا ہے بلکہ سودا کی پوری شاعری میں کسی نہ کسی طرح حالات کی جھلک نظر آتی ہے اور وہ حالات کی زبوں حالی کو کھل کر اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں۔

میر تقی میر مرزا رفیع سودا کے ہم عصر تھے لیکن سودا کے برعکس انھوں نے اپنی زندگی میں مشکلات کا وقت کچھ زیادہ دیکھا تھا۔ میر کی زندگی بچپن سے لے کر آخر تک مشکلات و مصائب سے گھری ہوئی ہے۔ میر کے ہاں دلی کے مرثیے اور شہر آشوب ان کے ہم عصر شعرا کی نسبت کچھ زیادہ ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ دلی کی دو دفعہ بڑی تباہیوں کے وقت وہ دلی شہر میں موجود تھے اور انھوں نے اپنی آنکھوں سے دلی شہر کو اجڑتے دیکھا تھا اس لیے ان میں دوسرے شعرا کی نسبت اپنے شہر کے اجڑنے کا غم کچھ زیادہ تھا۔ میر کی غزلیں، مرثیے، مثنویاں، قصیدے اور شہر آشوب دلی اور دلی کی تباہی سے عبارت ہیں۔

زندگانی ہوئی ہے سب پہ و بال کنجڑے جھینکیں ہیں روتے ہیں بقال

پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال اک تلوار نیچے ہے اک ڈھال

بادشاہ و وزیر سب قلاش (شہر آشوب، نشیدِ حریت )

میر تقی میر نے بادشاہ و امرا اور رعایا سب کو ایک حمام میں نہاتے ہوئے پیش کیا ہے۔ سب کی حالت دگرگوں تھی، کوئی خوش حال نہ تھا۔ دلی شہر جو صدیوں سے ہندوستان کے اہم شہر کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اس نے کئی بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا لیکن اب دلی اُجڑ چکا تھا۔ مغلوں نے دلی کی شان و شوکت میں اضافہ کیا لیکن مغل سلطنت کے زوال سے دلی بھی زوال پذیر ہو گیا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی نے جہاں دلی کو تباہ و برباد کیا وہیں جاٹوں سکھوں اور مرہٹوں نے بھی دلی و اہل دلی کی اینٹ سے اینٹ بجائی۔

جب ہر طرف لوٹ کھسوٹ اور جنگ و جدل کا بازار گرم ہو تو معاشی بدحالی بھی اس قوم کا مقدر بن جاتی ہے۔ پیٹ پالنا سب سے بڑی مصیبت نظر آتی ہے۔ انسان درندوں جیسی زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ میر کے دور میں دلی کے حالات کچھ ایسے تھے، میر صرف اپنا نوحہ نہیں بلکہ پورے دلی والوں کا نوحہ بیان کرتے ہیں۔

میر نے شروع سے مشکل وقت گزارا تھا اور تمام زندگی ان حالات کا نوحہ کرتے گزاری۔ دلی میں حالات ایسے نہیں رہے تھے کہ میر جیسے اعلیٰ شاعر کی قدر دانی ہوتی۔ آخر اٹھارہویں صدی کی نویں دہائی میں میر کی مشکلات کا خاتمہ اس وقت ہوا جب لکھنؤ کے نواب آصف الدولہ کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ میر کے لیے یہ دعوت نامہ خزاں میں بہار کی مانند تھا۔ میر نے فوراً رختِ سفر باندھا اور لکھنؤ جا پہنچے۔ میر کی زندگی کا بقیہ عرصہ لکھنؤ میں گزرا۔ لکھنؤ میں میر کی معاشی پریشانی تو ختم ہوئی لیکن دلی کی محبت آخری دم تک نہ گئی۔ دلی شہر جیسا بھی تھا میر کو اس سے محبت تھی۔ دلی میں میر کا بچپن اور جوانی گزری تھی اور سب سے بڑھ کر میر کے لیے دلی کا ادبی ماحول ان کی تخلیق کا سرچشمہ تھا۔ لکھنؤ میں پہنچ کر میر خود کو کوستے ہیں۔ دراصل میر دلی کی مشکل زندگی کے عادی ہو گئے تھے اور ساری عمر آسودگی میں گزارنے کی وجہ سے معاشی خوشحالی ان کے لیے اتنی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میر دلی کو دل سے نہ نکال سکے اور لکھنؤ کی نسبت دلی کو بہتر جانا۔

میر کی ساری عمر کانٹوں پر گزرے تجربات پر مبنی ہے کیونکہ میر لکھنؤ جا کر بھی دلی سکون نہ پا سکے بار بار دلی کی یاد ان کو ستاتی رہی۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ میر دلی کے شاعر تھے اور دلی میں شاعری کا ڈھنگ و اسلوب داخلی تھا جبکہ لکھنؤ میں مال و دولت کی ریل پیل تھی اور وہاں شعری رنگ خارجی تھا اس لیے میر کو قدر دان لکھنؤ میں میسر نہ آئے۔ میر کی ساری زندگی غموں کی کتاب ہے۔ اس کے جس ورق کو بھی پڑھیں گے، ایک نیا غم میر

کی زندگی میں نظر آئے گا۔ میر اپنے غم میں غمِ دنیا بیان کرتے ہیں۔ میر کا غم اکیلے ان کا نہیں بلکہ پوری دلی اور اہل دلی کا ہے۔

میر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور اردو شاعری غزل کی مرہون منت ہے۔ میر نے اردو غزل کو جو طاقت بخشی اسی کی بدولت غزل کی صنف آج اردو ادب میں بلند مقام پر فائز ہے۔ میر نے غزل کے علاوہ قصیدے، مرثیے، مثنویاں اور شہر آشوب لکھے ہیں لیکن میر کی ساری شاعری کا لبِ لباب زمانے کا غم ہے۔ میر کے عہد کی سیاسی وسماجی واخلاقی و معاشی حالات کو دیکھنا ہو تو میر کی شاعری پر نظر ضرور ڈالی جائے۔ شمس الرحمٰن فاروقی، میر تقی میر کی شاعری اور ان کی زندگی کا احاطہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> ”ہماری تاریخ میں میر کے علاوہ کوئی بڑا شاعر ایسا نہیں جس نے زمانے کے سرد و گرم اتنے دیکھے ہوں۔ جو جنگوں میں شریک رہا ہو، جس نے بار بار ترک وطن کیا ہو۔ جس نے بادشاہوں اور فقیروں کی صحبتیں اٹھائی ہوں۔ جس نے عسرت اور تنگی کے وہ دن دیکھے ہوں کہ بقول خود میر اسے ”کتے اور بلی کی طرح“ زندگی بسر کرنی پڑی ہو۔ جس نے آرام کے دن بھی دیکھے ہوں، جو صوفیوں میں صوفی، رندوں میں رند، اور سپاہیوں میں سپاہی رہا ہو۔“ (۵۳)

بلاشبہ میر تقی میر کو اٹھارھویں صدی کے عہد ساز شاعر کا رتبہ حاصل ہے جس نے زندگی کے تمام رنگ دیکھے اور ان رنگوں میں ایک نیا رنگ متعارف کرایا جو اردو شاعری میں میر تقی میر کا رنگ کہلاتا ہے۔ میر نہ صرف اپنے زمانے کے بلکہ آنے والے ادوار میں بھی اردو شاعری اور خاص کر اردو غزل کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ میر کے رنگ کے بغیر بعد کے آنے والے غزل گو شعرا کی شاعری ماند پڑ جاتی ہے۔ مغلیہ عہد کے اس انتشاری کے دور میں دلی کے تمام شعرا میر کی طرح حال دنیا اور حال دل بیان کرتے ہیں لیکن سماجی و معاشی حوالے سے میر کا کردار سب سے اہم رہا ہے۔

قائم چاندپوری بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ بجنور میں پیدا ہوئے اور تلاش روزگار کے سلسلے میں دہلی آئے لیکن دہلی آکر انھوں نے دیکھا کہ شاہی فوجیں اور مغلیہ سلطنت اندرونی سازشوں، بداعمالیوں اور بیرونی حملوں کی وجہ سے تباہی اور بربادی کا شکار ہو چکی تھی۔ قائم چاندپوری نے مغلیہ زوال اور اس کے اسباب کو اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ وہ مغلیہ بادشاہوں، خاص کر شاہ عالم ثانی کو پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ رعایا کا خیال رکھنے کے بجائے عیش و عشرت میں پڑے تھے اور رعایا کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ اپنے مخمس شہر آشوب میں وہ شاہ عالم ثانی سے شدید نفرت اور غم و غصہ کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

کیسا یہ شہ، کہ ظلم پر اس کی نگاہ ہے
ہاتھوں سے اس کے ایک جہاں داد خواہ ہے
لچا اک آپ ، ساتھ لٹیری سپاہ ہے
ناموس خلق سائے میں اس کے تباہ ہے
شیطان کا یہ ظل ہے ، نہ ظلِ الہٰ ہے (شہر آشوب، کلیاتِ قائم ،جلد دوم)

ہندوستانی عوام گزرے بادشاہوں کا انصاف اور عوام کے لیے خیر خواہی کا زمانہ یاد کرتے ہیں جب ہندوستان اور ہندوستانی عوام خوشحال تھے لیکن شاہ عالم جیسے حکمرانوں نے حسن سلوک کرنے کے بجائے طوائف الملوکی کو فروغ دیا۔ شاہ عالم کا دادا جہاندار شاہ دہلی کی مشہور طوائف لال کنور پر عاشق تھا۔ ایک دفعہ جہاندار شاہ نے لال کنور کے کہنے پر ملاح کو مسافروں سے بھری کشتی الٹنے کا حکم دیا۔ جس سے کشتی میں سوار سارے مسافر ڈوب گئے۔ قائم نے اس شہر آشوب میں شاہ عالم ثانی کو مخاطب کرتے ہوئے طنزاً کہا:

دادا ترا جو لال کنور کا تھا مبتلا
کہتا تھا کشتیوں کے ڈبونے کو برملا
اس خانداں میں حمق کا جاری ہے سلسلا
دوں دوس کس طرح سے میں تیرے تئیں بھلا
آخر گدھا پن ان کا ، ترا عذر خواہ ہے (شہر آشوب، کلیاتِ قائم ،جلد دوم)

غرض عسکری انحطاط و زوال، زوال پذیر معاشرہ، شورش و بدامنی، امرائے سلطنت کی نااہلی اور کم ہمتی، سماجی، اخلاقی و اقتصادی بدحالی اور حکومت و امرا کی خود غرضی ایسے عناصر تھے جن پر اس عہد کے شعرا نے قلم اٹھایا اور ان حالات کو اپنے الفاظ و جذبات کے ذریعے قلمبند کرنے کی کوشش کی لیکن مغلیہ سلطنت زوال کی اس نہج پر پہنچ چکی تھی کہ جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔ بقول لارڈ ہسٹنگز "اس کی (شاہ عالم ثانی کی) انتہائی بے حسی اور کاہلی نے اسے اس قابل نہیں رکھا کہ وہ بڑی سے بڑی طاقت کی امداد سے بھی اپنے حالات درست کر سکے یا حالات کا رخ ہی موڑ سکے"(۵۴) اس دوران برصغیر پاک و ہند میں تجارتی مقاصد کے لیے قائم ہونے والی ایسٹ انڈیا کمپنی نے حالات سے خوب فائدہ اٹھایا اور ہندوستان کی معیشت کو مسلسل اپنے کنٹرول میں لاتی رہی۔ ایک وقت ایسا آیا جب برصغیر کے وسیع اختیارات اس کمپنی کے پاس چلے گئے اور عظیم مغل کا تخت نشین ایسٹ انڈیا کمپنی کا تنخواہ دار بن گیا یعنی ۱۸۰۳ء میں حد سے بڑھے ہوئے سیاسی و سماجی انتشار کے سبب لارڈ لیک نے شاہ عالم ثانی کو اپنی سرپرستی

میں لے کر اس کی پنشن مقرر کر دی(۵۵)اس اکبر کا ہندوستان حقیقی معنوں میں انگریزوں کے ہاتھ میں چلا گیا اور مغلیہ بادشاہ نام کے بادشاہ رہ گئے تھے جن کی حیثیت ایک ملازم سے زیادہ نہ تھی۔

ریاستِ میسور:

شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد جہاں مرکز کمزور ہوا وہاں ہندوستان کے کئی صوبہ دار اور راجوں، مہاراجوں نے بغاوت کر کے علیحدہ حکومت بنالی تھی۔ جنوبی ہند کا علاقہ جس پر اورنگزیب نے سب سے مشکل اور طویل عرصے کے بعد بھاری نقصان اٹھانے سے فتح کی تھی، ان کی وفات کے ساتھ ہی ان کی اولاد کی آپس کی ناچاکیوں اور لڑائیوں سے مرکز کے کمزور ہونے کی بنا پر جنوبی ہند مغل سلطنت سے علیحدہ ہو گیا۔ جنوبی ہند کے علاقوں میں ایک ریاست میسور تھی جس پر وہاں کے راجہ کا قبضہ ہو گیا۔ اٹھارھویں صدی کی پانچویں اور چھٹی دہائی میں راجہ کو بیرونی جنگوں اور اندرونی مسائل نے کافی پریشان کرر کھا تھا۔ راجا تیج راج کے پاس ان مسائل اور جنگوں سے لگا تار شکست کے بعد اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں تھا کہ وہ اقتدار سے علیحدہ ہو جائے۔ اس لیے اس نے اپنی سیاسی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اس کے ہونہار سپہ سالار حیدر علی نے گدی سنبھال لی۔ اس طرح میسور کی ریاست ۱۷۶۱ء میں ایک مسلم فرمانروا کے ہاتھ میں آ گئی(۵۶)حیدر علی نے ایک مستحکم ریاست قائم کی۔ وہ ایک ہونہار اور قابل و دلیر مسلمان حکمران ثابت ہوئے جس نے پے در پے مرہٹوں، انگریزوں اور نظام کو شکستوں سے دوچار کیا اور میسور کی ریاست میں اضافہ کر لیا۔ ۱۷۸۲ء میں حیدر علی کی وفات کے بعد انگریزوں اور مرہٹوں کو خوشی ہوئی کہ اب ریاست میسور ان کی ہے لیکن ان کی یہ خام خیالی تھی کیونکہ حیدر علی کے بعد ان کے قابل اور ہونہار بیٹے ٹیپو سلطان نے اقتدار سنبھال کر دشمنوں کے خواب کو خاک میں ملا دیا۔ ٹیپو سلطان کے اقتدار سنبھالنے سے وہ قوتیں جو حیدر علی کی وفات کو اپنی کامیابی سمجھ رہی تھیں، ایک دفعہ پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئیں۔ ان میں انگریز، مرہٹے اور نظام شامل تھے۔ سلطان ٹیپو کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ بھی اپنے لشکر کے ساتھ بہادرانہ مقابلے کے لیے نکلا جس کو دیکھ کر میر نظام علی خان کے داماد نواب مہابت جنگ نے اپنے دیوان اسد علی خان کو سلطان ٹیپو کے پاس صلح کے لیے بھیجا اس موقع پر سلطان ٹیپو نے سفیر سے کہا:

> ”مجھے تم لوگوں سے کچھ دشمنی نہیں ہے مگر چونکہ نواب نظام علی خان نے بے وجہ ہم سے چھیڑ چھاڑ شروع کی ہے اور مرہٹوں سے اتفاق کر کے اس سلطنت خداداد کی تباہی پر کمر باندھی ہے۔ میں اس کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ نظام الملک کو اسلام کا کچھ بھی پاس نہیں۔ اس نے ہمیشہ اس اسلامی سلطنت کو مٹانے کے لیے اعدائے اسلام سے سازشیں کی ہیں اور اس موقع پر بھی جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ

مساجد اور اہل اسلام کے گھروں کو بت پرستوں نے بے حرمت کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ نظام الملک ہم سے اتفاق کرے اور دونوں سلطنتوں کی فوجیں متفق و متحد ہو کر پونا پر چڑھائی کریں۔ مذہب و ملت کی لاج رکھتے ہوئے خدا کی رضامندی اور خلق اللہ کی رفاہ کے لیے جہاد پر کمر باندھیں۔ جو ایک مسلمان کی سرخروئی کا باعث ہے۔"(۵۷)

سلطان ٹیپو کو مسلمان اور اسلام کا درد تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان متحد و متفق ہو کر ایک طاقت بن جائیں اور غیر مسلموں کو جو مسلمانوں کو کمزور و ختم کرنے کے درپے ہیں، اپنے راستے سے ہٹا دیں۔ صرف خدا کی وحدانیت قائم ہو اور اللہ کے آخری رسول کا پیغام اور اسوہ حسنہ پر عمل پیرا ہوں۔

ٹیپو سلطان یہ بات اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کا اصل دشمن انگریز ہے جو جدید ہتھیاروں سے لیس ہیں اور ہر طرح کی مکارانہ چالوں کو چلنے اور سمجھنے پر سبقت رکھتے ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے ہندوستان کی تمام مسلم ریاستوں میں اتفاق و اتحاد پیدا کرنے کی کوششیں کیں جو بے سود ثابت ہوئیں۔ سلطان نے مرہٹوں اور نظام کو ساتھ ملا کر انگریزوں کا مقابلہ کرنا چاہا کیونکہ سلطان ٹیپو ایک دور اندیش انسان ہونے کی وجہ سے آنے والے حالات کو دیکھ کر محسوس کر چکے تھے کہ جلد ہی پورے برصغیر پر انگریز کا قبضہ ہونے والا ہے۔ اگر ہندوستان کی مسلم ریاستیں ٹیپو سلطان کا ساتھ دیتیں تو اکیلا ٹیپو یکسر تاریخ کا رخ بدل سکتا تھا۔ انگریز بھی اس بات سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ یہ جان چکے تھے کہ انگریزی حکومت کو ہندوستانی سرزمین پر قبضہ جمانے میں اگر کوئی رکاوٹ بن سکتا ہے تو وہ صرف ٹیپو سلطان کی ذات ہے۔ ایک انگریز مؤرخ کے بقول "جنوبی ہندوستان نے کسی سلطان کو نہیں دیکھا بلکہ صرف ٹیپو سلطان ہی ایک ایسا سلطان ہوا کہ جس کی شاہانہ عظمت ہر ایک کو متحیر کر دیتی تھی۔"(۵۸)

جب انگریزوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ وہ کسی طرح بھی ٹیپو سلطان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو انھوں نے ٹیپو کی فوج کے سپہ سالاروں اور وزیروں کو خرید لیا جن میں میر صادق جیسے لوگ شامل تھے۔ جب اپنے ہی بک جائیں تو طاقتور حکمران کا زوال اٹل ہوتا ہے۔ یہی کچھ ٹیپو سلطان کے ساتھ ہوا۔ ۱۴ فروری ۱۷۹۹ء کو جنرل ہیرس کے زیر کمان فوج نے میسور کا رخ کیا جس کو راستے میں کسی خاص مزاحمت کا سامنانہ کرنا پڑا کیونکہ میسور کی فوج کے بہت سے کمانڈر بھی انگریزوں کے ساتھ مل چکے تھے اس لیے انھوں نے مزاحمت کرنے کے بجائے انگریز فوج کا ساتھ دیا۔(۵۹) ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ایک انگریز نامہ نگار نے یہ تک کہہ دیا کہ اب "مشرق کی سلطنت ہمارے پیروں کے نیچے ہے" (۶۰) واقعی اس کے بعد انگریزوں کو ہندوستان پر قبضے کے لیے کسی خاص معرکے کا سامنانہ

کرنا پڑا اور مسلم دنیا ایک عظیم سلطنت سے محروم ہو گئی۔ ایک نامعلوم شاعر نے ٹیپو سلطان کی شہادت کا نوحہ لکھا ہے جس سے اقتباس ہے:

تعریف اس کی کیا کہوں احمد کے دیں کا تھا نہال

ایسا نہال پر ثمر رکھتا تھا یوسف سا جمال

کیا کروں گا میں بیاں اے دوستو اس کا کمال

غمگین ہیں قدوسیاں کرو بیاں پر ہے ملال

سلطان ٹیپو دوستو مارا گیا ہے ناگہاں (نوحہ ٹیپو شہید، نشیدِ حریت)

بلاشبہ برصغیر پاک و ہند کی سرزمین میں ٹیپو سلطان آخری مسلمان سپاہی تھا کہ جس کا انگریز سرکار کو خوف تھا لیکن ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد حقیقی معنوں میں اس وقت انگریز عظیم ہندوستان کے مالک بن گئے۔ اوپر لکھے گئے نوحہ میں ملّی حمیت نمایاں ہے۔ جس میں شاعر نے ٹیپو سلطان کو حضرت محمد ﷺ کے دین کا پاسباں قرار دیا ہے اور ٹیپو سلطان کی شہادت کو عظیم رتبہ دیا ہے جو مسلمانوں کی سربلندی کی علامت ہے۔

لکھنؤ:

مغلیہ سلطنت جب معاشی، سیاسی، سماجی اور اخلاقی لحاظ سے پستی کا شکار ہو چلی تھی اور وہ ہندوستان کے وسیع و عریض خطے کا نظم و نسق سنبھالنے کے قابل نہیں رہی تھی تو اس صورت حال کا مخالفین نے خوب فائدہ اٹھایا۔ مزید یہ ہوا کہ دہلی حکومت کی طرف سے تعینات صوبہ داروں نے خود ساختہ حکمرانی کا اعلان کر دیا جس سے دہلی کی سلطنت سکڑ کر چھوٹی ہوتی گئی۔ جنگ بکسر (۱۷۶۴ء) کی شکست کے بعد اودھ کے خود ساختہ حکمران نواب شجاع الدولہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی شرائط پر معاہدہ کر لیا جس سے وہ اودھ کے مالک بن گئے کیونکہ بقول تبسم کاشمیری "وہ کمپنی اور انگریزوں سے اس حد تک مرعوب ہو چکا تھا کہ اس نے اپنے اقتدار کو مستحکم بنانے کے لیے لارڈ وارن ہیسٹنگز Lord warrn hastings سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ دلی کے مغل بادشاہ کے وزیر کی جگہ وہ انگلینڈ کے بادشاہ کا وزیر ہونا باعث افتخار سمجھے گا" (۶۱) لیکن دراصل یہاں سے اودھ کی سرزمین میں انگریزوں کی افعالیت کا آغاز ہوا اور مسلمان حکمرانوں کی مغلوبیت بڑھنے لگی۔ انگریزوں نے اودھ کی اندرونی و بیرونی حفاظت کے لیے ایک فوج قائم کی جس کے اخراجات سلطنت کے ذمے تھے جبکہ یہ فوج کمپنی کے ماتحت تھی۔ اودھ کے تمام حکمران ریزیڈینٹ Resident کے زیر حکم اپنے ہی پیسے سے بنائی ہوئی فوج سے مسلسل خائف رہے لیکن دراصل یہ فوج کمپنی ریاست کے وجود پر اپنا تسلط قائم کرنے اور حکمران خاندان پر خوف جمانے

کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اودھ کی ریاست بیرونی خطرات اور اندرونی سازشوں سے مکمل محفوظ ہو گئی۔ دلی کے برعکس یہاں امن وسکون قائم ہو گیا۔ اودھ کے نواب چونکہ علم وادب اور موسیقی کے شوقین تھے اس لیے اودھ کی سرزمین علم وادب کا گہوارہ بن گئی۔ جس سے دلی سے بدظن شعرا نے لکھنؤ کا رخ کیا جہاں ان کی قدر دانی ہونے لگی اور مالی بوجھ کچھ ہلکا ہوا۔ نواب شجاع الدولہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے نواب آصف الدولہ مسند حکمرانی پر بیٹھے۔ آصف الدولہ خود بھی شاعر تھے اور شاعروں کے قدردان بھی تھے یہی وجہ ہے کہ دہلی کے نامور اور عہد ساز شعرا جن میں میر تقی میر بھی شامل تھے، باعث مجبوری اودھ کی سرزمین لکھنؤ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے اور بقول ابوالخیر کشفی " آصف الدولہ کی شخصیت اور شاعروں کی قدردانی نے اودھ کو ایک ادبی مرکز بنادیا۔ یہ کہنا درست ہو گا کہ لکھنؤ نے دہلی کی جگہ لے لی۔"(۶۲) لکھنؤ میں علم وادب وشعر وسخن کی محفلیں سجنے لگیں۔ نواب شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ کے دور میں انگریزوں نے پرانے معاہدے کو منسوخ کر کے نیا معاہدہ کیا۔ جس کا مقصد تعلقات بڑھانا اور نواب پر اپنا رعب قائم کرنا تھا۔ نواب شجاع الدولہ والی برابری کی سطح ختم ہو گئی اور اودھ ریاست انگریزوں کے ماتحت غیر خود مختار ریاست رہ گئی جس کے برائے نام نواب مسلمان تھے۔ محمد احد علی "شباب لکھنؤ" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> " رعب و سطوت کا نام بھی باقی نہ رہا تھا۔ خالی وضعداری کا نباہ تھا کہ لوگ بظاہر گردن جھکاتے اور مراسم حلقہ بگوشی ادا کرتے تھے۔ البتہ انگریزوں کی جاہ و جلال، عاقلانہ تدابیر، حکیمانہ طرز عمل اور فوجی شان وشکوہ کا سکہ ہر طرف جم گیا تھا۔ ان کی تلوار کالوہا سب مان چکے تھے اور ان کے دماغوں کی فراست سب کے دلوں پر نقش ہو چکی تھی۔ ہر عاجز اور درماندہ عرض حاجت کرنے انھیں کے پاس دوڑتا۔"(۶۳)

ان حالات میں نواب آصف الدولہ نے خود بھی اور رعایا کے لیے بھی خوب مال و دولت خرچ کیا۔ لٹی ہوئی دہلی سے قطار در شعرا و اہل فن و ہنر لکھنؤ کا رخ کرنے لگے۔ جب میر جیسے انا پرست شاعر پیٹ کی خاطر دہلی چھوڑ کر لکھنؤ ہجرت کرنے پر مجبور ہو سکتے ہیں تو باقی اہل فن و ہنر سے کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ آصف الدولہ کی مقبولیت میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب انھوں نے دہلی کے بادشاہ شاہ عالم کی مدد کے لیے اور ضابطہ خان کی سرکوبی کے لیے روپیہ اور فوج بھیجی جس سے شاہ عالم کو ضابطہ خان سے نجات ملّی جبکہ اس خدمت کے عوض بادشاہ نے آصف الدولہ کو وزارت عطا کی۔ آصف الدولہ نے عام طور پر دلی سے کوئی سروکار نہ رکھا اور وہ صرف انگریزوں کو اپنا ساتھی اور مددگار سمجھتا رہا کیونکہ وہ حقیقی طور پر بادشاہ کے زیر نگیں نہیں بلکہ انگریز کے ماتحت تھا۔ بقول تبسم کاشمیری "آصف الدولہ کی حیثیت دلچسپ تھی۔ وہ اودھ کا حکمران تھا۔ دلی کی سلطنت کی طرف سے

اسے وزیر ہونے کا اعزاز حاصل تھا اور روایتی طور پر اسے اودھ کی صوبہ داری تفویض کی گئی تھی لیکن سیاسی اور عسکری اعتبار سے وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر نگیں تھا۔" (۶۴)

نواب سعادت علی خان کے دور تک اودھ ریاست کی خود مختاری ایسٹ انڈیا کمپنی کو منتقل ہو چکی تھی اور اس کے مسلمان حکمران برائے نام حکمران رہ گئے تھے۔ ان سے اختیار چھن چکے تھے۔ نواب سعادت علی خان بڑے مدبر، عاقل، اور دانش مند انسان تھے۔ انھوں نے اودھ کی سرزمین کو کمپنی سے آزاد کرانے اور اس کا نظم و نسق بہتر کرنے کے لیے بہت تدابیر کیں لیکن کمپنی کی چالوں کے سامنے وہ بھی بے بس نظر آئے۔ کمپنی کی طرف سے آئے روز مطالبات سے تنگ آ گئے تھے لیکن چونکہ عسکری طور پر کمزور تھے اس لیے وہ اودھ کو خارجی طور پر آزاد نہ کروا سکے البتہ انھوں نے داخلی طور پر اودھ کو بہتر بنانے کے لیے بہت کام کیا جو ان کی وفات کے بعد آنے والے حکمرانوں نے ان کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ اب حالات اس قدر کشیدہ ہو گئے کہ تقریباً سارا انتظام کمپنی کے سپرد ہو چکا تھا۔ کمپنی داخلی و خارجی طور پر خود کفیل ہو چکی تھی بقول تبسم کاشمیری "کمپنی کی حیثیت ایک پتلی گر Puppet Master کی سی ہو جاتی ہے لکھنؤ کی ریزیڈینسی Residency کے اندر بیٹھا ہوا ریزیڈنٹ اودھ کے نام نہاد بادشاہوں کو پتلیوں کی طرح نچاتا رہتا تھا"(۶۵) اودھ کے حکمرانوں کی اس حالت پر جرأت کی رباعی جس میں مسلمانان اور پاک و ہند قوم کے حکمرانوں کی حالت بیان کی گئی ہے، قومی شاعری کی اہم مثال ہے۔

کہیے نہ انھیں امیر اور نہ وزیر
انگریزوں کے ہاتھ یہ قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ وہ پڑھائیں سو یہ منہ سے بولیں
بنگالے کی مینا ہیں یہ پورب کے امیر　　　(امیر انِ اسیر، نشید حریت)

لکھنؤ شعرا میں مصحفی اور جرات کو ان شعرا میں شامل کیا جا سکتا ہے جنھوں نے قومی و ملّی بیانیے کی سب سے زیادہ ترجمانی کی۔ بقول ابو الخیر کشفی "مصحفی ہی وہ شاعر ہے جس نے برطانوی استعمار کے خلاف اپنے تمام پیش روؤں اور ہم عصروں سے زیادہ قوت کے ساتھ آواز بلند کی۔" (۶۶) مصحفی کی شاعری میں نہ صرف لکھنؤ بلکہ دلی کی تباہی و بربادی اور شکست و ریخت کی بے شمار جھلکیاں نظر آتی ہیں کیونکہ مصحفی کو دلی سے عقیدت تھی مگر حالات کی مجبوریوں سے تنگ آ کر ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ ان کو مسلمانوں کے زوال پر دکھ اور رنج تھا۔ مصحفی حالات کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے اور آنے والے حالات بھی ان کی عقل سے بعید نہیں تھے۔ برصغیر پاک و ہند پر دولت برطانیہ کے قبضے اور یہاں سے لوٹ مار کر کے انگلستان پہنچانے کے بارے لکھتے ہیں:

ہندوستان کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
وہ بھی فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی (٦٧)

انشاءاللہ خان انشا بھی اسی دور سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ بھی دوسرے صاحب کمال شعرا کی طرح ہجرت کر کے لکھنؤ پہنچے۔ انشاء کے کلام میں ہجو اور پھکڑ پن موجود ہے لیکن اس کے باوجود انھوں نے زمانے اور حالات کے پیش نظر شہر آشوب بھی لکھے ہیں جو اپنے زمانے کے سیاسی و سماجی حالات کی عکاسی کرتے ہیں:

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاء
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں (نالۂ غم، نشید حریت)

انشاء اور مصحفی کے بعد آتش اور ناسخ کا دور شروع ہوتا ہے ان شعرا نے انداز سخن کو ترقی دے کر بام عروج تک پہنچایا اور لکھنؤ کی سرزمین میں ادبی مرکزیت قائم کی۔ ناسخ کو عام طور پر صنعتوں اور خیال آفرینی کا شاعر کہا جاتا ہے لیکن ان کی شاعری میں سیاسی اور سماجی رنگ بھی جھلکتا ہے۔ وہ حالات سے ڈرتے اور پریشان نظر نہیں آتے بلکہ دشمن کو مقابلہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ سعادت یار رنگین بھی اسی دور سے تعلق رکھتے تھے جو ریختی کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ نام کی طرح رنگین مزاج والے سعادت یار رنگین پر بھی زمانے کی تلخیوں کا خاطر خواہ اثر ہوا اور انھوں نے قوم کا بیانیہ شہر آشوب کی صورت میں بیان کیا ہے۔ رنگین ان شعرا میں شامل ہیں جو اپنے زمانے کی حماقتوں میں کھل کر شریک ہوتے تھے اور گناہ کو گناہ سمجھنے کی بجائے فخر سے بیان کرتے تھے۔ دراصل رنگین اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب ہر کوئی یہ جان چکا تھا کہ جو پل اچھا گزار لیا جائے وہ بہتر ہے۔ آنے والے دور سے تمام لوگ واقف ہو چکے تھے جب انگریز پورے ہندوستان میں غالب ہونے والے تھے۔

لکھنؤ کی سرزمین میں آخری مسلمان حکمران اور شاعر واجد علی شاہ تھے۔ کہنے کو تو وہ حکمران تھے لیکن حقیقی معنوں میں تمام غلبہ انگریزوں کو حاصل تھا۔ واجد علی شاہ ریزیڈینٹ کے ماتحت ہو کر رہ گئے تھے کیونکہ تمام احکامات برطانوی حکومت کے کارندے ریڈیڈینٹ کے چلتے تھے۔ آخر برطانوی حکومت سے برائے نام حکمرانی بھی نہ دیکھی گئی تو انھوں نے واجد علی شاہ کو معزول کر کے معزولی کی دستاویزات کے معاہدے پر دستخط کرانا چاہتے تھے جسے واجد علی شاہ نے یہ کہہ کر دستخط کرنے سے انکار کر دیا کہ "معاہدے تو برابر کی سطح رکھنے والے کے درمیان ہوتے ہیں لیکن اب اس وقت میں کیا ہوں جو برطانوی سرکار مجھ سے معاہدہ کرنا چاہتی ہے۔"(٦٨) اس میں کوئی شک نہیں کہ واجد علی شاہ کی حیثیت کوئی حکمرانی حیثیت نہیں تھی وہ تو صرف اودھ اور لکھنؤ کے لوگوں

کے ایک نمائندے تھے۔ جس سے عوام اور رعایا کو ایک عارضی تشنگی حاصل تھی جبکہ واجد علی شاہ ان کے مسائل حل کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ شجاع الدولہ کے بعد لکھنؤ کا جو بھی حکمران آیا کمپنی نے ہر ایک سے نیا معاہدہ کیا جس میں شرائط سخت سے سخت کر دی گئیں اور واجد علی شاہ ایسے حکمران رہ گئے تھے جو بالکل بے اختیار تھے۔ حقیقی معنوں میں اودھ کی ریاست انگریزوں کی مرضی سے مرکز کو کمزور کرنے کے لیے بنی تھی اور شروع سے اس پر کمپنی کا کنٹرول تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا اور وہ وقت بھی آ گیا جب لکھنؤ کے نواب مسلمان حکمرانوں کو ایک ریزیڈینٹ نے معزول کر کے اقتدار کمپنی کے حوالے کر دیا۔

لکھنؤ میں کمپنی کا راج شجاع الدولہ کے بیٹے آصف الدولہ کے زمانہ سے شروع ہوا اور اس قدر بڑھتا گیا کہ سعادت علی خان جیسے مدبر حکمران بھی کمپنی کی تدبیروں کے آگے بے بس تھے آخر کمپنی نے بغیر کسی جنگ اور لڑائی کے لکھنؤ کی سرزمین پر قبضہ حاصل کر لیا۔

نظیر اکبر آبادی:

زوال اور تزلزل کے اس عہد سے تعلق رکھنے والے نظیر اکبر آبادی نے حقیقی معنوں میں عوامی نمائندگی کا اظہار کیا ہے۔ نظیر کی شاعری میں عوامی جذبات و خیالات سے زیادہ زوال پذیر معاشرے کی تہذیب و تمدن کی عکاسی اور تقریبات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نظیر نے اپنے حالات و واقعات کو کھلی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے جو سنا اس کو اپنے لفظوں میں ڈھال کر شعر کی صورت میں اظہار کیا ہے۔ وہ گل و بلبل کی صنف غزل کی بجائے وسیلہ اظہار کے لیے نظم نگاری سے کام لیتے ہیں۔ نظم نگاری کی وجہ یہ بھی ہے کہ نظیر کے مضامین میں دنیا کے کئی رنگ موجود ہیں جو صرف نظم کی صورت میں ہی بہتر طور پر ادا ہو سکتے تھے۔ نظیر کی شاعری جن رنگوں سے ملبوس ہے ان میں زندگی کے رنگا رنگ ہنگامے عوامی اور اعلیٰ مجلسوں کا حال، میلوں ٹھیلوں کی عکاسی، ہندوستان کے مذاہب، فرقوں اور طریقوں کے معتقدات، رسم و رواج اور باہمی میل جول شامل ہیں۔ نظیر کی شاعری میں موضوعات کے حوالے سے حافظ جلال الدین جعفری زمینی "انتخاب کلیات نظیر اکبر آبادی" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> "نظیر کبھی مصور فطرت ہے کبھی مبلغ حقیقت۔ کبھی معلم اخلاق ہے کبھی مصلح عادات، کبھی رند لا ابالی ہے کبھی صاحب کرامات، کبھی واعظ منبر پرست ہے کبھی عاشق دلبر پرست۔ کبھی فقیر بے نوا ہے کبھی گدائے متشکر کبھی ملائے مکتب ہے کبھی عالم متجر۔ کبھی مسلمان ہے کبھی برہمن، کبھی دنیادار ہے کبھی دین دار۔ کبھی دین و دنیا دونوں سے بیزار۔ زمین شعر کو وہ کبھی

گلزار سے بہتر بنا دیتا ہے کبھی خار دار سے بدتر بنا دیتا ہے۔ وہ کبھی زہر کھلاتا ہے کبھی آب حیات پلاتا ہے کبھی سبز باغ دکھا کر جنت کی سیر کراتا ہے کبھی روغن قاز مل کر دوزخ کی آنچ سے ڈراتا ہے۔ ہستی کا وسیع میدان اس کی جولان گاہ ہے وہ جدھر چاہتا ہے نکل جاتا ہے اور جہاں چاہتا ہے پہنچ جاتا ہے۔"(۶۹)

گویا نظیر کی شاعری میں شاید ہی کوئی موضوع ہو جو ان کے لفظوں کی زینت بننے سے رہ گیا ہو۔ نظیر کو وہ تمام مضامین و خیال جو اس کے دل میں پیدا ہوئے من و عن اظہار کرنے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ نظیر کی انھیں تحریروں میں ایک طویل مخمس شہر آشوب بھی ہے جس میں انھوں نے آگرے کی اقتصادی بے چینی اور عام پیشہ وروں کی معاشی حالت کا نقشہ کھینچا ہے:

اب آگرے میں جتنے ہیں، سب لوگ ہیں تباہ
آتا نظر کسی کا نہیں ایک دم نباہ
مانگو عزیزو، ایسے برے وقت سے پناہ
وہ لوگ ایک کوڑی کے محتاج اب ہیں آہ
کسب و ہنر کے یاد ہیں جن کو ہزار بند

(شہر آشوب، انتخابِ کلیات نظیر اکبر آبادی)

اس شہر آشوب کے علاوہ نظیر کی بے شمار نظمیں ہیں جن میں وہ عوامی خیالات و مسائل اور رسم و رواج کا ذکر کرتے ہیں۔ ان نظموں کے عنوان بھی موضوع سے منسوب ہیں جیسے عید، بسنت، ہولی، بہار، جاڑے کی بہاریں، طفلی، جوانی، بڑھاپا، جوگی نامہ، کوڑی نامہ، روٹیاں، چپاتی نامہ، آٹا دال، بنجارہ نامہ، تلاش زر، روپیہ نامہ، خوشامد نامہ، توکل نامہ، آدمی نامہ، عاشق نامہ، اور مفلسی نامہ، وغیرہ۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اردو زبان میں صحیح معنوں میں عوامی نمائندگی کا جو حق نظیر اکبر آبادی نے ادا کیا ہے وہ اس دور کے کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آیا۔ اسی لیے نظیر اکبر آبادی کو پہلا عوامی شاعر کہا گیا ہے۔

### تحریک سید احمد بریلوی شہید اور قومی و ملّی شاعری:

تحریک سید احمد شہید فکر و عمل کے لحاظ سے شاہ ولی اللہ کی تعلیمات و فکر و عمل کا پیش خیمہ ہے۔ شاہ ولی اللہؒ جس دور میں پیدا ہوئے وہ دور مغلیہ سلطنت کے زوال اور مسلمانوں کے مصائب کا دور تھا۔ برصغیر کے مسلمان دردناک اذیت سے دوچار تھے۔ ان کی املاک، ان کی زندگی اور حتیٰ کہ ان کی عزت و آبرو بھی محفوظ نہیں رہی تھی۔ یہ صورت ملت کے وجود کو ہی ختم کر دینے کے درپے تھی۔ چنانچہ مسلمان قوم کی زبوں حالی کے اس

دور میں شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے۔ وہ اس برصغیر میں سب سے پہلے مصلح ہیں جنھوں نے علمائے دین کو مخاطب کر کے قلب و نظر میں انقلاب پیدا کرنے کی دعوت دی اور دقیانوسی، جامد اور قدیم تعلیم میں انقلابی روح سمو دی"(۷۰) ان کو برعظیم کی ملت اسلامیہ کے مستقبل کے بارے میں اس قدر تشویش تھی کہ ایک باطنی مشاہدے میں انھیں اس امر کا یقین حاصل ہو گیا کہ ملت کے مستقبل کو خطرات سے بچانا ان کا فرض ہے اور یہ فرض ان کے لیے خدا کی طرف سے مقدر ہوا ہے۔(۷۱) لیکن شاہ ولی اللہ سمجھتے تھے کہ اس فرض کی منصبی اتنی آسان کام نہیں تھا کیونکہ برصغیر کے مسلمانوں کا بطورِ ملت شیرازہ بکھر چکا تھا۔ نادر شاہ، مرہٹوں اور سکھوں کی غارت گری نے مرکز دہلی کو اس قدر کمزور کر دیا تھا کہ وہ ان طاقتوں کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن شاہ ولی اللہ کا تیز ذہن جلد اس بات کو سمجھ گیا کہ سلطنت کا زوال معاشرتی نظام کی فرسودگی کا نتیجہ تھا اور یہ فرسودگی اس معاشرے کی اخلاقی تباہی کا نتیجہ تھی۔ چنانچہ انھوں نے ملت کے اتحاد کو بحال کرنے کی عملی کوشش کی کیونکہ شاہ ولی اللہ نہ صرف مذہبی مصلح تھے بلکہ سیاسی رہنما بھی تھے۔ وہ اسلام کے علمبردار اور دین کے پیشوا بھی تھے۔ جنھوں نے اپنے زمانے میں حق تجدید ادا کیا۔ (۷۲) اس مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تاکہ مسلمان قرآن مجید کا اصل مقصد یعنی دستور حیات کو سمجھ سکیں۔ قرآن شریف کی تفسیر اور تشریح، رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی تعلیم اور مسلم سوسائٹی کی تشکیل اور رہنمائی کے لیے "حجۃ اللہ البالغہ" لکھی۔ ہندوستان کے مسلمان ہندوؤں کے اثر اور جہالت کے نتیجے میں اسلام اور وحدت اسلام سے دور ہو گئے تو شاہ ولی اللہ نے اہل اسلام کو اس کی طرف متوجہ کیا کہ اسلام ایک عالمی مذہب اور دین انسانیت ہے اور اس کے نظام فکر سے کل عالم اسلام شامل ہے چنانچہ انھوں نے "تفہیمات الٰہیہ" میں برہان یعنی عقلی دلیل، وجدان اور قرآن مجید کی تعلیمات کا خاص کر ذکر کیا ہے۔ سیاسی لحاظ سے شاہ ولی اللہ کی بصیرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اس وقت کی مسلم دنیا کی دو عظیم شخصیتوں کو ایک جگہ جمع کیا یعنی روہیلوں کے سردار نجیب الدولہ اور احمد شاہ ابدالی کو حملے کی دعوت دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پانی پت کے مقام پر ۱۷۶۱ء میں مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی۔

بقول اشتیاق حسین قریشی:

> "اگر مسلمانوں نے جوش عمل اور عاقبت نااندیشی کا اظہار نہ کیا ہوتا تو وہ مرہٹوں کے مسئلے کو ہمیشہ کے لیے حل کر سکتے تھے۔ پانی پت میں مسلم افواج کی فتح شاہ ولی اللہ کی سیاسی جدوجہد کے مختصر المیعاد لائحہ عمل کی معراج تھی کیونکہ اگلے سال ان کا انتقال ہو

گیا۔ اگر احمد شاہ ابدالی پرانے مغل شاہی خاندان کا خیال نہ کرتا جس کی وجہ سے اس نے ہندوستان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا، تو شاید برِ صغیر کی تاریخ کا رخ کچھ عرصے کے لیے مختلف ہو جاتا"(۷۳)

شاہ ولی اللہ کو مغلوں کی حکومت سے کوئی ہمدردی نہ تھی اور نہ ہی مغلوں کی حکومت کے سنبھل جانے کی کوئی امید تھی لیکن وہ امت مسلمہ کے اس زوال کو روکنا چاہتے تھے جب تک کہ اس کا کوئی نعم البدل نہ مل جائے۔ شاہ ولی اللہ کا اصل کارنامہ مسلمانوں کے انحطاط کے بنیادی اسباب تلاش کرنا اور ان کا سدباب کرنے کی کوشش کرنا ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے اس انحطاط کا سبب اسلام سے ناواقفیت خیال کیا۔ جس کا باعث ان کے آپس کے اختلافات تھے اور وہ راسخ العقیدہ مذہبی خیالات و نظریات کے باعث دوسرے فقہ کے پیروکاروں کو دشمن خیال کرتے تھے۔ تورانی اور ایرانی کا فرق بھی شدت اختیار کر چکا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے مسلمانانِ ہند کے لیے اس نازک دور میں نشاۃ ثانیہ کے لیے جو قدم اٹھایا تھا وہ ان کی وفات کے بعد ان کی اولاد اور پیروکاروں نے جاری رکھا۔ شاہ ولی اللہ کی وفات کے بعد مسلم نشاۃ ثانیہ کی تحریک کی تکمیل کے لیے ان کے خاندان اور بڑے صاحبزادے شاہ عبد العزیز نے کوشش کی۔ شاہ عبد العزیز نے اپنی ساری زندگی اپنے باپ کے مقصد کی تکمیل میں صرف کر دی اور کئی کتب تصنیف کیں۔ ان کے بھائی شاہ عبد القادر نے قرآن مجید کا ترجمہ بامحاورہ اردو میں کیا تاکہ جو لوگ فارسی سے واقف نہیں وہ اس کے معنی اردو زبان میں سمجھ سکیں۔ اسی طرح شاہ رفیع الدین نے قرآن پاک کا اردو میں لفظی ترجمہ کیا تاکہ مسلمان قرآن پاک سمجھ اور سیکھ سکیں۔

شاہ عبد العزیز اس حقیقت کو سمجھتے تھے کہ اب مسلمانوں کی حکومت ختم ہو چکی ہے اس لیے انھوں نے برِ صغیر کی دارالاسلام کی حیثیت کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا بلکہ انھیں احساس تھا کہ مسلمان اب دارالحرب میں ہیں۔(۷۴) بر صغیر پاک وہند کو دارالاسلام کی بجائے دارالحرب کہہ کر انھوں نے مسلمانوں کی اس ذہنی الجھن کو دور کرنے کی کوشش کی کہ وہ اب اسلامی سلطنت میں نہیں رہ رہے یعنی اب وہ ایسے علاقے میں ہیں جہاں سے انھیں اقتدار سے محروم کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اسلامی حکومت کے قیام کی کوشش اور مسلمانوں کو متحد کرنے میں شاہ عبد العزیز کے فتوے نے اساسی خدمت سر انجام دی اور سید احمد شہید کی تحریک میں رائے عامہ ہموار کرنے اور لوگوں کو تحریک کا ہمنوا بنانے میں اہم ترین کردار ادا کیا۔(۷۵) شاہ عبد العزیز نے مسلمانوں میں صرف تعلیم و تربیت پر اکتفا نہ کیا بلکہ وہ چاہتے تھے کہ بر صغیر میں مسلمانوں کی دوبارہ حکومت قائم ہو۔ وہ انگریز اور غیر مسلم

اقوام کے تسلط سے آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ احمد شاہ ابدالی یا اس جیسے دوسرے کسی بیرونی مسلم حکمران کا تعاون بھی ناممکن ہو گیا تھا کیونکہ پنجاب سکھوں کے تسلط میں تھا۔ ہندوستان میں کوئی قوت اثر انگیز نہیں تھی۔

برصغیر میں ایک نواب امیر خان کی شخصیت ہی اس قابل تھی کہ کسی مؤثر تحریک کو سرگرم رکھنے کے لیے ان سے مدد کی درخواست کی جاسکتی تھی اس لیے ان سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا لیکن انگریزوں کی ریشہ دوانیوں نے اس مفارقت کو ختم کر دیا اور نواب نے ایک ریاست لے کر انگریزوں سے صلح کر لی تو سید احمد شہید جو شاہ عبد العزیز کے شاگرد اور مرید تھے اور نواب کے لشکر میں شریک تھے، بہت مایوس ہوئے۔ انھوں نے لشکر کو خیر باد کہہ کر واپسی کا سفر اختیار کیا۔

یہ وہ دور تھا جب انگریز پورے ہندوستان پر مسلط ہو چکے تھے۔ انگریز کی طاقت کے آگے کسی میں سر اٹھانے کی ہمت نہیں رہی تھی لیکن اس دور میں بھی شاہ عبد العزیز نے جو شاہ ولی اللہ کے اصولوں پر کار فرما تھے۔ پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے بڑھنے کا منصوبہ بنایا اور اپنے مریدین کی صلاحیتوں کا جائزہ لے کر ذمہ داریاں تقسیم کیں۔ سید احمد بریلوی جو حسینی سیدوں سے تعلق رکھتے تھے اور لکھنؤ سے انچاس میل کے فاصلے پر رائے بریلی میں آباد تھے، شاہ ولی اللہ سے ان کی رشتہ داری تھی۔ شاہ عبد العزیز کی شخصیت سے متاثر ہو کر ان کے حلقۂ ارباب میں شامل ہوئے تھے اور بعد میں نواب امیر خان کی فوج میں قابلیت اور مہارت حاصل کر چکے تھے(۷۶) ان کو اس گروپ کا لیڈر بنا دیا گیا تھا۔ مولانا عبد الحئ اور مولانا اسماعیل اس گروپ کے اہم ترین رکن اور سید بریلوی کے مشیر خاص قرار دیے گئے۔ لہٰذا کافی غور غوض کے بعد فیصلہ ہوا کہ پہلے پنجاب کی سکھ حکومت سے جہاد بلند کیا جائے۔ اس تحریک کا آغاز ۱۸۱۸ء میں سید احمد شہید کی قیادت میں دہلی سے ہوا۔ اس تحریک کے سرپرست شاہ عبد العزیز تھے(۷۷) ۱۸۲۴ء میں سید احمد بریلوی نے حج سے واپسی پر جہاد کے منصوبے سے سامان حرب کی نوک پلک درست کی اور جنوری ۱۸۲۶ء کے وسط میں شاہ عبد العزیز کے مقصد کی تکمیل کے لیے گھر سے روانہ ہو گئے۔

آزاد قبائل میں بسنے والے پٹھان اور سرحد کے لوگ غیور، دینداری اور ملّی حمیت میں دیگر مسلمانوں پر فوقیت رکھتے تھے اس لیے سرحد کو مرکز بنانا بہتر معلوم ہوا۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ افغانستان اور دوسرے اسلامی ممالک سے تعاون حاصل کرنے کے لیے یہ علاقہ ساز گار تھا۔ سید احمد بریلوی چاہتے تھے کہ سرحد اور ملحقہ علاقوں کے مسلمانوں کو اکٹھا کر کے سکھوں کی طاقت کو ختم کیا جائے اور ایک اسلامی ریاست کی بنیاد قائم کی جائے جو پورے ہندوستان میں انگریز کی استعماریت کو ختم کر سکے۔ لیکن سید شہید کی بدنصیبی اور پٹھان سرداروں کی

غداریوں سے وہ انگریز کا مقابلہ کرنے سے پہلے ہی شہید ہو گئے۔ اس تحریک کی اہم اور بنیادی کتابیں "صراط المستقیم" اور "تقویتہ الایمان" ہیں۔ جن کو سید شہید نے حج سے پہلے مکمل کیا تھا۔

سید احمد بریلوی شہید کی اس تحریک کا انجام کچھ بہتر نہ ہوا لیکن یہ تحریک عوام الناس اور اہلیان اسلام میں اپنا اثر چھوڑ گئی۔ اس تحریک کے اثرات عوام کے دلوں میں پیوستہ ہو گئے۔ سید احمد شہید جب سکھوں سے جہاد کر رہے تھے تو حکیم مومن خان مومن نے ایک مثنوی لکھی جس کا عنوان " مثنوی جہادیہ" ہے۔ تحریک سید بریلوی کے شعرا میں مومن خان مومن کی مثنوی "بہ مضمون جہاد" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جس میں وہ جہاد کا فلسفہ اور دعوت جہاد پیش کرتے ہیں اور خود بھی طالب شہادت ہیں:

امام زمانہ کی یاری کرو — خدا کے لیے جاں نثاری کرو
کسی کو نہیں ہے اجل کی خبر — کہ آجائے بیٹھے ہوئے اپنے گھر
تو بہتر یہی ہے کہ جاں کام آئے — پس مرگ تربت میں آرام آئے
قیامت کو اٹھو تو تم بامراد — لب "الحمد" گو اور دل شاد شاد
الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب — یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
میں گنج شہیداں میں مسرور ہوں
اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں (بہ مضمون جہاد، کلیات مومن، جلد دوم)

اردو شاعری نے اس تحریک کی قومی اور ملّی جذبہ کے تحت ترجمانی کی ہے اور بقول ابو الخیر کشفی "سید احمد شہید کی تحریک اردو شاعری میں اولیت رکھتی ہے جس کی اردو شاعری نے کسی سیاسی تحریک کی ترجمانی کی"(۷۸) اور بقول غلام حسین ذوالفقار " یہ مثنوی اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ یہ اردو شاعری میں ایک سیاسی تحریک کے سلسلے میں ایک بڑے شاعر کی پہلی شعوری کاوش کا نتیجہ ہے"(۷۹) حکیم مومن خان مومن کا تعلق نہ صرف سید احمد بریلوی سے تھا بلکہ مومن کے والد حضرت شاہ عبد العزیز کے مرید تھے اور سید احمد بریلوی بھی انھیں کے نیاز مندوں میں شامل تھے جن کا تعلق شاہ عبد العزیز اور شاہ ولی اللہ سے تھا۔ یاں ایں ہمہ مومن کا نام بھی شاہ عبد العزیز نے رکھا تھا۔ مومن کے کانوں تک پہلی آواز یعنی مومن کے کانوں میں اذان بھی شاہ عبد العزیز نے دی تھی(۸۰) اس لیے مومن کے دل میں شاہ عبد العزیز اور سید احمد بریلوی شہید کی دلی عقیدت تھی جس کا اثر مومن کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ شاہ عبد العزیز کی تاریخ وفات مومن نے لکھی۔ حکیم مومن خان مومن کو اس تحریک سے وابستہ تمام افراد سے عقیدت و محبت تھی۔ سید بریلوی شہید کے ساتھی اور شاہ عبد العزیز کے رشتہ دار مولوی محمد اسماعیل کی شہادت پر بھی تاریخ وفات لکھی:

محمد عمر (۸۱) کا ہوا انتقال
بزرگ ایسے ہوتے ہیں پیدا کہاں
مجھے سال تاریخ کا تھا خیال
کہ سب نے کہا "مرگ شیخ زماں"

(تاریخ وفات مولوی محمد عمر، مولوی محمد اسماعیل، کلیات مومن، جلد دوم)

مومن خان مومن کے علاوہ کئی معروف و غیر معروف شعرا بھی اس تحریک سے وابستہ ہوئے۔ ان میں مولوی خرم علی بلہوری نے تحریک کے مقاصد کے تحت کئی کتابیں تصنیف و ترجمہ بھی کیں اور ایک رزمیہ مثنوی لکھی تھی جس میں مجاہدین کا حوصلہ بڑھانے اور ان میں جوش اور جذبات پیدا کرنے کے لیے جہاد کی اہمیت، اس کا مقصد اور اس کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ مولوی نصیر الدین نے سانحہ بالاکوٹ کے بعد اس تحریک کو استقامت بخشی تھی۔ ان کا شمار تحریک کے اہم شرکاء میں ہوتا تھا لیکن اس تحریک میں جو مقام مومن کو حاصل ہوا وہ کسی دوسرے شاعر کے حصے میں نہیں آیا۔ اس لیے مومن کی خدمتِ اسلام کی حیثیت کے بارے میں شیخ محمد اکرم نے یوں فرمایا ہے:

> "حالی کو بالعموم مسلمانان ہند کا پہلا قومی شاعر سمجھا جاتا ہے لیکن اگر یہ سوچا جائے کہ مولانا سید احمد بریلوی نے پہلی دفعہ مسلمانان ہند کو دوسری قوموں کے مقابلے میں من حیث الجماعت جمع کیا اور ان کے ایک طبقہ کو مذہبی آزادی دلانے کے لیے اپنی جان قربان کر دی تو یہ ماننا پڑے گا کہ مسلمانان ہند کی جداگانہ قومیت کا اظہار سب سے پہلے انھوں نے کیا۔ اس صورت میں مومن کو مسلمانان ہند کو پہلا قومی شاعر ماننا پڑے گا کیونکہ اس نے مولانا سید احمد شہید کے خیالات کی ترجمانی اس طرح کی جس طرح بعد میں علی گڑھ تحریک کی حالی نے" (۸۲)

گویا علیحدہ قومیت کی داغ بیل اس وقت سے شروع ہو چکی تھی جب مسلمانان برصغیر زوال کا شکار تھے اور مغلیہ سلطنت ہچکولے کھا رہی تھی۔ اردو زبان و ادب میں ملّی شاعری کی داغ بیل بھی اسی زمانے میں پڑی اور مومن اردو زبان و ادب میں ملّی شاعری اور علیحدہ مسلم قومیت کی ترجمانی کا پہلا قومی و ملّی شاعر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

## ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور قومی و ملّی شاعری:

تیمور خاندان کی برصغیر پاک و ہند میں تین سو سال سے زائد عرصہ حکومت رہی جس کی وسعت کابل سے دکن اور کشمیر سے قندھار تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس خاندان کی کامیابی کی بڑی وجہ ہمت و استقلال، جفاکشی، اولوالعزمی اور بہادری جیسی خصوصیات تھیں لیکن بقول اقبال:

حمیت نام ہے جس کا، گئی تیمور کے گھر سے

تاریخی مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر پاک و ہند کی سرزمین میں جو یورپی سیاح آئے ان میں واسکوڈے گاما کو اولیت حاصل ہے جو پندرھویں صدی کے آخر میں چھوٹے بحری بیڑوں کی صورت میں عرب تاجروں کی مدد سے ہندوستان آیا۔ اس کے بعد عہد مغلیہ کے عظیم بادشاہ جلال الدین اکبر کے زمانے میں تین انگریز دربار اکبری میں ملکہ انگلستان کے خط کے ساتھ پیش ہوئے۔ ان انگریزوں کے قائد جان نیوبری نے ملکہ کا خط شہنشاہ اکبر کو پیش کیا۔ اس کی تحریر یوں ہے:

"ملکہ انگلستان کا پر خلوص مکتوب شہنشاہ جلال الدین اکبر والی ہندوستان کے نام میری رعایا کے پر خلوص جذبات اس امر کے متقاضی ہیں کہ دنیا کے ہر خطہ زمین پر بسنے والوں کے ساتھ ان کے تعلقات دوستانہ رہیں اور خیر اندیشانہ جذبات کا مظاہرہ ہوتا رہے۔ جان نیوبری آپ کی مملکت کی حدود میں تجارت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس لیے میں نے جان نیوبری کو خلوص، محبت، نیک نیتی اور دوستی کا پیغام دے کر آپ کی سلطنت میں بھیجا ہے۔ اس امید پر کہ آپ کی فیاضی، مہمان نوازی اور سخاوت ان کو ہر ممکن سہولت دے کر انگلستان کی محبت خرید لے گی۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ انگلستان میں بھی ہر خاص و عام کی زبان پر والی ہندوستان کی فیاضی کے قصیدے ہیں۔ میں امید کرتی ہوں کہ ان تاجروں کو، جو میری رعایا ہیں، ہر قسم کی مدد ملے گی اور ملکہ انگلستان اور رعایا سے دوستانہ تعلقات قائم رہیں گے۔"(۸۳)

اکبر بادشاہ نے فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان تاجروں کو مطلوبہ مراعات عطا کیں۔ اکبر کے بعد ان کے بیٹے جہانگیر کے دور میں انگریزوں نے مزید مراعات کی درخواست کی حتیٰ کہ شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں سر تھامس مور کو انگلستان کے سفیر کی حیثیت سے جگہ مل گئی جس کے بعد انگریزوں نے احمد آباد، سوات اور بمبئ میں اپنے تجارتی مراکز قائم کیے اور چند کارخانے بھی لگائے۔ سترھویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائی میں انھوں نے تجارت کے ساتھ ساتھ زمینیں بھی خریدنی شروع کیں اور عالی شان کوٹھیاں قائم کیں اور سیاسی و معاشی طور پر

اپنے قدم مضبوط کرنا شروع کیے۔ تجارت کی غرض سے آنے والے انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹر کو خط لکھا جس سے ان کی بدنیتی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

"وقت کا تقاضا ہے کہ تجارتی معاملات کی درستگی کے لیے آپ کے ایک ہاتھ میں تلوار بھی ہو"(۸۴)

انگریزوں کی بڑھتی دخل اندازی کو دیکھتے ہوئے شہنشاہ عالمگیر نے انگریزوں کے خلاف کاروائی کا حکم دیتے ہوئے ان کی کوٹھیوں پر قبضہ کر کے انگریزوں کو بے دخل کر دیا۔ جس کے بعد فرنگیوں نے بحری قزاقی شروع کر دی اور ان کا خاص نشانہ حاجیوں کے جہاز ہوتے تھے۔ ان کی بحری قزاقی سے مجبور ہو کر عالمگیر نے دوبارہ فرنگیوں کو تجارت کی اجازت دی اور مقبوضہ کوٹھیاں واپس کر دیں(۸۵) چونکہ مغلیہ بادشاہ خشکی کے ہیرو تھے اور انھوں نے بحری قوت کی طرف کوئی توجہ نہ دی تھی کیونکہ اس سے پہلے کبھی بحری قوت کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی تھی اس لیے شہنشاہ عالمگیر بھی اس نئی قوت کا مکمل خاتمہ نہ کر سکا۔ یہی وہ دور تھا جب برصغیر پاک و ہند کی عوام کے بدقسمت دور کا آغاز ہوا۔ عالمگیر کی زیادہ توجہ فتوحات کی طرف رہی اور انھوں نے مستقل بحری قوت کی طرف کوئی توجہ نہ دی جو برصغیر پاک و ہند کے زوال کا سبب بنی۔

اورنگزیب کی وفات کے بعد جہاں سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں کی طرف سے شورشیں پیدا ہوئیں وہیں انگریزوں نے بھی مغل صوبے داروں کو محصول دینے سے انکار کر دیا بلکہ بنگال میں ان کا محصول معاف ہو گیا تھا کیونکہ ہلمٹن فرخ سیر کے کامیاب معالجہ کے بعد بادشاہ سے بنگال میں بغیر محصول کے تجارت کرنے کے فرمان کی توثیق حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا(۸۶) رہتی کسر ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملہ اور لوٹ کھسوٹ نے پوری کر دی جس کے بعد مغل سلطنت کی آمدنی گھٹنا شروع ہو گئی اور فرنگی قوتوں کی آمدن میں بے پناہ اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ مغلوں کی اندرونی لڑائیوں، ناچاکیوں اور عیاشیوں کا فائدہ جہاں سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں نے اٹھایا وہیں یورپی قوتوں نے بھی اس موقع کو غنیمت جانا اور اپنے استحکام میں اضافے کا سلسلہ جاری رکھا۔ جبکہ انگریزوں نے باقاعدہ طور پر ۱۷۴۳ء سے کرناٹک کی لڑائی میں حصہ لینا شروع کیا اور فرانسیسیوں کو شکست دے کر اپنی دھاک جمالی(۸۷) بنگال میں انگریزوں نے مانک چند، امی چند، جگت سیٹھ اور میر جعفر کو ملا کر سراج الدولہ کے خلاف سازش کی اور ۲۳ جون ۱۷۵۷ء کی لڑائی میں موہن لال اور میر مدن کی بہادری اور جنگ میں تقریباً فتح یاب ہونے کی منزل کے باوجود ان کی سازشوں نے سراج الدولہ کو شکست سے ہمکنار کیا۔ یہ معمولی سی جھڑپ دنیا کی بڑی بڑی جنگوں سے کہیں زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور ۲۲ اکتوبر ۱۷۶۴ء کو شاہ عالم، شجاع الدولہ اور میر قاسم کی متحدہ

افواج کو بکسر کے میدان میں شکست دینے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں ایک اہم سیاسی قوت بن گئی(۸۸)۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں فرنگیوں کی میر جعفر جیسے غداروں کی مدد سے فتح اور حاکم بنگال نواب سراج الدولہ کی شہادت کے بعد سیاسی طور پر انگریز ہندوستان کے مالک بن چکے تھے۔یعنی پلاسی کی لڑائی ہی وہ پہلا اور آخری موڑ تھا جس کے بعد غلامی ہندوستانیوں کا مقدر ٹھہری اور فرنگیوں کو اس جنگ کے بعد برصغیر پاک وہند کی سرزمین پر قدم جمانے سے کوئی نہ روک سکا۔

۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی کا دلی پر حملہ بظاہر تو مغلوں کو مرہٹوں سے نجات دلانے کے لیے تھا لیکن حقیقی طور پر اس حملے نے بھی مغلیہ اقتدار کے زوال میں کیل ٹھونک دیا۔مغلیہ سلطنت معاشی و اقتصادی اور سیاسی طور پر گرفت کمزور پڑ گئی تھی۔۱۷۶۴ء میں جنگ بکسر میں مغلیہ فوجیں اور میر قاسم مل کر بھی فرنگیوں کا مقابلہ نہ کر سکے جس کے نتیجے میں مغلیہ حکومت فرنگیوں کے آگے سرنگوں ہو گئی اور ۱۷۶۵ء میں کٹرا اور اللہ آباد کے علاقوں کی صدیوں کی دیوانی فرنگیوں کو دے دی گئی بقول اکرم اکرام ”جب مسلمان حکمرانوں نے شمشیر وسناں چھوڑ کر طاؤس و رباب اختیار کیے تو مرہٹے ،سکھ، جاٹ، روحیلے اور حتیٰ کہ چند بحری قزاق سب ان پر چڑھ دوڑے۔“(۸۹)۱۷۷۱ء میں مرہٹوں نے شاہ عالم کو اپنا وظیفہ خوار بننے پر مجبور کر دیا۔اس طرح مغل شہنشاہوں کی عظیم سلطنت محدود ہو کر دلی کے لال قلعہ کی چار دیواری تک محدود ہو گئی اور دوسری طرف مختلف علاقوں کے نوابوں،راجوں اور صوبہ داروں نے اپنی اپنی عمل داری قائم کر لی۔

۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے مرہٹوں کی قوت کا خاتمہ کر کے دلی پر اپنا اقتدار قائم کیا اور ساتھ ہی دلی ریذیڈینسی کا قیام عمل میں آیا۔شاہ عالم نے جنرل لارڈ لیک کو فتح کی مبارکباد دی اور بڑے لمبے خطابات ”صمصام الدولہ ، شجاع الملک، خان دوران جنرل لیک بہادر فتح جنگ اور خلعت فاخرہ سے سرفراز کیا“(۹۰) دلی میں ریذیڈینٹ کی تعیناتی کے بعد بادشاہ کی حیثیت برائے نام ہو گئی۔ وہ صرف لال قلعہ تک محدود ہو گیا اور کمپنی کی طرف سے جو وظیفہ مقرر ہوا اس سے صرف دربار اور درباری گزر بسر کرتے۔ دیوانی حقوق،عدلیہ اور دوسرے تمام محکمے برطانوی تسلط میں آ گئے تھے۔بادشاہ کی حیثیت ایک علامتی تھی اور دلی کا کل کرتا دھرتا ریذیڈینٹ تھا۔ شاہ عالم ثانی کی وفات کے بعد ان کے جانشین اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر بھی علامتی بادشاہ تھے۔۱۸۰۳ء سے ۱۸۵۷ء تک دلی میں دلچسپ صورت قائم رہی یعنی دلی کے اصل مالک بادشاہ کی رعایا تھے اور بادشاہ اپنی اس رعایا یعنی ریذیڈینٹ کے احکامات کے سامنے بے بس تھا۔

ریذیڈینٹ اور شہنشاہ کے درمیان اختیارات اور طاقت کا یہ تضاد ۱۸۵۷ء تک قائم رہا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی وجوہات میں ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ برطانوی راج کو ختم کر کے طاقت کا اصل سرچشمہ برصغیر پاک و ہند کا نمائندہ یعنی موروثی وارث کو مقرر کیا جائے۔ پروفیسر اکرم اکرام مسلمانوں کے اس زوال کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "وہ عظیم الشان معاشرہ جو آٹھ سو سال میں بے شمار مسلمان حاکموں، امیروں، وزیروں، عالموں، صوفیوں، عارفوں، ہنرمندوں، شاعروں، فلسفیوں، عابدوں، شہیدوں اور سپاہیوں کی مسلسل جان فشانی سے قائم ہوا تھا ایک سو سال کے اندر اندر بالکل تباہ و برباد ہو گیا۔ اگرچہ اس کی اس تباہی کے متعدد اسباب شمار کیے جاتے ہیں لیکن از روئے تحقیق اگر ان تمام اسباب کا تجزیہ کیا جائے تو تباہی کا صرف ایک ہی سبب سامنے آتا ہے اور وہ اخلاقی انحطاط ہے اور بس" (۹۱)

آزادی کی تحریک جو ۱۸۵۷ء میں ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ تھی۔ اس تحریک کو مختلف مؤرخوں نے الگ الگ نام دیے۔ سر سید احمد خان اس کو بغاوت ہند کے نام سے پکارتے ہیں جبکہ انگریز مصنفین نے سپاہیوں کی بغاوت یا غدر کا نام دیا جبکہ قیام پاکستان کے بعد اسے قومی جنگ آزادی کا نام دیا گیا۔ یہ جنگ آزادی یا بغاوت ہند کسی ایک واقعہ یا حادثہ کی پیداوار نہ تھی بلکہ ایک صدی کی پیداوار تھی۔ کئی ایسے واقعات رونما ہوئے جنھوں نے برصغیر کی عوام کو انگریزوں کے ظلم و ستم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے پر مجبور کر دیا۔ ابو الخیر کشفی فرماتے ہیں:

> "۱۸۵۷ء کی بغاوت کسی منظم تحریک کے طور پر نہیں شروع ہوئی بلکہ انگریزوں کے خلاف اتنا مواد جمع ہو چکا تھا اور لوگوں کی تجارتی، صنعتی اور معاشی ابتری اور بدحالی نے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ وہ اس "بغاوت" سے وابستہ ہوتے چلے گئے اور اسے ایک عوامی تحریک کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس اعتبار سے اسے "عوامی سطح پر جنگ آزادی" قرار دیا جا سکتا ہے۔" (۹۲)

گویا انگریز حکومت نے خود ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ برصغیر پاک و ہند کے لوگ ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اگرچہ یہ تحریک کوئی منظم تحریک نہ تھی لیکن فرنگیوں کے تسلط سے آزادی اہل برصغیر کی مجبوری بھی تھی اور جذبہ ایمان بھی۔ اس تحریک سے پہلے بھی آزادی کی کاوشیں ہو چکی تھیں جن میں شاہ ولی اللہ، سید احمد بریلوی شہید، اور شاہ عبد العزیز جیسی شخصیات تھیں جنھوں نے علم جہاد بلند کیا۔ اگرچہ ان کو شکست ہوئی لیکن بغاوت کی چنگاریاں ابھی تک باقی تھیں جو بڑھتے بڑھتے شعلوں کی شکل اختیار کر گئیں۔

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کے مقام سے بغاوت شروع ہوئی اور بڑی تیزی کے ساتھ پھیل گئی۔ اس بغاوت کی فکری اور عملی قیادت جنرل بخت خان، تاتیا ٹوپے، عظیم اللہ خان، نانا صاحب، خان بہادر خان، کنور سنگھ، رانی لکشمی بائی اور بیگم حضرت محل کے ہاتھ میں تھی۔ اس تحریک کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی شخصیتیں بھی اس میں شامل تھیں اور اس سلسلہ میں مولانا لیاقت علی الہ آبادی اور مولانا احمد اللہ شاہ فیض آبادی قابل ذکر ہیں۔ حب وطنی، دینی تحفظ اور آزادی کی خاطر دہلی سے چالیس میل دور شروع ہونے والی اس بغاوت نے ہتھیاروں کے ساتھ دہلی کی طرف رخ کیا۔ بقول تلمیذ خلدون "میرٹھ کے باغیوں نے ہندوستان کے صدیوں پرانے پایہ تخت دہلی کی طرف تیزی کے ساتھ یلغار کی۔ وہ بغیر کسی بڑی مزاحمت کے دہلی دروازے سے داخل ہوئے۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا محاصرہ کیا اور اس کے شہنشاہ ہونے کا اعلان کیا۔" (۹۳) باغیوں نے بہادر شاہ ظفر کو شہنشاہ تسلیم کر لیا اور اس کے گرد تمام لوگ اکٹھے ہونے شروع ہو گئے۔ باغیوں نے بادشاہ سے اس بغاوت میں ساتھ دینے کا کہا اور مالی و عسکری مدد کی بھی درخواست کی تو بادشاہ نے فرمایا "میں بالکل عاجز ہوں، میرے تمام ملازمین کا دماغ الٹ گیا ہے یا وہ بھاگ گئے ہیں۔ میں تنہا رہ گیا ہوں۔ میرے پاس فوج نہیں ہے جو میرا حکم مانے۔ ایسی حالت میں میں کیا کر سکتا ہوں؟" (۹۴)

بہادر شاہ ظفر حالات کے دباؤ کے تحت اس تحریک میں شامل تو ہو گئے تھے لیکن ان میں تیمور خاندان کی جرأت باقی تھی اور نہ بابر کی طرح صبر و استقلال، بہادر شاہ ظفر ایک فقیرانہ زندگی بسر کر رہے تھے جو فرنگی سرکار کے وظیفہ سے چلتی تھی۔ اس کے علاوہ بہادر شاہ اور اس کے ساتھیوں اور شہزادوں کے پاس کوئی جنگی تجربہ بھی نہ تھا۔ اس تمام صورت حال کے باوجود بادشاہ نے تحریک آزادی کے مجاہدین کا ساتھ دینے کا اعلان کیا اور ساتھ اپنی مجبوری و کسمپرسی بھی ان پر ظاہر کر دی کیونکہ اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی راستہ نہ تھا۔ بلاشبہ اس سے بادشاہ کے کردار میں وہ جان نظر نہیں آتی جو ایک شہنشاہ کا خاصہ ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ اس حد تک مجبور محض تھا کہ قلعہ لال حویلی کے اندر بھی کوئی اتفاق نہ تھا کہ انگریزوں کا مقابلہ کیا جا سکتا۔ فوج کا اس موقع پر بھاگ جانا یا ساتھ چھوڑ دینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ بادشاہ کے پاس خزانہ بھی نہ تھا کہ ان کو تنخواہیں دے سکے۔ بادشاہ خود تنخواہ دار تھا اور جب یہ تنخواہ بھی رک گئی تو بہادر شاہ بے بس و لاچار انسان سے زیادہ کچھ نہ رہا۔ اس صورت حال میں جب بہادر شاہ ظفر کے پاس ہتھیار اٹھانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کیونکہ وہ مجاہدین کے دباؤ میں تھے، تو انھوں نے اپنے بیٹے مرزا مغل کو مجاہدین اور فوج کا سپہ سالار مقرر کیا جس کے پاس کوئی عسکری تجربہ نہ تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرنگی افواج شہر میں داخل ہو گئیں اور انھیں کسی خاص مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ انگریز

افواج کے شہر میں داخل ہونے کے بعد قتل و غارت کا بازار گرم ہوا تو بہادر شاہ ظفر اپنے اہل خانہ کے ساتھ بے سروسامانی میں لال قلعہ سے نکلے اور ہمایوں کے مقبرہ میں پہنچے۔ بقول ظہیر دہلوی:

> "اس وقت خلقت کا اضطراب اور خرابی پریشانی اور بے سروسامانی اور مستورات پردہ نشین جنھوں نے عمر بھر کبھی ایک قدم باہر نہیں رکھا تھا، ان کا گھبراہٹ میں سروپا برہنہ نکلنا اور بچوں کا واویلا کا شور اور گھبراہٹ کا حال دیکھنے سے کلیجے کے ٹکڑے ہوئے جاتے تھے۔ جس شخص کی نظر سے وہ معرکہ گزرا ہے کچھ وہی خوب جانتا ہے۔"(۹۵)

قلعہ سے نکلنے کے بعد مقبرہ ہمایوں میں پہنچنے سے قبل جنرل بخت خان (۹۶) نے بہادر شاہ ظفر کو اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن مرزا الٰہی بخش جو بادشاہ کا چچا تھا، نے بادشاہ کو ایسا کرنے سے روک لیا۔ بہادر شاہ نے جنرل بخت کو اگلے دن تک غور کرنے کے لیے کہا۔ جب اگلے دن جنرل بخت خان نے دوبارہ بادشاہ کو اصرار کے ساتھ اپنے ساتھ چلنے کو کہا تو بادشاہ نے آخر میں یہ جواب دیا:

> "بہادر! مجھے تمھاری ہر بات کا یقین ہے اور میں تیری ہر رائے کو دل سے پسند کرتا ہوں مگر جسم کی قوت نے جواب دے دیا ہے۔ اس لیے میں اپنا معاملہ تقدیر کے حوالے کرتا ہوں۔ مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دو اور بسم اللہ کرو۔ یہاں سے جاؤ اور کچھ کام کر کے دکھاؤ۔ میں نہیں، میرے خاندان میں سے نہیں نہ سہی، تم یا کوئی اور ہندوستان کی لاج رکھے۔ ہمارا فکر نہ کرو، اپنے فرض کو انجام دو۔"(۹۷)

اس کے ایک دن بعد بادشاہ کو اہل و عیال سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ مرزا الٰہی بخش شہزادے کی نشاندہی پر تیس شہزادگان دہلی کو، کہ ان میں بادشاہ کے بیٹے، پوتے، نواسے اور داماد تھے، گرفتار کر لیا گیا اور بیرون دروازہ دہلی سے ان کو قتل کرا کے ان کے سر کٹوا کر بادشاہ کے پاس بھیج دیے (۹۸) اس کے بعد دہلی شہر میں فرنگیوں کا قبضہ ہو گیا یوں فرنگی پورے ہندوستان میں غیر منظم تحریک آزادی اور اس کے مجاہدین کو کچلنے میں کامیاب ہو گئے۔ بادشاہ کے آخری ایام برما کے شہر رنگون میں قید کی حالت میں گزرے اور وہیں ان کا آیامِ قفس میں انتقال ہوا۔

جنگ آزادی کے پس منظر میں قومی و ملّی شاعری کو دیکھا جائے تو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے وقت صورت حال کچھ ایسی ہی تھی کہ شعرا اور ادباء کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ فرنگی چن چن کر انقلابیوں کو پھانسی لگا رہے تھے۔ مزید اس میں بہت سے ایسے بے گناہ لوگ بھی انگریز سرکار کے عتاب کا جزو بن گئے جن کا انقلاب یا بغاوت سے کوئی سروکار بھی نہ تھا۔ ان میں کئی شعرا کو بھی پھانسی یا قید کی سزا سنائی گئی۔ ابو الخیر کشفی لکھتے

ہیں کہ چاندنی چوک کا شاید ہی کوئی درخت ایسا ہو جس پر کسی مسلمان کو سولی نہ دی گئی ہو مسلمانوں سے خاص کر عداوت تھی کیونکہ انگریزوں کا خیال تھا کہ مسلمان قوم ہی دوبارہ ان کے خلاف بر سرپیکار ہو کر ان کے اقتدار کے لیے خطرہ پیدا کر سکتی تھی"(۹۹)اس کے باوجود برصغیر کے بیشتر شاعروں میں جذبہ حریت، قومی حمیت اور حب الوطنی سے لبریز قومی و ملّی نغمہ شاعری کسی قدر کم نہ ہوئی اور انھوں نے فرنگیوں کے ظلم و ستم کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ اس میں نہ صرف معروف شاعر شامل تھے بلکہ مقامی لوگوں نے بھی لوک گیتوں میں فرنگیوں سے نفرت کا اظہار کیا ہے بقول پی۔ سی جوشی" نہ صرف اس بغاوت کو منظم کرنے والے اعلیٰ طبقے نے ادنیٰ درجے کے لوگوں میں انقلاب کا پرچار کرنے کے لیے روایتی لوک گیتوں کا استعمال کیا بلکہ عوام میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ اس قدر جوش کے ساتھ ابھر رہا تھا کہ ۱۸۵۷ء سے متعلق لوک گیتوں کی بھرمار ہو گئی۔ یہ لوک گیت گمنام مگر حقیقتاً ذہین عوامی شعرانے مرتب کیے تھے۔"(۱۰۰)گمنامی کی بڑی وجہ فرنگیوں کا ڈر تھا لیکن جذبہ حب الوطنی اور قومی غیرت نے ان شعرا کو شعری اظہار پر مجبور کر دیا۔ پی سی جوشی نے ان لوک گیتوں کو اردو ترجمہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ذیل میں چند لوک گیت اردو میں پیش کیے جاتے ہیں۔ جن میں قومی حمیت دیکھنے میں آتی ہے۔

دریا میں تلاطم بپا ہے
انگلستان بہت دور ہے
جلدی کر جلدی، اے
دغا باز فرنگی! بھاگ جا(۱۰۱)

سب سے پہلے میرٹھ میں علم بغاوت بلند ہوا اور وہاں کے دیسی سپاہیوں نے انگریز سرکار کا حکم ماننے سے انکار کرتے ہوئے اپنے افسر کو گولی مار دی اور بہت سے قیدیوں کو چھڑا کر دلی کا رخ کیا تو اس وقت فرنگیوں کی ایک دل آویز تصویر کھینچی گئی ہے جو میرٹھ سے متعلق ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ گیت کسی سپاہی نے لکھا ہے جس میں اس کی خود اعتمادی نمایاں ہے۔

آہا! آؤ اور دیکھو
میرٹھ کے بازار میں
فرنگی کو گھیر کر مارا گیا ہے
گورے کو گھیر کر پیٹا گیا ہے
میرٹھ کے کھلے بازار میں
دیکھو! آہا، دیکھو (اسے کس طرح پیٹا جا رہا ہے) (۱۰۲)

ان لوک گیتوں کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کسی مسلمان شاعر کی آواز ہیں یا کسی ہندو شاعر کی لیکن چونکہ ۱۸۵۷ء کی جنگ ہندوستان کی تمام اقوام اور مذاہب نے مل کر لڑی تھی۔ یہ جنگ ہندوستانیوں کی مشترکہ جدوجہدِ آزادی تھی اس لیے تمام اقوام کے باشندوں نے یک جان ہو کر ہندوستانی خطۂ ارض کی حفاظت کے لیے اپنی جان کے نذرانے پیش کیے۔ یہ لوک گیت مقامی زبانوں اور گمنام شعرا کے لکھے ہوئے ہیں۔ اردو زبان و ادب میں اس سانحے کے حوالے سے شعرانے فرنگی فوجیوں کے ظلم و ستم اور وطنی محبت و عقیدت پر قومی حمیت کا عملی ثبوت دیا ہے۔ اردو زبان برصغیر پاک و ہند میں تمام اقوام اور ان کے کلچر کا بڑا مظہر تھی لہٰذا اس کے شعرانے عملاً بھی اس جنگ میں حصہ لیا اور انگریز کے انتقام کا نشانہ بھی بنے۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر رنگون بھیجے گئے۔ واجد علی شاہ اختر مٹیابرج میں قید ہوئے۔ منیر شکوہ آبادی کو کالے پانی کی سزا ہوئی۔ صہبائی کو شہید کیا گیا۔ اردو کے نامور شاعر مرزا اسد اللہ غالب نے ۱۸۵۷ء کی جنگ کے موقع پر دلی شہر کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

بسکہ فعال مایرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب ، انساں کا
چوک جس کو کہیں ، وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
تشنہ خوں ہے ہر مسلماں کا

(قطعہ غالب، دیوانِ غالب)

غالب اردو کے ایسے شاعر ہیں کہ دلی کی تباہی اور بربادی کے وقت دلی شہر میں ہوتے ہوئے جن کا اس قطعہ کے علاوہ سوائے اکا دکا شعر کے کوئی کلام شعری دہلی کی تباہی و بربادی کے بارے نہیں ملتا۔ بلکہ اس کے برعکس غالب کے نثری کلام میں یعنی دوستوں کو لکھے گئے خطوط میں دلی کی تباہی کا ذکر ملتا ہے۔ غالب کی اس خموشی کے پیچھے کیا راز کار فرما تھا اس کا یہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ غالب ہندوستانی فوج کے پسپا ہونے اور انگریزوں کے غلبے کا بخوبی اندازہ لگا چکے تھے اور وہ جنگ کے بعد کے حالات کو بھی سمجھتے تھے۔ اس کے بعد غالب کی ان دنوں کی سرگزشت جو "دستنبو" کے نام سے شائع ہوئی اس میں غالب نے خود کو اس تحریک سے الگ تھلگ پیش کیا ہے جبکہ اس کے آخر میں لکھا گیا ملکہ وکٹوریہ کی شان میں قصیدہ اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ غالب نے تمام چیزوں

سے زیادہ خود کی سلامتی کو ترجیح دی۔ ابو الخیر کشفی غالب کی شخصیت کے اس بڑے تضاد کے بارے لکھتے ہیں" دستنبو حاکموں کے حضور غالب کا تحفہ غلامی ہے اور خطوط و اشعار دل کی آواز "(۱۰۳)ظاہر ہے غالب بھی ایک انسان تھے۔ اوران میں باقی انسانوں کی طرح کمزوریاں پائی جاتی تھیں۔

غالب کی شخصیت بیدار مغز اور جامع صفحات پر مبنی ہے۔وہ حالات کا رخ بدلنے پر اس کے ساتھ چلنا جانتے تھے۔غالب اور اس کا خاندان طویل عرصہ سے کمپنی کا تنخواہ دار تھا۔ غالب کا ان اوقات میں گزر بسر کے لیے پینشن کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ پنشن کی بحالی کے لیے غالب نے کلکتہ تک کے سفر کیے تھے اس لیے وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس لڑائی میں مفت میں پھنس جاؤں اور انھوں نے اپنی زندگی بچانے کو اولین ترجیح دی۔ بصورت دیگر غالب پر غداری کا شک کیا جا سکتا تھا کیونکہ غالب کے لال قلعہ سے دیرینہ تعلقات تھے اور وہ ذوق کے بعد بہادر شاہ ظفر کے شاعری میں استاد بھی تھے۔اس لیے انھوں نے الگ تھلگ رہنے میں عافیت سمجھی۔

برصغیر کے مسلمان حکمرانوں میں سیاسی بصیرت اپنی جگہ لیکن بیشتر حکمران شاعر بھی گزرے ہیں جن میں دکن کے بادشاہ اولیت رکھتے ہیں۔ برصغیر پاک وہند کا مرکز دہلی تھا اور دہلی کے زمانہ آخر کے بادشاہوں میں چند ایک شعرا ہوئے جن میں شاہ عالم ثانی، نواب آصف الدولہ، مرزا جہاں بخت جہاں دار، نواب غازی الدین خان، مرزا سلیمان شکوہ اور بہادر شاہ ظفر قابل ذکر ہیں۔ بہادر شاہ ظفر برصغیر پاک وہند کے آخری مسلمان بادشاہ اور مغلیہ خاندان کا آخری چشم و چراغ تھے۔ وہ بادشاہ ہونے کے ساتھ ایک درویش اور صوفی صفت انسان تھے۔ وہ ایسے بادشاہ تھے جو بے اختیار اور کمپنی کے ماتحت تھے اپنی بے بسی کا ذکر اکثر اپنی شاعری میں کرتے ہیں۔

کیا طائر اسیر وہ پرواز کر سکے
جس میں نہ اتنا دم ہو کہ آواز کر سکے

(شکوہ روزگار، نشیدِ حریت)

بہادر شاہ ظفر کی ساری زندگی مصائب کا شکار رہی اور آخر میں قبر بھی اپنے دیس میں نصیب نہ ہوئی۔ رنگون میں قید کے دوران ہی وفات پائی اور اس جگہ رات کے اندھیرے میں دفن کر کے قبر کو مٹا دیا گیا۔ یوں مغلیہ اقتدار کا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ ہزاروں میل دور سے آئے فرنگی اپنی ریشہ دوانیوں اور میر جعفر و صادق جیسے غدار پیدا کر کے ہندوستان کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

ظہیر دہلوی بہادر شاہ ظفر کے اکابرین میں تھے۔ ظہیر دہلوی نے ناکام جنگ آزادی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ انھوں نے ”داستان غدر“ میں غدر کے حالات افسانوں کی صورت میں بیان کیے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنی شاعری میں بھی ان واقعات کو بیان کیا ہے۔ ”فغان دہلی“ میں ظہیر احمد دہلوی کی شامل ایک غزل دہلی کی تباہی کے منظر کی عکاسی کرتی ہے۔

مل گئی خاک میں سب شوکت و شان دہلی
نہ رہا نام کو بھی نام و نشان دہلی
اے فلک اپنے گریباں میں منہ ڈال ذرا
ہائے یہ ظلم و ستم اور کسان دہلی
رہ گئے کہنے کو کچھ کچھ ہیں فسانے باقی
اب نہ دہلی ہی رہی اور نہ زبانِ دہلی

(ظہیر دہلوی، مشمولہ، فغان دہلی)

ظہیر الدین ظہیر دہلوی نے غدر کا آنکھوں دیکھا حال کی لفظی تصویر کھینچنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ ظہیر کا شہر آشوب جو سقوط دہلی کے تمام واقعات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ جب کہ اس کا اندازِ بیان ایسا ہے کہ انگریزوں کے ظلم و ستم کا نقشہ آنکھوں میں تیرنے لگتا ہے۔

یہ وہ الم ہے کہ اس غم سے سب ہلاک ہوئے
لگا کے چرخ سے بے چین تا سماک ہوئے
ہلاک گود میں آسودگان خاک ہوئے
کفن بھی ساتھ گریباں کے چاک چاک ہوئے
نہ روز حشر سے کم تھی عذاب کی صورت
خدا دکھائے نہ اس انقلاب کی صورت

(شہر آشوب، فغانِ دہلی)

ظہیر دہلوی نے مسدس شہر آشوب میں جن واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ مغلیہ خاندان اور دہلی والوں کی موت و تباہی کے عناصر تھے جو کسی قیامت سے کم نہ تھے۔ یہ شہر آشوب جزیات نگاری اور واقعات کی صحیح عکاسی کے حوالے سے تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ شاعر اس منظر کو بیان کرنے کے ساتھ ایسے انقلاب سے پناہ بھی مانگتا ہے کیونکہ ظہیر دہلوی کے خیال میں مغلیہ خاندان اور دہلی کی تباہی کے ذمہ دار انقلابی یعنی باغی تھے۔

ظہیر اس بات کا ذکر کھلم کھلا شہر آشوب میں کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ظہیر دہلوی کی اس مسدس شہر آشوب میں دہلی شہر اور مغلیہ خاندان کے خاتمہ کی جو داستان رقم ہوئی ہے وہ تاریخی لحاظ سے ایک خوبصورت اور فنی لحاظ سے بہترین کاوش ہے۔

اسی طرح کا ایک اور درد و الم سے بھرپور شہر آشوب مفتی صدرالدین آزردہ کا ہے۔ مفتی آزردہ نے شہر آشوب میں حقائق کو بیان کیا ہے۔ وہ خود بھی اس آزادی کی جنگ میں شریک تھے۔ مفتی ان لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا تھا۔ ان علماء کرام کے ساتھ آزردہ کے دستخط بھی تھے۔ چنانچہ تحریک آزادی کی ناکامی اور انگریزوں کی کامیابی کے بعد فرنگیوں نے جن لوگوں پر مقدمات بنائے ان میں آزردہ کا نام بھی قابل ذکر تھا۔ چنانچہ انھیں پایۂ زنجیر کر کے زندان میں ڈال دیا گیا اور تمام جائیداد و کتب خانہ ضبط کر لیا گیا(۱۰۴) آزردہ نے شہر آشوب میں نہ صرف دلی کی تباہی و بربادی کا ماتم کیا ہے بلکہ اس میں امرا و شرفا کی نااہلی کو طنزاً بیان کیا گیا ہے۔

جن کو دنیا میں کسی سے بھی سروکار نہ تھا
اہل و نا اہل سے خلطہ انھیں زنہار نہ تھا
ان کی خلوت سے کوئی واقف اسرار نہ تھا
آدمی کیا تھے فرشتہ کا بھی واں بار نہ تھا
وہ گلی کوچوں میں پھرتے ہیں پریشاں در در
خاک بھی ملتی نہیں ان کو کہ ڈالیں سر پر (افسانہ عبرت، نشیدِ حریت)

یعنی بغاوت سے پہلے اہل اشرافیہ اور حکمران طبقہ کی یہ حالت تھی کہ وہ عام آدمی سے ملنا بھی گوارا نہ کرتے تھے بلکہ رعایا اور حکمران طبقے کی الگ الگ دنیا قائم تھی۔ لیکن غدر کے واقعے کے بعد سب کچھ بدل گیا اور وہ لوگ جو عام آدمی سے بات کرنا گوارا نہ کرتے تھے، غدر کے بعد گلی کوچوں میں اس پریشان حالی میں پھرتے ہیں کہ کوئی حال واحوال پوچھنے والا بھی نہیں تھا۔

شہر آشوب میں آزردہ کو اپنے دوست نواب مصطفی خان شیفتہ کی یاد آتی ہے جو غدر میں انگریزوں کے سخت خلاف تھے اور اس پاداش میں ان دنوں پابند سلاسل تھے۔

ٹکڑے ہوتا ہے جگر جی ہی پہ بن جاتی ہے
مصطفٰی خان کی ملاقات جو یاد آتی ہے (افسانہ عبرت، نشیدِ حریت)

شہر آشوب کے آخری شعر میں آزردہ نے مولوی امام بخش صہبائی کا ذکر کیا ہے جو عربی اور فارسی کے عالم تھے اور اردو کے شاعر بھی۔ مولوی امام بخش صہبائی کو خاندان کے ہمراہ غدر کے جرم کی پاداش میں پھانسی دے دی گئی۔

کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو (افسانہ عبرت، نشیدِ حریت)

مفتی صدرالدین آزردہ کا شہر آشوب صداقت کا امین ہے اور ان دنوں ایسی صداقت بیان کرنے کے لیے حوصلے اور ہمت کی ضرورت تھی جو آزردہ کے کلام میں نظر آتی ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے وقت بہت سے شعرا کا کلام ضائع بھی ہو گیا اس کی وجہ شعرا کے آزادی میں حصہ لینے اور پکڑے جانے کے بعد سب کچھ انگریز کی تحویل میں آگیا۔ غالب کی طرح بہت سے شعرا نے اپنی سلامتی چاہتے ہوئے چپ بھی سادھ لی۔ فغان دہلی میں حکیم محمد تقی سوزاں کا مسدس بھی شامل ہے۔ سوزاں مقامی باغی لوگوں کے سخت خلاف تھے۔ سوزاں ہندوستانی فوج کے بارے لکھتے ہیں کہ انھوں نے اوباشوں کو ساتھ ملا لیا اور فرنگیوں کا بہانہ کر کے گھروں کو لوٹ لیتے۔

یہاں کے جتنے تھے اوباش مل کے ان کے ساتھ
کیا بتائیں تمھیں زر کے ہاتھ آنے کی گھات
مگر یہ شرط ہے کچھ آئے گر ہمارے ساتھ
برائے نام نکالی یہ لوٹنے کی بات
جو اونچا گھر کوئی تکتے تو اس پہ چڑھ جاتے
فرنگی اس میں ہے یہ کہ کے گھر کو لٹواتے (مسدس شہر آشوب، فغانِ دہلی)

قربان علی سالک کو ان شعرا میں شامل کیا گیا ہے جنھوں نے حقیقت پسندانہ عزائم سے ان واقعات کی حقیقی منظر نگاری کی ہے۔ انھوں نے فرنگی اور ہندوستانی دونوں کے ظلم و ستم کو قلم کیا ہے۔ وہ ہندوستانیوں کی کوئی خطا سمجھتے ہیں کہ جس کی سزا کے طور پر خوفناک تباہی و بربادی مقدر بنی تھی۔

یہ شہر کس لیے برباد ہو گیا یا رب
لگی کسی کی یہ کیا ایسی بددعا یا رب
یہاں سے لوگوں سے کیا ہو گئی خطا یارب
ہوئے ہیں کس لیے یہ موردِ جفا یا رب

غرض تھی غدر سے ہوویں گناہ گار ثقات

وگرنہ ہوتے نہ ہرگز سزائے دار ثقات (مسدس شہر آشوب، فغانِ دہلی)

نواب مرزا داغ دہلوی کا تعلق بھی اسی زمانے سے ہے۔ انھوں نے لال قلعہ میں پرورش پائی۔ غدر کے دنوں میں وہ بھی متاثر ہوئے۔ وہ پوربیوں کو "خدا کا قہر" کہتے ہیں:

غضب میں آئی رعیت بلا میں شہر آیا

یہ پوربی نہیں آئے خدا کا قہر آیا (مسدس شہر آشوب، فغانِ دہلی)

میر ببر علی انیس غدر کے بعد حالات کے یکسر بدل جانے اور مال داروں کے فقیر بننے کی صورت حال کو ان الفاظ میں بیاں کرتے ہیں:

جو خلق میں تھے صاحب تخت و علم و تاج

نوبت یہ ہوئی ہے کہ نشاں ان کے نہیں آج

شاہان جہاں فخر سے دیتے تھے جنھیں باج

وہ قبر میں ہیں سورہ الحمد کے محتاج (نیرنگی عالم، نشیدِ حریت)

جنگ آزادی کے ان مجاہد شعرا کے علاوہ کئی شعرا ایسے تھے جنھوں نے جنگ آزادی اور اس کے بعد کی برصغیر پاک وہند کی عوام الناس کی صورت حال کے متعلق قلم اٹھایا۔ ان مجاہدین نے عوام میں جوش جہاد پیدا کرنے، لشکر کو ولولہ وعزم بڑھانے اور عوام الناس کی دلجوئی کے لیے شعری ونثری ادب میں اظہار بیاں کیا ہے۔ اس دور کی شاعری میں مایوسی اور احساس محرومی کی بھرمار ہے۔ خاص کر غدر کے بعد ابتدائی ایام کا ادب تو قنوطیت سے لبریز ہے۔ غلام حسین ذوالفقار غدر کے فوراًبعد کے ادب بارے رقم طراز ہیں کہ بزمِ آخر کی آرزوؤں اور تمناؤں کی تپش کو انقلاب ۱۸۵۷ء کے خونیں سیلاب نے ٹھنڈا کر دیا اور داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی شمع بھی کشتہ ہو کر رہ گئی۔ شب رفتہ کے پر شوکت ہنگامے تہ خاک سو گئے" (۱۰۵) الغرض اس دور کی شاعری شعرا کی ذہنی کشمکش اور پرانی ہندوستانی تہذیب کے مٹنے کا درد ہے جس میں شعرا آپ بیتی اور ہندوستانی معاشرے کے سیاسی زوال کے ساتھ تہذیبی اور ثقافتی زوال کا ماتم کرتے نظر آتے ہیں۔

پاک وہند برصغیر کی تاریخ میں انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے جس میں ثقافت، معاشرت، سیاست اور تہذیب سمیت سب کچھ پہلے سے یکسر مختلف ہے۔ نیز مشترکہ ہندوستانی معاشرے سے نیا مغربی تصور قومیت جنم لیتا ہے جس نے ہندو اور مسلمان کو ایک الگ قوم کے ساتھ حب وطن اور حب قوم کے احساس سے بیدار کیا۔

## جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد اردو میں قومی وملّی شاعری:

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد جہاں برصغیر پاک وہند مکمل طور پر غلامی کی دلدل میں پھنس گیا تو دوسری طرف برصغیر کی قوموں کے لیے نشاۃ ثانیہ کے دور کا آغاز ہوا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہندوستانی معاشرہ کی تہذیب و ثقافت برقرار رہیں تھیں۔ اس کی وجہ ہندوستان کا مرکز دلی کا شہنشاہ تھا۔ اگرچہ جنگ آزادی سے پہلے ہندوستانی معاشرہ سیاسی طور پر زوال کا شکار تھا اور ہندوستان کئی چھوٹی بڑی ریاستوں میں بھی تقسیم ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ ان ریاستوں کے نئے نئے راجہ، مہاراجہ اور بادشاہ بھی بن بیٹھے تھے لیکن شہنشاہ کا خطاب صرف دلی کے بادشاہ کے لیے مخصوص تھا۔ دلی کا شہنشاہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا علم بردار تھا۔ جنگ آزادی ہندوستان کی تہذیب و ثقافت کو غیر ہندوستانیوں کے اثر سے بچانے کی مشترکہ کوشش تھی۔ اس لیے اس جنگ میں تمام اقوام اور مذاہب نے حصہ لیا تھا یہ جنگ کسی ایک قوم اور مذہب کی جنگ نہ تھی بلکہ مشرقی روایات کو مغربی اثر سے محفوظ رکھنے کے لیے ذاتی عناد و مفاد کو پس پشت ڈال کر (جن لوگوں نے جنگ میں حصہ نہیں لیا یا انگریزوں کا ساتھ دیا اس گروہ میں بھی تمام اقوام اور مذاہب کے افراد شامل تھے) قومی یکجہتی کا عملّی ثبوت پیش کیا بقول سید مجاور حسین "اس لڑائی میں ہندوستانیوں کو شکست ہوئی مگر اس لڑائی میں قومی یکجہتی کا اہم عنصر بھرپور طریقے سے ابھرا اور وہ عنصر تھا مشترکہ جدوجہد۔ ۱۸۵۷ء کے درد کو ہندوستانیوں نے اجتمائی طور پر محسوس کیا کیونکہ یہ مشترکہ درد تھا" (۱۰۶) بنیادی طور پر یہ جنگ برصغیر کے عوام نے لڑی تھی۔ بادشاہ وامرا میں اگر کسی کا اس میں ذاتی مفاد تھا تو اس نے شمولیت اختیار کی علاوہ ازیں اس میں جاگیرداروں اور وڈیروں جو ہندوستان کی اشرافیہ تسلیم کیے جاتے تھے، اس جنگ سے خائف تھے اور پس پردہ انھوں نے انگریزوں کی پشت پناہی کی تھی۔ کئی جگھوں پر مجاہدین کو کچلنے والے خود ہندوستانی وڈیرے تھے جو انگریزوں کی خوشنودی کے لیے ایسا کر رہے تھے جن کو انگریزوں نے بعد میں بڑی بڑی جاگیریں بھی عطا کیں۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے ذاتی مفاد کی خاطر قومی مفاد کا سودا کیا۔ ہر شہر اور ہر علاقے سے کئی میر جعفر اور میر صادق نکلے۔ ہندوستان میں انگریز کا قبضہ اور مجاہدین و ہندوستانی قوم کی شکست بنیادی طور پر ان غداروں کی کارگزاری کا سبب تھی۔ بہادر شاہ ظفر نے مجبوراً مجاہدین کا ساتھ تو دیا لیکن وہ دل سے نہیں چاہتے تھے کہ ایسی نوبت آئے یہی حال لکھنؤ کے بادشاہ واجد علی شاہ کا تھا۔ یہ جنگ قومی غیرت، وطنی محبت، مذہبی فرض اور سیاسی بیداری کی جنگ تھی جس میں صرف ان عوام نے ہی حصہ لیا تھا جن میں یہ عناصر ابھی تک موجود تھے۔ گو کہ ہندوستان والوں کو اس جنگ میں شکست ہوئی لیکن اس کے بعد سیاسی شعور کی بیداری، حب الوطنی کے عناصر اور مذہبی فرائض کا احساس پہلے کی نسبت شدت اختیار کر گیا۔ علی جواد زیدی لکھتے ہیں:

”بظاہر آخری نتائج کے اعتبار سے، ہم یہ جنگ ہار گئے لیکن اس نقطے سے ایک نئی فتح بھی شروع ہوئی۔ اس جنگ نے سارے ملک کو اس سرے سے اس سرے تک چونکا دیا اور عوام و خواص میں نیا قومی اور وطنی احساس پیدا کر دیا۔“(۱۰۷)

۱۸۵۷ء کی جنگ خالص عوامی جنگ تھی اور اس میں بادشاہ و امرا کا کوئی خاص کردار نہیں ہے بلکہ عوام ان علامتی بادشاہوں کو دوبارہ ہندوستان کی طاقت دیکھنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ بخت خان نے بہادر شاہ ظفر کو شہنشاہ ہند تسلیم کیا تھا ایسا ہی واقعہ لکھنؤ میں بھی پیش آیا جب مولوی احمد اللہ کو انگریزوں نے گرفتار کر کے قید کر لیا اور پھانسی کی سزا دے دی تو ان کو تختہ دار سے بچانے کے لیے فیض آباد کے گردونواح میں جو زبردست عوامی تحریک چلی اس کے قائد صوبہ دار دلیپ سنگھ تھے۔ انھوں نے فیض آباد کے تمام انگریز افسروں کو قید کر کے فیض آباد کی آزادی کا اعلان کر دیا پھر ہندوستانی سپاہیوں اور جنتا کی بہت بڑی بھیڑ جیل کی دیواروں کو توڑ کر مولوی احمد اللہ کو وہاں سے رہا کرا لائی۔ لیکن صوبہ دار دلیپ سنگھ نے فیض آباد کی حکومت اپنے پاس نہیں رکھی بلکہ مولوی احمد اللہ کے سپرد کر دی۔ مولوی احمد اللہ نے فوراً اعلان کیا کہ بادشاہ اصلی واجد علی شاہ ہیں!“(۱۰۸) اس واقعہ سے ہم بنیادی طور پر یہ نتائج اخذ کر سکتے ہیں کہ اول ہندوستان کی تمام اقوام نے یہ جنگ قومی یکجہتی کے تحت لڑی۔ تمام مذاہب اور اقوام نے فرقہ وارانہ تضادات کو پس پشت ڈال دیا۔

دوّم جو لوگ یہ جنگ لڑ رہے تھے وہ قومی حمیت کے لیے لڑ رہے تھے، ان کو اقتدار کی کوئی حوس نہیں تھی بلکہ وہ اپنی تہذیب و روایات کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ برصغیر کے بادشاہ جن کو ان مجاہدین کی رہنمائی کرنی چاہیے تھی اور برصغیر کی آزادی کے لیے جہادی گروہوں کی کمان خود سنبھالنی چاہیے تھی۔ وہ بھی انگریزوں سے ہمدردی کی امید لگائے بیٹھے تھے اس سے ان کی حمیت و حب الوطنی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

انگریزوں سے برصغیر کی عوام و مجاہدین کی شکست کے بعد ظلم و ستم کی ایک داستان شروع ہوتی ہے اور اس داستان کو چند شعرا نے قومی و ملّی جذبے کے تحت شعری ادب کا حصہ بنایا۔ سن ستاون اور اس کے بعد چند سالوں تک شعرا جنگ آزادی کے قصوں، وارداتوں اور ظلم و ستم کی حکایات پر شعری ادب میں نوحہ کناں رہے لیکن جلد ہی ایک نئے جذبے اور احساس کے تحت نئے دور کا آغاز ہوا۔ مذہبی اور اصلاحی تحریکیں شروع ہو گئیں جنھوں نے برصغیر کی عوام کو اس قنوطی دور سے یاس و امید کی طرف گامزن کیا۔ ان تحریکوں میں سرسید اور ان کے ساتھیوں کا کردار جاندار رہے۔ سرسید بیدار مغز شخصیت کے مالک تھے۔ وہ گزرے ہوئے اور آنے والے حالات پر بخوبی نظر رکھے ہوئے تھے۔ بقول اشتیاق حسین قریشی ”انھیں اس کا یقین تھا کہ بغاوت ایک غلطی تھی

کیونکہ برطانیہ اس قدر زیادہ مستحکم ہو چکا تھا کہ ان طریقوں سے اسے متزلزل نہیں کیا جا سکتا تھا۔"(۱۰۹)انھوں نے برطانوی حکمرانوں کا غصہ فرو کرنے کے لیے "رسالہ اسباب بغاوت ہند" لکھ کر برطانوی حکام کو یہ غلطی باور کرانے کی کوشش کی۔ سرسید لکھتے ہیں:

"۱۸۵۷ء کی سرکشی میں یہی ہوا تھا کہ بہت سی باتے ں ایک مدت دراز سے لوگوں کے دل میں جمع ہوتی جاتی تھیں اور بہت بڑا میگزین جمع ہو گیا تھا صرف اس کے شتابے میں آگ لگانا باقی تھی کہ سال گذشتہ میں فوج کی بغاوت نے اس میں آگ لگا دی۔"(۱۱۰)

سرسید نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ یہ جنگ صرف مسلمانوں کی نہیں ہے اور یہ کہ اس میں کوئی بات مسلمانوں کے مذہب کے مطابق نہیں ہوئی سب جانتے ہیں کہ سرکاری خزانہ اور اسباب جو امانت تھا اس میں خیانت کرنا، ملازمین کا نمک حرامی کرنا مذہب کی رو سے درست نہ تھا۔" (۱۱۱) یہ باتیں کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اس جنگ کے بعد مسلمان خاص کر انگریزوں کے نشانہ پر تھے تو ان کا دفاع کرنا تھا کیونکہ انگریز یہ سمجھتے تھے کہ چونکہ مسلمان صدیوں سے یہاں حکومت کرتے چلے آ رہے ہیں اس لیے اس بغاوت کی بو پھیلنے کے اصل ذمہ دار مسلمان ہیں اور ہندو اس میں کم قصوروار ہیں کیونکہ ہندو تو ایک قوم سے دوسری قوم کی غلامی میں چلے گئے ہے اس لیے وہ خاص متاثر نہیں ہوئے اور نہ ہی انھوں نے غدر میں کوئی خاص کردار ادا کیا ہے۔ اس کے ذمہ دار صرف مسلمان ہیں۔ سرسید نے یہ بات باور کرانے کی بھرپور کوشش کی کہ اس بغاوت میں صرف مسلمان شامل نہیں بلکہ ہندو بھی برابر کے شریک جرم ہیں تاکہ انگریز حکومت کی طرف سے مسلمانوں کے لیے بند دروازے کھل سکیں۔ مسلمانوں کے اس غدر میں شامل ہونے کی بڑی وجہ عیسائیت کی تبلیغ تھی۔ مذہبی مداخلت کے علاوہ سرسید نے بغاوت کے جو اسباب بیان کیے ہیں وہ مختصراً حسب ذیل ہیں۔

اول: غلط فہمی رعایا یعنی برعکس سمجھنا تجاویز گورنمنٹ کا

دوم: جاری ہونا ایسے آئین و ضوابط اور طریقہ حکومت کا جو ہندوستانیوں کی عادات کے مناسب نہ تھے یا مضرت رسانی کرتے تھے۔

سوم: ناواقف رہنا گورنمنٹ کا رعایا کے اصلی حالات اور اطوار اور عادات اور ان مصائب سے جو ان پر گزرتی تھیں اور جن سے رعایا کا دل گورنمنٹ سے پھٹا جاتا تھا۔

چہارم: ترک ہونا ان امور کا ہماری گورنمنٹ کی طرف سے جن کا بجالانا ہماری گورنمنٹ پر ہندوستان کی حکومت کے لیے واجب اور لازم تھا۔

پنجم: بدانتظامی اور بے اہتمامی فوج کی۔ (۱۱۲)

سرسید کے خیال میں یہ وہ بنیادی اسباب تھے جس کی بنا پر برصغیر پاک و ہند کی اقوام غیر ملکیوں و غیر مذہب قوم کے خلاف ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہوئیں۔ اس میں سرسید نے دبے لفظوں میں ہندوستانیوں کی بغاوت میں شرکت کو تسلیم کیا ہے اور خاص کر مسلمانوں کی شمولیت کو تسلیم کیا ہے لیکن ساتھ یہ بھی بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کی بغاوت میں شمولیت کے پیچھے بہت سے اسباب تھے جن کی بدولت وہ مجبور ہو گئے تھے۔ در اصل سرسید کا یہ رسالہ لکھنے کا مقصد ہندوستانی اقوام اور خاص کر مسلمانوں کو انگریزوں کے عتاب سے بچانا تھا۔ گویا سرسید نے یہ رسالہ مسلمانوں کی صفائی اور بریت کے لیے لکھا تھا۔ سرسید نے بہت عرصہ تک مضامین لکھ کر انگریزوں کے دل سے مسلمانوں کے لیے شکوک و شبہات کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہے اور مسلمانوں کو جدید علوم سیکھنے کی طرف مائل کرتے رہے۔

مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹ جدید علوم سے دوری قرار دے کر مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ انگریزی اور جدید علوم سے بہرہ ور ہوں اگر وہ چاہتے ہیں کہ انگریزوں کے مقابلے میں خود کو ہندوستانی طاقت تسلیم کریں۔ الغرض سرسید نے مسلمانوں کو جدید تقاضوں کے مطابق غیر مسلم اقوام کا مقابلہ کرنے کے لیے متحرک کیا اور ان میں نئے علوم کی راہ ڈالی۔ سرسید کی مسلمانوں کے لیے ان کوششوں کی وجہ بیان کرتے ہوئے امجد علی شاکر لکھتے ہیں کہ وہ (سرسید احمد خان) ہندو مسلم میں تاریخی اختلاط کے قائل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ صدیوں کے عمل نے ہندو مسلم کو یکجا بھی کر دیا ہے اور یک دل بھی۔ وہ گنگا کی تقدیس کی توہین نہیں کرتے۔ وہ اردو کو ہندو مسلم اتحاد کی علامت قرار دیتے ہیں۔" (۱۱۳) انگریزی عمل داری کے اوائل میں مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں پر خاص مہربانی کی گئی لیکن جب سرسید کی کاوشوں سے مسلمانوں کو بھی ان کے حقوق ملنے شروع ہوئے تو ہندوؤں کو یہ بات ناگوار گزری جس سے ان میں مسلمانوں سے رنجش اور عداوت پیدا ہو گئی۔ یہ درست ہے کہ سرسید ہندو اور مسلمان دونوں اقوام کی ترقی اور خوشحالی چاہتے تھے لیکن انگریز کے جبر کا نشانہ مسلمانوں کے بننے کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے لیے زیادہ کوشاں رہے۔

یہ وہ دور تھا جب سرسید سمیت اہم شخصیات ہندو اور مسلم دونوں کے سیاسی استحکام اور ترقی و خوشحالی کے لیے کام کر رہے تھے لیکن انگریز کو کسی طور پر یہ بات پسند نہ تھی کہ ہندوستان کے تمام مذاہب و اقوام قومی یکجہتی کو اپنے شعار کا حصہ بنائیں اور مل کر انگریز کے خلاف جدوجہد کریں۔ انگریزوں کی کامیابی کی بنیادی وجہ ہندوستان

میں موجود مختلف طبقات اور اقوام کو آپس میں لڑا کر حکومت کرنا تھا لہٰذا وہ کیسے گوارا کرتے کہ ہندوستان میں پھر سے تمام اقوام متحد ہو جائیں۔ بقول پروفیسر اکرم اکرام:

> " انگریزوں نے ہندوستان میں حکومت کرنے کا جو راستہ اختیار کیا وہ ایک تو یہ تھا کہ قاہرانہ انداز میں حکومت کرو اور دوسرے ہندوؤں اور مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ نفاق اور افتراق پیدا کرو اور انھیں آپس میں لڑاؤ تاکہ وہ اپنے مسائل میں الجھے رہیں اور انگریز حاکم لوٹ مار کی حکومت کرتا رہے"(۱۱۴)

سرسید احمد خان اس خطرہ کو اچھی طرح بھانپ گئے تھے جو آنے والے دنوں میں مسلمانوں کے لیے سیاسی اور معاشرتی طور پر تھا یعنی مسلمانوں کو مکمل طور پر دیوار سے لگانے کا منصوبہ سرسید کی دوررس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا لہٰذا انھوں نے مسلمانوں کو اس خطرے سے دوچار ہونے سے بچانے کے لیے بھرپور سعی کی اور ایسے مسلمانوں کی ایک نسل پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے جو انگریز کے ساتھ اپنی بنیادی وفاداری کو خراب کیے بغیر اسلام اور دنیا کے جدید حالات میں مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ دوسری طرف ہندوؤں کی عدم تعاون پالیسی کو بھی سرسید اچھی طرح سمجھ گئے بقول اشتیاق حسین قریشی " ہندوؤں کی پہلی تحریک جس نے سید احمد خان کی آنکھوں سے پردہ اٹھایا، اس لیے جاری کی گئی تھی کہ شمال مغربی صوبے میں اردو کی بجائے ہندی کو دوسری سرکاری زبان تسلیم کرایا جائے۔"(۱۱۵) برصغیر میں اردو ہندی کا ایک نیا تنازعہ پیدا ہو چکا تھا جس نے مسلمانوں اور ہندوؤں میں فاصلے پیدا کر دیے۔ سرسید کی طرح ایسے بہت سے مسلم رہنما جو برصغیر کی سلامتی و ترقی ہندو مسلم اتحاد میں سمجھتے تھے، اچھی طرح سمجھ گئے کہ مسلمانوں کو اپنی سلامتی کے لیے الگ راستے کا انتخاب کرنا ہو گا اور یہ کہ ہندو مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انگریز مسلمانوں اور ہندوؤں میں تفریق پیدا کرنے میں کامیاب دکھائی دیا۔

گویا برصغیر پاک و ہند کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایسی سیاسی اور مذہبی کشمکش پیدا ہو گئی کہ اب ان کی دوریاں روز بروز بڑھتی گئیں اور ان تضادات میں اضافہ ہوتا گیا۔ صدیوں سے رائج مشترک روایات بھی دونوں قوموں کو قریب نہ لا سکیں اور ان روایات کو ترک کرنے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ تضاد کے اس دور میں جو چیز دونوں کو ایک میز پر لا سکتی تھی وہ اردو زبان تھی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ میراث اور روایت میں شامل تھی۔ لیکن ہندو شدت پسند عناصر کی طرف سے اردو کی مخالفت اور ہندی زبان کی ترویج سے ایک ایسی خلیج پیدا ہو گئی تھی جس نے دونوں قوموں کو قریب لانے کی رہی سہی کسر کا بھی خاتمہ تھی۔ بقول پروفیسر اکرم اکرام:

> ”انگریزوں نے اپنی سلامتی اس حکمت عملی میں دیکھی کہ ہندوؤں کو ہر طرح سے مستحکم کر کے مسلمانوں کو مکمل طور پر دبا دیا جائے۔ ہندوؤں کو انگریزی حکومت نے اقتصادی، تعلیمی اور سیاسی میدانوں میں حتیٰ الامکان مستحکم کرنا شروع کیا۔ ۱۸۸۵ء میں ایک انگریز اے او ہیرم نے ہندوؤں کے استحکام کے لیے کانگریس کی بنیاد رکھی جب مسلمان بالکل کمزور ہونے لگے تو سرسید احمد خان نے ان کے وجود کے استقرار کے لیے علی گڑھ میں تعلیمی مرکز قائم کیا جس نے مسلمانوں میں بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر شعور پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا“(۱۱۶)

سرسید احمد خان اور ان کے ساتھیوں نے کانگریس کو مسلمانوں کے حق میں بہتر نہ سمجھا۔ اس لیے علی گڑھ تحریک سے وابستہ لوگ کانگریس سے الگ رہے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کی کثرت اس جماعت میں شامل ہوگئی۔ جس سے کانگریس کسی ایک مذہب یا فقہ کی جماعت کے لقب کو زائل کرنے میں کامیاب ہوگئی لیکن آنے والے ادوار نے یہ سچ ثابت کر دیا کہ کانگریس صرف ہندوؤں کی نمائندہ جماعت ہے اور اس میں مسلمانوں کے لیے کوئی امید افزا خیال نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں نے اپنی الگ نمائندہ جماعت مسلم لیگ بنالی۔ بقول مجاور حسین ”جب تقسیم بنگال کے سوال پر ملک میں شورش پیدا ہوئی اور تقسیم کی تلخی سامنے آئی تو ایک طرف دادا بھائی نوروجی کی صدارت میں کانگریس ”سوراج“ کی طرف بڑھی اور مسلم فرقہ واریت جو اب تک صرف مذہبی اور اصلاحی تھی۔ لارڈ منٹو کے جداگانہ انتخاب کے اصول کے نتیجہ میں سیاست کی طرف بڑھی اور دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ قائم کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔“(۱۱۷) اس دور میں قائداعظم کانگریس کے سرگرم رکن تھے اور وہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشاں تھے۔ ۱۹۱۳ء میں قائداعظم نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی جس سے مسلم لیگ اور مسلمانوں کے علیحدہ قومی تشخص کو تقویت پہنچی جو آنے والے دور میں ایک الگ ملک پاکستان کی حیثیت سے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

ان اسباب سے وطنی اور قومی شاعری پروان چڑھی۔ جنگ آزادی کے کچھ عرصہ بعد جب رونا دھونا ختم ہوا تو شعرا نے ایک نئے جذبے اور قوت کے ساتھ حالات کا رخ متعین کیا۔ ان حالات میں اردو زبان و ادب نے اتحاد و یکجہتی کے لیے اپنا مؤثر کردار ادا کیا۔ مجاور حسین لکھتے ہیں ”ان حالات میں اردو شاعری نے مشترکہ تہذیب کی وارث کی حیثیت سے اتفاق، اتحاد اور یگانگت کی قندیلیں روشن کیں اور قومی یکجہتی جس کی تشکیل و تعمیر میں اردو شاعری نے مؤثر کردار ادا کیا تھا اردو شاعری نے اس دور کشاکش میں قومیت، وطنیت اور حب الوطنی کے شعور کو پروان چڑھایا جس کی نظیر ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ادب میں مشکل سے ہی مل سکے گی“(۱۱۸) اردو

شاعری جو گل و بلبل کے موضوعات کے حوالے سے پہچانی جاتی تھی، غدر کے بعد اس کے موضوعات میں تنوع پیدا ہوا اور اس کا رخ ادب برائے ادب کی بجائے ادب برائے زندگی کی طرف مڑ گیا۔ اب اردو شاعری قدیم روایتی موضوعات سے نکل کر جدید موضوعات جن میں قومی اور مذہبی موضوعات شامل ہیں، کی ترجمان بن گئی۔ اردو ادب کے مراکز دہلی اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد لاہور کی سرزمین اردو کے لیے سب سے موزوں ثابت ہوئی اور شعرا نے انگریزی عملداری میں اردو شاعری کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ اردو شاعری میں اس نئے دور کے آغاز اور لاہور میں اس کے ادبی مرکز کا سہرا کرنل ہالرائیڈ ناظم محکمہ تعلیم پنجاب اور مولانا محمد حسین آزاد کے سر جاتا ہے۔ پنجاب میں انجمن پنجاب کے پہلے جلسے کی صدارت ڈاکٹر لائٹنر پرنسپل گورنمنٹ اورینٹل کالج لاہور نے کی اور مولانا محمد حسین آزاد نے اردو شاعری کے جدید تقاضوں اور ضروریات کے حوالے سے خطبہ دیا۔

مقدمہ شعر و شاعری اردو کی پہلی تصنیف ہے جس میں ادب اور زندگی کے تعلق کا مسئلہ چھیڑا گیا ہے(۱۱۹)اس سے پہلے شاعری کو محض تخیل آفرینی اور رنج و ملال کے لیے ہی ضروری سمجھا جاتا رہا لیکن حالی نے شعر کی افادیت بیان کر کے اردو ادب میں شعر و شاعری کے کئی نئے راستے متعین کیے۔ اردو شاعری میں جنگ آزادی کے بعد جو نئے شعری مضامین پیدا ہوئے ان میں قومی وطنی رجحان کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ آزادی کی جنگ میں شکست اور انگریزی غلبہ پانے کے بعد جب شعرا رنج و ملال سے نکل کر نئی راہیں بنانے لگے تو انھوں نے قومی و وطنی حمیت اور قومی یکجہتی سے چلنے کا عزم کیا۔ یعنی اردو شعرا نے آزاد اور حالی کی راہ پر چلتے ہوئے قومی شاعری کی۔ اس روش پر چلنے والوں میں آزاد، حالی، شبلی، چکبست، برق، اکبر آبادی، اقبال، جوش، جگت موہن لال اور سورج نرائن سمیت کئی دیگر شعرا شامل تھے۔

جدید شعرا کی فہرست مین خواجہ الطاف حسین حالی ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری میں برصغیر کی غلامی کا زیادہ تاثر ملتا ہے۔ وہ ہندوستان کی غلامی اور آزادی کے متعلق نظم میں فرماتے ہیں:

کہتے ہیں"آزاد ہو جاتا ہے جب لیتا ہے سانس
یہاں غلام آکر۔ کرامت ہے یہ انگلستان کی
اس کی سرحد میں غلاموں نے جو ہمیں رکھا قدم
اور کٹ کر پاؤں سے ایک اک کے بیڑی گر پڑی"
قلب ماہیت میں انگلستان ہے گر کیمیا
مگر نہیں کچھ قلب ماہیت میں ہندوستان بھی

(انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی، دیوانِ حالی)

حالی نے مرثیہ دہلی، مناجات بیوہ، برکھارت اور مثنوی حب وطن جیسی نظمیں لکھ قوم کو پھر سے بیدار کرنے کے لیے تحریک پیدا کی۔ انھوں نے اپنی شاعری میں قوم کو متحد ہو کر وطن کی آزادی کے لیے سعی کرنے کا پیغام دیا۔ غلامی کی خواری اور آزادی کی قدر بیان کی۔ حالی کی نظم " کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان " میں غلامی کی رسوائی کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

دی سند گورے کو لکھ۔ تھی جس میں تصدیق مرض
اور یہ لکھا تھا کہ سائل سے بہت زارو نزار
یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مکے سے مرے
کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار
اور کہا کالے سے "تم کو مل نہیں سکتی سند
کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جاندار"

(کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان، دیوان حالی)

حالی ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے اور فرقہ پرستی و تعصب سے پاک تھے۔ وہ ہندوستان میں مسلمان اور ہندوؤں کے اتحاد کو انگریزوں سے نجات کی علامت سمجھتے تھے۔ قومی یکجہتی کو ضروری سمجھتے ہوئے انھوں نے مثنوی "حب وطن" لکھی۔ اقتباس ہے:

اے وطن، اے مرے بہشت بریں
کیا ہوئے تیرے آسماں و زمیں
جن و انسان کی حیات ہے تو
مرغ و ماہی کی کائنات ہے تو
تیری اک مشت خاک کے بدلے
لوں نہ ہر گز اگر بہشت ملے

(مثنوی حب وطن، دیوانِ حالی)

محمد حسین آزاد بھی قومی و وطنی محبت میں حالی کے پیش رو تھے۔ بقول زیدی "حب وطن " حالی اور آزاد دونوں ہی کی نظمیں ہیں لیکن حالی کے حب وطن کا تصور محدود ہے۔ وہ وطن سے صرف ایک جغرافیائی علاقہ رکھتے ہیں لیکن آزاد نے حب وطن کی بڑی جاندار تشریح کی ہے" (۱۲۰) حالی اور آزاد دونوں پر سرسید کا اثر تھا لیکن حالی پر نسبتاً زیادہ تھا جس وجہ سے شاید حالی میں جوش کی کمی اور دھیما پن زیادہ ہے لیکن اس دھیمے پن میں گہرائی ہے اور وہ اپنا مقصد بیان کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ آزاد کے جذبات میں حالی کی نسبت شدت ہے اور وہ وطنیت کے

اس شعور کو بیدار کرنا چاہتے ہیں جس کا تصور آج کے دور میں بھی مشکل سے ملے گا۔ ان کے تصور میں حب الوطنی، یکجہتی سے بھی عبارت ہے مثنوی "صبح امید" سے اقتباس ہے:

اب میں تمھیں بتاؤں کہ حب وطن ہے کیا
وہ کیا چمن ہے اور وہ ہوائے چمن ہے کیا
وہ رحمت خدا کہ جو بندوں پہ عام ہے
وہ لطف عام جس سے جہاں شاد کام ہے
وہ نور مہر جس سے زمانہ میں نور ہے
وہ نور ذرہ ذرہ پہ جس کا ظہور ہے (مثنوی صبح امید، کلیات محمد حسین آزاد)

محمد حسین آزاد برصغیر کی عوام کو قومی حمیت کا احساس دلاتے ہوئے حب الوطنی کا صحیح جذبہ اور اس کی آزادی کے لیے کوشش کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ صرف زبانی اظہار کو حب الوطنی نہیں کہتے بلکہ اس کے لیے قربانی اور عملّی اقدامات کرنے کو لازم سمجھتے ہیں۔

حالی اور آزاد دونوں نے اردو ادب میں قومی اور وطنی شاعری کو جدید تصورات کے مطابق اجاگر کیا ہے۔ ان کی نظموں میں رجائیت پائی جاتی ہے وہ ایک طرف قومی حمیت کا احساس دلاتے ہیں اور ساتھ امید و یاس کا دامن بھی نہیں چھوڑتے لیکن اگر دونوں کا شعری ادبی مقام میں موازنہ کیا جائے تو کسی ایک کو بھی کمتر نہیں کہا جا سکتا۔ دونوں شعرا اردو میں جدید اور مقصدی شاعری کے بانی تصور کیے جاسکتے ہیں۔ البتہ مولانا آزاد کا زیادہ کام انشاءپردازی پر ہے جبکہ مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر اردو شعری تحقیق کا رخ بدل دیا۔ حالی کے مضامین میں مقامی رنگ اور وطنیت کا پہلو آزاد سے نسبتاً زیادہ ہے جبکہ آزاد کی قومی شاعری میں سیاسی رنگ کی بجائے روحانی اور اخلاقی تصورات کی آمیزش نظر آتی ہے۔

شبلی نعمانی اردو کے پہلے شاعر تھے جنھوں نے برطانوی سامراج اور مغربی استعمار کے بین الاقوامی روپ کو دیکھا اور ان پر مغربی سیاست کی ریشہ دوانیاں بخوبی واضح ہو گئی تھیں۔ شاید اسی لیے شبلی کے کلام میں تلخی بھی زیادہ ہے۔ انھوں نے سرکاری ملازمت کو ترک کر کے قوم و وطن کے لیے اپنا وقت صرف کیا۔ شبلی بنیادی طور پر انشاءپرداز تھے۔ اس کے علاوہ تحقیق پر بھی کئی کتب لکھیں جن میں "موازنہ انیس و دبیر" اور "شعر العجم" وغیرہ شامل ہیں لیکن شاعری اور قومی شاعری میں شبلی اپنے ہم عصر شعرا کی طرح حصہ ڈالتے رہے۔ شبلی نعمانی کی نظم "احرار قوم" میں وہ برطانوی سامراج کے اعتراضات اور ان کی مضحکہ خیز باتوں کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

یہ اعتراض آپ کا بے شک صحیح ہے
احرار قوم میں ہیں خامیاں ابھی
چلتے ہیں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
گم گشتہ طریق ہے یہ کارواں ابھی
بے اعتدالیاں ہیں ادائے کلام میں
باہر ہے اختیار سے ان کے زباں ابھی

(احرارِ قوم، مشمولہ، آزادی کی نظمیں)

یہ وطنی جذبہ قومیت کی چند مثالیں تھیں لیکن وطنی قومیت کے ساتھ اردو شاعری میں مذہبی رجحان بھی پروان چڑھا اور قومی شاعری کے ساتھ ملّی جذبہ کی روایت کا آغاز ہوا۔ دراصل انگریزوں نے جب ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرق کرنا شروع کیا اور ہندوؤں کو نوازشوں کے ساتھ مسلمانوں کو دیوار سے لگایا جانے لگا جسے سرسید احمد خان نے محسوس کیا اور وہ مسلمانوں کے مفادات پر زیادہ توجہ دینے لگے لیکن اس کے باوجود سرسید کی شخصیت میں تعصب نہیں ملتا(۱۲۱) سرسید کی علی گڑھ تحریک کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرتی فلاح و بہبود تھا۔ سرسید احمد خان کی قیادت میں اس تحریک نے چند برسوں میں شدید مخالفت کے باوجود ہمہ گیر صورت اختیار کر لی اور ہندوستان کے ہر صوبے میں اس کے اثرات پھیل گئے(۱۲۲) سرسید کی شخصیت اور محنت نے بہت سے شعرا و ادبا کو اپنے حلقہ بگوش لے لیا اور ان شعرا و ادبا نے مسلمانوں کی فلاح و بہتری کے لیے شعری و نثری ادب کا بیش قیمت سرمایہ مہیا کیا۔

ان دنوں کئی مسلم مشاہیر کی حالت یہ تھی کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے درد تو رکھتے تھے لیکن ان کے سامنے راستہ نہیں تھا۔ ان کو کسی مخلص رہنما کی ضرورت تھی جو ان کو صحیح راستہ دکھا سکے جو ان کو انگلی سے پکڑ کر چلنا سکھا سکے تا کہ وہ قوم کے لیے کچھ کر سکیں۔ سرسید کی شخصیت ایسی پرکشش تھی کہ بہت سے شعرا و ادبا کو اپنے طرف کھینچ لائی اور ان کے حلقہ بگوش ہو کر ناول، تاریخ، سوانح عمریاں، مضامین اور منظومات وغیرہ میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کیا۔ گویا سرسید کی قیادت میں یہ ایک ایسا حلقہ بن گیا جو برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کا صحیح معنوں میں خیر خواہ تھا۔ اسی حلقہ اور گروہ کی بدولت آنے والے دور میں دو قومی نظریہ کی بنیاد پر مسلمان ہندوستان میں اپنا حق حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

اردو ادب میں اس تحریک نے جس کے بانی سرسید تھے، ہر میدان میں مسلمان قوم کے لیے تخلیقی سرمایہ فراہم کیا۔ اردو نظم نگاری کے سلسلے میں حالی نہ صرف میر کارواں تھے بلکہ ان کا سایہ اس دور کے دوسرے شعراء

پر بھی پڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ جبکہ شبلی نے ناموران اسلام کی تاریخ کے چند کارناموں کو نظم و نثر میں پیش کیا ہے اس لیے کہ شبلی کا اصل مقام تاریخ نگاری تھا۔ اس کارواں میں مولانا حالی نے "مسدس حالی" لکھ کر مسلمانوں پر ایک بہت بڑا احسان کیا۔ مسلمان قوم جس نے صدیوں تک مغربی قوموں پر اپنا اثر و رعب جمائے رکھا تھا وہ حالت زوال میں تھی اور مغربی قوتیں آج مسلمانوں پر حکومت کر رہی تھیں۔ مسلمان ان کے غلام بن چکے تھے۔ حالی نے مسلمانوں کو پھر سے بیدار کرنے کے لیے اسلام کی تاریخ منظوم صورت میں لکھی۔ مولانا حالی اپنی مسدس، مدوجزر اسلام کے بارے بتاتے ہیں "اس میں یا تاریخی واقعات ہیں یا چند آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ ہے یا جو آج کل قوم کی حالت ہے اس کا صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے۔ نہ کہیں نازک خیالی ہے، نہ رنگین بیان ہے نہ مبالغے کی چاٹ ہے، نہ تکلیف کی چاشنی ہے، غرض کوئی بات ایسی نہیں ہے جس سے اہل وطن کے کان مانوس اور مذاق آشنا ہوں" (۱۲۳) گویا مسدس حالی صرف مسلمانوں کی حالت زار کے لیے لکھی گئی اور اس کا مقصد شہرت یا انعام و کرام نہیں تھا جیسا کہ پرانے ہندوستان کی روایت تھی۔ خاص کر لکھنؤ کے ادب میں نازک خیالی، خیال آفرینی وغیرہ شاعری کا لازمی حصہ تصور کی جاتی تھی لیکن اس منظوم نظم میں ایسا کچھ نہیں تھا۔ اس کا مقصد صرف مسلمانوں کی حمیت وغیرت کو جگانا تھا۔ حالی نظم کی ابتدا بقراط کے اس قول سے کرتے ہیں:

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا
"مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا"
کہا "دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا
کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں
یہی حال دنیا میں اس قوم کا ہے
بھنور میں جہاز آ کے جس کا گھرا ہے
کنارہ ہے دور اور طوفان بپا ہے
گماں ہے یہ ہر دم کہ اب ڈوبتا ہے
نہیں لیتے کروٹ مگر اہل کشتی
پڑے سوتے ہیں، بے خبر اہل کشتی (مسدس حالی)

اس نظم میں حالی نے مسلمان قوم کی حقیقت نظم کر کے عوام کے سامنے پیش کی تو اس کے تلخ حقائق سے بقول غلام ذوالفقار "یہ قومی مرثیہ لکھ کر وہ خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی خوب خوب رلایا۔"(۱۲۴) مسدس حالی کے منظر عام پر آنے کے بعد عوام پر اس کا کیا اثر ہوا ہو گا اس کا آج کے دور میں اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن شاعر کو اس بات کا اندازہ تھا۔ انھوں نے اس کے دوسرے دیباچے جو مسدس کی اشاعت کے سات سال بعد شائع ہوا، میں لکھتے ہیں:

> " پس مصنف کو اگر فخر ہے تو صرف اس بات پر ہے کہ اس نے زمین شور میں تخم ریزی نہیں کی اور پتھر میں جونک نہیں لگانی چاہی اس نے ایک ایسی جماعت کو مخاطب گردانا ہے جو بے راہ ہے پر گمراہ نہیں ہے۔ وہ راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں مگر راستے کی تلاش میں چپ وراست نگراں ہیں۔ ان کے ہنر مفقود ہو گئے ہیں مگر قابلیت موجود ہے ان کے عیبوں میں خوبیاں بھی ہیں مگر چھپی ہوئی۔ ان کے خاکستر میں چنگاریاں بھی ہیں مگر دبی ہوئی۔"(۱۲۵)

حالی نے ان دبی ہوئی چنگاریوں کو پھر سے بھڑکانے، بھٹکے ہوئے راہی کو سیدھی راہ پر لانے اور ان کی صلاحیتوں کو پھر سے جلا بخشنے کے لیے قومی مرثیہ لکھا۔ انھوں نے سر سید احمد خان کی تحریک سے خوب فائدہ اٹھایا اور بقول غلام حسین ذوالفقار "مدوجزر اسلام یا مسدس حالی ایک عہد آفرین کارنامہ تھا جس نے سر سید کی اصلاحی تحریک علی الخصوص اس کے تعلیمی پہلو کو مسلمانوں میں مقبول عام بنانے میں اہم حصہ لیا۔"(۱۲۶) مسدس حالی مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستاں ہے لیکن حالی نے اپنے دور کے مسلمانوں کی حالت زار پر نشتر کے تیر چلائے ہیں تو بقول مصنف "یہ اسلوب جس قدر غیرت دلانے والا تھا اس قدر مایوس کرنے والا بھی تھا۔ مصنف کے دل کی آگ بھڑک کر بجھ گئی تھی اور اس کی افسردگی الفاظ میں سرائیت کر گئی تھی"(۱۲۷) مسدس حالی کا اسلوب اس قدر سخت گیر ہے کہ جس نے مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکانے کے ساتھ کسی قدر ٹھیس پہنچائی لیکن اس کی وجہ خود شاعر کے جذبات تھے جنھوں نے قوم کا علاج نرم لہجے کی بجائے سخت گیری سے کیا بقول غلام حسین ذوالفقار "انقلاب حکومت کے بعد مسلمانوں کی حالت ایک تکلیف دہ ناسور کے مشابہ تھی اس ناسور کو چھیڑنا اور غلیظ مواد کا اخراج صحت مندی کے لیے ضروری تھا۔ حالی ایک مزاج شناس طبیب کی طرح مریض کی طبعیت اور حالت سے بخوبی واقف تھے"(۱۲۸) تشخیص کے بعد اس کا علاج اور ناسور کا خاتمہ بھی صرف روئی کی مرہم پٹی سے ممکن نہیں تھا بلکہ اس کے لیے سرجری کی ضرورت تھی اور سرجری کے دوران تکلیف بھی ہوتی ہے لیکن اس

کے بغیر مرض کا مکمل ازالہ ممکن نہیں ہوتا گویا حالی نے برصغیر کے مسلمانوں کے مرض کا ازالہ اپنے سخت لب و لہجے سے کیا تا کہ اس کا زیادہ اور دیرپا اثر قائم رہ سکے۔

مسدس حالی کے بعد حالی کا زیادہ تر رجحان وطنی قومیت کی بجائے اسلامی ملت کی طرف ہو گیا۔ وہ ملت اسلامی کے تشخص کو اپنی شاعری اور نثر دونوں طریقوں سے اجاگر کرنے کی سعی کرتے رہے۔

جنگ آزادی کے بعد انگریزوں کی انتقامی کاروائیوں کا رخ چونکہ مسلمانوں کی طرف تھا جس کے بعد برصغیر کے مسلمانوں نے خود کو تنہا محسوس کیا لیکن اس کے نتیجے میں وطنی قومیت کی بجائے مذہبی قومیت کا رجحان بڑھ گیا۔ علاوہ ازیں اس دوران چلنے والی مذہبی تحریکوں نے بھی خاطر خواہ اثر کیا اور مسلمان اور ہندو شعرا کی طرف سے مذہبی قومیت پروان چڑھائی جانے لگی۔ اس دوران حالی کی "مسدس حالی" نے مسلمانوں کے زخموں پر نمک کا کام کیا۔ حالی کے علاوہ دیگر شعرا میں بھی مذہبی رجحان کثرت سے پایا جاتا ہے جن میں شوق قدوائی، شبلی، اسماعیل میرٹھی اور صفی لکھنوی وغیرہ شامل ہیں۔ ان شعرا نے مسلمانوں کے مرثیہ خواں کے طور پر کردار نبھایا۔ لہٰذا جداگانہ قومیت کا تصور سرسید اور ان کے رفقائے کار کے عہد میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ سرسید نے اپنی تحریروں و تقریروں میں علیحدہ قومیت کا اظہار واضح لفظوں میں نہیں کیا لیکن اس میں حقیقت ہے کہ انھوں نے آنے والے وقت کے خطرات کو بھانپ لیا تھا اور مسلمانوں کے علیحدہ قومی تشخص کا کام اولاً سرسید نے شروع کیا۔

ڈپٹی نذیر احمد مسلمانوں کے زوال و پستی کی وجہ علم و ہنر اور نئی ایجادات سے بے بہرہ ہونا قرار دیتے ہیں ان کی نظم "اسباب پستی" سے اقتباس ہے:

کھلی آغوش وجہ پستی حالت
جہالت !جہالت! جہالت ! جہالت
زمیں بدلی بدلا ہوا آسماں ہے
زمانہ کی اگلی سی حالت کہاں ہے
کوئی روز شاید کہ جاتا ہو خالی
کہ یورپ کے لوگوں کے اذہان عالی
نہ کرتے ہوں اک تازہ ایجاد کوئی
ہے تم میں بھی اے قوم ناشاد کوئی
وہی جانور ہیں وہی ہیں صفیریں
مسلمان اور اپنی پرانی لکیریں (اسباب پستی، نشیدِ حریت)

گویا یہ حقیقت ہے کہ انیسویں صدی کے اختتام تک اردو میں ملّی شاعری کی بنیادیں مستحکم ہو چکی تھی اور ہندو و مسلم اپنے علیحدہ قومی تشخص کو پہچان چکے تھے جبکہ بیسویں صدی تقسیم کی صدی ہے جس میں دو علیحدہ مملکتیں وجود میں آئیں۔

## بیسویں صدی میں ۱۹۴۷ء سے پہلے اردو میں قومی و ملّی شاعری:

بیسویں صدی برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں عظیم سیاسی و سماجی تغیرات کے ساتھ شروع ہوئی اور آنے والے وقتوں میں اس کی شدت میں اضافہ ہو تا گیا۔ اس کے ابتدائی آثار جنگ آزادی کے دس سال بعد یعنی ۱۸۶۷ء میں شروع ہوئے جب اردو ہندی تنازع کی ابتدا ہوئی۔ اسی تنازع کے بعد برصغیر کے مسلمانوں میں علیحدہ قومی وحدت کا خیال پیدا ہوا۔ اس تنازع سے ہندو مسلم اختلاف کے جو بیج بوئے گئے تھے ٹھیک چھبیس سال بعد یعنی ۱۸۹۳ء میں وہ فصل پک کر تیار ہو چکی تھی جس کے نتیجے میں بمبئی، اعظم گڑھ، رنگون اور بریلی میں فرقہ ورانہ فسادات ظاہر ہوئے۔ مزید تقسیم بنگال اور ہندو رہنماؤ ں خاص کر کانگریسی لیڈروں کے دباؤ سے تنسیخ بنگال سے ان جذبات میں شدت پیدا ہوئی۔ سر سید اور ان کی اصلاحی تحریک کے باوجود مسلمان کثرت سے کانگریس میں شامل ہوئے تھے۔ وہ مسلمان جنھوں نے کانگریس کو برصغیر کی تمام اقوام کی تہذیبی، سیاسی اور سماجی وحدت کی جماعت تصور کیا تھا لیکن اب ان پر کانگریس اور ہندو ذہنیت کھل چکی تھی جس کے نتیجے میں برصغیر کے مسلمانوں نے اپنی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ یہی وہ نقطہ آغاز تھا جس نے ہندوؤ ں اور مسلمانوں میں دو قومی نظریہ کو عملّی شکل دینے کے لیے آغاز کیا۔ مسلم لیگ کے قیام کے بعد اس کی درخواست پر جداگانہ انتخاب کے قیام کا عمل منظور ہوا۔ ہندو انتہا پسند تنظیموں اور رہنماؤ ں نے اس عمل کو آگے بڑھایا۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی اور ۱۹۱۸ء تک جاری رہی۔ اس دوران برصغیر کے عوام میں سیاسی شعور زیادہ بیدار ہوا جب عالمی سطح پر دنیا جنگ کے دہانے پر تھی۔ ۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کی شہادت اور ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کا واقعہ رونما ہوا۔ ترکی کو خلافت اسلامیہ میں مرکزیت حاصل ہونے کی وجہ سے اسلامی خلافت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ ترکی کے حصے بخرے ہونے کے بعد مسلمانان برصغیر پاک و ہند کے جذبات کو شدید دھچکا پہنچا اور انھوں نے استحکام خلافت کے لیے تحریک چلائی جس کے روح رواں علی برادران یعنی محمد علی جوہر اور شوکت علی تھے اس دوران مسلمانوں کے جذبات کی شدت میں مزید اضافہ ہوا اور عالمی سطح پر امت مسلمہ اور ان کے مسائل کے حوالے سے اندازہ ہوا۔ اس واقعہ کا اثر مسلمانانِ ہند نے خاص طور پر قبول کیا اور یہ محسوس کیا کہ نہ صرف برصغیر بلکہ عالمی سطح پر بھی غیر مسلم اسلام کے خلاف اکٹھے ہو چکے ہیں اور برصغیر میں انگریز کی واپسی پر وہ

ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ ان حالات و واقعات سے بر صغیر کے مسلمانوں کے ملّی جذبات میں شدت آگئی اور ملتِ واحدہ اور مسلم قومیت کے خیال کو تقویت حاصل ہوئی۔ قنوطیت و مصلحتوں سے نکل کر ایک پر زور تحریک چلائی اور اسلامیانِ ہند کے لیے الگ وطن کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔

اس دور کی شاعری جہاں ایک طرف قومی و وطنی دور کی شاعری کہلاتی ہے تو دوسری طرف ملّی نقطہ نظر سے اردو ادب میں ملّی شاعری پروان چڑھی۔ ملّی شعرا میں انیسویں صدی کے اختتام تک حالی، شبلی نعمانی اور اکبر آلہ آبادی جبکہ بیسوں صدی میں علامہ اقبال، ظفر علی خان، حسرت موہانی اور مولانا محمد علی جوہر نے گراں پایہ خدمات سر انجام دیں۔ مولانا شبلی نے عالمگیر ملت اسلامیہ کے جذبے کو جذباتی و نفسیاتی سہارا دیا اور حالات حاضرہ کو اپنی شاعری کا جزو بنایا۔ اسی طرح اکبر الہ ابادی نے مسلمانوں کے مذہبی، سماجی و سیاسی اقدار کی ہیجانی کیفیت کو ہر نقطہ نظر سے دیکھا۔ اکبر کا اسلوب طنزیہ ہے اس لیے وہ ہر ایسی بات جس کو سنجیدہ بیان کرنا خطرہ مول لینے کے مترادف تھا، اپنے خاص طنزیہ انداز میں بیان کرنے میں ماہر تھے۔ اکبر الہ آبادی کی شاعری میں جو کاٹ ہے وہ مسلمانوں کو نئے علوم و فنون سیکھنے کی طرف متوجہ کرتی ہے:

مسلمانوں بتاؤ تو تمھیں اپنی خبر کچھ ہے
تمھارے کیا مدارج رہ گئے اس پر نظر کچھ ہے
تمھیں معلوم ہے کچھ رہ گئے ہو کیا سے کیا ہو کر
کدھر آ نکلے ہو ترقی سے جدا ہو کر
بڑھاؤ تجربے اطراف کی دنیا میں سفر سیکھو
خواصِ خشک و تر سیکھو، علومِ بحر و بر سیکھو (افسانہ مسلم، نشیدِ حریت)

اکبر آلہ آبادی برطانوی حکومت کے ملازم تھے لیکن مسلمانوں کے سیاسی و سماجی مسائل اور ان سے ہمدردی کسی قدر کم نہ تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان بھی جدید علوم سے زیور آراستہ ہو کر برطانوی سامراجیت کا مقابلہ کریں۔ اس لیے وہ مسلمانوں میں غیرت و حمیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں اکبر کا اشارہ ان علماء کی طرف بھی ہے جو جدید علوم اور انگریزی زبان کو مسلمانوں سے دور رکھنا چاہتے تھے تاکہ مسلمانوں پر غیر مسلم قوم کی تہذیب کا اثر نہ پڑے لیکن اکبر الہ آبادی کشادہ نظر تھے اور خوب سمجھتے تھے کہ ان علوم کے سیکھے بغیر مسلمان کبھی بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس لیے وہ اپنے کلام میں جدید علوم سیکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اکبر آبادی کی شاعری میں تہذیب معاشرت اور سیاست کے موضوعات ہیں انھوں نے کہیں کھل کر اور کہیں پردوں میں طنز کا سہارا لے کر مغربی استعماریت پر بھرپور وار کیے ہیں۔

اکبر کے بعد ظفر علی خان اور علامہ محمد اقبال نے برصغیر کے مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کے ساتھ پوری عالم اسلام کے مسلمانوں کو اپنی شاعری سے نہ صرف غلامی کے بھنور سے نکالنے کی کوشش کی بلکہ عملّی سیاست میں حصہ لے کر برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ بھی کیا۔ اقبال کے خطبہ الہ آباد کے بعد برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں میں علیحدہ وطن کی ایک ایسی کامیاب تحریک اٹھی جس نے مغربی استعماریت کو مجبور کر دیا کہ وہ برصغیر چھوڑنے سے پہلے مسلمانوں کے لیے علیحدہ ملک کی حیثیت نہ صرف تسلیم کریں بلکہ اسے عملّی جامہ بھی پہنائیں۔ اقبال کے کلام میں ابتدا میں مغربی نظریہ قومیت و وطنیت کا اثر ہے جس کی بدولت انھوں نے "نیا شوالہ" اور "ترانہ ہندی" جیسی نظمیں لکھیں لیکن مغرب میں تعلیم کے دوران ان کو عالمی دنیا اور اسلام کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا جس کا اثر اقبال کی شخصیت پر ہوا اور وہ "ترانہ ہندی" سے نکل کر مسلمانان عالم کی تمدنی وحدت کی فضا میں محو ہو گئے اور عالم گیر اسلامی اتحاد کا تصور پیش کیا "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" اقبال کے اس تصور کی نشاندہی کرتا ہے۔ اقبال زمینی حقائق اور روحانی توازن سے قومیت کا ایسا نظریہ پیش کرنا چاہتے تھے جس کا تعلق تمام روحانی عقائد سے مستحکم ہو۔ اقبال اس نظریے کو اپنی شاعری میں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

آہ یہ مرگ دوام، آہ یہ رزم حیات
ختم بھی ہو گی کبھی کشمکش کائنات!
عقل کو ملتی نہیں اپنے بتوں سے نجات
عارف و عاصی تمام بندہ لات و منات
خوار ہوا کس قدر آدم یزداں صفات
قلب و نظر پر گراں ایسے جہاں کا ثبات
کیوں نہیں ہوتی سحر ، حضرت انساں کی رات ؟

(عالم برزخ، ارمغانِ حجاز)

اقبال کے نزدیک اسلام کا ضابطہ حیات دنیا کی تمام اقوام کو متحد کر سکتا ہے۔ اسلام ایک ایسا ضابطہ حیات پیش کرتا ہے جو جدید دنیا کے روحانی و سائنسی زاویوں کو ایک قلب انسانی میں ڈھال سکتا ہے کیونکہ اقبال کے نزدیک انسانی بقا کا راز دین اسلام میں ہے یعنی اسلام عالمگیریت کا نظریاتی اور عملّی تصور پیش کرتا ہے۔ اقبال اس تصور کو اپنے کلام میں جا بجا پیش کرتے ہیں۔ اقبال کا پورا کلام ارتقاء پذیر ہے۔ وہ رجائی لہجہ میں پر امید انداز سے خدا تعالیٰ کی وحدانیت پوری دنیا میں قائم ہونے کی پیش گوئی کرتے ہیں:

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے

یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے (شمع اور شاعر، بانگِ درا)

اقبال کے علاوہ اس دور کے اہم قومی شعرا میں ظفر علی خان اور چکبست کو اہمیت حاصل ہے۔ ظفر علی خان کی شاعری میں پہلی جنگ عظیم کے بعد آزادی کے مختلف مراحل کی عکاسی ہے۔ انھوں نے جنگ عظیم کے بعد ہندوستاں کے بڑے اور اہم سیاسی سانحات و حادثات جن میں رول ایکٹ، جلیانوالہ، مارشل لاء، ترک موالات اور تحریک خلافت کے زمانے کی ہنگامی کیفیات کو اپنے اشعار میں سمویاہے۔ اس کے علاوہ ان کے کلام میں آزادی کی اہمیت اور ملّی تقاضوں سے بھرپور خطوط ابھرتے ہیں۔ نظم " آزادی کے ساماں" سے اقتباس ہے:

شریعت کے نگہباں پابجولاں ہوتے جاتے ہیں

مسلمانوں کی آزادی کے ساماں ہوتے جاتے ہیں

پرستاران خاک کعبہ بے تابانہ بڑھ بڑھ کر

رسول اللہ ﷺ کی عزت پہ قرباں ہوتے جاتے ہیں

نہیں تخصیص عہد اس میں محمدؐ کے غلام اب بھی

سکندر بنتے جاتے ہیں سلیماں ہوتے جاتے ہیں

(آزادی کے ساماں، نشید حریت)

مولانا محمد علی جوہر کی زندگی کا ہر لمحہ مسلمانان ہند کی فکری و سیاسی ترجمانی میں گزرا۔ تحریک خلافت نے ان کی شعلہ نوائی سے حرارت حاصل کی۔ ان کی بے باکی سے جہاں برطانوی حکومت میں خوف پیدا ہوا وہیں مسلم سیاست میں بھی بے خوفی و دلیری پیدا ہوئی۔ انھوں نے تحریک آزادی میں نئی جان پیدا کر دی جس کی بدولت ان کو جیل میں بند کر دیا گیا لیکن جب مولانا محمد علی جیل سے رہا ہو کر آئے تو ان کا شاندار جلوس نکالا گیا۔ اس موقعے پر مولانا محمد علی نے یہ تاریخی فقرہ کہا تھا کہ "میں جیل سے واپسی کا ٹکٹ لے کر آیا ہوں۔"(۱۲۹) تحریک خلافت میں پیش پیش مولانا محمد علی جوہر نے اس تحریک میں ہندوؤں کا تعاون بھی حاصل کر لیا اور یہ ثابت کیا کہ مسلمان جغرافیائی حد بندیوں کی بجائے عالم گیر انسانیت و مسلم قومیت کو اہمیت دیتے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر مسلمانوں کو عظیم تر قربانی کی ترغیب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

دور حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد

ہے ابتداء ہماری تری انتہا کے بعد

لذت ہنوز مائدہِ عشق میں نہیں

آتا ہے لطف جرم تمنا سزا کے بعد

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

(کربلا کے بعد، نشیدِ حریت)

مولانا محمد علی جوہر کی اس غزل میں بلا کی تڑپ اور شدتِ غم ہے جو غیور مسلمانوں کے دل میں آزادی کا جذبہ بیدار کرنے کے لیے تحریک پیدا کرتی ہے۔ برصغیر کی تاریخ میں ۱۹۳۵ء سے تقسیمِ ہند اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک انتہائی ہنگامہ خیز دور گزرا ہے جس میں ہندو اور مسلمان باہمی رنجشوں کا شکار ہو کر دونوں فریق غیر اعتمادی کا کھل کر اظہار کر رہے تھے تو دوسری طرف تمام سیاسی جماعتیں ملک کی آزادی کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس دور کے قومی شعرا کی فہرست میں شعرا کی کثیر تعداد شامل ہو چکی تھی جن میں جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، سیماب اکبر آبادی، ساغر نظامی، روشن صدیقی، احسان دانش، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ن م راشد، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، اختر الایمان اور ساحر لدھیانوی وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں بیشتر شعراء ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے لیکن وطن اور قوم سے محبت کسی صورت کم نہ ہوئی۔ بقول غلام حسین ذوالفقار:

> ”سیاسی اعتبار سے اردو شاعری کا یہ دور غیر ملکی سامراج کے خلاف جارحانہ حملے کے سلسلے میں بڑا دقیع ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدا میں نوحوں اور مرثیوں کے برعکس اس سے اگلے دور میں وطن کی آزادی کے بہت زیادہ رجزیہ ترانے کہے گئے۔ ان ترانوں میں وطن کی عظمت کا احساس اور سامراج کے خلاف جذبہ پیکار بڑا شدید ہے“(۱۳۰)

اس دور کے لکھے گئے نغموں میں جوش و جذبہ کے ساتھ تعصب سے پاک کلام خالص وطن کی آزادی سے منسوب ہے۔ وطن کی آزادی کے ساتھ جو مسائل درپیش تھے ان میں کانگریس کے عزائم کا بھی اندازہ لگ چکا تھا۔ چھ صوبوں میں کانگریسی وزارتوں کے دور میں مستقبل کے بارے میں ہندو عزائم کھل کر سامنے آئے۔ ”بندے ماترم“ کو قومی ترانہ قرار دینا، نصابی کتب ہندو نقطہ نظر سے تیار کرنا اور تعلیمی اداروں میں گاندھی کی مورتی کو پرنام کرنا لازمی قرار دینا وغیرہ ایسے اقدام تھے جنھوں نے مسلمانوں کو اپنے مستقبل کے بارے میں بے حد فکر مند کر دیا(۱۳۱) برصغیر کی تاریخ کا یہ مختصر دور خاصا کٹھن تھا۔ اس لیے ایسے وقت میں تھوڑی سی کاہلی و سستی سے ہمیشہ کے لیے تاریکی نظر آ رہی تھی۔ اس میں شعرا نے اپنی جماعت اور قوم سے وابستگی اور اس کی

کامیابی کے لیے نغمے اور ترانے لکھے۔ مولانا ظفر علی خان کی نظم جو مسلم لیگ کے پیغام عام کے لیے لکھی گئی اور جس میں آریہ سماجی فتنہ کی روک تھام کا بھی ذکر ہے، اس کا ایک شعر زبان زد خاص وعام ہو گیا:

مسلمان ہے تو مسلم لیگ کا جھنڈا اڑاتا چل
پیام آزادی کامل کا دنیا کو سناتا چل
پڑھتا چل سبق باطل کی بنیادوں کے ڈھانے کا
سلیقہ راہ حق میں سر کٹانے کا سکھاتا چل
جلاتا چل دیا اسلام کا اطراف عالم میں
چراغ کفر کو ایمان کے پھونکوں سے بجھاتا چل

(نظم پیام آزادی، آزادی کے ترانے)

اس نظم میں ظفر علی خان مسلمانوں کو شہادت کا درس دینے کے ساتھ ان کو مسلم لیگ اور اس کے جھنڈے تلے جمع ہونے کی تلقین کرتے ہیں۔ جہاں ظفر علی خان کی مسلم لیگ اور اسلام سے وابستگی ظاہر ہوتی ہے وہیں علی جواد زیدی کے اس بیان کی تردید بھی ہو جاتی ہے کہ ”اردو کا ایک بھی اچھا شاعر مسلم لیگ کے دو قومی نظریے کا حامی نہ بن سکا۔“(۱۳۲) اس دور میں مسلمانوں کی طرف سے علیحدہ وطن کے مطالبے کے ساتھ اس کا نام پاکستان تجویز کر لیا گیا تھا تو اس حوالے سے نظمیں زد عام وخاص ہو گئیں۔ میاں بشیر کی نظم ”لے کے رہیں گے پاکستان“ ۲۴ اپریل ۱۹۴۳ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے تیسویں سالانہ اجلاس میں پڑھی گئی۔

حق ہے ہمارا پاکستان — حق پہ ہمارا ہے ایمان
آؤ کر دیں آج اعلان — چاہے اپنی جائے جان
لے کے رہیں گے پاکستان — لے کے رہیں گے پاکستان
عالمگیر اخوت ہو — سب کو سب سے محبت ہو
نیکی اپنی دولت ہو — خدمت اپنی خصلت ہو
دل کی راحت پاکستان
لے کے رہیں گے پاکستان

(لے کے رہیں گے پاکستان، آزادی کے ترانے)

مسلمانوں کے رہنما اور مسلم لیگ کے صدر قائد اعظم محمد علی جناح ایسی شخصیت تھے جن کی انتھک محنت کی بدولت علامہ محمد اقبال کے خواب کو عملی جامہ پہنایا جا سکا۔ بر صغیر کے مسلمان اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ

صرف قائد اعظم کی قیادت میں ہی وہ اپنی آزادی ممکن بنا سکتے ہیں۔ جس وجہ سے برصغیر کے مسلم شعرا نے حصول پاکستان کے ساتھ محمد علی جناح اور دوسرے مسلم لیگی رہنماؤں پر نغمے لکھے گئے۔ میاں بشیر احمد کا مقبول نغمہ جو مسلم لیگ کے ستائیسویں اجلاس منعقدہ لاہور میں بتاریخ ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو پڑھا گیا۔ اقتباس ہے:

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح
ملت ہے جسم ، جاں ہے محمد علی جناح
صد شکر پھر ہے گرم سفر اپنا کارواں
اور میر کارواں ہے محمد علی جناح
عمر دراز پائے مسلماں کی ہے دعا
ملت کا ترجماں ہے محمد علی جناحؒ

(محمد علی جناحؒ، آزادی کے ترانے)

اردو میں قومی وملّی شاعری کا وہ دور جس کی ابتدا حالی اور شبلی سے ہوئی تھی اور ان پر دو قومی نظریہ کی چھاپ سرسید نے لگائی تھی، آخر کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ یعنی اردو شاعری میں قومی اور ملّی دور کا ایک حصہ اپنے اختتام کو پہنچا اور تقسیم کے بعد قومی وملّی شاعری ایک نئے فکر اور نظریہ سے اردو شاعری میں وارد ہوئی جو اب تک جاری وساری ہے اور آئے روز اس میں تنوع در آتا ہے۔

## (ج) آزادی کی تحریکیں اور قومی وملّی شاعری

برصغیر پاک وہند میں جب مسلمان وارد ہوئے تو وہ نہ صرف مذہب بلکہ ایک نظام زندگی اور ایسا نظام زندگی جس پر انسانیت کی تشکیل اور ارتقا ہوا تھا، اپنے ساتھ لائے۔ اسلامی مذہب اور نظام حیات میں مساوات، اخوت، عدل اور حسن سلوک کا حکم ہے اس لیے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت اور آمد کے بعد برصغیر پاک و ہند کی قوم جو ہندو مذہب کی پیروکار تھی اور اس میں انسانیت کی تقسیم ذات پات پر تھی۔ جن میں برہمن، وید، کھشتری اور اچھوت شامل تھیں۔ ان میں برہمن کو تمام ذاتوں پر فوقیت کے علاوہ ہر قسم کے حقوق حاصل تھے۔ اس کے برعکس اچھوت کی حالت جانوروں سے بھی بدتر تھی۔ برہمنوں نے مسلمانوں کے وجود اور حکمرانی کو قبول نہ کیا۔ مسلمانوں کی برصغیر آمد کے بعد ہندوستان کی کم تر ذاتوں یعنی اچھوت، کھشتری اور وید وغیرہ نے اسلام

قبول کرنا شروع کر دیا جس سے برہمن کو سخت کوفت ہوئی اور انھوں نے بدیسی حکمرانوں و مذہب کے پیروکاروں کے خلاف پروپیگنڈے کرنے شروع کیے۔

ابوریحان البیرونی نے جو گیارھویں صدی عیسوی کو سلطان محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آیا اور یہاں کی آب و ہوا، حالات، مذہب اور لوگوں کی تہذیب و معاشرت اور ثقافت پر ایک کتاب تصنیف کی۔ جس کا نام ''کتاب فی تحقیق ماللہند من مقالہ مقبولہ و مردود '' ہے اور یہ کتاب ''کتاب الہند '' کے نام سے مشہور ہوئی(۱۳۳)اس میں البیرانی ہندو مذہب کے جنون کے بارے لکھتے ہیں کہ وہ دوسرے مذہب کے ماننے والوں بدیسیوں کو ملّیچھ یعنی ناپاک سمجھتے ہیں اور ان سے ملنا جلنا، شادی بیاہ کرنا ان کے قریب جانا یا ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا حرام سمجھتے ہیں''(۱۳۴)اس کے برعکس اسلام کی آمد سے ہندوستان کی نچلی ذاتوں کی کامیابی کے دروازے کھل گئے اور ان کی ہندوؤں کے مظالم اور تعصب سے جان چھوٹی۔ پہلے وہ غلاموں سے بدتر تھے لیکن اب وہ برہمن کے برابر حقوق کے مالک بن گئے یعنی ہندوستان میں انسانیت کے احترام کی راہ کھل گئی۔

ان حالات میں ہندو مذہب و قوم میں جس طبقہ کے وقار اور شان میں کمی آئی وہ برہمن طبقہ تھا۔ انھوں نے اپنے منصب کے چھن جانے کی فکر میں غم و غصہ اور مخالفت سے نچلے طبقے کے لوگوں کو ساتھ ملانے کے لیے کئی فتنے گھڑے۔ البیرونی ہندوؤں کے مذہبی تعصب اور غیر ملکیوں کی تحقیر کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ لوگ ہم سے اس درجہ مختلف ہیں کہ اپنے بچوں کو ہم سے، ہمارے لباس اور طور طریقوں سے ڈراتے اور ہم کو شیاطین (راکشوں) کی نسل میں شمار کرتے ہیں اور ہمارے اعمال کو نیکی کا الٹ تصور دیتے ہیں۔ ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ ان کے ملک کے علاوہ روئے زمین پر کوئی اور ملک نہیں ہے اور نہ ان کی قوم کے علاوہ کوئی دوسری قوم ہے، نہ کہیں ان کے بادشاہوں جیسے بادشاہ ہیں، نہ ان کا جیسا مذہب ہے اور نہ ان کا جیسا علم و فن ہے۔ اس خام خیالی نے انھیں تعلّی، ہٹ دھرمی اور حماقت میں مبتلا کر دیا ہے۔ جو کچھ یہ جانتے ہیں اس کو بتانے میں بخل کرنا اور دوسری قوم کے افراد تو درکنار، خود اپنی قوم کی ذاتوں کے لوگوں سے اسے بچانا اور چھپانا ان کی فطرت میں داخل ہے۔ یہ خام خیالی ان میں اس حد تک گھر کر چکی ہے کہ اگر ان کے سامنے خراسان و ایران سے کسی علم اور اہل علم کا ذکر کیا جائے تو وہ کہنے والے کو احمق ہی نہیں دروغ گو بھی سمجھیں گے۔ اگر یہ لوگ دوسرے ملکوں کا سفر کریں اور وہاں کے لوگوں سے ملّیں جلیں تو اس خیال سے باز آجائیں کیوں کہ ان کے اسلاف اتنے تنگ نظر نہیں تھے جتنی ان کی موجودہ نسل ہے۔''(۱۳۵)

ان تمام حالات کے باوجود مسلم حکمرانوں نے ہندوستان کے مقامی باشندوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور جو اپنی خوشی سے مسلمان ہوئے ان کو خوش آمدید کہا اور جو اپنے آبائی دین پر قائم رہے ان سے کسی نے تعرض نہ کیا۔ مسلمانوں کے اخوت و بھائی چارہ سے ہندو تیزی سے اسلام سے متاثر ہو رہے تھے اور حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد برابر کا رتبہ پا رہے تھے جس نے برہمنوں کے غم و غصہ کو شدید تر کر دیا لیکن اس کے بعد ہندو دانشوروں نے اپنے مذہب میں ضروری اصطلاحات کی طرف توجہ کی۔ وحدانیت کے تصور کی اعلانیہ طریقے سے ہندو مذہب میں آمیزش کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ اگر وہ ایسا کرتے تو پوجا پاٹ اور مندر میں مورتی کی پرستش کے بغیر ہندو سوسائٹی بے معنی ہو جاتی (۱۳۶) چند اصطلاحات سے ہندو مذہب میں انتہا پسند اور سخت رویے کے برعکس ان میں نرمی اور بہتری لائی گئی تاکہ ہندو مذہب کے لوگ مسلمانوں سے متاثر ہو کر ان کا مذہب قبول نہ کر لیں۔ ساتھ کم ذات اور غلام لوگوں کو مختلف حیلوں بہانوں سے دبایا گیا اور اسلام اور مسلمانوں سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی۔ ہندو دانشوروں نے مسلمان حکمرانوں کی صفوں میں آنا شروع کیا اور وہ حکومت کے اہم عہدوں پر فائز ہونے لگے جس سے مسلمان حکمرانوں کے خلاف سازشوں اور پروپیگنڈوں میں تیزی آئی۔ بقول عبید اللہ قدسی:

> "مغلیہ سلطنت کے دور میں باہر سے ہنر مند، پیشہ ور، شاعر، ادیب، اہل علم، فن کار اور جنگجو قسمت آزما جوانوں کی آمد کا سلسلہ کم ہو گیا۔ راجپوت شریک ہو گئے۔ برہمن بنیے اور بقال بھی عمائدین کی صفوں میں در آئے، محلات میں ہندو رانیاں داخل ہو گئیں۔ مندر بن گئے اور آزمودہ کار ترک اور ایرانی و افغانی، درباری سازشوں کا شکار ہو گئے۔ یوں تمام روابط منقطع ہو گئے اور سلطنت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے قوانین بھی مقامی افراد نے وضع کیے۔ اس عمل سے مختلف مکاتب فکر کے مابین کش مکش کی ابتدا ہوئی جس سے ذہنی انتشار پیدا ہوا اور سلطنت کا استحکام اندر ہی اندر کھوکھلا ہو کر رہ گیا۔" (۱۳۷)

یہ وہ دور تھا جب اکبر بادشاہ مغلیہ خاندان کا فرمانروا ہندوستان پر حکمرانی کر رہا تھا۔ اکبر بادشاہ نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے، "دین اکبری" جیسے مذہب کی بنیاد رکھی۔ گویا ہندوستانی سلطنت کی حکمرانی نام کی تو مسلمانوں کے پاس تھی لیکن وہ حقیقی معنوں میں ہندوؤں میں منتقل ہو رہی تھی۔ دوسرا اہم خطرہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے مذہب اور کلچر سے لاحق ہوا۔ کیونکہ دین اکبری سے ہندوؤں کے عزائم پایہ تکمیل کو پہنچنے کے قریب تھے اور اسلام کو یکسر پس پشت ڈال دیا گیا تھا۔

اسلام اور مسلمانوں کی اس ناگفتہ حالت پر برصغیر میں جس نے سب سے پہلے آواز بلند کی وہ مجدد الف ثانیؒ کی شخصیت تھی۔ گو کہ مجدد الف ثانیؒ کو قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلنی پڑیں لیکن وہ اپنے مقصد پر ڈٹے رہے

اور اگر اس زمانے میں مجدد الف ثانیؒ جدوجہد نہ کرتے تو برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں کا شیرازہ بہت پہلے بکھر جاتا(۱۳۸)

اکبر بادشاہ کے بعد ان کے بیٹے جہانگیر نے اسلامی اقدار کو پھر سے بحال کیا اور اورنگزیب عالم گیر ایسا پختہ ارادوں کا مالک تھا کہ اس نے دربار سے غیر اسلامی اقدار کا خاتمہ کیا اور ہندوستان کو اسلامی معاشرہ بنانے کی سعی کی۔ اورنگزیب کی وفات کے بعد ان کی اولاد میں کوئی ایسا قوی بادشاہ پیدا نہیں ہوا کہ وہ عالمگیر کے اقدامات کو قائم رکھ سکے۔ مسلم ریاست گزرتے ایام کے ساتھ زوال پذیر ہونا شروع ہو گئی کیونکہ مغلیہ حکمرانوں میں ہندوؤں کے عزائم اور ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہ تھی۔

اس زوال پذیر اسلامی مملکت کے دور میں دوسری شخصیت جس نے اسلام اور اسلامی حکومت کی بحالی کے لیے کوشش کی وہ شاہ ولی اللہ تھے۔ شاہ ولی اللہ کی تحریک مسلمانوں کی سیاسی آزادی کی ابتدا ہے جن کے منشور کو ان کے جانشین اور بیٹے شاہ عبد العزیز نے جاری رکھا اور شاہ عبد العزیز کے مرید سید احمد بریلوی نے عملاً کفار کے ساتھ جہاد بلند کیا۔ گو کہ وہ اس میں اپنے ساتھیوں سمیت شہید ہو گئے لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ پورے ہندوستان میں جہاد کا جذبہ ابھرنے لگا اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اسی کا شاخسانہ ثابت ہوئی۔ اس جنگ میں بھی مسلمانوں کو بری طرح شکست ہوئی اور وہ ہندوستان میں اپنی شناخت کھو بیٹھے۔ جس کے بعد مسلم دانشوروں نے نئے سرے سے اسلام کی شیرازہ بندی کے لیے کوششیں کیں اور کئی تحریکوں کا آغاز ہوا تا کہ غیر مسلموں سے آزادی حاصل کی جا سکے اور مسلمانانِ برصغیر کی پھر سے شناخت بحال ہو سکے۔ ان آزادی کی تحریکوں میں چند اہم اور معروف تحریکوں اور ان تحریکوں کے زیر اثر ہونے والی قومی و ملّی شاعری کا ذکر ضروری ہے۔

## علی گڑھ تحریک:

مسلمانوں پر جب بھی کوئی مشکل وقت آیا تو حق باری تعالیٰ نے اس کے سدِباب کے لیے وسیلے بھی پیدا کر دیے۔ مسلمانان برصغیر کے فکری خطرات کے ازالہ کے لیے مجدد الف ثانی کو بھیجا۔ اسی طرح جب اسلامی حکومت پر زوال آیا اور برصغیر پاک وہند کے مسلمان قدیم خیالات و فرسودہ روایات اور غیر اسلامی اعتقادات کی وجہ سے کسمپرسی کے شکار تھے، قریب تھا کہ مرہٹے، سکھ اور جاٹ غلبہ پا کر مسلمانوں کا خاتمہ کر دیتے، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک نے مسلمانان برصغیر کو سہارا دیا۔ شاہ ولی اللہ نے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے جدید علوم کی بنیاد رکھی۔ جس نے مسلمانوں میں تحریک پیدا کی اور جہاد بلند کیا۔ شاہ ولی اللہ کے انتقال کے پچانوے برس بعد یعنی ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانان برصغیر ایک دفعہ پھر ایسے مقام پر کھڑے تھے جہاں

ان کے لیے ہر طرف تاریکی تھی۔ معاشی، معاشرتی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی ہر لحاظ سے ابتری حالت تھی۔ ان حالات میں خدائے بزرگ و برتر نے سر سید احمد خان کی صورت میں ایک ایسا وسیلۂ رہبر پیدا کیا جس نے شاہ ولی اللہ کی طرز فکر کو اپنا کر مسلمانوں میں جدید علوم حاصل کرنے کی امنگ پیدا کی۔ وہ شاہ ولی اللہ کی طرح اصلاح پسندی کو مذہبی حدود میں شامل کرنا چاہتے تھے(۱۳۹) کیونکہ سر سید احمد خان کو بھی انھی جیسے حالات کا سامنا تھا جو شاہ ولی اللہ کے دور میں تھے یعنی مسلمانوں کی جدید علم سے دوری اور جہالت پروری۔ عہد سر سید میں مسلمانوں میں طرز فکر کے لحاظ سے دو گروہ تھے جس میں پہلا گروہ انگریزی تہذیب اور ہندوؤں کی ترقی سے متاثر تھا اور ان میں یہ احساس بیدار ہو چکا تھا کہ ان کی موجودہ پستی، ناکامی اور ذلت انگریزوں سے عداوت کی وجہ سے ہے۔ اس لیے انھیں اپنے اختلاف کو ختم کرنے کے لیے نظر ثانی کرنی چاہیے اور انگریزی علوم سے بہرہ ور ہو کر ہندوؤں کے برابر انھیں بھی ترقی کرنی چاہیے۔ اس احساس نے ان میں ایک نئی طرز فکر پیدا کی اور وہ انگریزوں سے عداوت کے بجائے مصالحت پر زور دینے لگے جبکہ دوسرا گروہ اس کے برعکس تھا۔ وہ انگریزی تعلیم اور تہذیب و ثقافت کے سخت خلاف تھا اور مسلمانوں کے قدیم طرز فکر اور قومی وجود کو برقرار رکھنے کے لیے ہر قسم کے ایثار کا جذبہ پیدا کرتا رہا(۱۴۰) سر سید احمد خان کا تعلق پہلے گروہ سے تھا جو مسلمانوں کو انگریزی سے دشمنی ختم کرنے اور انگریزوں کو رام کرنے کے ساتھ ان سے مسلمانوں کے لیے ترقی اور کامیابی کی راہیں ہموار کرنے کی لگن میں مگن رہے۔ بقول عبید اللہ قدسی:

> "برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی قسمت پلٹنے والے صحیح رہبر دو ہی ہوئے ہیں۔ ایک شاہ ولی اللہ اور دوسرے سر سید احمد خان۔ دونوں کو ایک جیسے حالات سے گزرنا پڑا اور دونوں نے قریب قریب یکساں تجربات کیے۔ پھر یہی کام آخر میں اقبال نے انجام دیا۔"(۱۴۱)

گویا سر سید نے جدید علوم سے بہرہ ور ہونے والے ہندوؤں اور انگریزوں کے مشترکہ خطرے کے پیش نظر انگریزوں سے مصالحت کی طرف قدم بڑھایا اور ان کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مسلمان ان کے دشمن نہیں بلکہ وفادار ہیں۔ صرف دونوں طرف سے قائم خلیج کو ختم کرنا باقی ہے۔ تحریک علی گڑھ بنیادی طور پر علمی تحریک تھی لیکن علم کی اسی شمع سے پھوٹنے والے پروانے تخلیق پاکستان میں قائداعظم کے ہم نوا بنے۔ اس لیے اس تحریک کی اہمیت نہ صرف علمی تھی بلکہ غدر کے بعد مسلمانوں کی یہ پہلی تحریک تھی جس نے مسلمانوں کے علیحدہ قومی تشخص کے لیے سعی کی۔ اس تحریک کے روح رواں چونکہ سر سید احمد خان تھے اس لیے اسے سر سید

تحریک کے نام سے بھی منسوب کیا جاتا ہے اور علی گڑھ وہ تعلیمی مرکز تھا جہاں مسلمانان برصغیر دینی اور جدید دونوں قسم کی تعلیم سے زیور آراستہ ہو رہے تھے۔

علی گڑھ تحریک کے بانی سرسید احمد خان جنھوں نے اس نازک دور میں مسلمانان پاک و ہند کو جدید تعلیم کی طرف راغب کیا بذات خود بھی علم و ہنر کا مینار تھے۔ ۱۸۴۱ء سے ۱۸۵۷ء تک انھوں نے تقریباً پندرہ کتابیں تالیف کیں لیکن جنگ آزادی کے بعد اپنی تمام توانائیاں مسلمانوں کے لیے صرف کر دیں۔ سرسید کی ذات میں قدامت اور جدیدیت دونوں کا امتزاج تھا اور انھوں نے مسلمانوں کے روشن ماضی سے عظمت و رفعت کا تصور حاصل کیا لیکن تصور میں رنگ آمیزی مغربی علوم سے کی(۱۴۲) یہ برصغیر کی تاریخ کا وہ دور تھا جب مسلمانان برصغیر تعلیم کے سلسلے میں شش و پنج میں مبتلا تھے کیونکہ گورنمنٹ نے جو مدرسے اور کالج ہندوستان میں قائم کیے تھے وہ پالیسی کی رو سے مذہبی تعلیم سے بیگانہ تھے۔ ان کا مقصد محض بعض ضروری دنیاوی علوم اور انگریزی پڑھانا تھا تاکہ ان پر عبور حاصل کر کے ہندوستانی سرکاری نوکریوں میں شریک ہو سکیں(۱۴۳) لیکن مسلمان نوکریوں کے ساتھ دینی تعلیم کو لازمی جزو سمجھتے تھے کیونکہ دین کا رشتہ وہ کسی صورت منقطع نہیں کر سکتے تھے۔

ان حالات میں جب ایک طرف ایسی تعلیم جو مذہب سے بالکل بے گانہ تھی لیکن جدید علوم سے آراستہ اور دوسری طرف خالص مذہبی تعلیم تھی جو جدید علوم اور تقاضوں کے لحاظ سے ناکافی تھی۔ اس صورت حال میں ایک مسلمان طالب علم کو سوائے اس کے کچھ چارہ نہ تھا کہ وہ یا تو قدیم تعلیم حاصل کرے اور موجودہ علوم سے کنارہ کشی کرے اور دنیا کے نئے مشاغل اور کاروبار میں ایک عضو معطل ہو کر رہے یا انگریزی تعلیم کی طرف رجوع کرے جو صریحاً تنگ اور محدود معنوں میں رفاہی تھی۔ علی گڑھ کی تحریک نے مسلمانوں کے سامنے ان دونو ں راستوں سے علیحدہ ایک تیسری شاہراہ پیش کی جس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ 'سر رشتہ تعلیم مادر دست ما باشد' یعنی ہم کو چاہیے کہ اپنے تعلیم کے نظام کو اپنی مخصوص ضروریات اور نصب العین کے مطابق تشکیل دیں اور اس کے ذریعہ قوم میں بیداری عملّیت کی ایسی روح پھونکیں جو ایک طرف توہمات، غفلت اور قدامت پرستی کی قوتوں کو شکست دے اور دوسری طرف ان طاقتوں کا مقابلہ کرے جو مذہب اور تمدن کو مٹا دینے کی دھمکی دے رہی تھیں"(۱۴۴) سرسید اور ان کی عملّی تحریک نے برصغیر مسلمانان کے مسائل اور حالات کو سمجھتے ہوئے ان کی تعلیمی پیاس بجھانے کی کوشش کی اور ساتھ ہی دینی مقاصد بھی پورے کرنے کی بھرپور سعی کی۔ اب وہ دور نہیں رہا تھا کہ سید احمد بریلوی کی طرح منکرین اسلام سے جہاد کیا جائے بلکہ اس دور کا تقاضا یہ تھا کہ دشمن سے ہاتھ ملا کر ان سے قومی و ملّی فوائد حاصل کیے جائیں اور مسلمان سیاسی، معاشی اور تعلیمی طور پر خود کو پہلے اتنا مضبوط کریں کہ وہ

ان جدید تہذیب و تعلیم سے آراستہ دشمن کا مقابلہ کر سکیں۔ اس کے بغیر مسلمان نہ تو دشمن کا میدان جنگ میں مقابلہ کرنے کی ہمت کر سکتے تھے جس کا ناکام تجربہ سید بریلوی شہید کر چکے تھے اور نہ ہی کسی اور میدان میں۔

گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو سکرات کے عالم سے نکالنے کے لیے جو کوششیں کیں وہ کسی پیغمبر کے کارناموں سے کم نہیں ہیں اور اگر سر سید مسلمانوں کو قدامت پسندی اور جمود سے نکالنے کی سعی نہ کرتے تو شاید آج پاکستان نہ ہوتا اور برصغیر کے مسلمان انگریز اور ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہوتے۔ بقول انور سدید ”یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہے کہ سر سید نے اپنے مقاصد ملّی سے انحراف نہیں کیا بلکہ انھوں نے اپنی قومی جنگ جاری رکھی اور کھلی جنگ میں توپ و تفنگ آراستہ کرنے کے بجائے جدوجہد کی بساط کاغذ پر سجائی اور اسے دلائل سے جیتنے کی کوشش کی“(۱۴۵) سر سید اور ان کی تحریک کے اہم کارناموں میں سکول مراد آباد، مدرسہ غازی پور کالج، سائنٹیفک سوسائٹی، علی گڑھ سائنٹیفک سوسائٹی، ورنیکلر یونیورسٹی، اور علی گڑھ کالج و یونیوسٹی کا قیام اہم ہیں جب کہ اخبارات ورسائل میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

علی گڑھ تحریک نہ صرف علمی، سیاسی و اسلامی تحریک تھی بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھی۔ اس تحریک نے فکری، علمی، ادبی اور تہذیبی حوالے سے بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ سر سید احمد خان نے جس طرح قومی و ملّی شعور بیدار کیا اسی طرح انھوں نے اردو زبان و ادب اور شعر و شاعری کے مزاج کو بھی بدلا۔ سر سید کی تحریک علی گڑھ نے ادب برائے ادب کے قدیم تصور کو بدل کر ادب برائے زندگی کا تصور اپنایا اور یوں اردو ادب کے موضوعات کا رخ پھیر دیا۔ جس سے اردو ادب صرف گل و مینا اور سرو و گلاب کے مضامین کو بیان کرنے کا ذریعہ نہ رہا بلکہ حقیقی زندگی کے مسائل اور اجتماعی زندگی کا ترجمان بن گیا جس سے موضوعات میں اضافہ اور تنوع پیدا ہوا اور ہر قسم کے خیالات و فکر پر اظہار کرنے کا سلیقہ اور صلاحیت پیدا ہوئی۔

اردو شاعری میں ایسی کاوش سب سے پہلے نظیر اکبر آبادی نے کی تھی لیکن ہندوستان کے سیاسی و تہذیبی حالات کے مطابق ان کو پذیرائی حاصل نہ ہوئی البتہ سر سید احمد خان کے دور میں برصغیر پاک و ہند کے حالات یکسر مختلف تھے اور اب وہ زمانہ تھا جس میں برصغیر پر بدیسی حکمران نہ صرف قابض تھے بلکہ وہ یکسر یہاں کی تہذیب و ادب پر اثر انداز ہو رہے تھے اور حالات کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ادب کو تفریح و تسکین سے نکال کر کار آمد بنایا جائے۔ اس سلسلے میں سر سید اور ان کی تحریک نے اہم کردار ادا کیا۔

سر سید تحریک نے اگرچہ اردو شاعری کے مقابلے میں اردو نثر پر زیادہ توجہ دی لیکن شاعری کو بھی نقائص سے پاک کرنے کی کوشش کی۔ بقول سید عبد اللہ ”سر سید احمد خان نئی ادبی تحریک کے پہلے بڑے محرک ہونے کے

باعث پرانے ادب کے بالمقابل نیا ادب پیدا کرنے کے اولین بڑے داعی قرار پاتے ہیں"(۱۴۶) اردو زبان میں انگریزی زبان کے اثرات انگریزوں کے آمد سے ہی رواج پا گئے تھے لیکن سر سید دور میں انگریزی کے اثرات اس دور کی نثر میں نمایاں ہو کر اسلوب کا حصہ بنے جس سے زبان کے لسانی سرمائے میں وسعت پیدا ہوئی اور یہ زبان علمی و ادبی زبان کی حیثیت سے ترقی کرتی ہوئی دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے ہم پلہ بن گئی۔

سر سید تحریک نے جہاں اردو نثر کو فروغ دیا اور جمود سے نکال کر نئے معنی اور ذخیرہ الفاظ کے ساتھ اس میں تحریک پیدا کی وہیں اردو شاعری کو تقلید کی بجائے صداقت، حقیقت اور واقعیت کے راستے پر ڈالا۔ اردو شاعری میں تخیل اور وجدان کے مقابلے میں عقل و استدلال کے رویوں کو متعارف کرایا۔ تعطل، فرسودگی اور جمود کو دور کر کے ہمہ گیری، مقصدیت، سنجیدگی اور مقبولیت پیدا کی۔ فکر و ادب میں آزادی اظہار رائے کی رسم جاری کی۔ اس طرح ادب (یعنی شعر و نثر میں) میں اجتماع کا رشتہ قائم کیا بقول سید الطاف علی بریلوی "سر سید احمد خان کے یہی خیالات منظم و مربوط اور مکمل و مدلل شکل میں "مقدمہ شعر و شاعری" کی صورت میں مولانا حالی سے ظہور پذیر ہوئے"(۱۴۷) چنانچہ اردو شاعری کے گزشتہ ادوار کے مقابلہ میں ملکی آزادی اور قومی اصلاح کے جذبات و احساسات زیادہ واضح اور کھل کر ادا کیے گئے۔ اجتماعی شعور کی یہ شکل اس سے پہلے موجود نہ تھی اس کا آغاز علی گڑھ تحریک سے ہوا(۱۴۸) تحریک علی گڑھ کے زیر اثر اردو زبان و ادب کو جو ترقی حاصل ہوئی وہ اس دور کے نامور شعرا و ادبا کی مرہون منت ہے۔ اردو کے ان شعرا میں چند کا خصوصیت سے ذکر کیا جاتا ہے جو علی گڑھ تحریک سے وابستہ تھے۔

خواجہ الطاف حسین حالی:

خواجہ الطاف حسین حالی کا شمار تحریک علی گڑھ سے وابستہ ان مشاہیر میں کیا جاتا ہے جو شاعر، ادیب، محقق، نقاد اور تحریک کے اولین مفکرین میں شامل تھے۔ انھوں نے اردو شاعری کو مقصدیت کی ڈگر پر ڈال کر فرسودگی سے تازگی بخشی۔ مقدمہ شعر و شاعری ان جدید خیالات کا دیباچہ ہے جو خواجہ حالی اردو شاعری میں چاہتے تھے۔ چنانچہ اردو شاعری میں قومی، وطنی اور ملّی شاعری کو اردو ادب میں رواج ڈالنے کا باقاعدہ آغاز بھی حالی سے ہوتا ہے۔ اردو شاعری میں ملّی جذبات کا آغاز مومن سے ہو چکا تھا اور وطنی مسائل پر نظیر اکبر آبادی اس کے پیش رو ہیں۔ بقول رام بابو سکسینہ "زمانہ موجودہ کی فطری اور قومی شاعری جس کی ابتدا مولانا حالی اور آزاد سے کی جاتی ہے اس کے پیش رو بلکہ موجد نظیر اکبر آبادی کہے جاسکتے ہیں"(۱۴۹) لیکن حالی اور ان کے رفقا نے قومی شاعری میں جس قوت کا اضافہ کیا اس میں اضافہ ہوتا گیا اور پیچھے پلٹ کر بھی نہ دیکھا ہاں البتہ موضوعات کا تعین

زمانہ قدیم یعنی مسلمانوں کی گذشتہ شان و شوکت، تہذیب و تمدن، علم و فنون اور اتفاق و اتحاد سے کیا۔ جس کے نتیجے کے طور پر ۱۹۷۹ء میں "مسدس حالی" تخلیق ہوئی۔ حالی نے ماضی سے موضوعات لے کر ایک مورخ اور شاعر کی حیثیت سے اسلام کی وہ تاریخ بیان کی جو قوم و ملت کے لیے عہد زریں سے تعبیر کی جاتی تھی۔ "مسدس حالی" اردو قومی و ملّی شاعری میں اسلامی طرز فکر کی اس قدر نمائندگی کرتی ہے جس کا اندازہ سر سید کے اس قول سے لگایا جاسکتا ہے:

"جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوڑی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جاسکتے۔ حق ہے جو بات، دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے۔ بے شک میں اس کا محرک ہوں اور اس کو میں اپنے ان اعمال حسنہ سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا کر لایا ہوں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔"(۱۵۰)

مولانا حالی نے مسدس کے علاوہ بھی نظمیں لکھیں جو قومی و ملّی جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ وہ شاعر کے ساتھ ایک مصلح بھی تھے جو قوم کی اصلاح چاہتے تھے لہٰذا ان کی شاعری میں قومی جذبات کے ساتھ اصلاح اور واعظ کا پہلو نمایاں ہے۔ وہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس جو علی گڑھ میں ۱۸۸۹ء میں منعقد ہوا اس میں پڑھی گئی ترکیب بند ہیئت کی نظم میں فرماتے ہیں:

زمانہ دیر سے چلاّ رہا ہے مسلمانو
کہ ہے گردش میں میری غیب کی آواز پہچانو
وہ ناصح اور ہوں گے جن کا کہنا ٹل بھی جاتا ہے
اگر میری نہ مانو گے تو پچھتاؤ گے نادانو

(ترکیب بند، علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں)

خواجہ الطاف حسین حالی کو مسلمانوں کی ابتر حالت کا شدید احساس تھا اور وہ اس کی وجہ جہالت اور تعلیم کی کمی خیال کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے مسلمانوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے کئی نظمیں لکھیں۔ انھوں نے مستورات کے حقوق اور مسائل کے حوالے سے بھی نظمیں لکھیں جن میں مناجات بیوہ، اور چپ کی داد وغیرہ شامل ہیں۔ ان نظموں کا مقصد عورتوں کے مسائل کے ساتھ معاشرے کی اصلاح کے عناصر شامل تھے۔ کیونکہ جاہل معاشرے میں بیوہ عورت کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور سب لوگ اس کو دھتکارتے ہیں لیکن وہ بیچاری اپنے دکھوں پر بول بھی نہیں سکتی:

اے مرے زور اور قدرت والے　　حکمت اور حکومت والے

میں لونڈی تیری دکھیاری　　دروازے کی تیری بھکاری

موت کی خواہاں جان کی دشمن　　جان پہ اپنی آپ اجیرن

اپنے پرائے کی دھتکاری　　میکے اور سسرال پہ بھاری

(مناجاتِ بیوہ، دیوان حالی)

اسی طرح الطاف حسین حالی "چپ کی داد" میں عورتوں سے ان الفاظ میں مخاطب ہیں:

اے ماؤ بہنو ! بیٹیو ! دنیا کی زینت تم سے ہے

ملکوں کی بستی ہو تمھیں، قوموں کی عزت تم سے ہے

تم گھر کی ہو شہزادیاں ، شہروں کہ ہو آبادیاں

غمگین دلوں کی شادیاں ، دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے

(چپ کی داد، دیوان حالی)

ان نظموں میں نہ صرف معاشرتی اصلاح کے پہلو نمایاں ہیں بلکہ عورتوں کے مسائل اور ہم وطنوں کی جہالت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ صالحہ عابد حسین الطاف حسین حالی کی عورتوں کے مسائل اور تعلیم کی فکر بارے لکھتی ہیں:

"ہندوستان کے مسلمانوں میں نئی تعلیم کا شوق پیدا کرنے اور پھیلانے کا کام سب سے پہلے سر سید نے شروع کیا تھا۔ حالی بھی ان کے ساتھیوں میں تھے۔ لیکن ایک بات میں وہ سر سید سے بڑھ گئے۔ پوچھیے وہ کیا؟ وہ یہ کہ مسلمان عورتوں میں تعلیم پھیلانے کا کام انھیں نے شروع کیا۔ پھر ہندوستانی عورت کو اس کا حق دلانے کی کوشش کی۔ اس پر جو زیادتی ہوتی تھی۔اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس کو علم حاصل کرنے کی آزادی اور حق دلانے کے لیے جدوجہد کی اور اپنے قلم سے اس کے بارے میں نظم اور نثر میں بہت کچھ لکھا۔"(۱۵۱)

حالی ایک درد دل رکھنے والے انسان تھے انھیں اپنے ہم وطنوں اور مسلمانوں کی محکومی کا تلخ احساس تھا اور وہ اس محکومی کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ وہ انگریز کے بنائے ہوئے قانون سے بھی نالاں تھے جس کی بنیاد ایک غلام قوم کا قانون تھا۔ وہ جہاں اصلاحی اور دھیمے مزاج کے آدمی تھے وہیں انھوں نے انگریزوں سے بدگمانی کا اظہار بھی کیا ہے۔ الطاف حسین حالی کو سر سید سے عقیدت تھی اور سر سید بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ کیونکہ حالی نے شعر و شاعری کے ذریعے قوم وملک کی اصلاح کا جو بیڑا اٹھایا تھا وہ کوئی کم نہ تھا۔ اس کے علاوہ بھی سر سید کے کاموں میں

برابر ہاتھ بٹاتے تھے۔ وہ سر سید کی بڑی عزت کرتے تھے۔ جس کی بدولت انھوں نے سر سید احمد خان کی شان میں قصیدہ لکھا جس میں ان کو قوم کا خیر خواہ کہا ہے۔

حالی جیسی درد پرور شخصیت کو نہ صرف مسلمانوں اور ہندوستانیوں بلکہ پوری دنیا کے لوگوں سے انس تھا جس کا احساس نہ صرف ان کی شاعری بلکہ نثر میں بھی پایا جاتا ہے لیکن مسلمانوں سے ان کو خاص لگاؤ تھا اور اردو شاعری میں ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے علیحدہ قومیت کا اظہار بھی سب سے پہلے حالی نے کیا تھا۔ وہ نظم "شکوہ ہند" میں مسلمانوں کے جداگانہ قومیت کو پیش کرتے ہوئے دوسری قوموں سے الگ تصور کرتے ہیں:

تھی ہماری قوم و ملت رسم و عادات سب سے جدا
رشتہ و پیوند کوئی ہم میں اور تجھ میں نہ تھا (شکوہ ہند، دیوانِ حالی)

## شبلی نعمانی:

تحریک سر سید میں قومی و ملّی شاعری کے حوالے سے جو نام حالی نے کمایا وہ شبلی کو نہ مل سکا۔ حالانکہ وہ شاعر تھے اور ان کا دیوان بھی موجود ہے۔ شبلی کو شاعری میں شہرت نہ ملنے کی وجہ کلیات شبلی کے دیباچہ میں سید سلیمان ندوی بیان کرتے ہیں کہ شبلی نعمانی کی شاعری ان کے علمی کمالات کے ڈھیر میں ایسی چھپ گئی کہ وہ بہت کم لوگوں کو نظر آئی(۱۵۲) ان کی ابتدائی اردو شاعری پر زیادہ اثر اودھ پنچ اور پیام یار کا تھا۔ وہ اودھ پنچ کو بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے جس میں سید احمد خان کی اصلاحی تحریک اور حالی کی جدید شاعری کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا(۱۵۳) شبلی کو ابتدا سے شعری ذوق تھا لیکن ابتدائی کلام میں کوئی خصوصیت نہ تھی البتہ ان کا فارسی کلام شروع سے ہی بہتر تھا۔ بقول سید سلمان ندوی "مولانا شبلی جب اوپر کی کتابیں پڑھنے لگے تو اردو اور فارسی شاعری میں اکثر شعر کہنے لگے فارسی شاعری کا ذوق تو بہت اچھا تھا مگر اردو شاعری ایسی ہی تھی جیسے اکثر نوجوان علم کے زور یا جوانی کے جوش سے شعر کہنے لگتے ہیں"(۱۵۴) مولانا شبلی کے اردو ذوق میں اس وقت بہتری ہوئی جب وہ ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ آئے اور سر سید احمد خان اور ان کی تحریک سے متاثر ہو کر تحریک کے ایک نامور رکن بن گئے(۱۵۵) علی گڑھ میں شبلی نعمانی کے خیالات و فکر میں سر سید کی شخصیت کا سحر رہا اور وہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس آل انڈیا کے سالانہ اجلاسوں میں شرکت کے ساتھ اپنا کلام بھی پڑھتے۔ اس کانفرنس کے تیسرے سالانہ اجلاس جو لاہور میں منعقد ہوا، میں شبلی کے پڑھے گئے اشعار سے اقتباس ہے:

بزم احباب ہے پر جوش ہے جلسا کیسا
جم گیا پھر طرب و عیش کا نقشا کیسا

صف بصف لوگ ہیں اور صدور ہیں وہ سید پاک

دیکھ اس لوح پہ کھلتا ہے یہ طغرا کیسا (۱۵۶)

علی گڑھ کے چوتھے سالانہ اجلاس جو علی گڑھ میں ہوا، میں شبلی نعمانی نے اپنا فارسی ترکیب بند پڑھا اور قوم کی اصلاح کا شرف حاصل کیا اس طرح پانچواں سالانہ اجلاس جو حیدر آباد میں منعقد ہوا اس میں بھی فارسی ترکیب بند پڑھا جس میں مسلمانوں کے قومی زوال اور انقلاب کی پر درد داستان بیان کی۔

ان اجلاسوں کے علاوہ بھی شبلی نعمانی نے قومی و وطنی اور ملّی نظمیں لکھی ہیں جن کا تعلق علی گڑھ تحریک سے تھا ان میں ایک اہم مثنوی "صبح امید" اور دوسری مسدس "تماشائے عبرت" ہے۔ مولانا شبلی کا پر جوش شہر آشوب "شہر آشوب اسلام" جو طرابلس اور بلقان کی جنگ کے موقع پر لکھا گیا۔ اس میں شبلی نعمانی نہ صرف قومی بلکہ ملّی درد کے حامل شاعر نظر آتے ہیں جن کو پوری امت مسلمہ کا درد تھا چاہے وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں آباد ہوں۔ بقول ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری "شبلی نعمانی کی زندگی دو جنگوں کے درمیان گھری ہوئی ہے وہ ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۴ء میں فوت ہوئے" (۱۵۷) آخری عہد کی شبلی کی زیادہ نظمیں جنگ طرابلس اور جنگ بلقان سے متاثر ہو کر لکھی گئیں۔

اسماعیل میرٹھی:

اسماعیل میرٹھی نے زیادہ تر ادب بچوں کے لیے تخلیق کیا اس لیے وہ بچوں کے شاعر مشہور ہوئے لیکن وہ نہ صرف بچوں کے شاعر تھے بلکہ ان کے دل میں ہندوستان اور مسلمانوں کے بڑے مسائل کا ادراک بھی تھا یہی وجہ ہے کہ ان کا تعلق تحریک سرسید سے براہ راست نہ ہونے کے باوجود انھوں نے اصلاحی مقاصد کے لیے علمی کام کیا اور علی گڑھ کالج و یونیورسٹی کے لیے چندے بھی فراہم کیے۔ اسماعیل میرٹھی اپنے زمانے کے معاشی و معاشرتی حالات و واقعات سے باخبر تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ قوم کی اصلاح کے بغیر بدیسی اقوام کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کو قدیم و جدید اور مغربی علوم پر دسترس حاصل تھی بقول غلام حسین ذوالفقار "بحیثیت شاعر وہ اپنے رنگ و سخن میں منفرد ہیں" (۱۵۸) میرٹھی کی نظموں میں ناصحانہ انداز اور سادگی و خلوص کی کثرت ہے۔ ان کی شاعری کا بنیادی وصف اصلاح قوم ہے۔ قطعہ "آزادی غنیمت ہے" میں فرماتے ہیں:

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر

تو وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر

جو ٹوٹی ہوئی جھونپڑی بے ضرر ہو

بھلی اس محل سے جہاں کچھ خطر ہو (آزادی غنیمت ہے، نشید حریت)

اسماعیل میرٹھی ان شاعروں میں سے ہیں جو حالی اور آزاد سے براہ راست متاثر ہوئے (۱۵۹) جس کے نتیجے میں اسماعیل میرٹھی کے قلم سے "جریدہ عبرت" "مسلمان اور انگریزی تعلیم" اور قطعہ اکبر آبادی جیسی نظمیں تخلیق ہوئیں۔ جریدہ عبرت دراصل قصیدہ کی شکل میں ہے اوراس کو قصیدہ شہر آشوب کا نام بھی دیا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں ہندوستانی معاشرہ کے مختلف طبقات کی اخلاقی، قومی، معاشی اور معاشرتی بدحالی کو درد بھرے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

اسماعیل میرٹھی کو سرسید سے عقیدت تھی اور اس تحریک کی اصلاحی کوششوں میں انھوں نے اپنا حصہ ڈالا اور کئی نظمیں لکھیں۔ انھوں نے اس تحریک کے سالانہ اجلاس جو آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے منعقد ہوتا تھا۔ اس کے پچیسویں اجلاس میں شرکت کی اور اپنا کلام پیش کیا۔ اقتباس ہے:

مسلمان کامل کی ہے یہ نشانی
کرے خدمت خلق تا حد امکاں
مگر ایسی خدمت کہ پر منفعت ہو
نہ ایسی کہ جس کا نتیجہ ہو نقصاں

(قطعہ، علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں)

الغرض مولوی اسماعیل میرٹھی نے ہر طبقے اور ہر رنگ میں معاشرتی اصلاح کے لیے نظم نگاری کی ہے جن کا مقصد قوم کی اصلاح تھا۔ بچوں کو قوم کا سرمایہ سمجھتے تھے اور بچوں کے لیے ان کی بہتر تربیت کے لیے خاص کر نظمیں پیش کیں جو آج بھی اپنی تاثیر رکھتی ہیں۔ حالی، شبلی اور اسماعیل میرٹھی کے علاوہ کئی شعرانے تحریک علی گڑھ کے اصلاحی مقاصد کے لیے اپنا کلام پیش کیا جو اس کے زیر اثر ہونے والے اجلاسوں میں پڑھا جاتا۔ ان شعرا میں چند کا ذکر درج ذیل ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا شمار علی گڑھ تحریک کے نثر نگاروں میں ہوتا ہے لیکن انھوں نے شاعری میں بھی طبع آزمائی کی اور نظمیں لکھیں جو آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھی بھی گئیں۔ آل انڈیا کے دسویں سالانہ اجلاس جو شاہجہاں پور میں ۱۸۹۵ء میں منعقد ہوا، میں مولوی نذیر احمد نے سرسید احمد خان کی محبت میں لکھے گئے اشعارِ قصیدہ پیش کیے:

بچایا ڈوبنے سے کشتی دین محمد ﷺ کو
الٰہی نوع کی سی عمر دے سرسید احمد کو

ہمیں احساں شناسی شکر پر مجبور کرتی ہے
وگرنہ ہم کمینہ پن سمجھتے ہیں خوشامد کو

(نظم سر سید احمد خان، علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں)

اسی طرح کانفرنس کے بارھویں اجلاس میں جو لاہور میں ہوا اور اس وقت سر سید وفات پا چکے تھے تو مولانا نذیر نے سر سید کا مرثیہ پڑھا:

مسلمانوں کا عاشق مر گیا اور ہم کو مرنا ہے
ہمارا کام سچائی سے حق کا کہہ گزرنا ہے
خدا کے آگے جا کر کیا کہیں ،کہہ کر مکرنا ہے
پھر اب مانو، نہ مانو اپنا کرنا اپنا بھرنا ہے
نہ مانو گے تو ساری عمر تقدیروں کو روؤ گے
بگڑ جاؤ گے مٹ جاؤ گے کچھ اپنا ہی کھوؤ گے

(مرثیہ سر سید احمد خاں، علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں)

ڈپٹی نذیر احمد کے مجموعہ کلام میں شامل نظمیں اجلاس یا تقریبات میں پڑھے جانے کے پس منظر پر مبنی ہیں۔ جن میں موضوع اور ہیئت کے تنوع کی کمی ہے اس کے علاوہ نذیر احمد کی شاعری میں شاعرانہ خوبیاں اور شعری تاثر ناپید ہے بس یہ ان کے منہ کا ذائقہ بدلنے کی کوشش معلوم ہوتی ہے ورنہ وہ شعری میدان کے کھلاڑی معلوم نہیں ہوتے۔

اس تحریک سے وابستہ دیگر شعرا میں خوشی محمد ناظر، منشی عنایت حسین کیفی ،احمد علی شوق، مولوی عبداللہ فخری، فضل حق عظیم آبادی، منشی سراج الدین، مولوی رفعت علی اور مولوی امجد علی اشہری وغیرہ سمیت کئی شعرا شامل تھے۔

علی گڑھ تحریک اور رد عمل کی تحریک:

جس طرح زوال مغلیہ کے عہد میں شاہ ولی اللہ کی تحریک وجود میں آئی اور جنگ آزادی کے رد عمل کے طور پر علی گڑھ تحریک کا ظہور ہوا اسی طرح علی گڑھ تحریک کے خلاف بھی رد عمل پیدا ہوا کیونکہ یہ تحریک مغرب اور مغربی علوم کی بالادستی قائم کرنا چاہ رہی تھی تو چند مذہبی حلقے اس کے خلاف ہو گئے اور سر سید پر کفر کے فتوے بھی لگائے گئے۔ لیکن سر سید کی شخصیت اور ارادے کی پختگی اس قدر قوی تھی کہ وہ تمام مخالفین کو بروئے کار لائے بغیر تسلسل سے اپنے مقصد پر ڈٹے رہے اور مسلمانوں کے لیے علوم کے نئے راستے کھولنے میں کامیاب

ہو گئے۔ جبکہ علی گڑھ کی مخالفت فکر جدید کے مقابلہ میں فکر قدیم کا رد عمل قرار دی جا سکتی ہے(۱۶۰) کیونکہ سر سید کی تحریک نے جہاں کئی خلا پر کیے وہیں کئی شگاف پیدا بھی کیے۔ تحریک سر سید کی فکر خالص علمی تھی اور ادب بنیادی طور پر تخیل اور جذبات کا محتاج ہے اس لیے ادب کو یکسر تخیل اور جذبات سے عقل و استدلال کی خاصیت میں لانا بذات خود ادب کے ساتھ ناانصافی ہے لہٰذا علی گڑھ تحریک کے خلاف جہاں خالص مذہبی مخالفت تھی وہیں اردو ادب میں اس کے رد عمل کے طور پر تحریک پیدا ہوئی جس کے روح رواں اکبر الہ آبادی تھے۔ یہ با قاعدہ کوئی تحریک نہ تھی اور چونکہ اس کا مقصد تحریک علی گڑھ میں پائی جانے والی خامیوں کو سامنے لانا تھا اس لیے اس کو تحریک علی گڑھ کا رد عمل ہی کہا جا سکتا ہے جس کا با قاعدہ پلیٹ فارم اودھ پنچ اخبار تھا اور اکبر الہ آبادی نے اردو شاعری میں اس فرض کا منصب سنبھالا ہوا تھا۔ بقول ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری "ہماری قومی تاریخ میں جن شاعروں کی اصلاحی کوششوں نے مِلّی تشخص کی بحالی کا فریضہ انجام دیا ان میں مولانا حالی کے بعد سب سے اہم نام اکبر الہ آبادی کا ہے جس نے اس زمانے میں بے وقت کی راگنی چھیڑنے کے بجائے کبھی سنجیدہ اور کبھی طنز و مزاح کے دلچسپ پیرائے میں ایسی شاعری کی جو وقت کی آواز ثابت ہوئی اس لیے انھیں "لسان العصر" یعنی زمانے کی زبان قرار دیا گیا"(۱۶۱) اس دور میں جہاں ایک طرف لوگ نئی تہذیب و علوم اور ادب میں رنگ لا رہے تھے تو دوسری طرف کچھ لوگ راسخ الاعتقادی پر بھی قائم تھے اور وہ قدامت پرستی سے باز آنے کو ہرگز تیار نہ تھے۔ اس دور میں اکبر آبادی اور ان کے ہم خیال لوگ ایسے بھی تھے جو ان دونوں کے خلاف تھے۔

وہ چاہتے تھے کہ بیشک ہم نئے علوم سے استفادہ کریں لیکن ہمیں اقدار کی حفاظت بھی کرنی چاہیے۔ ہمیں انگریز بننے کے بجائے ہندوستانی بننا چاہیے۔ وہ قدیم اقدار سے پیار کرتے تھے(۱۶۲) لیکن یہ پیار ان کو قدامت پرست نہیں بناتا بلکہ وہ تبدیلی کے فطری عمل کے حامی تھے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ٹھوس دلائل اور مخلصانہ جذبہ کے سبب آج وہ سر سید تحریک کے متوازی سمجھے جاتے ہیں(۱۶۳) اکبر نے قدیم اور جدید کے ملاپ سے ایسا ادب تخلیق کیا جو پڑھنے والے کو ہنساتے ہوئے رونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے پردے میں اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی جو سر سید تحریک کی بے انتہا مقصدیت کے سبب پیدا ہو گیا تھا۔ اکبر کی شاعری میں نہ صرف طنز و مزاح کی کثرت ہے بلکہ وہ اس رنگ میں قومی و مِلّی نظمیں بھی تخلیق کرتے ہیں اور مسلمانوں کے سوئے ہوئے ضمیر کو جگانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہندوستانی معاشرے پر جب مغربی تہذیب کا رنگ چڑھنا شروع ہوا تو کچھ معاشروں میں آزاد خیالی حد سے زیادہ پروان چڑھی اور وہ مذہب کو بھی بے کار سمجھنے لگے۔ اکبر نے ان مذہب مخالفین اور کانگریسی رہنماؤں کو جو مذہب کو ذاتی چیز سمجھتے تھے، بارے میں کہا ہے:

ہم نشیمن کہتا ہے کچھ پروا نہیں مذہب گیا
میں کہتا ہوں کہ بھائی یہ گیا تو سب گیا
ہے عقیدوں کا اثر اخلاق انساں پر ضرور
اس جگہ کیا چیز ہوگی وہ اثر جب دب گیا

(ہم نشیمن کہتا ہے کچھ پروا نہیں مذہب گیا، کلیات، جلد اول)

اکبر الہ آبادی مسلمان قوم کو آزادی حاصل کرنے کی تدبیر بتاتے ہوئے ''تدبیر آزادی'' کے نام سے لکھی نظم میں فرماتے ہیں:

تو وضع پہ اپنی قائم رہ قدرت کی مگر تحقیر نہ کر
دے پائے نظر کو آزادی خود بینی کو زنجیر نہ کر
گو تیرا عمل محدود رہے اور اپنی ہی حد مقصود رہے
رکھ ذہن کو ساتھی فطرت کا بند اس پہ در تاثیر نہ کر

(تدبیر آزادی، نشیدِ حریت)

اکبر کو مسلمانوں کے شکست و ریخت پر دکھ اور رنج تھا۔ وہ اس شکست و ریخت میں جہاں انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں وہیں مسلمانوں کو بھی اس میں برابر کے شریک کرتے ہیں۔ وہ اس کی وجہ مسلمانوں کی مذہب سے دوری خیال کرتے ہیں اور ان کی نازک حالی پر طنز کرتے ہوئے نظم ''برق کلیسا'' تخلیق کی جس میں مسلمان شاعر انگریز خاتون کی ظاہری خوبصورتی دیکھ کر اس پہ دل ہار بیٹھتا ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اس نظم میں مسلمانوں کے ایمان کی حالت کا نقشہ کھنچا ہے جو برائے نام مسلمان ہے اور اپنی ہوس بجھانے کے لیے اپنے دین کو بھی پس پشت ڈال دینے سے باز نہیں آتا۔ وہ اس دور کے مسلمان کی زبانی نظم کے آخر میں فرماتے ہیں:

مجھ پہ کچھ وجہ عتاب آپ کو اے جان نہیں
نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں
جب کہا صاف یہ میں نے کہ جو ہو صاحب فہم
تو نکالو دل نازک سے یہ شبہ یہ وہم

میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

(برقِ کلیسا، کلیات اکبر الہ آبادی، جلد اول)

اکبر الہ آبادی جدید تعلیم کے مخالف نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان جدید تعلیم حاصل کریں لیکن جدید تعلیم کے پر فریب نام سے اسلام اور مذہب کو پس پشت ڈال دینا جس سے بے دینی، الحاد، خود غرضی، اپنے تہذیبی اقدار کی نفی، مغرب پرستی اور روشن خیالی جیسے خیالات پروان چڑھیں، کے مخالف تھے۔ بقول غلام حسین ذوالفقار" اکبر اپنی بصیرت سے اس زہر ہلاہل کے عبرت انگیز انجام کو دیکھ رہے تھے اور یہ محسوس کر رہے تھے کہ اگر چندے یہی حالت رہی تو قومی وقار خاک میں مل جائے گا"(۱۶۴) جس سے مسلمان کی زندگی کا اصل مقصد دم توڑ دے گے اور وہ غیر کی تہذیب کو ہی بلند وقار اور باعث عزت سمجھیں گے۔

اکبر الہ آبادی اور اودھ پنچ کے مصنفین و شعرا سر سید احمد خان کی علی گڑھ تحریک کے مخالف ضرور تھے اور انھوں نے اپنے کالموں میں کھل کر اس کا اظہار کیا ہے لیکن وفات سر سید کا اکبر کو بھی رنج پہنچا۔ انھوں نے سر سید احمد خان کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے اور کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

(وفات سر سید مرحوم پر، کلیات اکبر الہ آبادی، جلد اول)

گویا اکبر الہ آبادی کی شاعری کو مقصدی شاعری کہا جا سکتا ہے جو طنز و ظرافت کے پیرایہ میں بیان ہوئی اور کلاسیکیت اور جدیدیت کے بہترین امتزاج سے ایک نیا اسلوب پیدا کیا جو اکبر کا اسلوب کہلاتا ہے۔ اور جو اکبر سے شروع ہو کر اکبر پر ہی ختم ہو گیا۔

### برطانوی سامراج سے آزادی کی تحریکیں:

بیسویں صدی میں ہندوستان میں حصول آزادی کی تحریکیں چلیں۔ چونکہ انیسویں صدی کے اختتام تک علی گڑھ اور اودھ پنچ جیسی تحریکوں سے حالات تحریک آزادی کے لیے ساز گار ہو چکے تھے لہٰذا بیسویں صدی میں اس کی عملی صورت نظر آتی ہے۔ بقول محمد فخر الحق نوری "بیسویں صدی تحریک حریت اور حصول آزادی کی صدی ہے۔ اس کے ابتدائی زمانے میں ہی ہر طرف آزادی کی لہر دوڑنے لگی تھی اور آزادی کا جادو ان لوگوں پر

بھی چل گیا تھا جو ظالم حکمرانوں کے خلاف اور آزادی کے حق میں اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہیں کرتے تھے"(۱۶۵) گویا بیسویں صدی میں آزادی کی تحریکوں میں برصغیر کے ہر طبقے کے افراد نے شمولیت اختیار کی۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کا شعور بیدار ہو چکا تھا اور ان کو اپنی محکومی کا احساس ہو چکا تھا۔ اس دور میں اردو شعرا نے حب الوطنی کے گیت لکھے اور اس آزادی کی تحریکوں میں بھرپور حصہ ڈالا۔ عوام میں احساس محکومیت اور محرومی کو بیدار کیا۔ پنڈت برج نرائن چکبست کی شاعری میں حب الوطنی کا تصور بڑا پر اثر ہے۔ چکبست فیض آباد میں ۱۸۸۲ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد پنڈت ادت نرائن بھی ایک اچھے شاعر تھے جبکہ پنڈت ادت نرائن کے بزرگوں کا تعلق کشمیری پنڈتوں سے تھا۔ چکبست جس وقت پیدا ہوئے اس وقت وطن بدیسی حکمرانی میں تھا۔ جب ان کے اندر قومی، وطنی سیاسی اور سماجی آگاہی پیدا ہوئی تو انھوں میں اس کا اظہار اپنی شاعری میں بھی کیا۔ نظم "خاک ہند" جو ۱۹۰۵ء میں لکھی گئی، اس سے انتخاب ہے:

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسن ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب و زینت کیا اوج عزوشاں ہے (خاکِ ہند، صبح وطن)

مسلمانوں کو نبی پاک ﷺ کے خلق و مروت کے ورثہ دار اور عرب کی شان حمیت کا احساس دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

دکھا دو جوہر اسلام اے مسلمانو !
وقار قوم گیا قوم کے نگہبانو
ستون ملک کے ہو قدر قومیت جانو
جفا وطن یہ ہے فرض وفا کو پہچانو
نبی کے خلق مروت کے ورثہ دار ہو تم
عرب کی شانِ حمیت کے یادگار ہو تم (وطن کا راگ، صبح وطن)

چکبست کا مذہب ہندو تھا لیکن وہ تعصب سے پاک تھے جس کی بدولت وہ ہندو اور مسلمان دونوں کے وقار کی حفاظت وطن کی حفاظت سے منسوب کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو اپنے اسلاف کی حمیت کا احساس دلاتے ہیں۔ ان کی نظموں میں وطن کی محبت اور آزادی کی طلب ہے وہ اس کے لیے تمام قربانیاں اور لہو بہا کر بھی آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

سرور جہاں آبادی بھی اسی دور سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی قومی نظمیں وطن اور وطنیت کی عکاسی کرتی ہیں وہ اپنی نظموں میں ہندو اور مسلمان دونوں کو یکجہتی اور حب الوطنی کی ترغیب کرتے ہیں۔ وہ اپنی نظم ”عروس حب وطن“ میں فرماتے ہیں:

اے عروس حب وطن میرے بر میں تو
آنکھیں تری تلاش میں ہیں محو جستجو
اے نگار! تجھ کو گلے سے لگاؤں میں
آ مجھ سے ہم کنار ہو اے شوخ خوش گلو
دنیا و آخرت میں نہ انجام ہو بخیر
تیرے سوا جو غیر کی ہو مجھ کو جستجو

(عروس حبّ وطن، انتخاب کلام سرور جہاں آبادی)

برطانوی سامراج سے آزادی کی اس تحریک میں بہت سے شعرا شامل تھے جن میں حالی، شبلی، اکبر، اقبال، ظفر اور دیگر شعرا شامل ہیں۔

## تحریک خلافت اور قومی وملّی شاعری:

بیسویں صدی کی ابتدا بالخصوص اس کی دوسری دہائی میں بین الاقوامی اور ہندوستانی سیاسی صورت حال سے ہندوستان کی مسلم سیاست کو کافی مشکلات کا سامنا رہا۔ اس کی وجہ بین الاقوامی سطح پر مسلم امہ کے دشوار حالات تھے اور اس کا اثر بلاواسطہ اور بالواسطہ ہندوستان کی مسلم سیاست پر پڑا جس کے نتیجے میں بین الاسلامی یا اتحاد اسلامی کی تحریک پیدا ہوئی۔ خلافت عثمانیہ دنیائے اسلام کی سیاسی قوت کا آخری قلعہ تھا جو اب دشمنوں کے نرغے میں تھا۔ مزید ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ نے برصغیر کے مسلمانوں کو اتحاد بین اسلامی پر مجبور کر دیا تھا۔ مغربی استعماریت اسلام کو زچ پہنچانے کے لیے ہر جگہ ریشہ دوانیوں میں مصروف تھی۔ ۱۹۱۳ء میں جنگ بلقان اور طرابلس کے بعد ہندوستانی مسلمان شعرا اور ادبا میں بیزاری بڑھ گئی جس کے نتیجے میں مسلمان شاعر اور صحافی ظفر علی خان کے زمیندار، ابوالکلام آزاد کے الہلال اور مولانا محمد علی جوہر کے ”کامریڈ“ نے مسلمانوں کی بیداری میں بھرپور کردار ادا کیا۔ مولانا محمد علی جوہر نے ایک شعلہ فشاں مضمون بعنوان ”ترکوں کا فیصلہ“ اپنے اخبار کامریڈ میں اس وقت شائع کیا جب ترک فوجیں برطانیہ مخالف اتحاد میں شامل ہو کر ۱۹۱۴ء کی جنگ میں شریک ہوئیں، جس نے برطانوی حکومت کے تن کو آگ بگولا کر دیا اور محمد علی جوہر کو جیل بھیج دیا گیا جہاں وہ ۱۹۱۹ء تک قید

رہے۔ اسی طرح دوران جنگ مولانا ابو الکلام آزاد کو بھی نظر بند کر دیا گیا(۱۶۶) ان کے نظر بند ہونے کے بعد بھی دوسرے شعرا اور ادبا جن میں شبلی نعمانی، ظفر علی خان، اقبال، حسرت وغیرہ نے مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے قلم کا استعمال کیا اور اتحاد اسلامی کے جذبات بیدار کرنے کی سعی کی۔ مسلم مشاہیر و اسلاف میں جذبہ ایمان کی یہ حالت تھی کہ مولانا محمد علی جوہر جن کے اس سے پہلے برطانوی حکومت سے وفادارانہ تعلقات تھے لیکن ایک مضمون کی سزا میں قید کر دیے گئے اور حکومت کا خیال تھا کہ محمد علی جوہر زمین بوس ہو جائیں گے لیکن ان کی سوچ کے برعکس محمد علی کی ایمانی قوت کا حال قاضی محمد عدیل عباسی کی زبانی سنیے:

> ”مولانا محمد علی کی گرفتاری نے ملک میں ایک ہیجان برپا کر رکھا تھا اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ تار وائسرائے اور وزیر ہند کو بھیجے گئے جس میں نظر بندی منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس کا انجام اگر کچھ ہوا تو صرف یہ کہ ایک افسر ایک تحریر لے کر آیا اور مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی (جو ایک ساتھ نظر بند تھے) سے کہا گیا کہ آپ اس پر دستخط کر دیں تو رہا کر دیے جائیں۔ اس تحریر میں صرف برطانیہ سے وفاداری کا اعلان تھا۔ علی برادران نے کہا کہ اگر اس میں اتنا اور اضافہ کر دیا جائے تو ہم دستخط کرنے کے لیے تیار ہیں ”بشرطیکہ یہ وفاداری مذہب اسلام کی پابندی میں حائل نہ ہو“ کیونکہ ہماری اول وفاداری مذہب اسلام سے ہے۔“(۱۶۷)

اس واقعہ نے شعائر اسلام کے دلوں کو تازہ دم کر دیا اور ان میں اسلام اور خلافت سے لگاؤ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ علی برادران کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ اسی طرح انھوں نے اپنی رہائی کا سودا اپنی وفاداری کی تبدیلی سے نہ کیا جب سزا پوری ہو گئی تو رہائی ملّی۔ اس دوران برطانوی حکومت کو محمد علی جوہر کی گرفتاری اور قید کو تاہ اندیشی سے زیادہ کچھ ثابت نہ ہوئی کیونکہ رہائی کے بعد وہ برصغیر پاک و ہند کے انتہائی متحرک اور با اثر مسلم قائد کی صورت میں ابھرے اور ۱۹۱۹ء میں خلافت کانفرنس کی بنیاد رکھی اور کانگریس میں شامل ہو گئے جو تین سال تک شامل رہے جب تک کہ خود اس کی حقیقت سے آگاہ ہو گئے کیونکہ اس وقت کانگریس خلافت کی حمایت کر رہی تھی۔ برصغیر کی سیاست میں ہندو مسلم اتحاد کی ایسی مثال دوبارہ نہیں ملتی لیکن یہاں بھی ہندوؤں کا تعصب سامنے آیا اور اس تحریک کی کامیابی دیکھ کر گاندھی جی نے تحریک واپس لے لی جو اس تحریک کے قائد تھے۔ اس کے بعد یہ تحریک خود ہی دم توڑ گئی جب اس میں سکت ہی باقی نہ رہی۔

تحریک خلافت میں چونکہ ہندو مسلم اتحاد تھا اور بہت سے ہندوستانی رہنماؤں کی طرح شعرا اور ادبا نے بھی اپنی ادبی خدمات اس تحریک کے سپرد کیں اور ادب کے موضوعات کو اس جدوجہد کا ایک پہلو بنا دیا۔ اس تحریک کے روح رواں شعرا میں محمد علی جوہر، ظفر علی خان، حسرت موہانی، فانی بدایونی، ہاشمی فرید آبادی، مرزا

ہادی عزیز لکھنوی، نادر کاکوری، آزاد لکھنوی وغیرہ کا سرمایہ کلام موجود ہے۔ان شعرا کی تحریروں نے برصغیر کی فضا میں شدت پیدا کر دی تھی۔ عین ممکن تھا کہ تحریک کامیاب ہو جاتی لیکن جب کسی اسلامی تحریک کے رہنما ہندو ہوں تو یہ کیسے ممکن تھا کہ اسلام کو فائدہ پہنچے۔

## تحریک پاکستان / تحریک آزادی:

تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد اگلا دور تحریک پاکستان کا شروع ہوتا ہے گو کہ اس میں بھی کئی نشیب و فراز آئے لیکن اس وقت کانگریس کی چالوں اور ہندو رہنماؤں کی ہٹ دھرمیوں کی وجہ سے مسلمان رہنما یہ سمجھ چکے تھے کہ اب ان کا ہندوؤں کے ساتھ مل کر رہنا مشکل ہے کیونکہ تحریک خلافت میں انتہا پسند ہندوؤں نے کانگریس سے بغاوت کر دی تھی اور مسلمانوں کے خلاف تحریکات کا آغاز کیا۔ان کے خیال میں برصغیر کی سیاست میں مسلمانوں کا بڑھتا ہوا اثر اور تحریک خلافت کی تنظیم اور اس کے انضباط سے پیدا ہونے والی مسلم قومیت ہندوؤں کے لیے سود مند نہ تھی۔اس سے مسلمانوں میں اضطراب کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اس دوران مارچ اور اپریل ۱۹۲۰ء میں محمد عبد القادر بلگرامی نامی شخص نے بدایوں کے اخبار "ذوالقرنین" میں ایک کھلی چٹھی گاندھی کے نام شائع کرائی جس میں اس پر زور دیا کہ برصغیر کو ہندوؤں اور مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے اور اضلاع کی ایک فہرست بھی دے دی جو مغربی اور مشرقی پاکستان کی موجودہ حدود سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھی"(۱۶۸) گویا ہندوستان کی تقسیم کا مسئلہ اس وقت پیش آ گیا تھا جب تحریک خلافت کے دوران ہندوؤں کے عزائم بڑھنا شروع ہوئے۔اس وقت ایک عام مسلمان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہندوؤں سے علیحدہ مملکت قائم کریں۔اس کے بعد ان خیالات و جذبات کو تقویت حاصل ہوتی گئی اور ایک جلسہ میں علیحدہ مملکت کا باقاعدہ اظہار علامہ محمد اقبال نے ۱۹۳۰ء میں کیا۔اقبال کے اس خطبے اور علیحدہ ریاست کے تصور کے متعلق عزیز احمد لکھتے ہیں:

> " اقبال اسلام کو ایک قانونی ریاست کی بنیاد تسلیم کرتے ہیں اور دینی ریاست میں، جو تشدد و تعصب کی مظہر ہے، فرق پیش کرتے ہیں برصغیر کی حدود میں ایک علیحدہ مسلم ریاست دینی ریاست نہیں بن سکتی بلکہ وہ اسلام کو عربی شہنشاہیت کی اس چھاپ سے آزاد ہونے کا موقع فراہم کرے گی جو اس کے ہاتھوں مجبوراً اس پر لگ گئی تھی۔" (۱۶۹)

ایک علیحدہ مسلم ریاست کا تصور چند مسلم اکابرین کے ذہن کی پیداوار تھا جو بعد میں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں اور مسلم لیگ کا منشور بن گیا۔ تحریک آزادی کے اس سفر میں جہاں اقبال کے اس مشن کو قائد اعظم

نے آگے بڑھایا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے دو علیحدہ قوموں کی حیثیت سے اکتوبر ۱۹۳۸ء کی سندھ صوبائی مسلم لیگ میں اس کا باقاعدہ اظہار کیا اور ایک انگریزی اخبار ٹائم اینڈ ٹائیڈ کے مضمون میں اس کی تفصیل پیش کی۔ اس میں انھوں نے کانگریسی رہنماؤں اور یورپ کی جدت پسندی پر تنقید کرتے ہوئے مسلمانوں کو ایک قومیت ہونے پر زور دیا۔

اس تحریک میں انگلستان کے طلبا کا ذکر نہ کیا جائے تو زیادتی ہوگی۔ انگلستان کی کیمرج یونیورسٹی کے مسلم طالب علم چودھری رحمت علی اور ان کے ساتھی بھی جداگانہ مسلم ریاست کے بڑے حامی اور داعی تھے، انھوں نے اس مجوزہ نئی ریاست کا نام ایجاد کیا اور اس کو مسلم اکثریت کے صوبوں کے نام کا پہلا حرف لیا اور بلوچستان سے انھوں نے "ستان" لیا(۱۷۰) اس طرح اس نئی ریاست کا نام "پاکستان" وضع ہوا جس کے بعد اس تحریک نے تقویت پکڑ لی اور تحریک آزادی تحریک پاکستان کے نام سے مقبول ہوئی۔ کئی شعرا نے اس کے نام کے نغمے تخلیق کیے جو بچے بچے کی زبان پر تھے "لے کے رہیں گے پاکستان۔ بن کے رہے گا پاکستان" اور اس جیسے دوسرے نعرے زور پکڑ گئے۔ جس نے ہندوؤں کو غضب ناک کر دیا گویا ہندو پریس کی تنقید کا نشانہ بنے رہے جب تک پاکستان معرضِ وجود میں نہیں آگیا۔

تحریک پاکستان اور قومی شعرا:

پاکستان کے قیام میں برصغیر کے مسلمانوں کی جہاں سیاسی کاوشیں ہیں وہیں ادبا و شعرا بھی پیچھے نہیں رہے۔ ادبا اور شعرا کے خونِ سے یہ کھیتی سیر اب ہوئی تب جا کر فصل تیار ہوئی۔ شعرا نے آزادی کی خاطر ہر قسم کی مشکلات برداشت کیں۔ قید و بند کی صعوبتیں ان کے لیے معمولی تھیں۔ آزادی کے اس کارواں کا سفر جنگ آزادی سے شروع ہو چکا تھا لیکن اس کو منزل مقصود تک پہنچنے میں نوے سال کا طویل عرصہ لگا۔ اس طرح پوری ایک نسل پیدا ہو کر داعی اجل ہوئی جس میں اس کارواں کو رواں دواں رکھنے میں اور اس میں تیزی لانے میں شعرا نے اپنا بھرپور حصہ ڈالا۔ آزادی کے اس کارواں کو رواں دواں رکھنے اور اسے منزل مقصود تک پہنچانے والے چند شعرا اور ان کے کلام کو پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے جب کہ چند دیگر اہم شعرا اور ان کی قومی و ملّی شاعری کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

ہماری قومی تاریخ میں کئی موڑ آئے لیکن سفر آزادی رکا نہیں البتہ دشوار گزار راستے سے گزرنے اور راستے کی رکاوٹیں ہٹانے میں اسلاف نے اپنے لہو کا نذرانہ ضرور پیش کیا۔ یہ لہو کبھی جان سے ہاتھ دھونے کی صورت میں تھا تو کبھی جگر کا لہو جلا کر راستے کو صاف کرنے کا تھا۔ دوسری مشکلات الگ تھیں جو کارواں کو راہزنوں

کی طرف سے پیش آئیں لیکن کاروان میں شامل مجاہدین نے ان کا مقابلہ کیا اور حوصلہ پست کرنے کے بجائے ہر نئی مشکل ان کا حوصلہ پہلے سے بھی بڑھا دیتی۔ آزادی کے اس کاروان میں شامل رئیس المتغزلین فضل الحسرت موہانی کا نام ان رہنماؤں میں شامل ہے جو قافلے میں نہ صرف ایک رہنما اور سیاست دان کی حیثیت رکھتے تھے بلکہ اپنے جگر کا خون جلا کر ایسے شعر پارے تخلیق کیے جس نے کارواں کو بلند حوصلہ عطا کیا۔ وہ اس سفر کو سفر سے زیادہ جنگ سمجھتے تھے اور اس جنگ کو لڑنے کے لیے قافلہ کی ذہنی تربیت کرنے والوں میں شامل تھے۔ ان کا عہد ۱۸۷۸ء سے ۱۹۵۱ء کے دورانیے پر مشتمل ہے۔

مولانا حسرت موہانی ایک عام شاعر نہ تھے بلکہ بقول خورشید ربانی "میر اور غالب جیسے عظیم شعرا کی فہرست میں بلا شبہ ان کا نام پہلے دس شاعروں میں شامل ہے "(۱۷۱) انھوں نے اردو شاعری کو ایک نیا اور الگ رنگ عطا کیا اور وہ رنگ اردو غزل میں ہے۔ اردو غزل جو اردو شاعری کی جان ہے، میر اور غالب کی پسندیدہ صنف سخن تھی۔ سرسید اور ان کی تحریک کے دور میں مقصدی شاعری کا رواج پڑا تو اردو غزل کو زوال آ گیا۔ حسرت موہانی نے اردو غزل کو سہارا دیا اور مقصدیت کو بھی نہ چھوڑا۔ انھوں نے اردو غزل میں نئے مضامین کا اضافہ کیا اور اس کو گل و بلبل کے موضوعات سے نکال کر ہر طرح کے نئے موضوعات عطا کیے۔ بقول خورشید ربانی "حسرت موہانی نے غزل کی روایت کو اس وقت سہارا دیا جب اس کا تناور درخت بادِ خزاں کی زد پر تھا اور اس کے برگ و بار بکھر رہے تھے۔ حسرت نے غزل کے شجر کو اپنے جذبوں اور فکر سے سیر اب کر کے اسے ترو تازہ کر دیا "(۱۷۲) حسرت موہانی کی غزل کی جب نئے رنگ وروپ کے ساتھ اردو شاعری میں آمد ہوتی ہے تو لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتی ہے۔ وہ برطانوی استعمار کی قید بامشقت میں غزل کو ان خوبصورت رنگوں میں ادا کرتے ہیں کہ غزل کی محبت اور سامراج سے نفرت کا یکسر گماں ہوتا ہے۔

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرف تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی
جو چاہو سزا دے لو تم اور بھی کھل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی

(ہے مشق سخن جاری، کلیاتِ حسرت، پہلا حصہ)

مولانا حسرت موہانی شاعر، سیاست دان، مقرر اور صحافی تھے۔ انھوں نے زمانہ طالب علمی میں ہی مسلمانوں کے دکھ اور تکالیف پر آواز اٹھانا شروع کر دی تھی۔ جس کے باعث وہ کالج سے تین مرتبہ نکالے گئے پھر انھوں نے بی اے پرائیویٹ طور پر پاس کیا(۱۷۳) تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ماہ نامہ

"اردو معلیٰ" کی صورت میں کیا جس کو کافی پذیرائی ہوئی لیکن مولانا کی سیاسی وابستگی اور مسلمانوں کے لیے تکلیف پر مبنی مضامین کی بدولت یہ رسالہ بند کر دیا گیا۔ اس کے باوجود ان کا جوش کم نہ ہوا اور آخر تک وہ مسلمانوں اور اسلام کے لیے اپنی کاوشیں جاری رکھے رہے۔ انھوں نے نہ صرف تحریک پاکستان کے لیے کئی ایک شمعیں روشن کیں بلکہ اردو شاعری میں بھی ایسا خزانہ چھوڑ گئے جو اردو غزل لکھنے والوں کے لیے تجربات کی نئی راہیں وا کرتا ہے۔ انھوں نے اردو غزل کو ایک نئی زندگی عطا کی۔

تحریک آزادی کے اس کارواں میں قلمی محاذ پر پنجاب کے سپوت مولانا ظفر علی خان کی شاعری قومی تاریخ میں نقش دوام کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی شاعری میں مسلسل جدوجہد، انتھک کوشش اور اسلامیان ہند سے درد مندی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خان نہ صرف ایک شاعر تھے بلکہ ایک سیاسی رہنما، صحافی اور بے باک حریت پسند مجاہد تھے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی دین اسلام کی خدمت اور آزادی کی سعی میں گزار دی۔ مولانا کے دور میں انگریزی استعماریت کے ساتھ ملکی مسلم غیر مسلم ریشہ دوانیاں عروج پر تھیں لیکن انھوں نے ہر قسم کے حالات میں مسلمانان برصغیر کی خدمت کو اپنا شعار بنالیا تھا۔ اس لیے بغیر کسی پرواہ کے وہ اپنی دھن میں لگے رہے اور اسلام کی بقا کی سعی کرتے رہے۔ "زمیندار" کا اجرا ان کی صحافتی زندگی کا کٹھن مرحلہ ہے لیکن انھوں نے ہمت و عزم سے تمام مخالفتوں کے باوجود اس کو جاری رکھنے کی سعی کی۔ مولانا کی ان کاوشوں پر ڈاکٹر نظیر حسین زیدی اپنی کتاب " مولانا ظفر علی خان... احوال و آثار" کے پیش لفظ میں مولانا کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں" اگر یہ کہا جائے (تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہو گا) کہ وہ جری انسان تاریخ ساز بھی تھا اور تاریخ بھی۔"(۱۷۴) علی گڑھ میں رہ کر سر سید احمد خان کی ژرف نگاہی اور شبلی نعمانی کا ترنگ دونوں ان کی شخصیت کا حصہ بنتے رہے۔ علی گڑھ کا طالب علم ہونے کی وجہ سے سر سید اور ان کے رفقاکار کے ساتھ تمام مسلمانوں کو ان سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ مولانا ظفر خان ان کی تمام کی توقعات پر پورا اترے۔ اُن پر اِن شخصیات کا اثر ساری زندگی رہا۔

مولانا ظفر علی خان نے برطانوی حکومت کے ملازم ہونے کے باوجود غلامی کا پھندا گلے میں نہیں ڈالا تھا۔ وہ ان لوگوں کے خیالات کے برعکس تھے جو انگریز سرکار کو خوش کرنے کے لیے تمام حجات کر گزرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ وفاداری کا صلہ غلامی ہے اور آرزوؤں کا ماتم۔

مولانا ظفر علی خان اتحاد ملت اسلامیہ کے بڑے داعی تھے لیکن ان کے خیال میں اتحاد امت میں بڑی رکاوٹ قادیانی تھے۔ اس وجہ سے وہ قادیانیوں کے خلاف تھے۔ اپنی نظم میں فرماتے ہیں:

وہ انجمن ہے جس کا نام اتحاد ملت
شکر خدا کہ اس پر ہے اعتماد ملت
آزادی مساجد آزادی وطن ہے
ہے عالم آشکارا یہ اعتقاد ملت
اس فیصلہ کے آگے کیوں سب کے سر نہ خم ہوں
قرآن کی روشنی میں ہو جس پر صادِ ملت

(مسجد گنج کی شہادت پر، دیوان ظفر علی خان)

مولانا ظفر علی خان بھی دیگر مسلم رہنماؤں کی طرح ابتدا میں کانگریس سے وابستہ ہوئے لیکن جب ان پر اس کی حقیقت کھلی تو وہ اس سے الگ ہوگئے اور قائد اعظم کے سپاہی بن گئے۔ اس کے بعد ان کی ساری کوششیں پاکستان کے حصول کے لیے رہیں۔ وہ اپنی ایک نظم میں پاکستان بننے کا پختہ یقین رکھتے ہیں اور ہندوؤں پر طنز کے نشتر چلاتے ہیں:

جا کے وزیر ہند سے پوچھو گئے ہے پہلے یا انسان
بوجھ سکیں گر وہ یہ بجھارت ہند کی مشکل ہو آسان
کہہ دو یہ جاکر برہمنوں سے کچھ تمھیں اس کی بھی ہے خبر
ہند میں اونچ اور نیچ کی لعنت چند ہی دن کی ہے مہمان
گاندھی و ساورکر ہوں کہ ایمری، ہم سے الجھ کر لیں گے کیا
عزم ہمارا ٹل نہیں سکتا بن کے رہے گا پاکستان

(پاکستان، دیوان ظفر علی خان)

ظفر علی خان ان خوش قسمت رہنماؤں میں شامل تھے جنھوں نے پاکستان کو آزاد ہوتے دیکھا اور آزادی کا میٹھا پھل بھی کھایا۔ وہ ۱۸۷۳ء سے ۱۹۵۲ء تک زندہ رہے اور ۱۹۵۲ء میں آزاد وطن کی آزاد فضاؤں میں خالق حقیقی سے جا ملے۔

آزادی کے سفر میں کچھ شخصیات کی قربانیاں ایسی ہیں کہ وہ الفاظ کی محتاج نہیں بلکہ ان کا نام تاریخ کے اوراق میں ایسے نقش ہو گیا ہے کہ وہ چاہتے ہوئے بھی مٹنے والا نہیں۔ ایسی شخصیات میں مولانا محمد علی جوہر بھی شامل ہیں۔ مولانا کی زندگی کا ایک اہم کارنامہ وہ گول میز کانفرنس ہے جس میں دوران تقریر مولانا نے برطانوی حکمرانوں سے کہا تھا:

"آج جس ایک مقصد کے لیے میں آیا ہوں وہ یہ ہی ہے کہ میں اپنے ملک کو اس حالت میں واپس جاؤں جب کہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو۔ میں ایک غلام ملک کو واپس نہ جاؤں گا۔ میں ایک غیر ملک میں جب تک وہ آزاد ہے مرنے کو ترجیح دوں گا اور اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو آپ کو یہاں مجھے قبر کے لیے جگہ دینی پڑے گی۔" (۱۷۵)

مولانا کے یہ الفاظ حرف بہ حرف درست ثابت ہوئے۔ وہ کچھ عرصے سے بیمار چلے آرہے تھے اور بیماری کی حالت میں اٹھ کر کانفرنس کے لیے گئے تھے حالانکہ ڈاکٹروں نے آرام کا مشورہ دیا تھا لیکن وہ آزادی کو اپنی زندگی سے بھی زیادہ اہم سمجھتے تھے لہٰذا انھوں نے جان کی قربانی پیش کر دی۔ چونکہ ان کی ساری زندگی اسلام کی خدمت میں گزری تھی۔ ان کی قسمت بھی دیکھیے کہ مستقل ٹھکانہ بیت المقدس میں ملا۔ فرماتے ہیں:

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی
ہوس زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی
اور کس وضع کی جویاں ہیں عروساں بہشت
ہیں کفن سرخ، شہیدوں کا سنورنا ہے یہی (کار لازم، نشیدِ حریت)

صابر ارشاد عثمانی بیسویں صدی میں مسلمانان ہند کی کسمپرسی ختم کرنے میں پانچ مولانا حضرات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ جن میں جو چار شخصیتیں سرسید کے تعلیمی ادارے علی گڑھ سے ابھریں ان میں مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خان جبکہ پانچویں شخصیت مولانا ابو الکلام آزاد کی ہے۔ جن کا تعلق علی گڑھ سے تو نہ تھا لیکن مسلمانان برصغیر کو جھنجھوڑنے میں ان چاروں کے ہم رکاب تھے۔ ان پانچ مولاناؤں کی قربانیاں تھیں جس کی وجہ سے مسلمانان ہند کے ذہنی شعور میں آزادی کی شعاعیں پھوٹیں اور حقوق کے علمبردار بنے (۱۷۶) گویا ان ملاؤں نے برصغیر پاک و ہند کی مسلم عوام کو راہ راست پر لانے اور آزادی کے لیے کوشش کرنے میں اہم کردار ادا کیا

کاروان آزادی میں ان شعرا کے ساتھ دوسرے کئی اہم شعرا نے بھی اپنی خدمات انجام دیں جن میں فانی بدایونی، جوش ملیح آبادی، ثاقب لکھنوی، آرزو لکھنوی، وحید الدین سلیم وغیرہ شامل ہیں۔ جن کے کلام میں قومی و ملّی جذبہ نمایاں ہے۔

فانی بدایونی بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں چونکہ ان کے کلام پر یاسیت اور قنوطیت غالب ہے لیکن اسی قنوطیت کے سائے میں انھوں نے برطانوی سامراج کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ وہ کشمیر جیسی حسین وادی جس کو جنت نظیر کہا جاتا ہے اس کی بد حالی کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

کشمیر میں حال اہل کشمیر تو دیکھ
ہر پاؤں میں افلاس کی زنجیر تو دیکھ
سمجھے ہم کیا تھے دیکھتے ہم کیا ہیں
کشمیر کے خواب اپنی تعبیر تو دیکھ

(کشمیر پر چند آنسو، نشید حریت)

شبیر حسین خان جوش ملّیح آبادی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے لیکن بقول ظفر محمود "جوش کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں کسی ایک فلسفے کو پیش نہیں کیا بلکہ مختلف النوع موضوعات کو اپنی شاعری میں پیش کیا اور فلسفیانہ پہلو کو بھی ملحوظ رکھا اور ہیئت میں بھی کئی نئے تجربات کیے۔" (۱۷۷) یہی وجہ ہے کہ جوش نے مضمون عاشقانہ کے ساتھ زمانے کی ناہمواریوں کو بھی اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔

جوش کی شاعری کی ابتدا غزل سے ہوتی ہے اور رباعی پر پہنچ کر اپنے عروج کو چھو لیتی ہے۔ غزل کے بعد رباعی جوش کی پسندیدہ صنف سخن ہے۔ جوش نے غزل اور رباعی سے قومی تحریک اور قومی خیالات کو پیش کیا اور اپنی نظموں سے قومی تحریک کو تقویت پہنچانے کی کامیاب کوششیں کیں۔ ان کی شاعری میں انقلابی رنگ نمایاں ہے اس لیے جوش ملّیح آبادی کو "شاعر انقلاب" کہا جاتا ہے۔ ان کے کلام سے اقتباس ہے:

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے، گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں (شکستِ زنداں، نشید حریت)

## اقبال اور قومی و ملّی شاعری:

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ پر اگر بغور نظر دوڑائی جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اشاعت اسلام کے لیے علما اور اولیا اللہ نے جتنی تکالیف اٹھائیں اس سے زیادہ تحفظ اسلام کے مسائل پیدا ہوئے۔ جس کے سد باب کے لیے حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، سر سید احمد خان اور پھر بیسویں صدی میں علامہ محمد اقبال نے اسلام اور مسلمانوں کے مخالفین کا بھرپور مقابلہ کیا۔ مقابلہ سے مراد یہ نہیں کہ انھوں نے اہل کفار سے جنگیں لڑیں بلکہ

ایک ایسے وقت میں جب مسلمان، اسلام اور کفر کے درمیان تذبذب کا شکار تھے۔ قومیت کا مغربی تصور پوری طرح سرایت کر چکا تھا اور برصغیر پاک وہند کے مسلمان کانگریس یا پھر مشترکہ ہندوستان جس میں ہندو اکثریت میں تھے اور مسلمان اقلیت میں، اور جدید تصور قومیت کے مطابق ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت ہندوؤں کے رحم و کرم پر تھی۔ مسلمان جو ہندوستان میں تقریباً ہزار سال سے حکومت کرتے آ رہے تھے ان کا تشخص خطرے سے خالی نہ تھا۔ اب ہندوستان ایک مسلمان ملک کے بجائے ہندو ملک بننے جا رہا تھا اور مسلمان اس میں اقلیت یا اقلیتی مذہب کے طور پر تھے۔ دوسرے لفظوں میں برصغیر کے مسلمانوں کا وجود خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس صورت حال میں سب سے پہلی کاوش سر سید احمد خان کی تھی جنھوں نے سب پہلے عملّی اقدامات کیے۔ انھوں نے مسلمانوں کو قدامت پسندی اور جاہلانہ تصورات سے جدید تعلیم کی طرف متوجہ کیا لیکن یہ نہیں سوچا کہ وہ جس تعلیم کی طرف ان کو لے جا رہے ہیں وہ مغربی تعلیم ہے اور اس میں اسلام کا کوئی عمل دخل نہیں بلکہ بعض اوقات اس میں اسلام مخالف نظریات پائے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان جدید تعلیم سے آراستہ تو ہو گئے لیکن وہ اسلام سے پیوستہ نہ رہ سکے اور انھوں نے تعلیم کی طرح مغربی تہذیب و خیالات کو اپنا شعار بنالیا بقول پروفیسر رشید احمد "سر سید کی خواہش اور اندازے کے خلاف حالات دوسرے سرے پر جا پہنچے۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مسلمانوں نے اور گل کھلایا۔ ان کے نوجوان مذہب سے متنفر ہو گئے جس سے ان کی مذہبی حالت خستہ سے خستہ ہو گئی۔ جاہل قدامت پرست طبقہ مذہب سے ضرور چمٹا رہا لیکن ان کی حیثیت قبروں کے مجاوروں سے زیادہ نہ تھی۔" (۱۷۸) مسلمانوں کے یہ دونوں گروہ حقیقتاً اسلام سے راسخ العقیدہ خیالات کی وجہ سے جدید دور سے مفاہمت کے لیے تیار نہیں تھے اور روشن خیال طبقہ اسلام اور مسلمان دونوں سے متنفر تھا اس صورت حال میں خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کی رہنمائی اور ان کو اس تاریکی سے نکالنے کے لیے جس مردِ حر کا انتخاب کیا وہ علامہ محمد اقبال کی ذات تھی۔ اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ اور ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اقبال کا جسد خاکی پیوند زمین ضرور ہو گیا لیکن اقبال کی روح تا قیامت زندہ رہے گی۔ اقبال نے برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کو حقائق سے آگاہ کیا اور ان کے سامنے اسلام کی حقیقی تصویر پیش کی جس سے مسلمان بیدار ہو سکیں اور وہ پستی سے نکل کر پھر سے دنیا میں انقلاب برپا کر سکیں۔

اقبال کی نظموں میں قومیت کا تصور کسی ایک ملک کے لیے نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ جس سے یورپی تصور قومیت کے حامل افراد نے ان کی شدید مخالفت کی لیکن اقبال مغربی تصویر کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے جس نے انسان اور انسانیت کے ٹکڑے کر دیئے تھے۔ وہ مسلمانوں کو تنبیہ کرتے ہیں کہ وطنیت کا مغربی تصور اسلامی

تعلیمات کے منافی ہے۔اقبال جیسی شخصیت بھی صدیوں کے بعد پیدا ہوتی ہے اور یہ صرف اس قوم کو عطا ہوتی ہے جس قوم پر اللہ بڑا احسان کرنا چاہے۔ آج اقبال کا جسم ہم میں نہیں ہے لیکن اقبال کی روح اور ان کا کلام ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

## ترقی پسند تحریک اور قومی شاعری:

برصغیر پاک و ہند میں جب ہر طرف آزادی کا واویلا تھا مذہبی و غیر مذہبی اور دیگر آزادی پسند جماعتیں اپنے مطالبات منوانے کی پر زور تگ و دو کر رہی تھیں جس کے لیے ان کو عوام کا ہر ممکن ساتھ چاہیے تھا۔ ان حالات میں جب روس میں عوامی انقلاب آ چکا تھا تو برصغیر پاک و ہند کے محنت کش اور عام آدمی نے یہ سوال اٹھانا شروع کیا کہ اس آزادی کے بعد ہماری کیا پوزیشن ہو گی۔ اس آزادی میں ہمارا حصہ کتنا ہو گا یا ہم پہلے کی طرح جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی چکی میں پستے رہیں گے۔ مذہب اور ذات کے نام پر جو ظلم و ستم ہوتے تھے کیا وہ ختم ہو جائیں گے یا ویسے ہی رہیں گے۔نئے سیاسی اور سماجی دور میں ان کا مقام کیا ہو گا۔ان خیالات نے ادبی حلقوں میں ایک نیا شعور جنم دیا جس نے ادبی حلقوں میں غیر ملکی استعماریت کے خلاف جدوجہد کے ساتھ اندرونی طور پر طبقاتی جدوجہد کا نعرہ بلند کیا۔طبقاتی کشمکش اور اجتماعی مسائل کی ترجمانی کے لیے شعرا اور ادبا کی طرف سے جو تنظیم سازی کی گئی اس کو ترقی پسند تحریک کا نام دیا گیا۔ اس تحریک کی بنیاد ۱۹۳۵ء میں رکھی گئی اور اس کا پہلا اجلاس ۱۹۳۶ء لکھنؤ میں منعقد ہوا(۱۷۹)اس تحریک کے آغاز کے بعد اردو شاعری میں نئے تجربات اور اردو شاعری کے سرمائے میں اضافہ ہوا۔ فکر و ادب میں تنوع پیدا ہوا۔ ہمارے خوابوں سے ایک دفعہ پھر حقیقت نگاری کی روشنی پیدا ہوئی۔بقول ہنسراج رہبر "ترقی پسند ادب ، حقیقت پسند ادب ہی کا ایک روپ ہے"(۱۸۰) اس حقیقت پسندی نے اردو شاعری کے رجحانات تبدیل کیے اور شعرا کی کثیر تعداد کو ہم خیال و ترجمان بنالیا۔ ان شعرا میں جوش ملیح آبادی ، فراق گورکھپوری، احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض، اسرارالحق مجاز ، علی سردار جعفری، سیفی عظمیٰ، اختر الایمان، ساحر لدھیانوی، سیماب اکبر آبادی، ساغر نظامی ، احسان دانش ، روشن صدیقی، مخدوم محی الدین، معین احسن علی جذبی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اس میں کچھ شعرا ایسے بھی ہیں جو باقاعدہ اس تحریک کا حصہ نہ ہونے کے باوجود ان خیالات میں دلچسپی رکھتے تھے۔اس کی وجہ تحریک کا بین الاقوامی منشور اور پسے ہوئے طبقے کی آواز بلند کرنا تھا جس نے شعرا اور ادبا کو متاثر کیا۔بقول علی سردار جعفری:

> "ترقی پسند تحریک کا ایک بین الاقوامی رشتہ بھی ہے جو قومی حدود اور جغرافیائی سرحدوں کو توڑ دیتا ہے۔ اور انسانیت کا تصور پیش کرتا ہے اور جو انصاف ، محبت اور آزادی کے جذبے سے

سرشار ہے۔ اور ایک قوم یا دوسری قوم کی برتری کا قائل نہیں ہے۔ یہ ہے بین الاقوامی رشتہ اس حقیقت کا نتیجہ ہے کہ آج غلامی اور معاشی استحصال کے ادارے بین الاقوامی بن چکے ہیں۔ اس لیے ان شیطانی قوتوں کے خلاف آزادی اور تہذیب کی جدوجہد ایک ملک یا قوم تک محدود نہیں رہ سکتی"(۱۸۱)

گویا ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعرا و ادبا کا بنیادی نصب العین پوری انسانیت کی فلاح و بہبود اور طاقتور قوتوں سے حقوق کا احتساب تھا لیکن ترقی پسند تحریک میں شامل شعرا میں حبِّ انسانیت کے ساتھ حب الوطنی اور قومیت کا تصور بھی موجود ہے۔ جنھوں نے بین الاقوامی موضوعات کے ساتھ قومی و وطنی تصورات کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ ان شعرا نے ہندوستانی سماج اور ناانصافی کو سیاسی اور سماجی آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی اور اس بربریت کے خلاف آواز اٹھائی جو برصغیر کے معاشرے میں سالوں سے چلی آ رہی تھی۔

چونکہ یہ دور تحریک آزادی کے عروج کا دور تھا لہٰذا ترقی پسند شعرا میں معاشی و معاشرتی ناانصافی کے ساتھ سیاسی، قومی اور وطنی ہنگاموں کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا لیکن وہ اپنے بنیادی مرکز انسان دوستی پر بھی قائم رہے۔ اس طرح انھوں نے قومی، وطنی، سماجی اور انسان دوستی کے مشترکہ موضوعات سے اردو شاعری میں ایک نیا تنوع پیدا کیا جس نے اردو ادب میں مقبولیت حاصل کی۔ ان شعرا نے اشتراکی فکر کے زیر اثر ایسی کار آمد، فنکارانہ اور جوشیلی نظمیں لکھیں جنھوں نے بیرونی دنیا کی طرح برصغیر پاک و ہند میں بھی ادبی انقلاب برپا کیا۔ کیونکہ اس تحریک کا اثر زیادہ تر ادب میں رہا اور یہ نچلے طبقے کی آواز تھی اس لیے برصغیر میں جہاں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا کنٹرول تھا وہاں یہ تحریک سیاسی پذیرائی حاصل نہ کر سکی۔ لیکن اس تحریک کو آزادی پاکستان سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس تحریک سے وابستہ چند اہم شعرا اور ان کی نظموں میں قومی تفکرات کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

ترقی پسند تحریک اور اشتراکی ادب کی چھاپ جن کی شاعری میں مکمل نظر آتی ہیں ان میں علی سردار جعفری اولین شعرا میں شامل ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ ۱۹۴۴ء میں "پرواز" کے نام سے شائع ہوا جو انھوں نے انقلاب پسند شخصیت پورن چند جوشی کے نام منسوب کیا اور پہلے صفحے پر یہ شعر درج کیا۔

کھل گیا در پڑ گیا دیوارِ زنداں میں شگاف
اب قفس میں جنبش صدِ بال و پر ہونے کو ہے (پرواز)

علی سردار جعفری کی اس مجموعہ میں شامل بیشتر نظمیں انقلابی ہیں جو اشتراکی فکر اور ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر لکھی گئیں۔ ان کی نظم "سماج" جو کہ مثنوی کی شکل میں ہے اس میں سماجی عکس کا خاکہ پیش کرتے ہیں:

غلط ہے یہ کہ یاں ٹوٹے ہوئے دل جوڑے جاتے ہیں
مرے نزدیک یاں بریز ساغر توڑے جاتے ہیں
کہیں آپس میں اہل زر کے مذہب کی لڑائی ہے
کہیں کھوٹے کھرے چاندی کے ٹکڑوں کی خدائی ہے (سماج، پرواز)

علی سردار جعفری کی شاعری ایک نئے لفافے میں سماج کی صدیوں سے بند آواز تھی۔ جس کو بلند کرنے کی سردار جعفری نے ہمت کی۔ مجنون گورکھپوری "پرواز" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> "علی سردار کی شاعری جو خصوصیت سے پہلے ہم کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ انھوں نے اپنے 'بربط دل' کو نئے انداز سے چھیڑا ہے لیکن ان کا یہ نیا انداز بہت رچا ہوا ہے اور ہماری موروثی روایات کی تمام شائستگی اور تہذیب کے لطیف ترین عناصر کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے"(۱۸۲)

"پرواز" کے بعد آنے والے مجموعوں میں فکر و خیالات میں شدت بڑھ جاتی ہے اور ظلم و ستم کو کھلے لفظوں بیان کرنے کے لیے خون، لفظ یا لہو کو اپنی شاعری میں بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ ان کے شعری مجموعوں کے نام بھی خون آلود ہیں ان کے دوسرے مجموعے بھی نئی دنیا کو سلام، ایشیاء جاگ اٹھا، پتھر کی دیوار، خون کی لکیر وغیرہ ملکی، بین الاقوامی، سماجی، عوامی اور انسانی مواد کا آلہ کار ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے نظریے کو سنجیدگی اور پوری توجہ کے ساتھ جس شخصیت نے قومیت اور وطنیت کے تصورات شامل کر کے الفاظ کو خوبصورت جامع پہنایا وہ فیض احمد فیض کی ذات ہے۔ فیض احمد فیض اس تحریک میں بین الاقوامی شہرت پانے والے شعرا میں ہیں۔ انھوں نے اپنے تفکرات کو غزل اور نظم دونوں اصناف میں پیش کیا اور عالمگیر سطح پر ظلم و استبدادیت کے خلاف علم بلند کیا۔ اس کے لیے انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں لیکن وہ اپنے مقصد سے پیچھے نہ ہٹے۔ فیض احمد فیض کے الفاظ میں ترنگ ہے وہ قاری کو صحیح ترنگ میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ وطن کی ترقی کے ساتھ سماج میں انصاف قائم ہو۔ اس لیے وہ طاقتور طبقے جو سماج پر ظلم و ناانصافی کرتے ہیں ان کی کھلے عام مزامت کرتے ہیں اور عوام الناس کو اپنے حقوق کے لیے اٹھ کھڑے ہونے اور سامراجی قوتوں کا پانسہ پلٹ دینے کا یقین رکھتے ہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی طرح فیض احمد فیض کو بھی قیام پاکستان سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ لہٰذا انھوں نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ ڈالا۔ تحریک پاکستان اور ترقی پسند تحریک دونوں آزادی کے لیے

کوشاں تھیں، لیکن ترقی پسند تحریک کا زاویہ نگاہ عالمی تھا اور وہ عالمی سطح پر استعماریت کے خلاف آواز اٹھا رہی تھی چونکہ سب سے پہلے ان کے اپنے وطن میں غلامی کا دور گزر رہا تھا اس لیے انھوں نے اس کی آزادی میں تحریک کے مقاصد کو محسوس کیا۔

اسرار الحق مجاز دھیمے لہجے کے شاعر ہیں اور ان کی شاعری پہ زیادہ رنگ رومانوی ہے لیکن وہ تحریک ترقی پسند سے بھی متاثر تھے اور انھوں نے اس کے زیر اثر ادب تخلیق کیا۔ وہ ہندوستان میں برطانوی راج کو برداشت نہیں کرتے اور ان کو یہاں سے نکل جانے کو ان کی بہتری خیال کرتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے اہم شعرا میں عبد الحئی ساحر لدھیانوی بھی شامل ہیں جنھوں نے اپنے کلام کو سامراج کے ظلم اور سماج کے حقوق کے لیے وقف کیا۔ ان کی نظم "یہ کس کا لہو" سے اقتباس ہے:

ہم ٹھان چکے ہیں اب جی میں ہر ظالم سے ٹکرائیں گے
تم سمجھوتے کی آس رکھو، ہم آگے بڑھتے جائیں گے
ہر منزلِ آزادی کی قسم، ہر منزل پر دہرائیں گے
یہ کس کا لہو ہے کون مرا
اے رہبر ملک و قوم بتا

(یہ کس کا لہو ہے، تلخیاں)

احسان دانش نے خود سماج کی ٹھوکریں برداشت کی تھیں اور مزدوری کے لیے بھی ٹھوکریں کھائی تھیں جس کا باقاعدہ اظہار انھوں نے "جہاں دانش" میں کیا ہے۔ لہٰذا وہ اس تحریک سے خاصے متاثر تھے۔ اگرچہ وہ باقاعدہ اس تحریک کا حصہ نہیں تھے لیکن ان کے تفکرات اس تحریک سے ملتے ہیں۔ بقول نریندر ناتھ "ان کے دل میں قوم و وطن کے نچلے طبقے کی بدحالی کا شدید احساس تھا۔ خصوصاً مزدور طبقے کے لیے انھوں نے اپنی ساری سوچ کو جیسے وقف کر دیا تھا اس لیے "مزدور شاعر" کہلائے"(۱۸۳) ان کی شاعری میں جابجا احساس اور امید جھلکتا ہے جس میں وہ نوجوانانِ وطن سے پر امید نظر آتے ہیں اور انھیں ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے اور حوصلہ بڑھاتے نظر آتے ہیں۔

ن م راشد تحریک آزادی کے وقت ان شعرا میں شامل تھے جنھوں نے روایت سے بغاوت کی۔ یہ بغاوت کسی ایک شے سے نہیں بلکہ اردو شاعری میں راشد نے موضوع اور ہیئت دونوں سے بغاوت کی اور اردو شاعری میں آزاد نظم کے بانی شمار ہوئے۔ راشد ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہ تھے لیکن ان کے خیالات ترقی پسندانہ تھے۔ ان کی شاعری میں رومانوی احساس کا غلبہ بھی ہے اور حقیقت پسندی بھی۔ وہ کسی ایک معاشرے یا گروہ کے شاعر

نہیں بلکہ ان کا نظریہ آفاقی ہے۔ ان کو مغربی استعماریت اور مشرق کی بے بسی کا ملال ہے اور ان کے دل میں دشمن سے انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے وہ اپنی نظم "انتقام" میں اس کا اظہار کرتے ہیں:

اس کا چہرہ اس کے خدوخال یاد آتے ہیں
اک برہنہ جس اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم،
میرے "ہونٹوں" نے لیا تھا رات بھر
جس سے ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام
وہ برہنہ جسم اب تک یاد ہے (انتقام، ماورا)

مندرجہ بالا تحریکوں کے علاوہ مقامی اور بین الاقوامی سطح پر کئی تحریکیں تھیں جو آزادی کی جدوجہد میں شامل تھیں۔ کاروان آزادی میں شعرا کا سلسلہ بھی طویل ہے جن کی مسلسل رنگ آمیزی اور خون پسینے کی آبیاری سے آزادی کا تنا اپنے عروج کو پہنچا اور اس کا پھل آنے والی نسلوں کے کھانے کے قابل بنا۔ یہ شعرا کسی نہ کسی طرح آزادی کی تحریک سے وابستہ رہے۔ مذکورہ بالا شعرا کے علاوہ دیگر بہت سے شعرا شامل ہیں جن کی مسلسل کوشش، تگ ودو اور رنگ ولہو سے حصول پاکستان ممکن ہوا اور آزادی کا سورج طلوع ہوا۔

# حوالہ جات وحواشی


۱۔ابن حنیف۔دنیا کا قدیم ترین ادب۔ملتان:کاروان ادب،۱۹۸۲ء۔ص۴۰۹

۲۔منظور احمد طاہر۔اردو رزمیہ شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ۔مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو۔(غیر مطبوعہ)اسلام آباد:علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،۲۰۰۵ء۔ص۱۱

۳۔بحوالہ احمد عقیل روبی۔یونان کا ادبی ورثہ۔لاہور:الوقار پبلی کیشنز،۲۰۰۰ء۔ص۷۰

۴۔منظور احمد طاہر۔اردو رزمیہ شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ۔ص۲۸

۵۔قاسم یعقوب۔اردو شاعری پر جنگوں کے اثرات۔کراچی:سٹی بک پوائنٹ،۲۰۱۵ء۔ص۳۴

۶۔نعیم احسن خان۔مترجم؛مہا بھارت۔لاہور:نگارشات،۱۹۹۹ء۔ص۵

۷۔منظور احمد طاہر۔اردو رزمیہ شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ۔ص۳۴

۸۔ایضاً۔ص۳۶

۹۔ساحر،تنویر بخاری۔جنگ نامے تے لوک گیت۔لاہور:ریورنیو بک پیلس،س ن۔ص۱۱

۱۰۔قاسم یعقوب۔اردو شاعری پر جنگوں کے اثرات۔ص۴۹۔۵۰

۱۱۔شبلی نعمانی۔شعر العجم( جلد اول)۔اعظم گڑھ:معارف پریس،۱۹۵۱ء۔ص۱۰۱

۱۲۔عابدی،ڈاکٹر سید تقی۔"مقدمہ"،کلیات غالب فارسی( حصہ اول)۔نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ ایوانِ غالب مارگ،س ن۔ص۳۱

۱۳۔غالب،اسد اللہ۔کلیات غالب فارسی( حصہ اول)۔(مرتبہ ڈاکٹر سید تقی عابدی)۔ص۵۰۔۵۱

۱۴۔محمد کاظم۔عربی ادب کی تاریخ۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء۔ص۳۱

۱۵۔ندوی،ڈاکٹر عبدالحمید۔عہد نبوی ﷺ کی شاعری۔بھٹکل: مجلس صحافت و نشریات،۲۰۱۲ء۔ص۳۴

۱۶۔ایضاً۔ص۳۶

۱۷۔محمد کاظم۔عربی ادب کی تاریخ۔ص۳۸۶

۱۸۔بحوالہ ایضاً۔ص۴۲۱

۱۹۔ابوالاعجاز حفیظ صدیقی۔کشاف تنقیدی اصطلاحات۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۱۹۸۵ء، ص۱۴۵

۲۰۔ الہدیٰ،احمد رمیض۔اقوام عالم۔۔۔ان کے قومی پرچم اور ترانے۔لاہور:مولوی شوکت پریس، ۲۰۱۲ء۔ص۲۱۵

۲۱۔ایضاً۔ص۲۱۹

۲۲۔ایضاً۔ص۲۲۲

۲۳۔روسپ منڈل سٹام۔مترجم؛احمد سلیم۔مشمولہ، بین الاقوامی ادب نمبر ۶، جلد ۱۱ شمارہ ۴۵۔۴۶، خزاں۔سرما، ۱۹۹۸ء۔اکادمی ادبیات پاکستان۔ص۱۹۶۔۱۹۷

۲۴۔توماز جیسٹرن ۔ مترجم؛ ظہیر پراچہ۔مشمولہ، بین الاقوامی ادب نمبر ۳، جلد ۱۰، شمارہ۳۹۔۴۰، بہار۔گرما ۱۹۹۷ء۔اکادمی ادبیات پاکستان۔ص۴۱۸

۲۵۔اورخان لی۔ مترجم ، مسعود اختر شیخ۔مشمولہ، بین الاقوامی ادب نمبر ۳، جلد ۱۰، شمارہ۳۹۔۴۰، بہار۔گرما ۱۹۹۷ء۔اکادمی ادبیات پاکستان۔ص ۴۳۲

۲۶۔خلیل طوقار،ڈاکٹر۔محمد اقبال اور محمد عاکف۔لاہور:ماوراپبلشرز،۲۰۱۸ء۔ص۴۱

۲۷۔بحوالہ محمد عاکف۔مترجم؛ڈاکٹر محمد کامران۔مشمولہ، محمد اقبال اور محمد عاکف۔ص۹۶

۲۸۔پھاؤ وارن کھاؤ نگام۔مترجم؛پرتوروہیلہ۔مشمولہ، بین الاقوامی ادب نمبر ۳، جلد ۱۰، شمارہ۳۹۔۴۰، بہار۔گرما ۱۹۹۷ء۔اکادمی ادبیات، پاکستان۔ص ۴۷۲

۲۹۔کشی روتناکا۔ مترجم ؛ تبسم کاشمیری۔مشمولہ، بین الاقوامی ادب نمبر ۳، جلد ۱۰، شمارہ۳۹۔۴۰، بہار۔گرما ۱۹۹۷ء۔اکادمی ادبیات پاکستان۔ص۵۰۱

۳۰۔انیا اخمتووا۔مترجم؛ ابرار احمد۔مشمولہ، بین الاقوامی ادب نمبر ۶، جلد ۱۱، شمارہ ۴۵۔۴۶، ۱۹۹۸ء۔ اکادمی ادبیات، پاکستان۔ص ۳۸۰

۳۱۔نیلسن منڈیلا۔مترجم؛شوکت ہاشمی۔مشمولہ، بین الاقوامی ادب نمبر ۳، جلد ۱۰، شمارہ۳۹۔۴۰، ۱۹۹۷ء۔اکادمی ادبیات، پاکستان۔ص۵۴۳

۳۲۔سمیع القاسم۔مترجم، شوکت ہاشمی۔مشمولہ، بین الاقوامی ادب نمبر ۵، جلد ۱۱، شمارہ ۴۳۔۴۴، ۱۹۹۸ء۔اکادمی ادبیات پاکستان۔ص ۵۴۴

۳۳۔عبادت بریلوی،ڈاکٹر۔روایت کی اہمیت۔کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان،۱۹۵۳ء۔ص۴۱۷

۳۴۔مظفر عباس،ڈاکٹر۔اردو میں قومی شاعری۔لاہور:گوہر پبلیکیشنز،س ن۔ص۲۷

۳۵۔بحوالہ سید محمد ابوالخیر کشفی۔اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر۔اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۱۷ء۔ص۴۸

۳۶۔عبادت بریلوی،ڈاکٹر۔روایت کی اہمیت۔ص۴۲۰

۳۷۔مظفر عباس،ڈاکٹر۔اردو میں قومی شاعری۔لاہور:ص۳۸

۳۸۔کشفی،ڈاکٹر سید،محمد ابوالخیر۔اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر۔ص۸۷

۳۹۔ایضاً۔ص۸۷

۴۰۔عبدالحق،ڈاکٹر مولوی۔نصرتی۔نئی دہلی:انجمن ترقی اردو،۱۹۸۸ء۔ص۲۷

۴۱۔ملا نصرتی۔علی نامہ۔(مرتبہ عبدالمجید صدیقی)۔حیدرآباد:اعجاز پرنٹنگ پریس،۱۹۵۹ء۔ص۳۱۷

۴۲۔جمیل جالبی،ڈاکٹر۔مرتب؛دیوان حسن شوقی۔کراچی،انجمن ترقی اردو،۱۹۷۱ء۔ص۶۹

۴۳۔کشفی،ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر۔اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر۔ص۹۹

۴۴۔ایضاً۔ص۹۹

۴۵۔طاہرہ نیّر،ڈاکٹر۔اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار۔کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان،۱۹۹۹ء۔ص۵۹

۴۶۔تبسم کاشمیری،ڈاکٹر۔اردو ادب کی تاریخ....ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۹ء۔ص۲۶۰

۴۷۔کشفی،ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر۔اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر۔ص۱۰۵

۴۸۔جعفر زٹلی۔زٹل نامہ(کلیات جعفر زٹلی)۔(مرتبہ رشید حسن خان)۔نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۲۰۱۱ء۔ص۳۰۶۔۳۰۷

۴۹۔کشفی،ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر۔اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر۔ص۱۰۹

۵۰۔ محققین و نقاد اس شعر کو ولی دکنی سے منسوب ہونے کے بارے متضاد رائے کا شکار ہیں ہے۔ جو محققین و نقاد یہ ولی کا شعر تسلیم کرتے ہیں ان میں سب سے اول محمد حسین آزاد ہیں جنھوں نے "آب حیات" میں صفحہ ۸۰ پر یہ شعر لکھا ہے۔ محمد حسین آزاد کی پیروی میں اس شعر کو ولؔی سے منسون کرنے والوں میں ڈاکٹر مظفر عباس بھی شامل ہیں جنھوں نے "اردو میں قومی شاعری" کے صفحہ ۱۴ پر اس شعر کو ولؔی سے منسوب کیا ہے جبکہ ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی جنھوں نے کلیات ولی کو اولین مرتب کیا وہ اس شعر کو ولؔی کی بجائے مضموؔن کا خیال کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے" پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ولی دوبارہ دلی گئے ایک تو ۱۱۱۲ھ میں اور دوسری بار ۱۱۳۲ھ میں یعنی محمد شاہ کے زمانے میں۔ یہ غلطی اس شعر سے اور بھی تائید حاصل کرتی تھی جو آزاد نے ولی کے نام سے آب حیات میں درج کر دیا تھا۔

دل ولؔی کا لے لیا دلّی نے چھین — جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

لیکن ولؔی کے دیوان میں نہ یہ شعر ہے نہ محمد شاہ کا کہیں ذکر۔ یہ شعر دراصل مضموؔن کا ہے اور یوں ہے۔

اس گدا کا دل لیا دلّی نے چھین — جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر سید۔ "مقدمہ"، مشمولہ، کلیات ولی۔ لکھنؤ: نظامی پریس، ۱۹۸۲ء۔ ص ۴

۵۱۔ کشفی، ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر۔ اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر۔ ص ۱۳۶

۵۲۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر۔ اردو ادب کی تاریخ....ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک ۔ص ۳۰۲

۵۳۔ فاروقی، ڈاکٹر شمس الرحمان۔ شعر شور انگیز، جلد اول۔ نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۶ء۔ ص ۳۳

۵۴۔ لارڈ ہٹسگز۔ شاہ عالم ثانی کے عہد کا دربار۔ (مرتبہ و مترجمہ نصیب اختر)۔ کراچی: ادب منزل، ۱۹۶۷ء۔ ص ۱۴۰

۵۵۔ طاہرہ نیّر، ڈاکٹر۔ اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار۔ ص ۶۲

۵۶۔ محب الحسن۔ تاریخِ ٹیپو سلطان۔ (مترجمین؛ حامد اللہ افسر، عتیق صدیقی)۔ نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۲۰۱۰ء۔ ص ۱۱

۵۷۔بحوالہ بنگلوری، محمود خان محمود۔ تاریخ سلطنت خداداد (میسور)۔ دہلی: ہمالیہ بک ہاؤس، ۱۹۷۰ء۔ ص۲۱۹

۵۸۔ایضاً۔ ص۲۱۸

۵۹۔محب الحسن۔تاریخِ ٹیپو سلطان۔(مترجمین حامد اللہ افسر، عتیق صدیقی)۔ص۱۲۴

۶۰۔بحوالہ ایضاً۔ص۴۳۷

۶۱۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر۔اردو ادب کی تاریخ....ابتداسے ۱۸۵۷ءتک۔ص۳۷۳

۶۲۔ کشفی،ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر۔اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر۔ص۱۶۸

۶۳۔ احد علی، محمد۔"مقدمة الکتاب "مشمولہ،شباب لکھنؤ از ولیم نائٹس ۔لکھنؤ:شام اودھ، ۱۸۹۹ء، ص۱۸

۶۴۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر۔اردو ادب کی تاریخ....ابتداسے ۱۸۵۷ءتک۔ص۳۷۴

۶۵۔ایضاً۔ص۳۷۷

۶۶۔ کشفی،ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر۔اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر۔ص۱۸۱

۶۷۔ مصحفی، شیخ غلام ہمدانی۔ مشمولہ ، نشیدحریت ۔(مرتبہ شان الحق حقی)۔کراچی: فیروز سنز، ۱۹۵۷ء۔ص۳۵

۶۸۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر۔اردو ادب کی تاریخ....ابتداسے ۱۸۵۷ءتک۔ص۳۸۰

۶۹۔زیبنی،سید جلال الدین احمد جعفری۔"مقدمہ"، مشمولہ،انتخاب کلیات نظیر اکبر آبادی۔آلہ آباد:انوار احمدی پریس، س ن۔ ص۲۱۔۲۲

۷۰۔قدسی،عبیداللہ۔آزادی کی تحریکیں۔لاہور:ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۰۱۴ء۔ص۶۳

۷۱۔ اشتیاق حسین قریشی،ڈاکٹر۔برصغیر پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ۔(مترجمہ بلال احمد زبیری)۔کراچی: کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۳ء۔ص۲۲۸

۷۲۔قدسی،عبیداللہ۔آزادی کی تحریکیں۔ص۶۴

۷۳۔ اشتیاق حسین قریشی،ڈاکٹر۔برصغیر پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ۔(مترجمہ بلال احمد زبیری)۔ ص ۲۳۴

۷۴۔ایضاً۔ص ۲۵۰۔۲۵۱

۷۵۔انور سدید،ڈاکٹر۔اردو ادب کی تحریکیں۔کراچی:انجمن ترقی اردو،پاکستان،۲۰۱۳ء۔ص ۲۵۴

۷۶۔ اشتیاق حسین قریشی،ڈاکٹر۔برصغیر پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ۔(مترجمہ بلال احمد زبیری)۔ ص ۲۵۲۔۲۵۳

۷۷۔میاں،مولانا سید محمد۔علمائے ہند کا شاندار ماضی، جلد ۲۔ دہلی:الجمعیت پریس،۱۹۵۷ء۔ ص ۱۰۱

۷۸۔ کشفی،ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر۔اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر۔ص ۲۳۵

۷۹۔ذوالفقار،ڈاکٹر غلام حسین۔اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء۔ص ۲۶۷

۸۰۔ کشفی،ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر۔اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر۔ص ۲۴۶

۸۱۔ موج کوثر میں شیخ اکرم فرماتے ہیں کہ سید صاحب کے مریدوں میں بلند ترین مرتبہ مولوی عبد الحئی اور مولوی محمد اسماعیل شہید کا تھا۔ یہ دونوں بزرگ بمنزلہ حضرت ابو بکرؓ صدیق اور حضرت عمرؓ کے آپ کے یار غار اور جان نثار بھی تھے جن میں مولوی محمد اسماعیل صاحب میں حضرت عمرؓ کی طرح جوش و خروش اور جرات و بہادری تھی اور بدعت کے خلاف وہ اسی طرح تہ تیغ و بکف رہتے تھے۔

شیخ محمد اکرم۔موج کوثر۔دہلی:ادبی دنیا،۲۰۰۱ء۔ص ۳۷

۸۲۔بحوالہ ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی۔ اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر۔ ص ۲۵۵

۸۳۔بحوالہ محمد صدیق قریشی۔جنگِ آزادی کے مسلم مشاہیر۔لاہور:مقبول اکیڈمی،۱۹۹۵ء۔ص ۷

۸۴۔بحوالہ سید مجاور حسین۔ اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر۔لکھنؤ:اتر پردیش اردو اکادمی،۲۰۰۴ء۔ص ۲۸۱

۸۵۔ قریشی، محمد صدیق۔جنگِ آزادی کے مسلم مشاہیر۔ص ۸

۸۶۔مجاور حسین،سید۔اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر۔ص۲۸۱
۸۷۔ایضاً۔ص۲۸۱
۸۸۔ایضاً۔ص۲۸۱۔۲۸۲
۸۹۔اکرم اکرام۔اقبال اور مِلّی تشخص۔لاہور:بزمِ اقبال،۱۹۹۸ء۔ص۲۰۶
۹۰۔قریشی،محمد صدیق۔جنگِ آزادی کے مسلم مشاہیر۔ص۱۰
۹۱۔اکرم اکرام۔اقبال اور مِلّی تشخص۔ص۳۰۶۔۳۰۷
۹۲۔کشفی،ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر۔اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر۔ص۲۸۰
۹۳۔تلمیذ خلدون۔"بغاوتِ عظیم"،مشمولہ،معرکہ عظیم۔(مرتبہ صدیق الرحمان قدوائی)۔غالب انسٹی ٹیوٹ،نئی دہلی:۲۰۰۸ء۔ص۲۷۳
۹۴۔حسن نظامی،خواجہ۔مرتب؛غدر کی صبح شام۔دہلی:کارکن مشائخ بک ڈپو،۱۹۲۶ء۔ص۶۳
۹۵۔ظہیر،سید ظہیر الدین دہلوی۔داستان غدر۔لاہور:میسرز پبلشرز یونائٹڈ لمیٹڈ،۱۹۵۵ء۔ص۱۵۵
۹۶۔جنرل بخت خان قادر روہیلہ کا پوتا تھا۔فرنگی فوج میں جنرل کے عہدے پر تعینات تھے،جنگِ آزادی کے دوران قومی حمیت وغیرت نے انگریز کے خلاف بغاوت پر مجبور کیا۔دہلی آکر مجاہدین کے سپہ سالار مقرر ہوئے۔
۹۷۔بحوالہ محمد صدیق قریشی ۔ جنگِ آزادی کے مسلم مشاہیر۔لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۵ء۔ص۴۳
۹۸۔ظہیر،سید ظہیر الدین دہلوی۔داستان غدر۔ص۱۶۴
۹۹۔کشفی،ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر۔اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر۔ ص۳۰۱۔۳۰۲
۱۰۰۔جوشی،پی۔سی۔"۱۸۵۷ءکے متعلق لوک گیت"،مشمولہ،معرکہ عظیم۔(مرتبہ صدیق الرحمان قدوائی)۔ص۳۳۲
۱۰۱۔ایضاً۔ص۳۳۳
۱۰۲۔ایضاً۔ص۳۳۳۔۳۳۴

۱۰۳۔ کشفی،ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر۔اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر۔ص۳۰۱
۱۰۴۔ محمود الرحمن ،سید ۔جنگِ آزادی کے اردو شعرا۔ مقالہ برائے پی ایچ ڈی(غیر مطبوعہ)، جامشورو: جامعہ سندھ،۱۹۷۹ء۔ص۱۵۳
۱۰۵۔ ذوالفقار،ڈاکٹر غلام حسین۔اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر۔ص۲۶۹
۱۰۶۔ مجاور حسین،سید۔ اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر۔ص۲۸۹
۱۰۷۔ زیدی، علی جواد۔اردو میں قومی شاعری کے سو سال۔ لکھنؤ: اترپردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۲ء۔ص۴۵
۱۰۸۔ ایضاً۔ص۴۵
۱۰۹۔ اشتیاق حسین قریشی،ڈاکٹر۔برصغیر پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ۔(مترجمہ بلال احمد زبیری)۔ص۳۰۸
۱۱۰۔ سرسید احمد خان۔رسالہ اسباب بغاوت ہند۔(مرتبہ ڈاکٹر فوق کریمی)۔دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۵ء۔ص۲۷۔۳۷
۱۱۱۔ ایضاً۔ص۷۷۔۷۸
۱۱۲۔ ایضاً۔ص۹۱۔۹۲
۱۱۳۔ شاکر، ڈاکٹر امجد علی۔ دو قومی نظریہ ...ایک تاریخی جائزہ۔ لاہور: جمعیت پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء۔ص۴۸
۱۱۴۔ اکرم اکرام۔اقبال اور مِلّی تشخص۔ص۲۱۴۔۲۱۵
۱۱۵۔ اشتیاق حسین قریشی،ڈاکٹر۔برصغیر پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ۔(مترجمہ بلال احمد زبیری)۔ص۳۲۰
۱۱۶۔ اکرم اکرام۔اقبال اور مِلّی تشخص۔ص۲۱۶
۱۱۷۔ مجاور حسین،سید۔اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر۔ص۳۰۷
۱۱۸۔ ایضاً۔ص۳۰۹

۱۱۹۔احسن فاروقی،ڈاکٹر۔ حالی کے مقدمہ شعروشاعری کی اہمیت۔ مشمولہ ،مقدمہ شعروشاعری۔لاہور:پاپولر پبلشنگ ہاؤس،۱۹۸۴ء۔ص۳

۱۲۰۔زیدی،علی جواد۔اردو میں قومی شاعری کے سو سال۔ص۴۹

۱۲۱۔ایضاً۔ص۴۸

۱۲۲۔ذوالفقار،ڈاکٹر غلام حسین۔اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر۔ص۲۸۴

۱۲۳۔حالی،خواجہ الطاف حسین۔"دیباچہ مسدس حالی"۔مشمولہ،دیوانِ حالی۔(مرتبہ رانا خضر سلطان)۔لاہور:بک ٹاک،۲۰۰۵۔ص۳۲

۱۲۴۔ذوالفقار،ڈاکٹر غلام حسین۔اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر۔ص۲۸۸

۱۲۵۔حالی،خواجہ الطاف حسین۔"دیباچہ دوم مسدس حالی"۔مشمولہ،دیوانِ حالی۔(مرتبہ رانا خضر سلطان)۔ص۳۴

۱۲۶۔ذوالفقار،ڈاکٹر غلام حسین۔اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر۔ص۲۹۲

۱۲۷۔حالی،خواجہ الطاف حسین۔"دیباچہ مسدس حالی"۔مشمولہ،دیوانِ حالی۔(مرتبہ رانا خضر سلطان)۔۳۴

۱۲۸۔ذوالفقار،ڈاکٹر غلام حسین۔اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر۔ص۲۹۲

۱۲۹۔زیدی،علی جواد۔اردو میں قومی شاعری کے سو سال۔ص۵۴

۱۳۰۔ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین۔اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر۔ ص۳۹۰۔۳۹۱

۱۳۱۔طاہرہ نیّر،ڈاکٹر۔اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار۔ص۹۴

۱۳۲۔زیدی،علی جواد۔اردو میں قومی شاعری کے سو سال۔ص۵۸

۱۳۳۔احمد،قیام الدین ۔"مقدمہ" ،مشمولہ، البیرونی کا ہندوستان۔(مترجم عبدالحئی)۔لاہور: یو پبلشرز،۲۰۰۵۔ص۸

۱۳۴۔البیرونی،ابوریحان۔البیرونی کا ہندوستان۔(مترجم عبدالحیٔ)۔ص۳۰

۱۳۵۔ایضاً۔ص۳۰۔۳۱

۱۳۶۔قدسی،عبیداللہ۔آزادی کی تحریکیں۔ص۲۱

۱۳۷۔ایضاً۔ص۲۱۔۲۲

۱۳۸۔ایضاً۔ص۲۲

۱۳۹۔زیدی،علی جواد۔اردو میں قومی شاعری کے سو سال۔ص۴۸

۱۴۰۔عقیل،ڈاکٹر معین الدین۔تحریک آزادی میں اردو کا حصہ۔لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۷ء۔ص۱۷۳

۱۴۱۔قدسی،عبیداللہ۔ آزادی کی تحریکیں۔ص۶۷

۱۴۲۔انور سدید،ڈاکٹر۔اردو ادب کی تحریکیں۔ص۲۷۸

۱۴۳۔غلام السیدین۔علی گڑھ کی علمی تحریک۔علی گڑھ:مسلم یونیورسٹی،۱۹۳۱ء۔ص۱۲

۱۴۴۔ایضاً۔ص۱۲۔۱۳

۱۴۵۔انور سدید،ڈاکٹر۔اردو ادب کی تحریکیں۔ص۲۸۱

۱۴۶۔عبداللہ،ڈاکٹر سید۔اردو ادب کی ایک صدی۔دہلی:چمن بک ڈپو،س ن۔ص۵۸

۱۴۷۔بریلوی،سید الطاف علی۔"دیباچہ"،مشمولہ،علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں۔(مرتبہ سید الطاف علی بریلوی، محمد ایوب قادری)۔کراچی:اکیڈمی آف ایجوکیشن ریسرچ،۱۹۷۰ء۔ص۳۱

۱۴۸۔عقیل،ڈاکٹر معین الدین۔تحریک آزادی میں اردو کا حصہ۔ص۲۵۰۔۲۵۱

۱۴۹۔سکسینہ، رام بابو۔تاریخ ادب اردو۔(مترجمہ مرزا محمد عسکری)۔نئی دہلی :بزم خضر راہ،۲۰۰۰ء۔ص۳۴۹

۱۵۰۔بریلوی،سید الطاف علی۔علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں۔ص۳۱۔۳۲

۱۵۱۔صالحہ عابد حسین۔خواجہ الطاف حسین حالی۔نئی دہلی:نئی بک ٹرسٹ انڈیا،س ن۔ص۶۵۔۶۶

۱۵۲۔ سلیمان ندوی، سید۔دیباچہ، مشمولہ،کلیات شبلی اردو۔اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی یوپی، ۲۰۰۷ء۔ص۳

۱۵۳۔ عقیل،ڈاکٹر معین الدین۔تحریک آزادی میں اردو کا حصہ۔ص۲۵۷

۱۵۴۔ سلیمان ندوی،سید۔ دیباچہ، مشمولہ،کلیات شبلی اردو۔ص۴

۱۵۵۔ ذوالفقار،ڈاکٹر غلام حسین۔اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر۔ص۲۹۹

۱۵۶۔ بریلوی،سید الطاف علی۔علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں۔ص۳۸

۱۵۷۔ نوری،ڈاکٹر محمد فخر الحق۔آزادی کی گونج۔لاہور: پولیمر پبلی کیشنز،۲۰۰۲۔ص۳۹

۱۵۸۔ ذوالفقار،ڈاکٹر غلام حسین۔اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر۔ص۳۰۱

۱۵۹۔ مظفر عباس،ڈاکٹر۔اردو میں قومی شاعری۔ص۱۳۲

۱۶۰۔ طاہرہ نیّر،ڈاکٹر۔اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار۔ص۸۳

۱۶۱۔ نوری،ڈاکٹر محمد فخر الحق۔آزادی کی گونج۔ص۳۱

۱۶۲۔ مظفر عباس،ڈاکٹر۔اردو میں قومی شاعری۔ص۱۳۷

۱۶۳۔ طاہرہ نیّر،ڈاکٹر۔اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار۔ص۱۲۸

۱۶۴۔ ذوالفقار،ڈاکٹر غلام حسین۔اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر۔ص۳۲۸

۱۶۵۔ نوری،ڈاکٹر محمد فخر الحق۔آزادی کی گونج۔ص۴۲

۱۶۶۔ عزیز احمد۔برصغیر میں اسلامی جدیدیت۔(مترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی)۔لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ،۱۹۸۹ء۔ص۱۹۱

۱۶۷۔ عباسی، قاضی محمد عدیل۔تحریک خلافت۔نئی دہلی: ترقی اردو بورڈ،۱۹۷۸ء۔ص۷۱۔۷۲

۱۶۸۔ اشتیاق حسین قریشی،ڈاکٹر۔برصغیر پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ۔(مترجمہ بلال احمد زبیری)۔ص۳۸۴

۱۶۹۔ عزیز احمد۔برصغیر میں اسلامی جدیدیت۔(مترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی)۔ص۲۳۵۔۲۳۶

۱۷۰۔ اشتیاق حسین قریشی،ڈاکٹر۔برصغیر پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ۔(مترجمہ بلال احمد زبیری)۔ص۲۸۷

۱۷۱۔خورشید ربانی۔حسرت موہانی ...شخصیت اور فن۔ اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۷ء۔ص۱۳

۱۷۲۔ایضاً۔ص۱۳

۱۷۳۔ایضاً۔ص۵۰

۱۷۴۔زیدی، نظیر حسین۔مولانا ظفر علی خان ...احوال و آثار۔لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۸۶ء۔ ص۱۱

۱۷۵۔بحوالہ صابر ارشاد عثمانی۔مولانا محمد علی جوہر...حیات و خدمات۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۲۰۰۷۔ص۷۵

۱۷۶۔عثمانی،صابرارشاد۔ مولانا محمد علی جوہر...حیات و خدمات۔ص۶۱

۱۷۷۔ظفر محمود۔جوش ملِّیح آبادی... شخصیت اور فن۔ نئی دہلی،ترقی اردو بیورو،۱۹۸۹ء۔ ص۹۸

۱۷۸۔رشید احمد۔مسلمانوں کے سیاسی افکار۔لاہور:ادارہ ثقافت اسلامیہ،۲۰۰۸ء۔ص۲۹۲

۱۷۹۔ذوالفقار،ڈاکٹر غلام حسین۔اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر۔ص۳۷۸

۱۸۰۔ہنسراج رہبر۔ترقی پسند ادب ...ایک جائزہ۔دہلی: آزاد کتاب گھر، س ن۔ ص۱۰

۱۸۱۔ علی سردار جعفری۔ترقی پسند ادب۔دہلی:انجمن ترقی اردو(ہند)،۲۰۱۳ء۔ص۱۸

۱۸۲۔مجنوں گورکھپوری۔ "دیباچہ"، مشمولہ،کلیات علی سردار جعفری۔نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۲۰۰۴ء۔ص۳۸

۱۸۳۔نریندر ناتھ، ڈاکٹر ویرمنی۔ اردو نظموں میں قومیت اور وطنیت۔ اندور:مالوہ پبلی کیشنز،۲۰۰۱۔ص۲۶۰

باب سوّم — صفحہ نمبر

## قیامِ پاکستان کے بعد قومی وملّی نغمہ نگاری----عمومی موضوعات وافکار ۱۷۵

## (الف) پاکستان کا قیام......اسباب و محرکات

برصغیر پاک و ہند کی سرزمین میں مسلمانوں کے دورِ اقتدار کا آغاز ۱۲ اےء کے بعد ہوا اور لگ بھگ گیارہ سو سال سے زائد عرصہ تک برصغیر پر کلی یا جزوی طور پر حکمران رہے۔ اس عہد میں مسلم حکمران نہ صرف قانون، قاضی، فوج، اور عمائدین کو اپنے ہمراہ لائے تھے، بلکہ ان کا مذہب، زبان اور رسم رواج کے ساتھ علم و ہنر کا سرمایۂ کثیر مقامی لوگوں کے اطوارزندگی میں تبدیلی کا باعث بنا۔ مسلمان حکمران، خاص کر مغلوں نے مقامی مذاہب کے لوگوں سے نہ صرف برابری کا سلوک کیا بلکہ ان کو ایوانانِ اقتدار کا حصہ دار بھی بنایا۔ مسلمانوں میں چھوت چھات کی پابندی نہ ہونے کی وجہ سے احترامِ انسانیت کے دروازے کھل گئے اور ہر جماعت و گروہ کو ترقی کرنے کے برابر مواقع نصیب ہوئے۔

ایوانِ اقتدار میں غیر مسلموں کی شمولیت سے مسلم حکمرانوں کے زوال کی ابتدا ہوئی۔ امر واقع یہ ہوا کہ جب برہمن اور راجپوت عمائدین کی صفوں میں شامل ہوئے تو محلات میں ہندو رانیاں بھی در آئیں جس کے بعد آزمودہ کار ترک، افغانی و ایرانی درباری سازشوں کا شکار ہونے لگے اور آہستہ آہستہ قوانین سلطنت بھی مقامی افراد نے وضع کرنا شروع کر دیے۔ جس کے بعد ہندوستانی و غیر ہندوستانی عمائدین کے درمیان ذہنی انتشار اور کشمکش کو تقویت حاصل ہوئی اور سلطنت کا استحکام کھوکھلا ہونا شروع ہوا جس سے مسلم کلچر اور حریت کو خطرات لاحق ہوتے چلے گئے۔ نتیجے کے طور پر برائے نام مسلم حکمرانی تو قائم رہی لیکن ان عوامل نے برِ صغیر میں کاروبار کے لیے در آنے والی ایسٹ انڈیا کمپنی کو یہاں پر تسلط قائم کرنے کے ارادے کو تقویت بہم پہنچائی۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں برصغیر کی تاریخ میں اسلامی ریاست کی شیرازہ بندی کی پہلی کاوش مجدد الف ثانیؒ نے کی جن کی جدوجہد سے باشعور طبقے میں اصلاحی تحریک کا آغاز ہوا اور مسلم ریاست کا شیرازہ بکھرنے سے محفوظ رہا۔ لیکن ان کی کاوشیں بھی اس دیمک کا مستقل علاج ثابت نہ ہوئیں اور اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد اسلامی ریاست کا مرکز تو قائم رہا لیکن مرہٹوں اور سکھوں نے ریاست کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ قریب تھا کہ مرکز پر بھی مرہٹوں کا قبضہ ہو جاتا اور اسلامی ریاست اور مسلم تشخص برصغیر پاک و ہند سے ختم ہو جاتا مگر ایسے نازک حالات میں مسلم حکمرانی کو سنبھالا دینے کی دوسری دوسری کاوش شاہ ولی اللہؒ کی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کی سیاسی تحریک جو دینی علوم اور سیاسی و اجتماعی ترقی کے لیے ایک جامع تحریک تھی۔ اپنی ابتدائی منزلیں طے کرتے ہوئے سید احمد شہید بریلویؒ پر ختم ہو گئی۔ سید احمد بریلویؒ نے اسلام کا پرچم لے کر جہاد کا آغاز پنجاب (قدیم) کے علاقے پشاور سے کیا جہاں انھوں نے سکھوں سے پے در پے جنگیں لڑیں لیکن پٹھان سرداروں کے دھوکہ سے بالاکوٹ کے مقام پر

اپنے رفقائے کار کے ساتھ انجام کو پہنچے اور یہی شکست ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف شکست کا بھی پیش خیمہ بنی جس کے بعد برصغیر پاک وہند سے مسلمان اپنی شناخت کھو بیٹھے اور برصغیر کی تاریخ میں ایک نئے دور (جسے دورِ غلامی کہا جاتا ہے) کا آغاز ہوا۔

۱۸۵۷ کی شکست مسلمانانِ برصغیر کی صرف سیاسی شکست نہیں تھی بلکہ اب کی بار بدیشی حکمران کا طرز حکمرانی پہلے ادوار سے مختلف تھا جس میں اس نے نہ صرف سیاسی بلکہ ثقافتی، سماجی اور مذہبی آزادی سلب کر کے ہندوستانی باشندوں کو عیسائیت یا لادینیت کی طرف مائل کرنا شروع کیا۔ اس تمام صورت حال میں ہندو مذہب کے پیروکاروں کو خاص فرق نہ پڑا کیونکہ پہلے مسلم حکمران تھے اور اب عیسائی، اگر متاثر ہوا تو وہ مسلم طبقہ تھا۔ مسلم قوم جہاں ایک جانب انگریز کی غلامی کے نتیجے میں غیرت و حمیت اور خودی و عزت نفس سے محروم ہوئی تھی، وہیں اُن غیر مسلم ابنائے وطن کے دلوں میں ان کے خلاف نفرت و انتقام اور بغض و عداوت کے جذبات پروان چڑھ رہے تھے جس پر انھوں نے کئی صدیاں حکومت کی تھی۔ آزادی ہند سے قبل یہ جذبات ایک خوفناک طوفان کی شکل اختیار کر گئے جن میں وہ برصغیر پاک وہند سے مسلم تشخص ہمیشہ کے لیے دبانے یا ختم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانوی حکومت نے برصغیر میں پارلیمانی نظام رائج کیا تھا اور غیر مسلموں کے اکثریت میں ہونے کی وجہ سے یہ نظام ان کے مقاصد کے لئے سازگار تھا جبکہ برصغیر میں کئی قومیں اور قبائل آباد تھے اور ہندوستان ایک ایسا وسیع خطہ تھا جس میں کئی ریاستیں اور ممالک موجود تھے اور یہ پورا خطہ پارلیمانی نظام کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ بہر حال ان حالات کے پیش نظر تحریک پاکستان شروع ہوئی جو عام مسلمانوں کے جذبوں اور امنگوں کی آئینہ دار تھی اور مسلم سیاسی رہنماؤں کی بصیرت اور فطانت اس کا درخشندہ حصہ تھی اور شعرا و ادبا نے اس کو فکری استقامت بخشی جس کے نتیجے میں ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ کو پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔

پاکستان کا قیام بیسویں صدی کا عظیم کارنامہ تھا جس میں کروڑوں انسانوں کی قسمت بدلی اور جنوبی ایشیا کی تاریخ کا رخ تبدیل ہوا۔ پاکستان کا قیام اہمیت اور نوعیت کے لحاظ سے صدیوں کی تاریخ پر بھاری ہے اور عالمی سطح پر بھی اس کے گہرے اثرات پڑے۔ عالمی دنیا میں چلنے والی آزادی کی تحریکوں نے اس کا خاص اثر لیا اور وہ اپنے ممالک کو آزاد کرانے میں پاکستان کو ایک مثال سمجھ کر طاقتور قوتوں کے سامنے دیوار کی مانند کھڑے ہو گئے اور آخر کار بہت سے ممالک آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ موجودہ دور میں چلنے والی آزادی کی تحریکوں کے لیے بھی پاکستان ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

پاکستان کا قیام جہاں ایک طرف ۱۸۵۷ کی ہاری ہوئی جنگ کا بدلہ ہے جس میں ہمارے بزرگوں نے انگریز کے مقابلہ میں شکست کھائی تھی اور ان بزرگوں کی اولاد نے اُن کی شکست کا بدلہ لے کر آباؤ اجداد کی قبروں اوران کی روحوں کو چین پہنچایا تو دوسری طرف پاکستان مخالف طبقوں کا خیال تھا کہ ہندو مسلم صدیوں سے مل جل کر رہتے آرہے ہیں تو انھیں جدا نہیں ہونا چاہیے اور وہ قیام پاکستان اور ہندو مسلم کی جدائی کو مسلم لیگ اور قائد اعظم کو ذمہ دار ٹھہراتی ہیں۔ شیر محمد گریوال کے بقول "اس ضمن میں اب تک بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی رہیں۔ کبھی یہ کہا گیا کہ پاکستان ایک تاریخی حادثہ تھا اور اس کے پیچھے کوئی ٹھوس عوامل کام نہیں کر رہے تھے، کبھی اس بات پر زور دیا گیا کہ پاکستان محض انگریزوں کی شہ پر معرض وجود میں آیا۔ کبھی اس بات کا دعویٰ کیا گیا کہ پاکستان ہندوؤں اور خاص طور پر کانگرس کی ہٹ دھرمی کا نتیجہ تھا، کبھی یہ کہا گیا کہ پاکستان کا قیام اسلامیانِ ہند کے مذہبی جنون کا مرہونِ منت تھا۔ کبھی یہ دعویٰ کیا گیا کہ پاکستان مسلم لیگی رہنماؤں کی جاہ پسندی اور ہوس اقتدار کی وجہ سے بنا اور کبھی اس بات کو اچھالا گیا کہ پاکستان مسلمان عوام کے اقتصادی مسائل حل کرنے کے لیے تشکیل دیا گیا۔ الغرض جتنے منہ اتنی باتیں۔"(۱) لیکن پاکستان کا قیام ان تمام وجوہات کے باوجود اسلام کے اس عالمی غلبے کی خدائی تدبیر کے طویل المیعاد سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جس کی بنیاد جناب رسول کریم ﷺ نے چودہ سو سال پہلے سرزمینِ عرب میں رکھی تھی۔ شاید اسی لیے مسلمانان برصغیر اپنی تمام کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود بغیر جنگ و جدل، وسیع و عریض خطوں پر مشتمل ایک عظیم الشان مملکت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ورنہ برصغیر کے مسلمان آبادی میں ایک تہائی ہونے کی وجہ سے آزادی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتے اور وہ دائمی ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہونے کے ساتھ ان کے ظلم و ستم اور انتقام کا نشانہ بنے رہتے۔ برصغیر پاک وہند کی تقسیم کے پیچھے کوئی ایک محرک یعنی صرف مذہب ہی کارفرما نہیں بلکہ اس کے بہت سے محرکات بنے جن کی بنا پر مسلمانان برصغیر کو اپنے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ کرنا پڑا، ان میں معاشی، اقتصادی، سیاسی، معاشرتی، نفسیاتی اور تاریخی محرکات کو مختصراً بیان کرنے کی سعی اِن صفحات میں کی گئی ہے۔

**مذہبی محرک:**

اسلام ایک مذہب ہی نہیں بلکہ ایک نظامِ زندگی بھی ہے جو اپنے پیروکاروں کو مثالی اصولِ زندگی کی تربیت دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک مسلمان مومن کے تمام افعالِ زندگی حکمِ الٰہی کے تابع ہوتے ہیں۔ وہ حکمِ خداوندی پر عمل کرتے ہوئے یثرب کی چھوٹی سی وادی سے نکلے اور افریقہ، یورپ سمیت دنیا کے مختلف

گوشوں میں پھیل گئے۔ مسلمانوں کی بقائی، پہچان اور سالمیت اسلام کے مرہون منت ہے کہ وہ اسی سبب قوت حاصل کرتے ہوئے اپنے وقت کی سپر پاور سے ٹکرائے اور ان پر فتوحات حاصل کیں۔ اسی طرح برصغیر میں بھی مسلمانوں کی آمد اور عروج کا بنیادی محرک دینِ اسلام تھا۔ برصغیر کے مسلمان جب تک اسلامی روایات پر کاربند رہے تو اسلام نے اُن کو وہ قوت، حوصلہ اور حکمت عطا کی کہ محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے لے کر سلطان محمود غزنوی، محمد غوری، لودھی، اور تیمور سمیت کئی خاندان برصغیر میں فتوحات حاصل کرتے ہوئے صدیوں یہاں حکمران رہے لیکن جیسے ہی ان میں جذبۂ ایمانی کم ہوا اور انھوں نے عیش و عشرت میں پڑ کر ہندوؤں اور ہندو رانیوں کو اپنے محلّات میں جگہ دی تو ان کا زوال شروع ہو گیا۔ ان ہندو راجاؤں اور رانیوں نے مسلمانوں اور اسلامی حکومت کو ظاہری استحکام بخشا لیکن باطنی سطح سے کھوکھلا کرنا شروع کر دیا۔ دشمنان اسلام کی انھیں کوششوں کی ایک لڑی اکبر بادشاہ کا ہندو رانیوں کی خوشنودی اور ایما پر ''دینِ اکبری'' کی ایجاد تھی۔ اس طرح اسلام اور اسلامی تعلیمات کو ختم کرنے کے لیے کئی خطرناک تحریکیں چلائی گئیں۔ جب انگریز ہندوستان میں متحرک ہوئے اور عیسائی مشینری نے اسلام کے خلاف کردار ادا کرنا شروع کیا تو ہندوؤں نے بھی انگریزوں کی آڑ میں نشاۃ ثانیہ کے خواب دیکھنے شروع کیے اور مسلمان جو صدیوں سے ان پر حکومت کرتے آ رہے تھے، ان سے انتقام لینے کا بہترین موقع خیال کیا۔ لہٰذا انھوں نے انگریزی اقتدار کو دل و جان سے قبول کرنے کے بعد ہندومت کے احیا کے لیے تحریکیں چلائیں۔ جن میں آریہ سماج، مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوئی۔

آریہ سماج تحریک کے بانی دیانند سرسوتی نے اپنی کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' میں کھل کر اسلام مخالفت کا اظہار کیا کیونکہ اس تحریک کے مقاصد میں قدیم ہندومت کا احیا تھا۔ بقول انور سدید ''دیانند سرسوتی کی آریہ تحریک کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس نے ہندومت کے ماضی سے رہنمائی حاصل کی اور قدیم تحریروں کو مستقبل سازی کے لیے استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا۔ آریہ سماج راسخ العقیدہ، ہٹ دھرم، اور عقیدہ پرست مزاج کی تحریک تھی، اس نے مذہبی مقاصد کی تکمیل کے لیے تدبر کی بجائے جبر اور عقل کے بجائے جوش کو استعمال میں لانے کی سعی کی۔''(۲) اسی طرح اس تحریک نے لسانی اختلاف کو فروغ دیا اور ہندومت کے احیا کے ساتھ ہندی زبان کے احیا کے لیے مسلمانوں سے تصادم سے بھی گریز نہ کیا۔ ان حالات میں برصغیر میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے جنھوں نے بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں شدت اختیار کر لی۔ لسانی اختلاف، مذہبی اختلاف سے بھی خطرناک تھے حالانکہ اردو زبان برصغیر کے ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان تھی لیکن چونکہ شدت پسند ہندو اسلام اور مسلمانوں سے خاص طور پر بغض رکھتے تھے اس لیے انھوں نے فارسی اور عربی رسم الخط

کی بجائے دیوناگری رسم الخط لاگو کرانے کی جدوجہد تیز کردی۔ بقول احمد سعید "متعصب ہندوؤں کی طرف سے جب ہندومت کے احیا کی تحریک شروع ہوئی تو انھوں نے مسلم دشمنی کی وجہ سے اردو زبان کو بھی اپنا ہدف بنایا اور اردو زبان اور فارسی رسم الخط کی بجائے ہندی اور ناگری رسم الخط کے اجرا کی کوششیں شروع کردیں" (۳) رسم الخط کی تبدیلی کوئی عام بات نہیں تھی بلکہ اس سے برصغیر کے مسلمانوں کے شاندار ماضی کو بادی النظر میں ختم کرنے کی کوشش تھی۔ ناگری رسم الخط کے احیا سے مراد یہی تھا کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا ہے اور اس میں مسلمان ایک بدیسی قوم سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ کیونکہ بقول ٹائن بی" اب کسی ملک کے عظیم کتب خانے جلانے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس سے مفت میں بدنامی ہوتی ہے۔ اس قوم کا رسم الخط بدل دینا ہی کافی ہے۔"(۴) لہٰذا عربی رسم الخط کو ناگری رسم الخط میں بدلنے کے پیچھے برصغیر سے اسلام اور مسلمانوں کے خاتمہ کا مقصد کارفرما تھا۔

اسلام اور اردو زبان کی مخالفت تو مقصود تھی ہی، اس مقصد کے حصول کے لیے اسلامی تعلیمات اور خاص کر رسول کریم ﷺ کی ذات مبارکہ کے خلاف جملے کسے گئے اور کتابیں لکھی گئیں، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچی اور انھوں نے ہندوؤں کو جواب دینے کے لیے مختلف تحریکیں چلائیں۔ نتیجتاً ہندو مسلم جذبات میں بھی شدت پیدا ہوتی گئی اور فسادات میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ اس دوران کانگریسی وزارتوں نے بھی کھل کر ہندو ذہنیت کا ساتھ دیا جس سے ان کی اسلام دشمنی آشکار ہوتی چلی گئی۔ علاوہ ازیں تعلیمی اداروں میں گاندھی کی مورتی کی پوجا کو تمام مذاہب کے بچوں کے لیے لازمی قرار دینا دراصل برصغیر میں ہندو راج قائم کرنے کی کوششوں کی ایک اہم کڑی تھی۔

برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے لیے یہ حالات کافی پریشان کن تھے۔ اب یہ صاف نظر آرہا تھا کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد ہندوستان میں ہندو راج قائم ہونے والا ہے، جس میں نہ صرف اسلام غیر محفوظ ہوگا بلکہ ہندو صدیوں سے حکومت کرنے والوں سے بدلہ بھی چکائیں گے۔ ہندوؤں کے تعصبانہ روّیوں کے پیشِ نظر اب مسلمانوں کے لیے تحفظ کے صرف دو راستے تھے۔ ایک یہ کہ وہ واحد خدا کو چھوڑ کر ہندوؤں کے بتوں کی پوجا شروع کردیں اور اپنی تمام اسلامی تعلیمات کو بھلا کر گائے ماتا اور چھوت چھات کی روش کو اپنالیں۔ دوسرا یہ کہ وہ ہندوؤں سے علیحدگی اختیار کرلیں اور اپنے لیے الگ ملک کا مطالبہ کریں، جہاں وہ اسلامی شعائر کے مطابق اپنی زندگی گزار سکیں۔ اس صورت حال میں مسلمانانِ ہند نے قومی حمیت اور غیرت کا احساس کرتے ہوئے ہندو غلامی سے چھٹکارا پانے کے لیے دوسرے پہلو پر غور شروع کیا۔ ظاہر ہے ان حالات میں ایک علیحدہ وطن کا مطالبہ

مسلمانوں کے لیے ناگزیر تھا جہاں وہ اپنے دین کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ اس لیے پاکستان خالص اسلامی وجوہات اور مذہبی محرکات کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آیا۔

سیاسی محرک:

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس میں نہ صرف مذہب بلکہ سیاست کو بھی بنیادی مقام حاصل ہے۔ اسلام میں مذہب اور سیاست الگ نہیں ہیں۔ سیاست مذہب کا حصہ ہے۔ اگر اسلام کے ابتدائی دور پر روشنی ڈالی جائے تو اسلام کی اشاعت، نفاذ، استحکام اور پذیرائی اس وقت تک ممکن نہ ہو سکی تھی جب تک رسول کریم ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف نہیں لے گئے۔ مدینہ میں آپ نے ایک اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی جس کے بعد اسلام ترقی کرتا ہوا نہ صرف سرزمین عرب بلکہ پوری دنیا میں پھیل گیا۔ اگر تاریخ کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اس وقت تک ترقی کرتا اور پھیلتا رہا جب تک سیاست اور مذہب الگ نہیں تھے۔ مسلمان خلفاء / حکماء ایک ہی وقت میں اسلامی مملکت کا نظام سنبھالنے کے ساتھ، خطیب، سپہ سالار، عالم و فاضل اور اسلام کے مبلغ بھی ہوتے تھے۔ جس کی بدولت دنیا کے بیشتر حصوں میں اسلامی اقتدار قائم ہوا اور عظیم الشان مسلم ریاستیں قائم ہوئیں۔ ان مسلم ریاستوں کے حکمرانوں نے اسلامی اصولوں یعنی بہترین انتظامی اور سیاسی قیادت کی بدولت اخوت، مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف کی بدولت غیر مسلموں کے دلوں کو مسخر کیا۔ جس سے اسلام اور اسلامی معاشرے و ریاست کو استحکام حاصل ہوا۔

برصغیر میں اشاعت اسلام کے آغاز کا سلسلہ خلفائے راشدین کے ادوار سے ہو چکا تھا لیکن جب تک یہاں اسلامی ریاست قائم نہیں ہوئی، اسلام بھی مضبوط نہیں ہوا تھا۔ برصغیر میں مسلمانوں نے بہت سی ریاستوں کو ملا کر شاندار سیاسی اور انتظامی نظام قائم کیا اور ایک بڑی مملکت کی بنیاد رکھی جس میں پورے خطے کا نظم و نسق ایک جیسا تھا۔ اسلام سے پہلے یہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں آپس میں برسرِ پیکار رہتی تھیں لیکن مسلمان بادشاہوں خاص کر سلاطینِ مغلیہ نے تمام چھوٹی ریاستوں کو ختم کر کے ایک مضبوط سلطنت قائم کی۔ اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد ان کی اولاد اس قابل نہ تھی کہ وہ اتنی بڑی سلطنت کا نظم و نسق چلا سکتی اور اس پر اپنا کنٹرول رکھ پاتی، جس کے نتیجے میں ملت اسلامیہ کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو گیا اور ان کے وقار میں تنزلی آتی گئی۔

اسلامی سلطنت کے زوال کے اسباب میں جہاں مغلیہ خاندان کی نااہلیت اور عیش پرستی تھی وہیں ابنائے وطن کی غداری اور دراندازیوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ مزید یہ کہ انگریزوں نے تلوار سے کم اور عیاری سے زیادہ کام لے کر سلطنت کو کھوکھلا کرنا شروع کر دیا تھا۔ برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی وقار کو بچانے کے لیے کئی

کوششیں بھی کی گئیں جن میں نواب سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کی کاوشیں سرِ فہرست ہیں جنھوں نے اس کے لیے اپنی جان کی بازی لگادی۔ شاہ ولی اللہ اور احمد شاہ ابدالی کی کوششوں سے مغلیہ سلطنت کو وقتی سہارا ملا لیکن یہ بھی ایک بلبلہ ثابت ہوا۔ سید احمد بریلوی کی تحریکِ جہاد کا مقصد بھی برصغیر میں اسلامی اقتدار کو بچانا تھا لیکن ان کی جدوجہد بھی بار آور نہ ہو سکی اور ۱۸۵۷ء میں برصغیر کے عوام کو انگریز کے خلاف عظیم جنگ لڑنا پڑی جس میں شکست مقدر بنی اور مسلمانوں کے سیاسی مرکز کو ختم کر کے اس ہنگامے کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی گئی۔ ان سے انتظامی عہدے اور زمینداریاں چھین لی گئیں اور مسلمان خاص کر انگریز کے جبر کا نشانہ بنے اور بہت سوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ علامہ فضل حق خیر آبادی جو آزادی کی اس جنگ میں خود بھی شریک تھے، اس ہنگامے کے بعد کے حالات بارے لکھتے ہیں "پھانسی پانے والوں اور قتل ہونے والوں کی تعداد ہزارہا تک پہنچ گئی۔ ظالموں کے ظلم کا شکار اکثر و بیشتر مسلمان تھے۔ ہندوؤں میں صرف وہ مارے گئے جن کے متعلق دشمن و معاون ہونے کا یقین تھا اور مسلمانوں میں سے فقط وہ بچ سکے جو کسی نہ کسی طرح وہاں سے ہجرت کر گئے تھے یا وہ جو نصاریٰ کے ناصر اور اپنے دین و مذہب میں قاصر تھے یا وہ جو ان کے جاسوس اور اللہ کی رحمت سے مایوس تھے۔" (۵) گویا اس واقعے نے برصغیر سے سیاسی لحاظ سے اسلامی تشخص کو ختم کر دیا اور عیسائی انگریز کی بالادستی قائم ہو گئی جنھوں نے قدیم سیاسی ڈھانچہ یکسر تبدیل کر دیا۔

نیا سیاسی نظام جو ۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر پاک و ہند میں رائج ہوا اس کی بنیاد برطانوی طرز پر پارلیمانی نظام پر رکھی گئی جس میں اکثریت حاصل کرنے والی جماعت کو حکومت کرنے اور سیاسی بالادستی کا حق حاصل ہوتا ہے۔ یہ نظام اس ملک کے لیے تو کارآمد ہو سکتا تھا جس ملک کے باشندے ایک نسل، ایک مذہب کے پیروکار اور ایک زبان بولتے ہوں، ان کی ثقافت اور تاریخ ایک جیسی ہو اور ان کا نفسیاتی و معاشی محرک مشترک ہو۔ برصغیر میں نہ تو ایک قوم تھی اور نہ ایک مذہب، زبانیں اور کلچر تک مختلف تھا۔ جن میں ہندو قوم / بت پرستوں کی اکثریت تھی اور مسلمان ایک تہائی کے برابر تھے۔ دوسرے لفظوں میں اس جدید نظام کے تحت ہندو قوم کو سیاسی طور پر مستقل غلبہ حاصل ہوتا تھا اور مسلمانانِ ہند اقلیت میں ہونے کہ وجہ سے ہمیشہ ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہوتے۔ گویا برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک لمحۂ فکریہ تھا کہ وہ کسی طرح ہندوؤں کی بالادستی سے محفوظ رہ کر اپنا تشخص قائم رکھ سکیں۔

اسلامیانِ ہند کے اسی لمحہ فکریہ کو سرسید احمد خان نے بھانپ لیا اور اس کے تدارک کے لیے اقدامات کی جدوجہد شروع کی۔ سرسید احمد خان ابتدا میں ہندو مسلم یکجہتی کے قائل تھے اور فرمایا کرتے تھے "ہندوستان ایک

دلہن کی مانند ہے جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جائے گی۔ اور اگر ایک دوسرے کو برباد کر دیں گی تو وہ کانڑی بن جاوے گی، پس اے ہندوستان کے رہنے والے ہندو مسلمانوں اب تم کو اختیار ہے کہ چاہو اس دلہن کو بھینگا بناؤ ، چاہے کانڑا''(٦) یعنی سر سید کی پوری کوشش تھی کہ برصغیر کے ہندو اور مسلمان ایک طاقت بن کر رہیں۔

افسوس کہ سر سید احمد خان کی توقعات کے برعکس ہندو اور مسلمانوں میں مذہبی و لسانی جھگڑے پیدا ہو گئے تو سر سید احمد خان نے بھی اندازہ لگا لیا کہ اب اگر برصغیر کے مسلمان ہندوؤں کے رحم و کرم پر رہے تو ان کا مستقبل تاریک ہے لہٰذا انھوں نے بقیہ زندگی اسلام اور مسلمانوں کے لیے وقف کر دی۔ سر سید اولین شخصیت تھے جنھوں نے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے الگ قوم کا لفظ استعمال کیا۔ وہ لدھیانہ کے جلسے میں مسلمان قوم کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''یاد رکھو کہ قوم کوئی چیز نہیں ہے جب تک کہ وہ قوم قوم نہ ہو، ایک ایک شخص جو اسلام کے گروہ میں داخل ہے وہ سب مل کر مسلمانوں کی ایک قوم کہلاتی ہے جب تک وہ اپنے عزیز مذہب کے پیرو اور پابند ہیں تب ہی تک وہ قوم ہیں۔ یاد رکھو کہ اسلام جس پر تم کو جینا ہے اور جس پر تم کو مرنا ہے اس کو قائم رکھنے سے ہماری قوم قوم ہے۔ اے عزیز بچے اگر کوئی آسمان کا تارا ہو جائے مگر مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا؟ وہ تو ہماری قوم ہی نہ رہا۔ پس اسلام قائم رکھ کر ترقی کرنا قومی بہبود ہے۔'' (٧)

سر سید احمد خان کی ژرف نگاہی نے اچھی طرح بھانپ لیا تھا کہ اب مسلمان ایک الگ قومیت ہیں جبکہ ہندو علیحدہ قوم ہیں ۔ اس کے بعد سر سید نے مسلمانوں کے مستقبل کے حوالے سے جو اقدامات کیے ، تعلیمی پروگرام اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کی بالادستی کے لیے شدید مخالفت کے باوجود اپنے مشن پر گامزن رہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کی جو بنیاد سر سید نے رکھی تھی اس کو مشاہیر اسلام نے آگے بڑھایا اور مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ مسلمانانِ برصغیر کی نمائندہ جماعت تھی جس کے قیام کا مقصد مسلمانوں کے حقوق کی سیاسی سطح پر حفاظت کرنا تھا۔ کیونکہ اب مسلمانوں کو انگریزوں سے اتنا خطرہ نہیں تھا جتنا ہندوؤں سے تھا جو برصغیر سے انگریزوں کے چلے جانے کے بعد عظیم ہندوستان پر ہندو راج کا خواب دیکھ رہے تھے۔ کانگرس اور اس کے رہنماؤں نے مسلمانوں کے خدشات کو تقویت بخشی۔ اردو ہندی تنازع، تقسیم بنگال اور نہرو رپورٹ جیسے واقعات ایسے تھے جن میں ہندو ذہنیت کھل کر سامنے آگئی تھی۔ ان

حالات میں علیحدہ وطن کا حصول ناگزیر ہو گیا تھا۔ مولانا حسین احمد مدنی جو کانگریس کی حمایت میں پاکستان کو ایک اسکیم قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "پاکستان کا بنانا اور اس کی تجویز کانگریسی حکومت کے قیام اور اس کے مظالم مشورہ سے پہلے ہی قرار پاچکی ہے۔ مظالم کانگرس کو اس کا باعث قرار دینا محض عوام کو بھڑکانے کے لیے ہے۔ کانگرس کی حکومت ۱۹۳۶ء کے آواخر میں شروع ہوتی ہے اور پاکستان کی پیدائش ۱۹۱۳ء یا اس سے پہلے ہوتی ہے۔" (۸)

مولانا حسین احمد مدنی کے قول سے ان کے بیان کی نفی ہو جاتی ہے کیونکہ پاکستان محض کانگریسی مظالم کی بنیاد پر نہیں بنا تھا، بلکہ ۱۸۶۷ء میں اردو ہندی تنازعہ، ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال اور اس کی تنسیخ اور پھر ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ جیسے اہم واقعات قیام پاکستان کے لیے کافی تھے۔ کانگریسی وزارتوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی جس سے تمام ہندو رہنماؤں کا ذہنی تعصب اچھی طرح آشکار ہو گیا تھا اور پنڈت نہرو نے یہاں تک دعویٰ کر دیا تھا کہ "ہندوستان میں صرف دو جماعتیں ہیں ایک کانگرس اور دوسری حکومت۔"(۹) لیکن قائد اعظم نے نہرو کے اس دعویٰ کو مسترد کرتے ہوئے تیسری جماعت یعنی مسلم لیگ کی موجودگی کو باور کرایا۔

کانگریسی حکومت کے مسلمانوں کے ساتھ ناروا سلوک اپنی جگہ لیکن مسلمانوں کے مذہبی جذبات مجروح کرنے کے لیے ترنگے کو قومی جھنڈا اور بندے ماترم کو قومی ترانہ قرار دینا، مسلمانانِ ہند کی تضحیک و تذلیل سے کم نہ تھا کیونکہ یہ ترانہ ایک بنگالی مصنف بنکم چندر چیٹر جی کے مسلم دشمن ناول "آنند مٹھ" سے لیا گیا تھا۔ یہ ترانہ دراصل مسلمانوں سے نفرت کا پلندہ تھا جسے پنڈت جواہر لال نہرو نے قومی ترانہ قرار دیا۔

اس ترانہ کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ جب جنگ پلاسی میں بنگال کے مسلمان حکمران سراج الدولہ کو شکست ہو چکی تھی لیکن ابھی تک مرشد آباد کے حکمران مسلمان تھے، وہ بھی ہندوؤں کو ہضم نہیں ہو رہے تھے اور مسلمانوں کی حکومت کا تختہ الٹنے کی خاطر ناول کا ہیرو بھاونند فوج اکٹھی کر کے اپنے منصوبے کے بارے ایک شخص مہندر کو آگاہ کرتا ہے لیکن جب مہندر اس منصوبے کو ناقابلِ عمل بتاتا ہے تو بھوانند اپنی دل کی بات زبان پر لے آتا ہے اور کہتا ہے کہ "دھرم ہمارا ناش ہو گیا ہے۔ ذات پات ہماری اڑ گئی ہے ننگ و ناموس ہمارے پر پانی پھر گیا ہے اور اب ہماری جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں جب تک یہ بدمت لم ڈھاڑئے (مسلمان) یہاں سے نہیں نکلتے، ہندو دھرم کا بچنا محال ہے" مہندر یہ کہہ کر بھوانند کا مذاق اڑاتا ہے کہ "ضرور تم تو اکیلے ہی ایک تھپڑ مار کر ان کو نکال دو گے! اس پر بھاوَنند گانا گاتا ہے:

سپت کوٹی کنٹھ کل کل نناوا کرالے

دو سپت کوٹی بھج دھرت کھر کروا لے

ابلا کیں ما ایت بلے

(سات کروڑ گنوں کے شور سے ہیبت ناک، اور چودہ کروڑ ہاتھوں میں تلواریں لئے ہوئے، ماتا پھر تو کیوں کمزور ہے)

ان تمام باتوں کے باوجود جب مہندر کو یقین نہیں آتا تو بھوانند ان الفاظ میں مسلمانوں کی تذلیل اور انگریز کی تعریف کر کے مہندر کو یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے:

> "انگریز مر جائیگا مگر میدان جنگ سے نہیں بھاگے گا، مسلمان بندوق چلتے ہی بھاگ جاتا ہے اور شربت مانگنے لگ جاتا ہے۔ انگریز ضد کے پکے ہیں جس بات کے پیچھے پڑتے ہیں، کر کے چھوڑتے ہیں۔ مسلمان تنخواہ کے لیے لڑتے ہیں اور اکثر وہ بھی انھیں نہیں ملتی، سب سے ضروری بات دلیری ہے، توپ کا گولہ بھی ایک جگہ پڑتا ہے اور وہ دو سو کو ایکدم نہیں مار سکتا، تاہم جب مسلمانوں میں ایک گولہ آکر پڑتا ہے تو وہ سب کے سب بھاگ جاتے ہیں۔"(۱۰)

اس کے بعد بھوانند اور مہندر فوج اکٹھی کر کے (ماں) وطن کو دشمن (مسلمان) سے آزاد کرانے کے لیے جنگ کرتے ہیں۔ اور ساتھ بندے ماترم کا گیت گاتے ہیں۔ اس ناول میں مسلمانوں (دشمنوں) کے لیے بار بار لفظ ملّیچھ (ناپاک) استعمال ہوا ہے، یعنی وہ اپنے وطن سے مسلمانوں کو ختم کر کے اسے پاک کرنے کے لیے سارا منصوبہ تشکیل دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس ناول میں کھلے لفظوں مسلمانوں سے اعلان جنگ ہے۔

کانگرسی وزارتوں کے دوران ہندوؤں نے اپنے عزائم کھل کر ظاہر کرنا شروع کر دیے تھے۔ جس کی بدولت مسلمانوں کو ہر جگہ کم تر ظاہر کرنے کی کوششیں کی گئیں، گویا ہندوؤں نے یہ سمجھ لیا کہ ہندو راج جس کا وہ صدیوں سے انتظار کر رہے تھے، یہی ہے۔ اس وجہ سے انھوں نے برصغیر سے اسلام اور مسلمان کو مٹانے کے لیے واردھا اور ودیا مندر جیسی سکیمیں رچائیں اور مسلمانوں کو مذہبی تعلیمات کی ادائیگی کی راہ میں جگہ جگہ رکاوٹیں ڈالیں۔ سید حسن ریاض ان حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

> " کانگرس کی وزارتیں قائم ہوتے ہی ہندوؤں نے یہ سمجھ لیا کہ ان کا راج آگیا، یوپی میں، بہار میں اور ہندو اکثریت کے دوسرے صوبوں میں اذان پر، نماز پر، قربانی پر، محرم کے جلوس پر روک ٹوک اور حملے اپنے غلبے کے مظاہرے کے لیے انھوں نے

ضروری قرار دے لیے۔ پولیس نے ان ہنگاموں میں لاپروائی اختیار کی۔ اگر وہ دباتی بھی تو مسلمانوں ہی کو۔ خود کانگریسی حکومت نے سرکاری عمارتوں پر کانگرس کے جھنڈے لگوادیے۔ بندے ماترم کو قومی ترانہ قرار دیا۔ سرکاری سکولوں میں کانگرس کے جھنڈے کی سلامی جاری کی۔ کانگریسی حکومت نے بڑے اہتمام کے ساتھ مسلمانوں کو یہ محسوس کرایا کہ ان کی رائے اور مرضی کوئی چیز نہیں۔ ان کو اس ملک میں ہندوؤں کے تابع ہو کر رہنا ہو گا۔" (۱۱)

یہ تمام وہ وجوہات تھیں جنھوں نے مسلمانوں کو پہلے سے بھی زیادہ اپنے مستقبل کے بارے فکر مندی میں مبتلا کر دیا اور یہ فکر ۱۹۴۰ء میں قرار داد پاکستان پر منتج ہوئی جس میں مسلمانان ہند کے لیے علیحدہ اور خود مختار ریاست کے حصول کو ناگزیر سمجھا گیا۔ قرار داد کی منظوری کے بعد قائداعظم کی قیادت میں مسلمانوں نے آزادی کی جدوجہد تیز کر دی اور سات سال کے قلیل عرصے میں آزادی سے ہمکنار ہوئے۔

معاشی محرک:

قیام پاکستان کے دیگر محرکات میں ایک اہم محرک معاشی محرک بھی تھا۔ کیونکہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اقتصادی فرق نمایاں ہے۔ مسلمانوں میں کاروبار کرنے سے لے کر تمام امور ہندوؤں سے مختلف ہیں۔ برصغیر میں ہندو سرمایہ دار اور وسیع ذخائر کے مالک تھے جبکہ مسلمان کم سرمایہ دار اور غریب تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بہت سے مسلمانوں سے جائیدادیں قرق بھی کی گئیں تھیں، جبکہ اس دوران ہندو بنیے سرمایہ سمیٹنے میں کامیاب رہے۔ جس سے ہندو تجارت و صنعت میں اجارہ داری قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اسی طرح سرکاری ملازمتوں میں بھی ہندوؤں کی نسبت مسلمانوں کو ان کی آبادی سے بھی کم حصہ ملا، جس سے ہندو تعلیم و ترقی میں مسلمانوں سے بڑھ گئے۔ ہندو ساہوکار سرمایہ دار تھے اور سود خوری ان کے خون میں شامل تھی اور اکثر غریب مسلمان ان کے مقروض رہتے اور سود در سود یہ قرض اتنا بڑھ جاتا کہ ان کو قرض کے بدلے زمینیں ضبط کروانا پڑتی۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اسلام میں سود کی سخت ممانعت ہے بلکہ زکوٰۃ کا نظام قائم ہے جس کے ذریعے سرمایہ امیروں سے خود بخود غریبوں کو منتقل ہو جاتا ہے اور غریب مسلمان کی عزت بھی مجروح نہیں ہوتی اور اس کی ضروریات زندگی بھی پوری ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اسلام میں قرض حسنہ کا حکم ہے اور سود خوری کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ اس وجہ سے ایسے نظام جس میں ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کا کنٹرول ہو جبکہ ایک طبقہ مسلسل پس رہا ہو، وہاں انصاف کے تقاضے بھی پورے نہیں ہوتے اور نظام کائنات غیر متوازن ہو جاتا ہے۔

علیحدگی کی صورت میں مسلمان اپنے اسلامی نظام کے ذریعے آپس میں لین دین قائم کرسکتے تھے جس میں کسی غریب مسلمان کو زکوٰۃ کی صورت میں یا صدقہ و خیرات کے ذریعے امداد دی جاسکتی ہے۔ اگر ان کو قرض کی ضرورت پیش آئے تو وہ بھی سود سے پاک نظام قائم کر کے اپنی مطلوبہ حاجات کو پورا کیا جاسکتا تھا۔ اس لیے مسلمانوں کے اقتصادی مسائل کا حل تلاش کرنا، قیامِ پاکستان کے محرکات سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ (پاکستان ابھی تک اسی سودی نظام پر چل رہا ہے کیونکہ موجودہ دور میں عالمی سطح پر یہ نظام مکمل طور پر متحرک ہے۔)

تاریخی محرک:

کسی بھی ملک، قوم اور مذہب کے تشخص میں ان کی تاریخ کا کافی عمل دخل ہوتا ہے۔ اگر مسلمانوں کی تاریخ کا جائزہ لیں تو مسلمان خلفائے راشدین کے دور سے ہی عظیم تاریخ رقم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ جب مسلمانوں نے روم و ایران جیسی سپر طاقتوں کو شکست دے کر وہاں اسلام کا جھنڈا گاڑا تو دشمنانِ اسلام کے دلوں پر صدیوں تک خوف و ہیبت کے سائے منڈلاتے رہے۔ اگر مسلمانانِ برصغیر کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہاں بھی مسلمانوں نے سنہری تاریخ رقم کی۔ مسلمانوں نے برصغیر کو ایک عظیم ریاست کی صورت میں تشکیل دیا تھا اور یہاں کی ریاستوں و قبیلوں کی آپس کی لڑائیوں کو ختم کر کے ایک قومیت میں پرو دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تحریک پاکستان کے دوران مسلمان مشاہیر نے نظم و نثر کی صورت میں اسلامی تاریخ کے حوالے دیے اور مسلمانوں میں جوش پیدا کر کے تحریک پاکستان کو تقویت بخشی، اس سلسلے میں سرسید احمد خان، الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبلی نعمانی جو تحریک علی گڑھ کے اہم ستون تھے، ان کی شعری و نثری خدمات جس میں مسدس حالی، اسلاف کی سوانح عمریاں اور سیرت حضرت محمد ﷺ شامل ہیں، نے مسلمانانِ برصغیر میں اپنے قومی تشخص اور وقار بحال کرنے کی تحریک پیدا کی جو آنے والے ادوار میں قیامِ پاکستان کی صورت میں ہی قومی تشخص بحال ہوسکتا تھا۔ متحدہ ہندوستان کی صورت میں برصغیر کے مسلمانوں کا عظیم تاریخی ورثہ ہمیشہ کے لیے کھو دینے کے مترادف تھا۔ اس لیے تحریک پاکستان میں اسلام اور مسلمانانِ برصغیر کی عظیم تاریخ بھی ایک اہم محرک شامل ہے کیونکہ متضاد صورت میں مسلمانانِ برصغیر کے عظیم کارنامے تاریخ کے اوراق میں گم ہو جاتے لیکن مسلمانوں نے آباؤ اجداد کی عظیم تاریخ دہراتے ہوئے دنیائے اسلام اور تاریخِ عالم میں نئے ابواب کا اضافہ کیا۔

نفسیاتی محرک:

مسلمان نفسیاتی طور پر تعمیری ذہنیت اور مثبت خیالات کے مالک ہیں۔ اگر تاریخی پس منظر کو دیکھا جائے تو اشاعت اسلام کی بنیادی وجہ مسلمانوں کا کردار انتہائی مثبت اور تعمیری تھا، مسلمانوں کا نظام حیات اور شاندار

ماضی سے ان کا احساس تشخص اور انفرادیت قائم تھی جس کی بدولت مسلمانوں نے دنیا کی تسخیر میں اپنا کردار ادا کیا تھا۔ مسلمانوں کے آباؤ اجداد تعداد میں کم ہونے کے باوجود مشرکین سے سینہ سپر ہو کر لڑتے تھے اور غازیان یا شہدا میں اپنا نام قلمبند کرانے میں مقابلہ کرتے۔ جس وجہ سے مسلمانوں میں بے خوفی پیدا ہوتی اور ان کی اس بے خوفی نے دنیا کو خوف میں مبتلا کر دیا تھا اور مسلمانوں کی غیر مسلموں پر ایک نفسیاتی برتری حاصل رہی تھی۔ برصغیر پاک و ہند میں بھی مسلمان انتہائی کم تعداد ہونے کے باوجود ہزار سال تک سیاہ و سفید کے مالک رہے تھے اور ہندو اکثریت میں ہونے کے باوجود مسلمانوں سے اقتدار چھین نہ سکے تھے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں کے زوال کی وجہ بھی ابنائے وطن کی غداریاں تھیں لیکن اب پھر موقع تھا کہ مسلمان نشاۃ ثانیہ سے گزر کر اپنا تشخص الگ قائم کریں یا ہندوؤں کی مستقل غلامی کے بجائے موت کو ترجیح دیں، یہی جذبہ تھا جس نے مسلمانان ہند کو ہتھیار ڈالنے اور غلامی کی زندگی میں رہنے کی بجائے الگ وطن کے لیے سیاسی جنگ لڑی تھی جس میں فتح مقدر ہوئی اور پاکستان کا حصول ممکن ہوا۔

معاشرتی محرک:

مسلمانوں اور ہندوؤں میں صدیوں اکٹھے رہنے کے باوجود کبھی بھی معاشرتی ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان معاشرہ اور ہندو معاشرہ میں بود و باش سے لے کر لباس اور کھانے پینے کے طریقے تک مختلف ہیں۔ جس طرح مسلمان وحدہ لاشریک کے قائل ہیں اسی طرح ان کی روایات میں پردہ لازم ہے اور وہ کھلے مکان، صاف ستھرے اور ہوادار رہائش کے عادی ہیں لیکن اس کے برعکس ہندو معاشرہ مشترکہ خاندانی نظام کا عادی ہونے کے باوجود ان کے رہن سہن کے مکان اور گلیاں تنگ و تاریک اور گنجان آباد ہوتی تھیں۔ مسلمان گوشت خور اور ہندو سبزی خور ہونے کے ساتھ ان کے استعمال کے روزمرہ کے برتن تک میں نمایاں فرق تھا۔ اسی طرح ہندوؤں میں مشترکہ خاندانی نظام کی وجہ سے صرف گھر کے سربراہ کو فوقیت حاصل تھی جبکہ خاندان کے باقی افراد کی عزت نفس، شخصی آزادی اور سوچ دب کر رہ جاتی تھی۔ اسلام میں اس کے برعکس ہر شخص انفرادی عزت نفس اور آزادی کا قائل ہے اور اس کو اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ اسلام نے عورت کو عزت اور مرتبہ بخشا اور مرد کی طرح اس کے حقوق بھی وضع کیے اور خاوند فوت ہو جانے یا طلاق کی صورت میں اپنی مرضی سے دوسری شادی یا تیسری شادی کی اجازت دی ہے اور اس کے لیے نکاح کی شرط رکھی ہے جبکہ ہندو مذہب کے معاشرے میں نکاح کی بجائے "پھیرے" دیے جاتے ہیں اور مرد کے فوت ہو جانے کی صورت میں عورت کی بقیہ زندگی موت سے بھی بدتر ہوتی اور اس کو "ودوا" کہہ کر معاشرے میں حقیر سمجھا جاتا

اور دوسری شادی کی اجازت تک نہ تھی۔ اسلام میں مردوں کو احترام سے غسل دیا جاتا ہے اور کفن دے کر قبروں میں دفنایا جاتا ہے جبکہ ہندو اپنے مردے جلاتے ہیں۔ مسلمان گائے کا گوشت کھاتے جبکہ ہندو گائے کو ماتا کہہ کر اس کی پوجا کرتے ہیں۔

مسلمان اور ہندو دونوں قوموں میں ملنے اور خط و کتابت تک کے طریقے الگ ہیں کیونکہ مسلمان جب کسی مسلمان بھائی سے ملتا ہے تو السلام علیکم کہہ کر اس کی سلامتی کا اقرار کرتا ہے اور خط و کتابت میں بھی تحریر سے پہلے سلام لکھتا ہے جبکہ ہندو نمسکار، نمستے یا رام رام بولتے اور لکھتے ہیں۔

ہندو اور مسلم معاشرے میں تہواروں کا بھی فرق ہے کیونکہ مسلمان سال میں ایک دفعہ عید الاضحیٰ مناتے ہیں اور اس پہ جانوروں کی قربانی کر کے گوشت مسلمان بھائیوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ مسلمان سال میں ایک مہینہ روزے رکھتے اور اس کے بعد عید الفطر کی خوشی مناتے اور بغل گیر ہوتے ہیں جبکہ ہندوؤں میں دسہرہ، دیوالی، لوھڑی اور دوسرے موسمی تہوار و میلے منانے کا رواج ہے۔

مسلمان معاشرے کی سب سے اہم خوبی مساوات ہے یعنی امیر و غریب سب کو برابر کے حقوق حاصل ہیں۔ اسی طرح تمام انسانوں کی ذات پات کے لحاظ سے کوئی تقسیم نہیں ہے اور سب کو آدم کی اولاد سمجھ کر کسی کو کسی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے۔ لیکن ہندو معاشرہ ذات پات، چھوت چھات جیسی طبقاتی کشمکش میں تقسیم ہے اور کمتر ذات کے لوگوں کو بنیادی انسانی حقوق تک حاصل نہیں ہیں بلکہ اس کی نسبت اونچی ذات کے لوگوں کو زیادہ عزت حاصل ہے۔

ہندو قوم مسلمانوں کو ملّیچھ (ناپاک) سمجھتی ہے۔ اگر کوئی مسلمان ہندو سے ہاتھ ملا بیٹھے یا ان کے گھر آ جائے تو ہندو غصہ ہو جاتے اور جب تک وہ گھر اور ہاتھ کو پاک نہ کر لیتے ان کو سکون نہ ملتا۔ جنگ آزادی کے بعد جب مسلمانوں کو سیاسی سبقت نہ رہی تو یہ صورتحال اور بھی بڑھ گئی اور تحریک پاکستان کے دنوں میں اس نے شدت اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ ریلوے اسٹیشنوں پر دو طرح کے پانی کے مٹکے ملتے تھے جن پر "ہندو پانی" اور "مسلم پانی" تحریر ہوتا تھا۔ گویا اس قدر معاشرتی فاصلہ رکھنے والی قومیں کیسے اکٹھی رہ سکتی تھیں۔

ثقافتی محرک:

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اسلام محض ایک مذہب نہیں ہے بلکہ ایک نظام حیات ہے اور ایسا نظام حیات جو بالکل فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس میں انسانیت کے ارتقا اور ترقی کے وہ تمام پہلو شامل ہیں جن کے تحت انسان ہر دور میں تسخیر کائنات کے ساتھ خوشحال زندگی گزار سکتا ہے۔ اس میں تعصب، تنگ نظری، نا

انصافی، انسانوں کی ذات پات یا عہدوں و رتبوں کا انسانی برابری سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ تمام انسانوں کو برابری کے حقوق حاصل ہیں۔ تسخیر کائنات کی لگن، مسلسل غور و فکر، تجسس، جستجو، تحقیق، ندرت خیال، اور فکر میں جدت اس کی اہم بنیادوں میں شامل ہیں۔ جبکہ توحید، رسالت، تقویٰ، حلم، عفو و در گزر اس کے اہم پہلو ہیں جس کے باعث سماجی انصاف، اخوت، مساوات اور جمہوریت اسلامی تہذیب و تمدن کے بنیادی خدوخال ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ فطرت کے عین مطابق ہونے کی وجہ سے اس میں بڑھنے، پھیلنے پھولنے اور تخلیق کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ ان صلاحیتوں کی بدولت اسلام تھوڑے عرصے میں ہی سرزمین عرب سے افریقہ، ایشیا اور یورپ کے براعظموں میں پھیل گیا اور وہاں پر بھی اسلامی تہذیب و ثقافت کا بول بالا ہونے لگا۔ بغداد، قاہرہ، قرطبہ، سمرقند، بخارا، غزنی، لاہور، دہلی، اور دیگر کئی شہر اسلامی تہذیب و ثقافت کا گہوارہ رہ چکے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی روشنی دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح ظہور اسلام کے تھوڑے عرصے بعد پہنچ گئی۔ تاراچند کے بقول:

> ”ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں ظہور اسلام اور ایک مرکزی ریاست کے ماتحت عرب قبائل کا اتحاد 'عالم گیری' کی اس تحریک کے لیے زبردست تازیانہ ثابت ہوا جو اسلامی عہد سے قبل جاری تھا۔ عساکرِ اسلامیہ بہت ہی جلد شام اور ایران فتح کرنے کے بعد ہندوستان کے نواحات تک آ پہنچے۔ مسلم تاجروں نے جلد ہی ایرانی بحری تجارت کے ورثے کو اپنا لیا اور عربی بیڑے ہندوستانی سمندروں میں پھیل گئے...... سب سے پہلا مسلم بیڑا ۶۳۶ء میں حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں ہندوستانی سمندروں میں نمودار ہوا۔“ (۱۲)

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے یہاں ترقی و علم و ہنر کے نئے در کھلے جنھوں نے مقامی باشندوں کی تہذیب و ثقافت پر گہرا اثر ڈالا چنانچہ بقول سبط حسن ”برصغیر کی خوراک اور پوشاک پر، سوچنے اور محسوس کرنے کے انداز پر، ادب، مصوری، موسیقی، رقص، تعمیر، آرائش و زیبائش کے سامان، حرب و ضرب کے آلات اور نشست و برخاست کے آداب سب پر ایرانی تہذیب کا رنگ چڑھ گیا۔“ (۱۳) اسلامی تہذیب اور مسلمانوں کی آمد سے برصغیر پاک و ہند میں سیاسی انتشاری اور افراتفری کا خاتمہ ہوا اور مسلمانوں نے سیاسی استحکام کے ساتھ اخلاقی، معاشی اور معاشرتی پہلوؤں میں بھی جدت پیدا کی جس سے ہندوستان کے لوگ متاثر ہو کر اسلام کی طرف راغب ہوئے، تاراچند اسلامی فتوحات سے پہلے برصغیر کے حالات بارے لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں جنوبی ہند کے اندر مذاہب کے باہمی تصادم سے بہت ہیجان پھیلا ہوا تھا کیوں کہ متشدد ہندو مت برتری حاصل کرنے کے لیے بدھ مت اور جین مت سے برسرِپیکار تھا۔ سیاسی اعتبار سے بھی یہ ایک بے سکونی کا زمانہ تھا، ایسے موقع پر اسلام

ایک سیدھے سادے ضابطہ ایمان، واضح و معین عقائد و عبادات اور معاشرتی تنظیم کے جمہوری نظریات کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔"(۱۴) مسلمانوں کی آمد سے برصغیر میں سیاسی انقلاب کے ساتھ تمام شعبۂ ہائے زندگی میں تبدیلی آ گئی اور جہالت و گمراہی کی بجائے توحید و رسالت کا چرچا ہونے لگا۔ بت پرستی کی بنیادیں کمزور اور واحدانیت کی بنیاد مضبوط ہونے لگی۔ مسلمانوں نے اخوت، رواداری، اور مساوات کی عمدہ مثالیں قائم کیں۔ جس سے مقامی باشندوں پہ گہرا اثر پڑا اور وہ اسلام قبول کرنے لگے۔ ہندو سرداروں سے لے کر اچھوت تک مسلمانوں سے متاثر ہو کر حلقہ اسلام میں داخل ہونے لگے، اور جو لوگ اسلام میں داخل نہ ہو سکے انھوں نے بھی خود کو سدھارنا شروع کر دیا۔ گویا ہندوستان کے تمام مذاہب و علم و فکر و فن میں بہتری آنی شروع ہوئی اور یہ تمام اسلام کی تعلیمات او مسلم تہذیب و ثقافت کی وجہ سے ہوا کیونکہ بقول سبط حسن "ہندو بھگتوؤں نے اسلامی لٹریچر پڑھ کر اپنے عقائد میں اصلاح نہیں کی بلکہ مسلمان صوفیوں کی زبانی تعلیمات سے یا ان کے طور طریقوں کو دیکھ کر۔"(۱۵) یعنی ہندو مسلمان علما و صوفیا کی تبلیغ سے زیادہ ان کے حسنِ اخلاق اور اسلامی تعلیمات سے متاثر ہوئے۔

اسلامی تعلیمات کا اثر نہ صرف ہندوستان کے لوگوں کے مذاہب و معاشرے پر ہوا بلکہ مسلمانوں نے علم و ہنر اور فن تعمیر کی کئی مثالیں قائم کیں۔ مسلمانوں نے مساجد تعمیر کیں، مکتب، مدرسے، اور جامعات قائم کیں اور قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، حساب، طب، شاعری، موسیقی، مصوری، اور خطاطی جیسے فنون کو فروغ دیا۔ مسلمان چونکہ خود بھی زیادہ تر تاجر تھے اور انھوں نے برصغیر میں زراعت اور صنعت و حرفت کے ساتھ تجارت کو فروغ دیا۔

صنعت و حرفت کے میدان میں ہندوستان نے خاطر خواہ ترقی کی اور عمدہ قالین و سکے ڈھلنے لگے اور کاغذ کی صنعت کو فروغ حاصل ہوا۔ مسلمانوں نے کئی نئے شہر بسائے اور سڑکوں کے جال بچھائے۔ اسی طرح دریاؤں سے نہریں نکالیں اور زراعت کو ترقی دی۔ دریاؤں پر پل بنا کر رابطے آسان کیے۔ گویا اسلام اور مسلمانوں کی آمد سے برصغیر پاک و ہند میں سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی لحاظ سے انقلاب آ گیا تھا۔

مسلمانوں کی ایک خاص خوبی یہ تھی کہ وہ متعصب نہیں تھے۔ انھوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں ہندوؤں اور ہندوستانیوں کو اپنے ساتھ شامل کیا۔ چاہے وہ فن تعمیر کا معاملہ ہو یا میدان جنگ ہو، زراعت و حرفت ہو، یا صنعت کاری ہو۔ اس کا اثر ہندوؤں کی اپنی تہذیب و ثقافت اور فن تعمیر پر بھی پڑا اور بقول تارا چند "اس دور کا ہندوستان فن تعمیر بھی اس امتزاجی رجحان کا پتا دیتا ہے، ہندو محلات، منادر، یادگاری مقابر، یا چھتریاں اب خالص قدیم انداز پر تعمیر نہیں ہو رہے تھے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ فن تعمیر کے اسلامی عناصر کو اپنایا بلکہ ان کے اندر

ایک نئی روح پیدا ہو گئی تھی۔"(۱۶)اس نئی روح سے مراد یہ کہ ہندوستان اب قدیم بوسیدہ طور طریقوں سے نکل کر جدید اور ترقی یافتہ مملکت کی صورت میں قائم ہوا جس میں ہر طرز فکر اور شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والوں کو مکمل آزادی حاصل تھی اور آزادی کے ساتھ ترقی نے امن اور خوشحالی کو عروج بخشا۔

برصغیر میں مسلمانوں نے نہ صرف بقیہ شعبہ ہائے زندگی میں ترقی عطا کی بلکہ سیاسی اعتبار سے ہندوستان کو ایک طاقت بخشی کیونکہ اس سے پہلے کئی چھوٹے چھوٹے قبیلے خود مختارانہ طرز حکومت کو اپنائے ہوئے تھے جسے مسلمانوں نے ختم کر کے ایک طاقتور اور عظیم ہندوستان کی بنیاد رکھی۔ بقول تاراچند "مسلم غلبے نے خود مختار طاقتوں کے بے شمار مراکز توڑے اور سرداروں کے سلسلے کو دبانے کی طرف بھی توجہ کی جو مرکزی حکومت اور افراد کے بیچ کا واسطہ بنے ہوئے تھے اور اس طرح سیاسی یکسوئی پیدا کی اور ایک وسیع تر طاقت کا احساس پیدا کیا۔"(۱۷)دوسرے لفظوں میں عظیم اور طاقتور ہندوستان کی تکمیل مسلمان حکمرانوں کی بدولت ممکن ہوئی۔

چنانچہ یہ وہ بنیادی عناصر تھے جنھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں میں قومی حمیت و غیرت پیدا کی تھی اور انھوں نے ایک ایسی قوم کی غلامی قبول کرنے سے انکار کر دیا جو خود ترقی، خوشحالی اور عالمی دنیا میں طاقت کے لحاظ سے مسلمانوں کی مرہونِ منت تھی۔ ہندوؤں کی برتری سے مسلمانوں کے وقار اور عزت کو شدید ٹھیس پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ وہ غلامی کیسے قبول کر لیتے کہ وہ ایک عظیم الشان ثقافتی اور تہذیبی ورثے کے مالک تھے چنانچہ پاکستان کے قیام کے محرکات میں یہ ایک بنیادی محرک شامل ہے جس میں مسلمانان برصغیر کی بقا اور سالمیت اور ان کے حقوق و مفادات کے تحفظ کا مسئلہ تھا۔

برصغیر میں جب سے مسلمان داخل ہوئے اس وقت سے ہندو ان کو علیحدہ قومیت اور سودیشی وطن کہا کرتے۔ جب مسلمان فاتحین نے ہندوستان کو اپنا مستقبل وطن بنایا اور یہاں مقامی باشندوں کی ہندو رانیوں سے شادیاں کر لیں تو وہ اب سودیشی نہ رہے بلکہ خالص ہندوستانی کہلائے، البتہ ان کی شناخت ایک علیحدہ قومیت کے طور پر تھی۔ ہزاروں سال جب ہندوؤں پر حکمرانی اور ابنائے وطن کی ریشہ دوانیوں سے مسلم اقتدار زوال کا شکار ہوا تو ہندو اور مسلم تہذیب کے فرق کے احساس میں مزید اضافہ ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب اسلامی اقتدار کا خاتمہ ہو چکا تھا تو ہندو ذہنیت کھل کر سامنے آگئی جس سے اندازہ ہوا کہ ہزاروں سال مسلمان اور ہندو ایک ساتھ رہنے کے باوجود آپس میں مل نہیں سکے بلکہ وہ مذہبی، سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی لحاظ سے الگ قوم ہیں اور ہندو ازم ابھی تک ان کو سودیشی سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا بلکہ وہ مسلمانوں کو سودیشی خیال کر کے ہندوستان سے نکالنا چاہتے ہیں اور ہندوستان (ہندو ماتا) کو (ملیّچھ) مسلمانوں سے آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ قریب تھا کہ برصغیر پاک و ہند میں بھی

سپین کی تاریخ دہرائی جاتی اور برصغیر میں بسنے والے کروڑوں مسلمانوں کو نکال دیا جاتا اور ان کا ملّی تشخص برصغیر سے ختم کر دیا جاتا (جیسا کہ بھارت اب کشمیری مسلمانوں کے ساتھ کر رہا ہے)۔ ان حالات میں سب سے پہلی کاوش سرسید احمد خان نے کی جنھوں نے انگریزوں سے مصالحت کا قدم بڑھا کر برصغیر میں مسلمانوں کے قدم مضبوط کیے۔ سرسید احمد خان اور ان کے رفقائے کار نے مسلمانوں میں قومی شعور بیدار کرنے کے لیے بھرپور تحریک چلائی جسے بعد میں علامہ اقبال اور ان کے ہم عصر شعرا و مفکرین نے آبیاری کی اور قائد اعظم محمد علی جناح نے اس کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

علامہ محمد اقبال نے شاعری کے ذریعے مسلمانوں کی ثقافتی و تہذیبی کارناموں کو اس انداز سے بیان کیا کہ اسلامی تہذیب و تمدن کی عظمتوں کے نقوش ابھر کر سامنے آگئے اور برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی جس نے ان میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ ان کا ماضی کس قدر شاندار رہے گویا ان میں اپنے انفرادی تشخص کا شعور بیدار ہو گیا۔

## ملت اسلامیہ / اسلامیانِ ہند کے لیے ایک الگ ریاست کا تصور:

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مسلم اقتدار کے زوال کے بعد مسلمانان ہند کے لیے حالات اس قدر دگرگوں ہو چکے تھے کہ ان کے لئے آزادی کا سانس لینا مشکل تھا۔ جنگ آزادی اور اس کے فوراً بعد انگریزوں کے جبر اور بعد میں ہندوؤں کا تعصب اور تنگ نظری ایسی وجوہات تھیں کہ اسلامیانِ ہند اپنے مستقبل کو تاریک محسوس کرنے لگے اس کی وجہ اسلام اور اس کی مذہبی روایات ہیں کیونکہ اسلام غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزادی کا درس دیتا ہے اور مسلمانوں کو کسی بھی صورت مشرکین کے آگے ہتھیار ڈالنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ اسلام میں شہادت پانے یا غازی کا رتبہ پانے کے سوا کوئی تیسرا مقام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے مسلم اکابرین و مشاہیر نے خون پسینے سے غلامی کی سنگلاخ زمین کا سینہ چیر کر آزادی کا پودا پروان چڑھایا۔ انھوں نے جان و مال اور عزت و آبرو کی بے پناہ قربانیاں دے کر عقائد اسلامیہ کے تحفظ کے لیے ایک نئی اسلامی مملکت کی داغ بیل ڈالی۔

اسلامیان ہند کے لیے الگ ریاست کا وجود کسی ایک شخص یا تحریک کا مرہون منت نہیں ہے بلکہ اس کا بیج مجدد الف ثانیؒ نے بویا تھا پھر اس کو شاہ ولی اللہ اور سید احمد شہید کے رفقا نے اپنے خون سے سیراب کر کے اس میں جان بخشی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے مجاہدین کا خون بھی اس پودے کی آبیاری میں شامل ہے جسے بعد میں تحریک ریشمی رومال جیسی جہادی اور تحریک علی گڑھ جیسی علمی و ادبی تحریک نے جبر و استبداد کے موسم سے اس کی

حفاظت کی اور اس کی قوت میں اضافہ کیا۔ علامہ محمد اقبالؒ نے رنگِ سخن سے اس میں رنگ بھرے اور قائداعظم نے اس کا پھل اسلامیان ہند کے سپرد کیا۔ گویا پاکستان، اس کا تصور اور اس کے وجود کی داستان چند سالوں پر نہیں بلکہ کئی صدیوں پر محیط ہے۔

برطانوی راج کے ابتدائی چند سال کا دورانیہ ظلم و جبر اور سیاسی انتقام پر مشتمل ہے۔ جب یہ ستم کچھ کم ہوا تو اہل ہندوستان کی جانب سے برطانوی سامراج سے آزادی حاصل کرنے کی خاطر کوششیں شروع کی گئیں۔ ہندوؤں کو تعداد میں زیادہ ہونے کی وجہ سے برصغیر پاک و ہند کی معاشی، سیاسی اور اقتصادی صورت حال پر غلبہ حاصل ہو گیا۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ انھوں نے صدیوں سے قائم مسلم سلطنت کا بدلہ ان کی نسلوں سے لینا شروع کر دیا جس کو جلد ہی مسلم مشاہیر و اکابرین بھانپ گئے اور یہ سمجھ لیا کہ اب اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد ہندوؤں سے مستقل علیحدگی اختیار کر لی جائے تاکہ آنے والی نسلیں ہندوؤں کے انتقام سے محفوظ رہ سکیں۔ علاوہ ازیں مسلمان ہر لحاظ سے ہندوؤں سے ایک الگ قوم ہے اور وہ صدیوں ان کے ساتھ رہنے کے باوجود ضم نہیں ہو سکی تھی بلکہ ان کی تہذیب و ثقافت، مذہب، رسم و رواج اور سماجی نظام یکسر مختلف ہے اس لیے مسلمانوں کی بہتری اسی میں تھی کہ وہ ایک علیحدہ سلطنت قائم کریں جہاں خالص اسلامی حکومت ہو، قوانین و تعزیرات کا اجرا شریعت کے مطابق ہو، بیت المال، زکوٰۃ کا نظام قائم ہو اور خالص شرعی عدالتیں قائم ہوں جو اسلام اور قرآن کی روشنی میں فیصلے کر سکیں۔ قائداعظم نے ایک موقع پر انھی خیالات کی پاسداری کرتے ہوئے فرمایا:

> ”ہم ایک قوم ہیں اور ہماری ثقافت و تہذیب ہماری اپنی ہے۔ ہماری اپنی زبان ہے، ہمارا اپنا ادب ہے، ہمارا اپنا فن ہے اور اہم اپنے فن تعمیر پر ناز کرتے ہیں۔ ہمارے نام اور نام رکھنے کے اصول ہمارے اپنے ہیں۔ اقدار اور نسبتوں کا تصور ہمارا اپنا ہے۔ ہمارا اپنا قانون اور ہمارا اپنا نظام اخلاق ہے۔ ہماری رسومات اور کیلنڈر، تاریخ اور روایات اور امنگیں صرف ہم ہی سے ماخوذ ہیں اور زندگی کو جانچنے اور سمجھنے کا انداز اور زندگی کو تابع کرنے کے مسائل اور زاویے ہمارے اپنے ہیں۔“ (۱۸)

قائداعظم کی مندرجہ بالا تقریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامیان ہند کے لیے علیحدہ مملکت کا حصول نہ صرف ایک ضرورت تھی بلکہ پاکستان ایک نظریہ ہے اور ایسا نظریہ جس کی بنیاد آج سے چودہ سو سال پہلے سرزمین عرب میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے رکھی تھی۔ آپ کا مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں پہلی جمہوری ریاست کا قائم کرنا، جس میں مسلمانوں کو مذہبی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی آزادی حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ تمام مذاہب

اور عقیدے کے لوگوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ مدینہ کی یہ ریاست بر صغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک واضح مثال موجود تھی کیونکہ اگر مسلمان آپؐ کی رہنمائی میں مکہ سے مدینہ ہجرت کر کے ایک علیحدہ ریاست کی بنیاد نہ رکھتے تو شاید آج ہم بھی لا الہ الااللہ محمد الرّسول اللہ سے محروم ہوتے۔ اگر اللہ کے رسول ﷺ کفار مکہ کے ساتھ معاہدہ کر کے ان کو اپنے عقیدے پر قائم رہنے دیتے اور خود اپنے عقیدے پر قائم رہتے اور وطن (مکہ) کی محبت میں وہاں سے نہ نکلتے تو اسلام ایشیاء، یورپ اور افریقہ تک نہ پھیلتا بلکہ مکہ میں ہی آپ کی رحلت کے بعد چند سالوں میں حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتا۔ بالکل اسی طرح اگر بر صغیر کے مسلمان علیحدہ وطن کے قیام کا مطالبہ اور کوششیں نہ کرتے اور وہ متحدہ ہندوستان میں ہی رہنا پسند کرتے تو اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ چند سالوں یا صدیوں میں بر صغیر سے اسلام نام کی کوئی چیز باقی نہ رہتی۔ ہو سکتا ہے کہ مسلمان رہتے لیکن وہ بھی برائے نام مسلمان۔ جن کا اسلام اور اسلامی روایات سے کوئی خاص تعلق نہ رہتا۔

ایک دوسرا اور اہم نقطہ یہ ہے کہ متحدہ ہندوستان کی صورت میں سیاسی اقتدار و اختیار کے مالک ہندو ہوتے کیونکہ وہ اکثریت میں تھے اور یہ ایک ہندو ریاست کہلاتی اور جب کبھی ان کا اسلام یا مسلمانوں سے واسطہ پڑتا تو اتنی بڑی سلطنت مسلمان ممالک کو زیادہ سے زیادہ زچ پہنچا سکتی تھی اور بر صغیر کے مسلمان سوائے افسوس کرنے کے کچھ بھی نہ کر سکتے (جیسا کہ ۱۹۴۸ء، ۱۹۶۵ء، ۱۹۷۱ اور کارگل کی پاک بھارت جنگوں کے دوران ہوا ہے) کیونکہ مسلمان دنیا کے جس کونے اور ملک میں آباد ہوں ان کا دل اسلام اور مسلمانوں کے لیے دھڑکتا ہے اور ان جنگوں کے دوران بھارت میں آباد مسلمان بہت افسردہ ہوتے تھے لیکن وہ ہندو دھرم کے آگے بے بس ہوتے۔

کچھ لوگوں کا علیحدہ مملکت کے تصور سے اس وجہ سے اختلاف تھا کہ ان کے خیال میں بر صغیر مسلمانوں کی ریاست اور ملک ہے تو وہ کیسے اس کے کچھ حصے کو لے کر بقیہ ہندوؤں کے حوالے کر دیں؟ وہ لوگ تقسیم کے خلاف صرف اس وجہ سے تھے کہ بر صغیر کا خطہ ارضی صرف مسلمانوں کا ہے اور قائد اعظم اور ان کے چند ساتھی اس کے تھوڑے سے حصے پر اکتفا کیوں کر رہے ہیں؟

اس سوال کا جواب انتہائی آسان اور سیدھا سادہ ہے کہ بے شک بر صغیر میں مسلمان صدیوں حکمران رہے اور بر صغیر کسی دور میں دنیا کی بڑی طاقتوں میں شمار ہوتا تھا اور ان طاقتوں کے مالک مسلمان تھے لیکن وہ قوت و اقتدار اور سلطنتیں فتوحات سے حاصل ہوئی تھی اور ان فتوحات کے پیچھے وہ جذبہ کار فرما تھا جس نے دنیا کا نقشہ بدل ڈالا تھا، لیکن مملکت پاکستان کا قیام کسی فتوحات کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ یہ اس تحریک کا نتیجہ تھا جسے بر صغیر میں

مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا نام دیا گیا ہے اور فتح اور نشاۃ ثانیہ میں خاصا فرق ہے۔ پروفیسر جیلانی کامران نشاۃ ثانیہ کی تعریف اور اس کا مسلمانانِ ہند کے ساتھ تعلق کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نشاۃ ثانیہ ہر لحاظ سے ایک فکری تحریک کے طور پر ظاہر ہوتی ہے اور پھر اس تحریک سے سیاسی اور معاشرتی عمل پیدا ہوتا ہے جسے فکری تحریک کے ذریعے بدلنے کی کامیاب کوشش کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں نشاۃ ثانیہ ایسی قوم کے اندر وقوع پذیر ہوتی ہے جس کی اپنی تاریخ ہوتی ہے۔ نشاۃ ثانیہ ایسی قوموں کے درمیان ظاہر نہیں ہوتی جن کی تاریخ کا وجود نہیں ہوتا۔ نشاۃ ثانیہ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ذریعے وہ قوم جو اس عمل میں شامل ہوتی ہے، نہ صرف اپنی تاریخ کے ماضی کو ایک تحریک اور اثر کے طور پر تسلیم کرتی ہے بلکہ جمود اور محکومی کو ختم کر کے اپنے لیے نئے مستقبل کی تعمیر کا وعدہ ہوتا ہے۔" (۱۹)

مسلمانانِ برصغیر کی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد مجدد الف ثانیؒ نے رکھی لیکن اس کا تناور درخت جنگ آزادی کے بعد سر سید احمد خان اور ان کے رفقائے کار کی بدولت ہوا۔ اور آخر میں قائد اعظم کی شب و روز محنت سے پاکستان کا وجود اسی نشاۃ ثانیہ کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ پاکستان ایک فکری بنیاد پر وجود میں آیا اس لیے اسے نشاۃ ثانیہ سے جدا نہیں کیا جا سکتا بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کی تعمیر و ترقی اور رفعت و عظمت کو تسلیم کرنے کے ساتھ تہذیبی برتری کے تحفظ کو قائم کرنا اور نئے سرے سے پہلے سے بہتر طور پر پیدا ہونا نشاۃ ثانیہ کے زمرے میں آتا ہے۔

### وطن کے جغرافیائی تصور کی بجائے مذہبی تصور کے ساتھ ربط:

پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا یعنی برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے جس ریاست کی بنیاد رکھی گئی اس کا نام پاکستان رکھا گیا۔ پاکستان ریاست مدینہ کے بعد دنیا کی پہلی مملکت تھی جس کی بنیاد اسلام تھا۔ اسلام دو قومی نظریے کا تصور پیش کرتا ہے۔ اسلامی دو قومی نظریہ سے مراد مغربی تصور قومیت کے برعکس جغرافیائی اقوام کی بجائے دو فکری تصور، دو قومی تصور کہلاتا ہے۔ دو فکری تصور سے مراد مسلم تفکیر اور غیر مسلم تفکیر ہیں۔ اسلامی فکر کی تعلیمات و تشکیل دوسری اقوام سے مختلف ہے۔ غیر مسلم فکری تصور و خیال جس طرح قوم اور قومیت کی تشریح کرتا ہے۔ اس میں کہیں رنگ، کہیں نسل اور کہیں زبانوں کے اختلاف نے علیحدہ قوم کی شکل اختیار کی ہے۔ غیر مسلم اقوام نے قومیت کی بنیاد جغرافیائی حد بندی سے رکھی اور انسانوں کو اکٹھا کرنے کی بجائے کئی اقوام میں تقسیم کر دیا جس سے رنگ و نسل، علاقائی تعصب اور مال و دولت کے فرق نے انسانوں اور قوموں کے درمیان واضح خلیج پیدا ہوئی۔ ایسی خلیج جس میں مغربی اقوام مشرقی اور افریقی اقوام و ممالک پہ واضح

برتری رکھتی ہیں اور وہ ان علاقوں کے لوگوں کو انسانیت سے کم تر درجے پر تصور کرتی ہیں جبکہ کالا اور گورا رنگ کا اختلاف بھی انسانوں کے درمیان پست اور برتر اقوام کا فرق تصور کیا جاتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں صورت حال باقی ممالک سے قدرے مختلف تھی۔ وسیع و عریض علاقہ ہونے کی بدولت یہاں نہ تو کوئی ایک قوم آباد تھی اور نہ ایک مذہب کے پیروکار۔ یہاں کے باشندے ایک زبان بھی نہیں بولتے تھے بلکہ یہاں کئی زبانیں بولی جاتی تھیں، اسی طرح رنگ و نسل میں بھی اختلاف تھا لہٰذا جب برصغیر کے باشندوں کو ایک قوم اور قومیت میں پرونے کی کوشش کی گئی تو یہاں کے مسلم باشندوں نے خود کو ہندوستانی جغرافیائی قومیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ اسلام اور مسلمان کہیں بھی جغرافیائی سطح پر قومیت کا یقین نہیں رکھتے۔ اسلام کے نزدیک قومیت کی بنیاد جغرافیائی حدبندی، رنگ و نسل یا زبان نہیں ہے بلکہ اسلام میں ایک فکر اور واحدانیت کی بنیاد پر قومیت کو تسلیم کیا جاتا ہے جس کے لیے "ملت" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

دنیا میں قوم اور قومیت کی بنیاد جب بھی نظریات کی بجائے کسی اور پہلوؤں پر رکھی گئی تو اس میں اخوت کا فقدان پایا گیا جو کسی بھی قومیت کے لیے لازمی جزو ہونا چاہیے کیونکہ اصل اتحاد و اخوت فکر کی یگانگت سے پیدا ہوتی ہے اور فکری اختلاف ہونے کی صورت میں اخوت میں کمی لازمی امر ہے۔ اسی طرح ایسی ریاستیں جن کی بنیاد فکر و نظریات پر رکھی گئی وہ قدرے زیادہ مستحکم نظر آتی ہیں۔ اب یہ اس ریاست کے باشندوں پر منحصر ہے کہ وہ جس فکر و نظریہ کے تحت قوم کی بنیاد رکھتے ہیں، وہ فکر اور نظریہ کس قدر قوی ہے۔ نظریہ جتنا مضبوط ہو گا قوم اتنی ہی مضبوط و مستحکم ہو گی۔ فکر و نظریہ کمزور پڑ جانے سے قومیت کی اساس میں بھی خامیاں نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

جہاں تک اسلام اور اس کی تعلیمات کا تعلق ہے تو اس کی تعلیمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں اور تمام انسانوں کو خواہ وہ کسی بھی قبیلے، قوم، رنگ اور علاقے سے تعلق رکھتے ہوں، ان کو برابری کی سطح پر سمجھا جاتا ہے اور تمام انسانوں کے لیے اخوت، مساوات اور انصاف کا یکساں حکم ہے۔ اسلام کی ان تعلیمات میں انسانی فلاح کی جاذبیت ہے اور لوگ ان تعلیمات کی بدولت ہی حلقہ بگوش اسلام ہوتے آئے ہیں۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں نے ان تعلیمات پر زیادہ عمل کیا جس کا اثر یہ ہوا کہ اسلام یثرب کے چھوٹے سے خطے سے براعظموں تک پھیل گیا۔ مرور ایام کے ساتھ مسلمانوں میں ان تعلیمات و عقائد سے دوری نظر آتی ہے جس کی بنا پر مسلمانوں زوال کا شکار ہوئے لیکن اس کو اسلامی تعلیمات یا فکر و مذہب کی خامی نہیں کہہ سکتے بلکہ اس کے ماننے والوں کا قصور ہے جنھوں نے اسلامی فکر و تعلیمات کی بدولت غیر اسلامی اصولوں کو اپنایا۔ گویا اصل مسئلہ فکر و

مذہب کا نہیں اس کے پیروکاروں کا ہے۔ دنیا میں جتنی بھی اقوام یا سلطنتیں قائم ہیں ان کے کچھ قوانین اور اصول وضوابط ہیں جن کی بدولت وہ ریاستیں اور اقوام قائم ہیں ۔ گویا قانون اور اصول وضوابط کے بغیر انسانی زندگی کو جنگلی حیات سے بھی بدتر زندگی کہہ سکتے ہیں۔ اسلام کیا ہے؟ اسلام ایک دستور حیات ہے ایک فکر ہے ایک فلسفہ ہے جو دنیا کے تمام انسانوں کو یکسوئی عطا کرتا ہے۔ اسلام ایک ایسا ضابطہ حیات، طریقہ کار اور نظامِ فکر ہے جو دنیا کے تمام آئین و قوانین سے افضل اور برتر ہے اور غیر مسلم دنیا میں انسانی مساوات کا جو نظام قائم ہے وہ اسلام سے ہی مستعار شدہ یا اسلامی تعلیمات کا چربہ ہے۔

برصغیر پاک وہند میں جب تک مسلم حکومت قائم رہی تو اس وقت نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام مکتب فکر کے لوگوں کو برابری کی سطح پر حقوق حاصل ہوئے اور اس دوران فرقہ ورانہ فسادات کی نوبت نہ آئی لیکن جوں ہی مسلمانوں کی حکومت ختم ہوئی تو ہندو اپنے عزائم کی تکمیل میں مسلمانوں پر چڑھ دوڑے اور فسادات شروع ہوگئے۔ مولانا محمد اسماعیل ذبیح ’کوتلہ چانکیہ کی کتاب ”ارتھ شاستر“ کا ایک مطالعاتی جائزہ پیش کرتے ہوئے ہندو قوم کی خصوصیات لکھتے ہیں:

> ”ابتدائی آرین اقوام کی الہامی کتابوں یعنی ویدوں اور اس کے بعد کتابوں جو اپنشدوں اور پرانوں کی شکل میں ہندو قوم کا مقدس مذہبی لٹریچر ہے۔ اس نے ابتدائی ویدک دور سے لے کر رام چندر اور شری رام کرشن کے دور تک ہندوؤں کو یہی سکھایا ہے کہ آرین اپنے ساتھ جو دیوتا اور دیویاں لائے تھے ان کے رشیوں اور مینوں نے ہر دور میں غور و فکر کے بعد جن بے شمار دیوتاؤں اور دیویوں کو طاقت، اختیار و اقتدار کا مالک بنایا تھا وہی دھرم ہے اور اس کے سوا عقل، سائنس اور خدائے واحد کی تعلیم دینے والے رسولوں اور ان کے دلائل کو قبول کرنا اصل ہندو مذہبی فلسفہ کے خلاف ہے۔“ (۲۰)

مسلمان قوم دنیا کے مختلف علاقوں میں آباد ہے اور ان کا تعلق زمین یا جغرافیائی رشتہ کی بجائے مذہب سے ہے اور وہ دین اسلام کی بنا پر ایک قوم ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کا نقطہ نظر جغرافیائی حدود میں محدود رہنے کی بجائے عالمی ہے۔ انھوں نے جہاں بھی حکومت قائم کی وہی ان کا وطن ٹھہرا۔ کیونکہ اسلام کے مطابق زمین و آسمان اور جو کچھ اس میں ہے، اس سب پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ہے اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جبکہ بنی نوع انسان اس کا نائب ہے اور اس کے احکام بجالانے کا پابند ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمان کسی علاقہ یا وطن سے محبت توضرور کرتا ہے اور یہ اس کے ایمان کا حصہ بھی ہے لیکن غیر مسلموں خاص کر ہندوؤں کی طرح دھرتی کی پوجا نہیں کرتا۔ اسلام میں پوجا (عبادت) کا حق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات مبارکہ کو حاصل ہے۔ اسلام مٹی سے محبت کی

بجائے اس پر رہنے والے انسانوں سے محبت سکھاتا ہے اور اسی محبت کا نتیجہ تھا کہ برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں انسانی بہتری، ترقی اور فلاح و بہبود کے بے شمار کارنامے انجام دیے۔ انھوں نے برصغیر کے باشندوں کو مکمل مذہبی آزادی بھی دی اور تمام مذاہب و فرقوں میں مساوات قائم کی۔ اگر دیکھا جائے تو بھارت اور اس کے باشندوں کی ترقی، شعور کی بیداری اور جدیدیت کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے لیکن اس کے برعکس ہندو مذہب کے ماننے والے ہمیشہ موقع کے انتظار میں رہے اور موقع ملتے ہی انھوں نے اپنے خوفناک عزائم کو عملّی جامہ پہنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ مولانا محمد اسماعیل ذبیح ہندوؤں کی اس سوچ بارے لکھتے ہیں:

"ہزاروں سال کی مسلسل روایت نے ہندو کی سوچ کو اس حد تک عادی بنا دیا ہے کہ وہ کوئی فیصلہ کن اقدام اٹھانے سے قبل احتیاط کے تقاضوں کے مطابق سو بار سوچتا ہے اگر اس کا مدمقابل کسی حد تک طاقتور ہے تو وہ اس سے خوف زدہ ہو جاتا ہے پھر اس کو چانکیہ کوتلیہ کی بتائی ہوئی ڈپلومیسی (چترتا) یاد آتا ہے۔ ہندو کبھی دو ٹوک بات کرنا پسند نہیں کرتا۔ وہ الفاظ کے گورکھ دھندوں پر یقین رکھتا ہے اور کج بحثی اگر مگر اور انکار و اقرار کی پالیسی کو اپنا رہنما اصول بناتا ہے جس پر وہ ہزاروں سال سے عمل پیرا ہے۔ شک، خوف اور خطرہ جس حد تک ہندو ذہن پر مسلط رہتا ہے وہ کسی اور قوم پر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ تہ در تہ احتیاطی تدابیر ہندو قوم کی انفرادی اور قومی فطرت کا لازمی حصہ ہے۔" (۲۱)

"ارتھ شاستر" ہندوؤں کی وہ قدیم سیاسی رہنمائے اصولوں پر مبنی کتاب ہے جو ۳۲۶ سے ۳۲۱ قبل مسیح میں کوتلیہ چانکیہ نے چندر گپت موریہ کے عہد حکومت میں لکھی تھی۔ اس کتاب کے کل ۱۵۰ ابواب ہیں جس میں انتظامیہ، خارجہ پالیسی، کمزور اور طاقتور حکومتوں سے مقابلے، فتح مندی کے طریقے، مالیات پر مکمل کنٹرول، سراغ رسانی، خفیہ مراکز، جنگی تیاریوں کے طریقے، رعایا پر کنٹرول کرنے کے طریقے اور قوانین، سازشوں اور غیر ملکی ریشہ دوانیوں اور ملکی سازشوں کو کنٹرول کرنے کے طریقے حتیٰ کہ ریاست کو تمام پہلوؤں سے مستحکم کرنے کے اقدامات درج ہیں۔ موجودہ بھارت کوتلیہ چانکیہ کی اس کتاب میں دیے گئے اصولوں پر عمل پیرا ہے۔ اگر ۱۹۴۷ء سے موجودہ دور تک بھارت کی پالیسی کو بغور دیکھا جائے تو ان تمام اقدامات کا پتہ چلتا ہے جو کوتلیہ چانکیہ نے ارتھ شاستر میں مرتب کیے ہیں۔

مسلمان صدیوں تک ہندوؤں پر حکمران رہے لیکن انھوں نے کبھی بھی ابنائے وطن کے عقیدوں کو ٹھیس پہنچانے یا تبدیل کرنے کے متعلق نہ سوچا۔ ہزار سال سے زیادہ مسلمان حکمران رہنے کے باوجود ہندو مذہب قائم و دائم رہا۔ اگر مسلمان چاہتے تو تمام رعایا پر اپنا مذہب مسلط کر سکتے تھے لیکن مسلمان متعصب نہیں ہیں

اور نہ ہی ان کو زبردستی کسی کا مذہب تبدیل کرنے کا حکم ہے لیکن ہندو مذہب میں ایسا نہیں ہے۔ یہ ہمیشہ چانکیہ کوتلیہ کے اصولوں پر عمل پیرا ہو کر موقع کا انتظار کرتے ہیں اور موقع ملتے ہی دوسرے مذاہب والوں کو سخت انتقام کا نشانہ بناتے ہیں۔ مولوی محمد اسماعیل ذبیح ہندو قوم کے ان ارادوں کے بارے لکھتے ہیں:

"جب ہندو قوم حکمران اور طاقتور ہو تو وہ اپنے سے کمزور عوام کو جذب کر لیتی ہے بلکہ تباہ کر دیتی ہے جیسے ماضی بعید میں صدیوں تک بھارت کے عوام پر چھا جانے والے بدھ مت اور جین مت کے ماننے والوں کے ساتھ ہوا اور اب پھر برصغیر کی تقسیم کے بعد عددی اکثریت اور فوجی طاقت میں برتری حاصل کرنے کے بعد ہندوستان کی بڑی اور چھوٹی اقلیتوں کے ساتھ ہندو کا سامراجی ذہن ان پر غالب آنے اور ان کی عبادت گاہوں تک کو اپنی جنگی جارحیت سے مسمار کرنے کے شرمناک مظاہروں میں لگا ہوا ہے۔" (۲۲)

یہی وجہ تھی کہ تحریک پاکستان کے دوران کانگریسی رہنما یہ چاہتے تھے کہ ان کی ماتا بھارت پر مکمل کنٹرول ہندوؤں کا ہو جانے کے بعد وہ دوسرے مذاہب کو اپنے عزائم کے مطابق اس حد تک مجبور کر دیں گے کہ یا تو وہ ہندوستان چھوڑ دیں گے یا ہندو مذہب قبول کر لیں گے اس لیے انھوں نے قومیت کی بنیاد مذہب کی بجائے وطن پر زور دیا جو کہ جدید مغربی تصور قومیت بھی ہے اور جس کا ذکر پیچھے ہو چکا ہے لیکن مسلمان مفکرین ہندوؤں کے ان ارادوں کو اچھی طرح سمجھ گئے اور انھوں نے قومیت کی بنیاد وطن کی بجائے مذہب کو تسلیم کر لیا اور ویسے بھی اسلام میں قومیت کی بنیاد مذہب ہے، علاقہ یا وطن قومیت کے زمرے میں نہیں آتا اور مسلم قومیت کی تشکیل دین و مذہب سے ہوتی ہے جغرافیائی یا لسانی حد بندیوں سے نہیں۔ اس لیے برصغیر کے مسلمانوں نے خود کو ہندوستانی کہلوانے کی بجائے مسلم کہلوانے کو فوقیت دی بلکہ خود کو ہندوستانی مسلمان کہلوایا۔ اقبال تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک قوم میں مربوط ہونے کی ترغیب دیتے ہوئے نظم "طلوع اسلام" میں فرماتے ہیں:

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی ، نہ ایرانی ، نہ افغانی
یہ ہندی ، وہ خراسانی ، یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل! اچھل کر بے کراں ہو جا (طلوعِ اِسلام، بانگِ درا)

یعنی دینِ اسلام اور مسلمان تمام حد بندیوں سے آزاد ہے اور لا محدودیت کا قائل ہے پاکستان کا قیام اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں تمام دنیائے اسلام ایک قوم اور ملت تصور کی جاتی ہے۔

## (ب) قیامِ پاکستان کے بعد ہماری مذہبی شناخت کا حوالہ

مسلمانانِ برصغیر کی شب و روز محنت اور قائد اعظم جیسے رہنماؤں کی قیادت سے آخر کار ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا اور عالمِ ارض میں ایک مسلم ملک کی حیثیت سے نقش ہو گیا جس کے بعد برصغیر کے بھارتی علاقوں سے بہت بڑی تعداد میں مسلمان جغرافیائی حد بندیوں اور وطنی محبت کو بھلا کر اسلامی نظریے اور عقیدے کی حفاظت کے لیے پاکستان پہنچے۔ ملّی جذبے اور نظریے کی بنیاد پر اتنی بڑی ہجرت عالمی دنیا میں مثالی حیثیت رکھتی ہے اس طرح یہ ہجرت مملکت پاکستان کی انفرادی خصوصیت میں شامل ہے۔ لہٰذا جس اسلامی مملکت کے لیے اتنی بڑی قربانیاں دی گئیں اس کے قیامِ پاکستان کے بعد مذہبی شناخت اور قومی و ملّی شاعری کے نمایاں پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

### تہذیبی خدوخال...... نمایاں پہلو:

پاکستان کا قیام چونکہ اسلام اور مذہب و فکر و نظریہ کی بنیاد پر ہوا تھا اور اسی ولولے اور جوش سے ہندوستان کے مختلف علاقوں سے مسلمان گھر بار چھوڑ کر اسلامی ریاست کی ترقی اور اسلامی طرز پر زندگی گزارنے کے لیے ہجرت کر کے پاکستان آئے لیکن بد قسمتی کہ قیامِ پاکستان کے ایک سال بعد بانیِ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناحؒ فوت ہو گئے جس سے مسلمانانِ پاکستان کو شدید صدمہ اور پاکستان کی اساس کو شدید نقصان پہنچا۔ اقتدار پر آزاد خیال لوگوں کا قبضہ ہو گیا اور مسلمانوں کا دیرینہ خواب پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا حالانکہ قائد اعظم نے بارہا اپنی تقریروں میں اسلام اور اس کی عملی شکل بروئے کار لانے پر زور دیا تھا۔

> "اس برصغیر میں ہم ایک بڑی قوم ہیں اور ہمارا شاندار ماضی ہے اور ہماری تاریخ عظیم الشان ہے، لیکن اسے ثابت کرنا باقی ہے تاکہ اسلام کا دوبارہ عروج ہو، اس کی عظمت ظاہر ہو اور اس کی شوکت دنیا پر آشکار ہو۔"(۲۳)

برصغیر کے مسلمانوں کو اپنا شاندار ماضی اور عظیم الشان عروج ثابت کرنے کے لیے یہ ایک بہترین موقع تھا اب اسلام اور خطہ ارضی پاکستان کو عربی شہنشاہیت سے آزاد کرنے کا بھی موقع تھا۔ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے بغیر کسی قوم و مذہب کی دخل اندازی اور میل جول پیدا کیے، خالص اسلامی اصولوں کی بنیاد پر ایک مثالی ریاست جس میں عالمی اسلامی معاشرہ منسلک ہو، متعارف کروایا جا سکتا تھا۔ وہ اسلامی ریاست جس کا خواب اقبال نے دیکھا تھا اور برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے خون سے جس درخت کو سینچا اب وہ اب فصل دینے کو تیار تھا اور

اس کی فصل کاٹنے کا وقت تھا لیکن ایسے وقت ایوان اقتدار میں ایسے لوگوں کا قبضہ ہو گیا جن کو نہ تو اسلام سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ پاکستان سے محبت، بلکہ وہ تو اقتدار کے ایوانوں کے طلبگار تھے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی مکہ سے مدینہ ہجرت دراصل اس امر کی متقاضی تھی کہ مسلمانوں کے لیے مقامی وطن کوئی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ اصل چیز نصب العین ہے۔ برصغیر کے مسلمان بھی اسی نصب العین کو پاکستان میں عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے اور برصغیر کے مسلمانوں پر شہنشاہیت کی جو چھاپ لگی ہوئی تھی اس کو مٹانے اور ایک خالص اسلامی جمہوری حکومت قائم کرنا ان کا نصب العین تھا کیونکہ شہنشاہیت کی تشکیل میں مسلمانوں کو کامیابی ضرور ہوئی تھی لیکن اسلام کی ثقافتی نشو نما کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی تھی اور اس طرح بیرونی اور مقامی ثقافتیں جن میں غیر ضروری اور غلط قسم کی روایات بھی پائی جاتی تھیں، اسلامی حکومت میں مروج ہو گئی تھیں۔ مسلمان قوم ہر لحاظ سے خیر الامم ہے کیونکہ اس کو آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی اتباع نصیب ہوئی جن کی نبوت کا مقصد پورے عالم میں اخوت، رواداری اور انصاف کو جاری کرنا تھا اور ان کی تعلیمات اخلاقی قوتوں کے ذریعے پوری کائنات کو مسخر کرنے کے لیے تھیں، جن کو بروئے کار لا کر مسلمانوں نے پورے دنیا میں اسلام کا بول بالا کیا تھا۔ اب پھر موقع تھا کہ اسلامی تہذیب و ثقافت کو پروان چڑھایا جائے اور آپ کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے پوری بنی نوع انسان کو اخلاقیات کے تابع کیا جا سکے، ترکی کی طرز پہ پاکستان کسی لادینی ریاست کے قیام کی گنجائش نہیں رکھتا تھا بلکہ اس کا مقصد خالص اسلامی ثقافت کی روح کو تقویت پہنچانا اور پورے عالم کے لیے ایک مثالی ریاست ثابت کرنا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد پاکستانی تہذیب و ثقافت کے بارے میں کئی متضاد رائے پیدا ہو گئیں۔ اسلامی حلقوں کا خیال تھا کہ پاکستان کا قیام خالص اسلامی نظریے کی بنیاد پر تھا تو اس کی تہذیب و ثقافت پر بھی کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہونا چاہیے اور اس کی تہذیب اسلامی تہذیب ہونی چاہیے لیکن یہ بات واضح کرنے میں وہ حلقے بھی ناکام رہے کہ پاکستان میں اسلامی تہذیب سے مراد عربی لباس، بول چال، زبان اور طرز زندگی ہے اور عربی شہنشاہیت ہے یا کچھ اور۔ اگر خلافت راشدہ کو خالص اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی ثقافت تصور کر لیا جائے تو موجودہ دور میں اس پر کیسے عمل کیا جا سکتا ہے لہٰذا اس سے "ہندی مسلم تہذیب و ثقافت" کا ایک نیا پہلو سامنے آیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی "پاکستانی کلچر" میں ہندی مسلم تہذیب کو پاکستانی تہذیب کہتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہم پاکستان کے سب باشندے اس "ہند مسلم ثقافت" کے وارث اور جانشین ہیں جو
اس برصغیر میں مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ دور حکومت میں یہاں کی فضا، مزاج، آب

وہوا اور میل جول کے زیر اثر پروان چڑھتی ہے جس میں عربوں کا مذہبی جوش اور آدرش بھی شامل ہے اور افغانوں، ایرانیوں، ترکمانوں اور مغلوں کا مزاج اور روح بھی نہ صرف یہ بلکہ جس کی روح نے برصغیر پاک وہند کی روح کو اپنے مزاج میں سمو کر تہذیب کا ایک ایسا نمونہ پیش کیا تھا جو کم و بیش آج برصغیر کی زندہ تہذیب کی ایجاد ہے۔"(۲۴)

برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے ایک ہزار سالہ ملاپ یا اکٹھے رہنے کے باوجود وہ نہ تو ایک قوم ہو سکے اور نہ ان کی ایک ثقافت تھی، لہٰذا یہ بات کرنا حقائق کے مخالف ہے کیونکہ اگر مسلمانانِ برصغیر ہندوپاک کی تہذیب و ثقافت میں فرق نہ کرتے تو پاکستان کی کیا ضرورت تھی؟ لہٰذا اس سے مسلم لیگ اور اقبال و قائداعظم سمیت تحریک پاکستان کے تمام مسلمانوں کے خیالات و نظریات کی نفی ہوتی ہے کیونکہ مسلمانوں نے الگ وطن کا مطالبہ مذہبی اختلاف کے ساتھ تہذیبی و ثقافتی اختلاف کی بنیاد پر کیا تھا، قائداعظم نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا:

" ہندوستان میں بہت سی نسلیں آباد ہیں۔۔۔۔ ان میں سے اکثر ایک دوسرے سے نژاد، رسم و رواج، اور طرز زندگی میں اسی طرح مختلف و ممتاز ہیں جس طرح اقوام یورپ۔ اس کے دو تہائی باشندے کسی نہ کسی شکل میں ہندو مذہب کے ماننے والے ہیں اور سات کروڑ سے زیادہ باشندے اسلام کے پیرو ہیں اور دونوں قوموں میں نہ صرف مذہب ہی کا فرق نہیں ہے بلکہ ان کے قانون اور ثقافت میں بھی زبردست اختلاف ہے۔" (۲۵)

یعنی اگر ہم ہندی مسلم ثقافت کو پاکستانی ثقافت و تہذیب تسلیم کر لیں تو پاکستان بنانے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور اس طرح کانگرس کے موقف کی تائید اور مسلم لیگ کے مؤقف کی نفی ہو جاتی ہے جس سے لاکھوں مسلمان جن کے جان و مال و عزتیں صرف پاکستان کے حصول کی خاطر قربان ہوئی تھیں ان کے جذبات کو شدید ٹھیس پہنچانے والی بات ہے۔ اگر پاکستانی تہذیب کو ہندو مسلم تہذیب ہی قرار دینا تھا تو دونوں طرف سے ہجرت کے دوران خون کی ہولی نہ کھیلی جاتی۔ قرۃ العین حیدر اپنے ناول "آگ کا دریا" میں لکھتی ہیں کہ ہندوستان پوری کوشش کر کے یہ ثابت کرنے میں مصروف ہے کہ تقسیم غلط تھی اور ملک دراصل ایک ہے اور اس کی تہذیب ناقابل تقسیم۔ پاکستان یہ ثابت کرتا ہے کہ تقسیم بالکل جائز اور صحیح تھی اور یہاں کا کلچر بے حد مختلف ہے اور اسی علیحدہ قومیت کی بنیاد پر ملک حاصل کیا گیا ہے۔(۲۶) لہٰذا جمیل جالبی کا نظریہ ہندوستان اور کانگرس کا ترجمان تو ہو سکتا ہے لیکن مسلم لیگ اور معماران پاکستان کے مؤقف کی تردید کرتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد معاشرے اور ایوانانِ اقتدار میں جاگیر دار اور سرمایہ دار قابض ہو گئے جن کو دین اسلام سے کوئی خاص رغبت نہ تھی۔ سیاسی اور معاشی طور پر بھی ہم آزادی کے فوراً بعد امریکہ کے جال میں پھنس گئے کیونکہ ہجرت کے بعد معاشی طور پر پاکستان کافی کمزور ہو گیا تھا اس وجہ سے کہ برصغیر کی معیشت زیادہ تر ہندو تاجروں اور ساہو کاروں کے ہاتھ تھی جو اپنا سرمایہ اور بوریا بستر لپیٹ کر ہندوستان چلے گئے اور ہندوستان سے مہاجرین لٹ پٹ کر خالی ہاتھ پاکستان پہنچے جن کے پاس نہ کچھ کھانے کے لیے تھا اور نہ رہنے کے لیے مکان بنانے کا سرمایہ۔ ان حالات میں پاکستان اور مسلم دشمن عناصر کو اپنی سکیم پر عمل درآمد کرنے کا موقع ملا اور وہ اپنے ارادوں میں کسی حد تک کامیاب ہو گئے۔ گویا ایسے عناصر پاکستان کو دیگر مسائل کی طرح تہذیبی مسئلے میں بھی الجھانے میں کامیاب رہے اور علمی و ادبی حلقوں میں یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ پاکستان کی تہذیب الگ ہونی چاہیے کیونکہ پاکستان ایک خود مختار الگ ریاست ہے جو عربوں کے زیر اثر نہیں آتی لہٰذا اس کی تہذیب کے ساتھ عرب تہذیب کا واسطہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کا تعلق صدیوں پہلے قائم ہونے والی موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی تہذیبوں سے شروع ہوتا ہے لیکن اگر اس نقطہ نظر کو دیکھا جائے تو مسلم فاتحین جن میں محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور غوری وغیرہ تو غاصب اور ظالموں میں شمار ہوں گے لیکن ایسا قطعاً نہیں ہے کیونکہ موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی تہذیبیں دور قدیم کی ایک الگ تہذیبیں ہیں جن کو کسی صورت بھی اسلامی یا پاکستانی تہذیب کے ساتھ شامل نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان ایک بالکل جداگانہ ثقافتی تصور کی پیداوار ہے۔ مسلمان فاتحین و علماء برصغیر پاک و ہند نہ آتے تو برصغیر میں مسلم تہذیب جنم نہ لیتی اور یوں پاکستان کا نظریہ جو قیام پاکستان کا جواز تھا، جنم نہ لیتا۔

اسی طرح ہم عہد مغلیہ یا برصغیر پاک وہند میں قائم مسلم حکومتوں کو بھی پاکستانی تہذیب و ثقافت کے لیے بطور نمونہ پیش نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو وہ حکومتیں شخصی تھیں اور ان حکومتوں میں اسلامی قانون سے شخصی حکم زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ دوسری وجہ یہ کہ ان مسلمان حکمرانوں نے غیر مسلم مقامی باشندوں کی خوشنودی کے لیے نظام سلطنت میں کچھ ایسے احکام جاری کیے جو غیر اسلامی تھے، اکبر بادشاہ کا دین الٰہی اس کی سب سے بڑی اور زندہ مثال ہے۔ تیسری بات یہ کہ بادشاہ خود بھی اسلام کا کوئی عملی نمونہ نہیں تھے۔ برصغیر کے مسلم حکمرانوں کے عہد میں طوائف الملوکی، امرد پرستی، میخانوں کا رواج اور زنا عام تھا۔ خود بادشاہوں کی سینکڑوں کنیزیں ہوتی تھیں تو رعایا پر بھی ان بدکاریوں کی پابندی کیسے لگائی جا سکتی تھی۔ یہ بات بھی درست ہے کہ چند حکمرانوں نے اسلامی تعلیمات پر عمل کروانے کی کوششیں کیں جن میں اورنگزیب عالمگیر شامل ہیں، لیکن ایسے حکمرانوں کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ انتقال اقتدار کا نظام اسلامی نہیں تھا۔

اورنگزیب نے ہی اقتدار کے لیے اپنے بھائیوں کو قتل کروا دیا تھا۔ اسلام اور اسلامی ثقافت ایسے افعال کی قطعاً اجازت نہیں دیتی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ پاکستانی تہذیب کیسی ہونی چاہیے؟ کیا پاکستانی تہذیب و ثقافت عربی کلچر کی تقلید ہی اسلامی کلچر ہو گا یا وہ تہذیب جس کا ذکر اوپر جمیل جالبی نے کیا ہے؟ ڈاکٹر محمد حسن عسکری اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "لوگ اسلام کو ایک خاص قوم یعنی عربوں سے منسلک کر دیتے ہیں چنانچہ ان لوگوں کے نزدیک اسلامی کلچر کے معنی ہیں "عربوں کا کلچر" پھر خود عربوں کی تاریخ میں کئی کلچری تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں وہ بھی ان لوگوں کو قبول نہیں ہیں۔۔۔ بعض لوگ چاہتے ہیں کہ عربی کو پاکستان کی قومی زبان بنایا جائے، ایک گروہ ایسا بھی ہے جس کی خواہش ہے کہ پاکستان کے لوگ عربی لباس پہنا کریں مسلمانوں میں بات یہ ہے کہ اسلام نے چند بنیادی خیالات پیش کر دیے تھے اور مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ ان خیالات کو پیش نظر رکھ کر دنیا کے ہر حصے سے علم حاصل کرو، جو اور کو آتا ہو وہ ان سے سیکھو، جو تمھیں آتا ہو وہ اوروں کو سکھاؤ، اس کلچر کا مطلب عربوں جیسا لباس نہیں ہے نہ عربی زبان بولنا۔" (۲۷)

حسن عسکری کی رائے حقیقت پر مبنی ہے اور وزن رکھتی ہے کہ اسلام نے چند بنیادی اصول وضع کیے ہیں جس میں نہ عربی لباس لازم ہے اور نہ عربی زبان بلکہ قرآن و حدیث میں مسلمانوں کے لیے زندگی گزارنے اور حصول علم کے لیے احکامات بیان کیے ہیں جن پر عمل لازم ہے۔ حسن عسکری مسلمانان برصغیر کے جن عوامل و افعال کو پاکستانی تہذیب کے لیے بطور نمونہ پیش کرتے ہیں وہ کسی حد تک کار آمد ہیں اور ان عوامل سے شاید ہی کسی کو انکار ہو:

> "اسلام کے بنیادی تصورات کے بعد ایک اور کلچری تصور ہے جس کا حق ہم سب پر زیادہ ہے اور وہ ہے ہند اسلامی کلچر، عمومی اعتبار سے یہ وہ کلچر ہے جو دہلی کے مسلمان سلطنتوں کے زیر سایہ نشو نما پاتا رہا ہے جس کے سب سے بڑے مظاہر دو ہیں: مغل عمارتیں اور اردو زبان۔۔۔۔ ہند اسلامی تہذیب کا بنیادی خاکہ ہمارے پاس موجود ہے اور ہماری کلچری عمارت اس کے اوپر تعمیر ہونی چاہیے مگر یہ بھی ناممکن ہے کہ پاکستان کا کلچر لفظ بہ لفظ وہی ہو جو دہلی یا لکھنؤ کا کلچر تھا ایک مطلق العنان بادشاہی اور جمہوری ریاست میں فرق ہونا چاہیے۔" (۲۸)

پاکستانی کلچر اور ہند اسلامی کلچر کا فرق نہ صرف مطلق العنان بادشاہی اور جمہوری ریاست کا ہونا چاہیے بلکہ پاکستانی کلچر میں ان غیر اسلامی افعال پر بھی سختی سے پابندی ہونی چاہیے جو مسلم بادشاہوں اور ان کی اشرافیہ کی طرز زندگی کا حصہ تھے اور رعایا بھی انھی کے رنگوں میں رنگی ہوئی تھی۔ یہی غیر اسلامی افعال ہی بنیادی طور پر مسلم اقتدار کے زوال کا سبب بنے تھے۔ اگر ہم پاکستانی کلچر میں ان بدکاریوں و غیر اسلامی اعمال کی اجازت دے دیں کہ یہ ہند اسلامی کلچر کا حصہ تھے تو ان افعال کی ایک خالص اسلامی ریاست میں قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں مسلم حکمرانوں کا عہد اسلامی سے زیادہ شخصی تھا۔ یہ مانا کہ انھوں نے اسلامی تعلیمات کی پذیرائی بھی کی لیکن اس معاشرے یا کلچر کو خالص مسلم معاشرہ یا اسلامی ثقافت نہیں کہا جا سکتا کیونکہ خالص اسلامی ریاست میں حاکم کی بجائے خلیفہ اللہ تعالیٰ کا نائب ہوتا ہے اور وہ احکام الٰہی کی پاسداری کرتا ہے لیکن اگر ہم مغلیہ بادشاہوں کے کلچر کو اسلامی کلچر مان لیں تو گویا ہم نے اکبر بادشاہ کا دین الٰہی سمیت ان بادشاہوں کی تمام اخلاقی برائیوں کو بھی مان لیا جن کے خلاف مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ جیسے صوفیاء کرام اور علمائے دین نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں علمِ بغاوت بلند کیا تھا لہٰذا مغلیہ یا برصغیر کے مسلم حکمرانوں کی ثقافت کو پاکستانی ثقافت کے قابل تسلیم نہیں کیا جا سکتا سوائے اردو زبان اور عظیم الشان عمارتوں کے، جو کہ پاکستانی ثقافت کے لیے مثبت پہلو ہیں۔

پاکستانی تہذیب و ثقافت کے بارے میں ہمارے عظیم مفکر، شاعر اور فلسفی علامہ محمد اقبالؒ کا نظریہ ثقافت ہمارے سامنے ہے جس کی رو سے پاکستانی کلچر کو پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔ اقبال نے اپنے پورے کلام میں اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا پرچار کیا ہے۔ خاص کر ان کا پانچواں انگریزی خطبہ ''اسلامی ثقافت کی روح'' اسلامی ثقافت کو سمجھنے اور پاکستان میں اس پر عمل کرنے کے لیے سرمایہ افتخار ہے۔ پروفیسر محمد عثمان، علامہ اقبال کے انگریزی خطبات کا اردو ترجمہ ''فکر اسلامی کی تشکیل نو'' کی صورت میں پیش کرتے ہیں اور اقبال کے پانچویں خطبے ''اسلامی ثقافت کی روح'' میں اقبال کا نظریہ اسلامی ثقافت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اسلامی ثقافت پر گفتگو کا آغاز بالعموم نظریہ توحید سے ہوتا ہے اس لیے اسلامی فکر و کردار کی ساری عمارت توحید پر قائم ہے۔ قرآن حکیم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ خدا ایک ہے وہ پوری کائنات کا خالق و مالک اور رب ہے اس دنیا یا کسی اور دنیا کی کوئی شے اس کے قبضہ قدرت سے باہر نہیں۔ سب انسان ایک آدم کی اولاد ہیں اور سب خدائے واحد کی مخلوق ہیں۔۔۔ انسانوں کی اس برابری کو معاشرے میں عملاً نافذ کرنا اسلامی ثقافت کا نقطہ آغاز ہے۔ انسانوں کی مساوات کے بعد اسلامی ثقافت جس بات پر زور دیتی ہے وہ جنسی پاکیزگی

ہے۔ وہ بے حیائی اور فحش کاری کو شیطانی عمل اور بدترین فعل سمجھتی ہے اور اسلامی معاشرے کو اس سے پاک رکھنا چاہتی ہے۔۔۔ انسانی مساوات اور جنسی پاکیزگی کے ساتھ اسلامی ثقافت کی ایک اہم ترین خصوصیت اس کا عدل و انصاف پر زور ہے۔"(۲۹)

پاکستان کا قیام خالص اسلام کے نام پر ہوا تھا لہٰذا مذہبی حلقوں اور علماء کرام کے دباؤ کے تحت اسلامی اصول و عقائد کے مطابق پاکستانی قوانین و تہذیب کو ڈھالنے کی کوشش کی گئی جس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی قوانین و ضوابط اور تہذیب و ثقافت میں لچک کے کردار کو نظر انداز کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندی تہذیب کے عناصر بدستور قائم رہے۔ دیہاتوں میں خاص کر ہندی روایات کی پیروی کی جارہی ہے جبکہ شہری طبقے دو حصوں میں منقسم ہیں، ایک پیروی مغرب میں مصروفِ کار ہیں اور دوسروں پر اسلامی روایات کا غلبہ ہے۔ اس لحاظ سے ستر سال گزرنے کے باوجود پاکستان کی نہ تو کوئی ایک تہذیب بن سکی ہے اور نہ ہی مسلم علماء شرعی اصطلاحات مذہب یعنی اجتہاد سے قدیم و جدید معاشرے میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ لہٰذا مذہب کے عقائد کو صرف عبادات و رسوم تک رسائی مل سکی ہے۔ جبکہ اسلامی تہذیب کی روحِ اصل یعنی اسلامی فکر و نظر سے قدیم و جدید علوم میں تحقیق سے ہم ابھی تک بے بہرہ ہیں۔

## قومی اور ملّی شاعری کا نیا رخ:

قیام پاکستان سے پہلے قومی و ملّی شاعری کا بنیادی رخ برطانوی استعماریت سے آزادی کا حصول تھا جس میں تمام مکتب فکر اور مذاہب و تحاریک شامل تھیں آخر تمام گروہوں کی مسلسل کاوشوں سے تقسیم کا عمل پورا ہوا۔ تقسیم کے بعد لازمی امر تھا کہ قومی و ملّی شاعری کا رخ بدلا جائے جس سے عام طور پر تین فکری رویے سامنے آئے۔ پہلا فکری نظریہ ترقی پسندوں کا تھا۔ قیام پاکستان کے وقت بھی ترقی پسند تحریک زوروں پر تھی جس نے اردو ادبا و شعرا کی بیشتر تعداد کو وابستہ رکھا ہوا تھا اس تحریک کا بیانیہ حقیقت نگاری اور ادب اور اس کے موضوعات کو نچلی سطح تک پھیلا کر انسانیت کی یکسر فلاح و بہبود کا پیغام دینا تھا جس سے معاشرے اور ادیب کا زندگی سے رشتہ وسیع اور مضبوط ہو گیا۔

پاکستان اور اس کے قیام سے ہر آدمی سمیت ترقی پسندوں کو بھی اس سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں بقول طاہرہ نیر "قیام پاکستان صرف نئی سرحدوں کے تمدن ہی کا نام نہیں تھا، بلکہ ایک بہت بڑی سیاسی اور روحانی تبدیلی کا امکان بھی تھا"(۳۰) اس امکان کی بدولت ہی مسلمانوں نے اتنی بڑی قربانیوں سے یہ ملک حاصل کیا تھا لیکن جب مسائل جوں کے توں رہے اور صرف سرحد بدلنے اور حکمرانوں کی تبدیلی کے سوا کچھ نہ ہوا تو اقتصادی

اور سماجی مسائل سمیت کئی موضوعات نے جنم لیا جن میں سب سے اہم موضوع ہجرت اور اس کے دوران فسادات کا تھا۔ ڈاکٹر رشید امجد قیام پاکستان کے فوراً بعد ہجرت کے موضوع پر ادبی صورتِ حال کے حوالے سے چار پہلوؤں کا ذکر کرتے ہیں:

"اول: فسادات کا المیہ، محرومی اور انسانی جانوں کے ضیاع پر دکھ اور غم
دوئم: ہجرت کا دکھ، پرانی زمین اور آبائی گھروں کی یاد جس نے ایک نئی طرح کی تنہائی اور مایوسی کو جنم دیا۔
سوم: نئی مملکت کے بارے میں ٹوٹتے خواب کہ کچھ عرصہ بعد ہی احساس ہونے لگا کہ جس بڑے مقصد کے لیے اتنی بڑی قربانی دی گئی تھی وہ ابھی دور ہے اور لوٹ کھسوٹ ہی کا ایک نیا نظام وجود میں آگیا ہے۔
چہارم: کچھ خوش فہمیاں جن کی بنیاد پر ہجرت کے سارے عمل سے مطمئن ہونا تھا۔"(۳۱)

ترقی پسند مصنفین شاعری اور نثر دونوں میں پہلے دو پہلوؤں کے اظہار کے ساتھ تیسرے پہلو پر زیادہ فوکس کر رہے تھے۔ مزید یہ کہ سیاسی حالات کی ابتری نے غیر یقینی صورت حال کو جنم دیا۔ ترقی پسند مصنفین مذہب کے نام پر حاصل کی گئی مملکت کے خلاف اشتراکی خیالات کا پرچار کر رہے تھے۔ ان کا مقصد خالص سماجی تھا اور جھونپڑوں اور محلوں میں پیدا اتضاد پر بحث اور تنقید تھا۔ چونکہ ان کو حکومت اور اس کے طریقہ کار پر سخت اختلاف تھا لہٰذا انھوں نے حکومت کے خلاف بھی پرزور مخالفت کا اظہار کیا جس کے باعث حکومت نے کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگا دی اور شعرا و ادبا احتساب کی زد میں آگئے۔ فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی سمیت کئی شعرا کو پابند سلاسل کیا گیا جس سے ترقی پسندوں کا زور ٹوٹ گیا۔ ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء لگنے اور ۱۹۶۸ء میں چلنے والی عوامی تحریک کے دوران شعرا نے غیر اعلانیہ اپنے جذبات کا اظہار علامتوں کے استعمال سے کیا۔ بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں دوسرا مارشل لاء اور منتخب وزیر اعظم کو پھانسی لگنے سے ترقی پسند دوبارہ متحرک ہوئے اور مزاحمتی ادب کی صورت میں اظہار کیا لیکن ترقی پسند تحریک جس زور سے قیام پاکستان کے وقت متحرک تھی وہ عروج اس کو پاکستان میں کبھی نصیب نہ ہوا۔

قیام پاکستان کے بعد دوسرے فکری رویے میں وہ لوگ شامل تھے جو پاکستان کو خالص اسلامی ریاست بننے کا خواب دیکھ رہے تھے چونکہ اس وقت پورے برصغیر میں ترقی پسند تحریک چھائی ہوئی تھی اور "انقلاب زندہ باد" کے نعروں سے پوری دھرتی گونج رہی تھی۔ ترقی پسند تحریک مارکسی نظریے کی بدولت مذہب سے بالکل عاری تھی اور بقول انور سدید "اس دور میں اشتراکیت کا مطلب لادینیت اور الحاد تھا اور پاکستان چونکہ اسلامی

نظریات کی اساس پر وجود میں لایا گیا تھا؛ اس لیے اشتراکی تصورات کو اسلام کے منافی سمجھا گیا۔" (۳۲)یعنی ترقی پسند تحریک کے رد عمل اور شعر و ادب کو بے مقصدیت، الحاد اوراشتراکیت سے نجات دلا کر ایک اسلامی اور صالح معاشرے کی تشکیل و تعمیر کے لیے اسلامی ادب کی تحریک کا آغاز ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد اسعد گیلانی، ماہر القادری، نعیم صدیقی اور دیگر اسلامی نظریات رکھنے والے ادباو شعرا نے بے دینی، فحاشی اور عریانی کو نشانہ بنا کر مختلف اخبارات ورسائل میں اسلامی ادب کے نظریے کو فروغ دیا۔ اس تحریک کو بھی دوسری تحریکوں کی طرح مشکلات اور مسائل کا سامنا رہااور ترقی پسندوں کی طرف سے زبردست مخالفت کی گئی۔ چونکہ اس وقت زیادہ ادباو شعرا کی وابستگی ترقی پسندوں کے ساتھ تھی اس لیے اسلامی ادب میں نامور شعرا کی کمی رہی اور یہ کمی آخر تک نظر آتی ہے۔ دوسرا یہ کہ اس تحریک کے سامنے کوئی مثال موجود نہ تھی اور نہ ہی اس تحریک میں شامل مصنفین کے پاس کوئی تجربہ تھاسب نئے خون اور اسلامی جذبہ و ایثار کی بدولت ترقی پسند کے رد عمل میں اسلامی تعلیمات اور اسلامی ادب کا فروغ چاہتے تھے۔ وہ ادب کو غیر اسلامی فکر و فلسفہ اور لادینی عقائد و نظریات کی بجائے اسلامی نظریات وعقائد اور ادب کو اسلامی روح کے مطابق ڈھالنا چاہتے تھے۔ لہٰذا اسلامی ادب کی تحریک نے بھی بیشتر ایسے ذرائع کو استعمال کیا جن کو پہلے ترقی پسند مصنفین زیر عمل لا چکے تھے بقول انور سدید "اسلامی نظریات کے ادبی فروغ کے لیے رسائل اور اخبارات جاری کیے گئے۔ مختلف مقامات پر تحریک کی شاخیں قائم کی گئیں اور تخلیقات پر بحث و مباحثے کے لیے ہفتہ وار تنقیدی مجالس کا اہتمام کیا گیا۔" (۳۳) دوسرے لفظوں میں اسلامی کی تحریک کے فروغ میں ترقی پسند تحریک یا اس جیسی دوسری ادبی تحریکوں کی بھرپور نقل کی گئی۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلامی ادب کی تحریک میں کوئی بڑا تخلیق کار نہیں تھا۔ یہ تحریک کوئی ایسا شاعر یا ادیب پیدا نہ کر سکی جو اسلامی حدود میں رہتے ہوئے اسلامی ادب کو فروغ دے سکے۔ اگر دیکھا جائے تو اسلام شرک، جھوٹ، منافقت اور فحاشی و عریانی کے زندگی کے ان تمام معاملات کو بیان کرتا ہے جو ادب کا حصہ ہوتے ہیں، اس لیے اسلامی دائرہ میں رہ کر اسلامی ادب تخلیق کیا جاسکتا ہے بلکہ بہترین ادب تخلیق ہو سکتا ہے، لیکن یہ اسلامی ادبی تحریک کی بدقسمتی کہ لیں کہ اسے کوئی بڑا تخلیق کار یا نقاد سوائے حسن عسکری کے میسر نہ آسکا۔ محمد حسن عسکری کے خیالات و افکار میں مرور ایام کے ساتھ تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اس لئے بعض نقاد نے حسن عسکری کے اسلامی ادب کی تحریک بارے تصورات سے اختلاف کے باوجود ان کی خدمات کو سراہا ہے۔ مہر اختر وہاب محمد حسن عسکری کے ہاں اسلامی ادب کے تصور کے بارے میں لکھتے ہیں کہ محمد عسکری کے ہاں اسلام اور اسلامی ادب کا تصور 'اسلامی ادب کی تحریک' سے مختلف ہے بلکہ عسکری کو اس تحریک سے سخت اختلاف ہے۔

مگر اس کے باوجود اسلامی ادب کی تحریک کے فروغ میں محمد حسن عسکری کے چھیڑے ہوئے مباحث نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ وہ مباحث آج بھی اتنے زندہ اور توجہ طلب ہیں کہ ان سے معاصر تنقیدی تناظر میں بھی صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے جدید تعلیم یافتہ طبقے کا اسلامی اقدار و روایات پر اعتماد بحال کرنے کی کاوشیں کیں۔ جس سے وہ ۱۸۵۷ء کے بعد تقریباً محروم ہو چکا تھا۔ ان کے خیال میں اعتماد کی بحالی کی بدولت ہی ادبی تخلیقات میں اسلامی افکار و تصورات کی ترجمانی ممکن تھی"(۳۴) حسن عسکری کی تحریروں میں گہرائی اور وسعت تھی جس نے نئے افکار و خیالات کو جنم دیا اور تنقیدی حلقوں میں اسلامی ادب کے حوالے سے بحث و مذاکروں کی فضا پیدا ہو گئی

محمد حسن عسکری پہلے پاکستانی نقاد ہیں جنھوں نے قیام پاکستان کے بعد پاکستانی تہذیب و ثقافت کو جدید تقاضوں کے مطابق اسلامی تہذیب و ثقافت اپنانے پر زور دیا جس کے لئے انھوں نے پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کا نعرہ لگایا اور ترقی پسندوں کے خلاف آواز بلند کی۔ ان کے تنقیدی مضامین مارکسیت اور ادبی منصوبہ بندی، ادب اور انقلاب، ہمارا ادبی شعور اور مسلمان، انسان اور آدمی، ہیں، انھوں نے اسلامی ادب، پاکستانی ادب اور اس کے شعور اور مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی پوری کاوش کی۔ وہ تنقیدی مضمون "ہمارا ادبی شعور اور مسلمان" میں ان ترقی پسند ادیبوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ہمارے ادیبوں نے پاکستان کی نہ تو حمایت کی نہ کھل کر مخالفت ہی کی۔ اگر ادیب پوری سنجیدگی اور غور و فکر کے ساتھ پاکستان کے مطالبے کی پر زور مخالفت ہی کرتے تب بھی قوم کو فائدہ ہی پہنچتا اور مختلف مسئلوں کے بہت سے ایسے پہلو نظروں کے سامنے آ جاتے جن کا پتہ پاکستان بننے کے بعد چلا۔ اندرونی تضاد کی وجہ سے بعض مسلمان ادیب بڑی مضحکہ خیز قسم کی ذہنی الجھنوں میں پڑ گئے۔ کبھی خیال آیا کہ نہیں یہ محض ایک طبقے کی زبان ہے۔" (۳۵)

اس مضمون میں محمد حسن عسکری، برصغیر کے مسلمان ادبا کا جنگ آزادی کے بعد اسلام سے دوری کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں جس کے مطابق ترقی پسند مصنفین اور بعض تعلیم یافتہ طبقے کو اسلام اور پاکستان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن چونکہ مسلم لیگ عوام میں مقبولیت حاصل کر لینے کے بعد پاکستان کے قیام میں کامیاب ہو گئی تو اب پاکستانی ادبا سے قومی ادب اور قوم کے ساتھ سچی اور گہری وابستگی پر زور دیتے ہیں۔

حسن عسکری نے اسلامی ادب کے بارے چند رہنما اصول ضرور پیش کیے لیکن وہ اسلامی ادب کی مباحث پر کوئی مربوط نظریہ پیش نہ کر سکے۔ بہر حال ادب اسلامی کی چھیڑ سے ادبی حلقوں کی فکر و توجہ مبذول کرانے میں

کامیاب ضرور ہو گئے۔ جس کے بعد مولانا مودودی نے اسلامی فکر و نظر کے ایک مفسر کی حیثیت سے اسلامی ادبی تحریک کو علمی و فکری حیثیت سے متاثر کیا۔

اسلامی ادبی تحریک چونکہ ترقی پسند تحریک کا ردعمل تھی لہٰذا کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگنے سے اس کی بنیادیں بھی کمزور ہو گئیں اور بقول انور سدید "ترقی پسند تحریک کی طرح اسلامی ادب کی تحریک بھی بہت جلد شخصیت پرستی کا شکار ہو گئی" (۳۶) اور یہ اپنی بنیادیں مضبوط نہ رکھ سکی اور کچھ عرصے بعد یہ تحریک دم توڑ گئی البتہ اسلامی ادب اور افکار و نظریات کی روح آنے والے تخلیق کاروں کی تخلیقات میں سرایت کر چکی ہے۔ مہر اختر وہاب اسلامی ادب کی تحریک کی انفرادیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس تحریک سے وابستہ شاعروں اور ادیبوں نے امت مرحوم کا مرثیہ لکھنے اور مریضانہ ماضی پرستی کی بجائے قوم میں خود اعتمادی پیدا کی جس سے شعر و ادب میں قومی و ملّی جذبات کو فروغ حاصل ہوا" (۳۷) اور انھی جذبات کی بدولت قومی و ملّی موضوعات میں کثیر سرمایہ ادب تخلیق ہوا جس میں ملّی نغمہ نگاری کی روایت کو سب سے انفرادیت حاصل ہوئی ہے اور اردو ادب میں ایک نئی صنفِ سخن "ملّی نغمہ" کا اضافہ اسلامی ادبی تحریک کا ممنون ہے۔

تقسیم کے بعد پاکستان میں ایک تیسرا رویہ بھی ابھرا جو سب سے اہم اور قوی تھا جس کی جڑیں اس قدر مضبوط ہو گئیں کہ مخالفین کی کوشش کے باوجود اس کی ساکھ متاثر نہ ہوئی بلکہ اس کو مٹانے کی جس قدر زیادہ جدوجہد کی جاتی اس قدر یہ رویہ مزید مضبوط ہوتا چلا گیا۔ یہ رویہ دھرتی سے وابستگی اور اس کی اہمیت کا احساس تھا۔ دھرتی سے محبت کا یہ رویہ کوئی نیا نہیں تھا بلکہ اس کا سرچشمہ دور قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ دھرتی سنسکرت کا لفظ ہے اور اس کے معنی زمین کا ٹکڑا یا خطہ کے ہیں۔ عام طور پر وطن یا ملک کے معانی میں بھی پایا جاتا ہے۔ پاکستان میں دھرتی سے محبت کے اظہار سے مراد ہندو مذہب کے مطابق دھرتی کی پوجا نہیں ہے بلکہ پاکستانی دھرتی سے مراد علاقہ یا وطن کے ہیں جہاں انسان پیدا ہوتا، رہتا اور زندگی بسر کرتا ہے۔ پچھلے ابواب میں یہ وضاحت پیش کی جا چکی ہے کہ پاکستان میں علاقہ یا وطن سے محبت اسلام کے عین مطابق ہے اس محبت سے یہ قطعاً مراد نہیں کہ پاکستان کی محبت اسلام اور عالم اسلام پر غالب آ گئی بلکہ پاکستان سے محبت اسلامی اصولوں اور تعلیمات کے مطابق ایک اسلامی ریاست سے محبت ہے جو پوجا کے زمرے میں نہیں آتی۔ وہ محبت جو مدینہ یا مکہ سے آپ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ کو تھی اور مدینہ کی حفاظت اسلام کی حفاظت تھی۔ اسی طرح پاکستان سے محبت اور اس کا تحفظ اسلامی اصولوں کے عین مطابق ہے۔ قیام پاکستان کے بعد اس تحریک نے حلقہ ارباب ذوق سے روشنی حاصل کی کیونکہ بقول رشید امجد "حلقہ ارباب ذوق باقاعدہ تحریک نہ تھی لیکن ایک رجحان اور رویے کے طور پر اس کے اثرات

بھی گہرے ہیں۔"(۳۸) دھرتی سے محبت کی اس تحریک نے ترقی پسند تحریک سے حقیقت پسندی، ادبی اسلامی تحریک سے مذہبی آدرش حاصل کیا۔ اس تحریک کے محرک ڈاکٹر وزیر آغا تھے۔ اس تحریک نے اس وقت مزید تقویت حاصل کر لی جب پاکستان کا بھارت سے ٹاکرا ہوا۔ خاص کر ۱۹۶۵ کی جنگ کے بعد دھرتی کی اہمیت اور قدر و قیمت میں اضافہ ہوا اور اس تحریک کو مضبوطی اور پائیداری حاصل ہوئی۔ اگر کچھ مذہبی عصبیت پسند حلقوں کی طرف سے دھرتی کی پوجا کہ کر رد کرنے کی کوشش بھی کی گئی تو پاکستان اور بھارت کی جنگوں نے اس تحریک کے روحانی اور ارضی تصور کو جلا بخشی اور جنگ کے بعد اس کی وابستگی میں شدت سے اضافہ ہوا۔ جس کے بعد یہ تحریک دھرتی کے شعرا اور ادبا سے نکل کر پوری قوم کی رگوں میں سرائیت کر گئی۔ بقول انور سدید "ارضی ثقافتی تحریک نے صرف نظریاتی اساس ہی مرتب نہیں کی بلکہ اس کے نقوش کئی ادبا کی تخلیقات میں بھی جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ تنقید میں ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب "اردو شاعری کا مزاج" اس تحریک کی نظریاتی بوطیقا ہے۔"(۳۹)

اس تحریک کا تخلیقی اظہار نثر میں عام طور پر اور شاعری میں خاص طور پر ہوا ہے۔ اس تحریک نے اپنے اندر اس قدر موضوعات سمیٹ لیے ہیں گویا دھرتی اور اس پر بسنے والے افراد کی فکری، سماجی اور معاشرتی سوچ کی آئینہ دار بن چکی ہے۔ اس تحریک کی دھرتی سے محبت، مذہبی آدرش اور بین الاقوامی ہم آہنگی ایسے عناصر ہیں کہ بعض اوقات تخلیق کے دیگر پہلو اس کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں۔ اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اس سے معاشرے میں قنوطیت اور احساس محرومی کی بجائے رجائیت اور امید و یاس پیدا ہوئے ہیں یعنی قیام پاکستان کے بعد ترقی پسند تحریک کے مصنفین کی طرف سے پیدا ہونے والی مایوسی کے اثر کو زائل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کی بجائے نئے راستے، سمتیں اور مستقبل کے لیے کچھ کر گزرنے کا حوصلہ پیدا کیا ہے۔

اس ساری بحث کا ماحصل یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے اسلامیان کے لیے سب سے پہلے الگ وطن اور ملک کا وجود ضروری تھا تو اس دوران ہونے والی قومی و ملّی شاعری کا رخ استعماریت سے آزادی اور مستقبل میں ہندوؤں کی غلامی سے محفوظ رہنے اور اپنا قومی تشخص برقرار رکھنے کے لیے ایک علیحدہ سلطنت کے قیام کی طرف تھا۔ جب آزادی بھی مل گئی اور علیحدہ سلطنت کا قیام عمل میں آ گیا تو یہ وقت ان وعدوں، ان اصولوں اور ان قسموں کو پورا کرنے کا تھا جو ہمارے مشاہیر نے آزادی سے پہلے کیے تھے۔ اس دوران ہونے والی قومی و ملّی شاعری نے بھی رخ بدلا اور وطن کو مضبوط، قوی اور عظیم تر بنانے کے لیے اپنی نئی راہیں متعین کیں۔ جو سلطنت حاصل ہوئی تھی اس کے تحفظ اور بہتر مستقبل کی ذمہ داری اردو قومی و ملّی شاعری کے موضوعات نے لے لی۔

قیام پاکستان کے ابتدائی چند سالوں تک ہجرت اور فسادات کا موضوع غالب رہا لیکن جلد ہی وقت نے قوم کے زخم مندمل کر دیے یا انسان نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا اور حالات کا رونا دھونا کرنے کے بجائے بہتر سے بہترین مستقبل اور خدا کی دی ہوئی آزادی اور سلطنت کی قدر و اہمیت و تحفظ کی طرف رخ مڑ گیا۔ مزید یہ کہ پہلے غیروں کے ظلم و ستم تھے جو برداشت کر لیے جاتے تھے اب اغیار کے بجائے اپنوں کے کرم آزمانے کا دور تھا۔

## حصول آزادی کے بعد حفظِ آزادی:

مسلمانانِ برصغیر نے صدیوں خون پانی ایک کر کے آزادی حاصل کر تو لی لیکن یہ آزادی منکرانِ اسلام کو کیسے ہضم ہو سکتی تھی۔ لہٰذا ہندوستان نے روز اول سے پاکستان کو دل سے قبول نہ کیا مزید ظلم یہ ہوا کہ برطانوی استعمار جس نے تقریباً سو سال بلا شرکت غیرے تعداد میں نہایت کم ہونے کے باوجود جس انداز و اطوار سے حکومت کی تھی اس کا زہر یہاں سے رخصت ہوتے ہوئے دو آزاد خود مختار ریاستوں میں گھول گیا۔ جس کا مقصد سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ دو ریاستیں ہمیشہ آپس میں لڑتی رہیں اور سامراج کی بالادستی ہزاروں میل دور ہونے کے باوجود قائم رہے۔ ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی جاتے ہوئے بھی اپنا کر دونوں ممالک کو مستقل جنگ میں جھونک کر برطانیہ نے حقیقی معنوں میں سامراجیت کا ثبوت پیش کیا۔ دوران تقسیم ریڈ کلف ایوارڈ میں صریحاً ناانصافی، املاک اور حد بندی میں جان بوجھ کر عجلت اور چھوٹی چھوٹی مقامی ریاستوں کے مسائل یوں ادھورے چھوڑ کر جانے سے دونوں ممالک میں اختلاف کے ایسے بیج بوئے گئے جس کے کڑوے پھل تقسیم سے لے کر آج تک ہم کئی بار نگل چکے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے۔ اس کے علاوہ کشمیر کا مسئلہ دونوں ممالک کے لیے گلے کی ایسی پھنسی ہڈی ہے جو نہ تو کسی کو ہضم ہو رہی ہے اور نہ ہی گلے سے باہر آ رہی ہے جس کے نتیجے میں لاکھوں کشمیری عوام بھی جان سے ہاتھ دھو چکے ہیں لیکن اس کا مسئلہ نہ صرف انڈیا بلکہ عالمی دنیا (کفران اسلام) بھی حل کرنے میں مخلص نہیں ہیں۔ کشمیر جہاں پاکستان کی شہ رگ ہے وہیں انڈیا نے اسے اپنا اٹوٹ انگ قرار دے کر کشمیری عوام کی مرضی کے خلاف تسلط قائم رکھا ہوا ہے۔ کشمیری عوام ستر سالوں سے بھارتی فوج کا ظلم و تسلط سہنے کے باوجود اس کی آزادی کے لیے کوشاں ہیں اور اس مسئلے کو حل کرنے میں اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل بھی لیت و لعل سے کام لے رہے ہیں۔

حیدر آباد دکن جیسی کئی چھوٹی ریاستوں نے آزادی کے وقت پاکستان سے الحاق کیا تھا لیکن آزادی کے کچھ عرصہ بعد انڈیا نے ان ریاستوں کی آزادی کا مذاق اڑاتے ہوئے اپنی فوجیں ان ریاستوں پر چڑھا کر ناجائز قبضہ کر لیا۔ ایسا ہی قبضہ کشمیر میں ہوا تھا جس کا کچھ علاقہ کشمیری مجاہدین آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئے لیکن اس کا زیادہ

حصہ ابھی تک ہندوستان کے قبضے میں ہے اور کشمیری اپنے خون کی ندیاں بہا کر جنت نظیر کشمیر کی آزادی کے لیے کوشاں ہیں۔

ہندوستان نے تقسیم کے وقت وقتی طور پر آزادی کی خاطر پاکستان کے معاملے میں خاموشی اختیار کر لی بلکہ اس کا خونی انتقام ہجرت کرنے والے عام مسلمانوں سے لیا لیکن جب مہاجرین کے خون کی ہولی کھیلنے کے بعد بھی اس کے دل میں لگی پاکستان کی آزادی کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی تو اس نے نہ صرف پاکستان سے الحاق شدہ چھوٹی مسلم ریاستوں جیسا کہ حیدر آباد، جونا گڑھ اور کشمیر پر ناجائز قبضہ کر لیا بلکہ پاکستان پر بھی قبضہ کا خواب دیکھنے لگا جس سے پاکستان کو آزادی کے فوراً بعد تحفظ آزادی کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ بھارت نے پاکستان پر قبضہ کے عملّی ثبوت کے طور پر کئی دفعہ حملہ بھی کیا اور جنگیں بھی ہوئیں، جب وہ ان جنگوں میں کامیاب نہ ہو سکا تو پاکستان کو توڑنے کی سازش کی جو بالآخر کامیاب ہو گئی اور پاکستان بنگلہ دیش اور پاکستان کی صورت میں دو مسلم ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔

اس بحث کا ماحاصل یہ ہے کہ پاکستانی عوام صدیوں کی مشقت سے برطانوی سامراج سے تو آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن آزادی کے ساتھ حفظ آزادی کے جو خطرات لاحق ہو گئے اس نے شعر و ادب کو ایک نیا رخ عطا کیا۔ تحفظ آزادی میں نہ صرف بھارت سے حملہ کا خطرہ تھا بلکہ معاشی استحکام، بین الاقوامی تقاضے اور داخلی مسائل نے تحفظ آزادی کے مسائل میں اضافہ کیا۔ لہٰذا اردو شعرا کے سامنے سیاسی عدم استحکام اور ذہنی محکومی کے ساتھ حفظ آزادی نے موضوعات کی ایک نئی گرہ کھول دی۔

## مِلّی نغمہ کا آغاز و ارتقا:

جنگ آزادی سے پہلے برصغیر پاک و ہند میں جزوی یا مکمل طور پر مسلمان حکمران رہے۔ مسلمان بادشاہوں کا طرز حکمرانی چونکہ اسلامی سے زیادہ شخصی تھا لیکن اس کے باوجود ان کا تشخص مسلمان تھا اس لیے مسلم حکمرانی کی وجہ سے ان کی قومی شاعری بھی مِلّی شاعری کے زمرے میں آتی تھی کیونکہ اسلام اور مسلم ریاست میں ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ اس دور کی شاعری میں چند مخصوص مواقع کے علاوہ مِلّی شاعری کا اظہار کم پایا جاتا ہے۔ مِلّی شاعری کا باقاعدہ آغاز اس وقت ہوتا ہے جب اسلام اور مسلمان کی آزادی کو خطرہ لاحق ہونا شروع ہوا۔ جس کا آغاز تحریک سید احمد بریلوی شہید سے متاثر ہو کر اردو کے نامور شاعر مومن خان مومن نے "مثنوی جہادیہ" لکھ کر کیا جس کا ذکر پچھلے باب میں کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا اردو زبان و ادب میں مِلّی شاعری کے باقاعدہ اولین شاعر مومن خان مومن کہلائے جا سکتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر پاک وہند غیر مسلم کے تسلط میں چلا گیا تھا تو قومی شاعری ملّی شاعری نہ رہی البتہ مسلمانان برصغیر کے شعرا میں ملّی جذبات پائے جاتے ہیں جس کا آغاز حالی کی "مسدس حالی" سے ہوا کیونکہ اس کا تعلق بالواسطہ اسلام یا مسلمانوں سے تھا۔ قومی شاعری جس کا تعلق حب الوطنی سے تھا اور جو برطانوی غلامی سے آزادی کی خاطر لکھی گئی اور جس میں مسلم و غیر مسلم تمام ابنائے وطن شامل تھے، کو صرف قومی شاعری کے زمرے میں ہی تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اس میں وہ تمام شعرا اور شاعری شامل ہے جس کا تعلق صرف ہندوستانی قومیت سے تھا اور اسلام کے ساتھ کوئی وابستگی نہیں تھی۔ چاہے مسلمان شعرا ہوں یا ہندو یا کوئی بھی مذہب یا ملحد ہوں۔ ان کا کلام قومی ہی متصور ہو گا۔ جیسے اقبال کی نظم:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا (ترانہ ہندی، بانگِ درا)

کو صرف قومی نظم یا قومی شاعری کہیں گے لیکن اگر ہندوستان پر مسلم حکمران یا اسلامی حکومت ہوتی اور اس اسلامی حکومت کی باقی مسلم دنیا کے ساتھ ہم آہنگی ہوتی تو قومی جذبہ کے تحت لکھے گئے نغمے بھی ملّی نغموں میں شمار ہوتے۔ البتہ وہ تمام شاعری جو ایک مذہبی ریاست کی آزادی کی خاطر لکھی گئی اور جس کا تعلق مذہب سے ہے اس کو ملّی شاعری کہا جا سکتا ہے۔ یعنی حصول پاکستان کی خاطر مسلم شعرا کی وہ شاعری جس کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ ایک مسلم قوم، ملک و ریاست کی آزادی یا تحریک آزادی سے تھا، اس کو بھی ملّی شاعری کہا جا سکتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد پاکستان کی دیگر اسلامی ممالک کے ساتھ ہم آہنگی سے پاکستانی قومی شاعری کو ملّی شاعری یا ملّی نغمہ نگاری میں شمار کیا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں ملّی نغمہ نگاری کی روایت تو قدیم ہے لیکن اس کا باقاعدہ آغاز قیام پاکستان سے ہوتا ہے۔

## (ج) اہم موضوعات

قیام پاکستان کے بعد اردو شاعری میں جو رویہ سب سے غالب رہا وہ پاکستان سے محبت و عقیدت کا رویہ تھا۔ اس رویے کے زیر اثر اردو شعرا نے پاکستان کی تعمیر نو میں حصہ لے کر اسے پوری اسلامی دنیا کے لیے مینارِ نور بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ تحریک پاکستان سے تکمیل پاکستان تک متنوع موضوعات ایسے ہیں جو اردو ملّی نغموں کا حصہ بنے۔ ان موضوعات میں ہجرت، ہجرت کے نتیجے میں فسادات، سیاسی عدم استحکام، مارشل لاء، پاک بھارت جنگیں، شہدائے وطن، قومی و ملّی رہنماؤں پر لکھے گئے شعر پارے، تعمیر پاکستان، مناظر پاکستان، پاکستانی شہروں

سے محبت کا اظہار، مذہبی روایات، اخلاقی روایات اور حفظ آزادی جیسے متعدد موضوعات پر شعرائے پاکستان نے قلم آزمائی کی۔ اس کے علاوہ ملت اسلامیہ کا ایک اہم کارکن ہونے کی وجہ سے عالمی دنیا میں اسلام کی بالادستی کا شعری اظہار اردو ملّی نغموں میں بکثرت پایا جاتا ہے اور اسلامی دنیا جن میں بوسنیا، چیچنیا، افغانستان، فلسطین، عراق، شام اور کشمیر جیسے مسلم اکثریتی علاقوں میں منکرانِ اسلام کی طرف ہونے والے جبر واستبداد کے خلاف آواز کو بلند کرنا، اردو شعرا کی اسلام اور ملت اسلامیہ سے وابستگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس سے ان عناصر کی حوصلہ شکنی بھی ہوتی ہے جو پاکستان کو ایک سیکولر ریاست بنانے کے لیے پر تول رہے ہیں لیکن پاکستان ایک خالص اسلامی ریاست ہے اور یہ عالم اسلام کے ساتھ مکمل ہم آہنگ ہے۔ اس لئے اس کو سیکولر بنانے والوں کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو گا۔

اردو شاعری میں ہونے والی ملّی نغمہ نگاری کے تمام موضوعات کو بہ تفصیل ایک مقالہ میں سمیٹنا نہ صرف دشوار ہے بلکہ مقالہ کی حدود و وسعت کے بھی خلاف ہے۔ اس لیے اس مقالہ میں ملّی نغمہ نگاری کے چند اہم موضوعات کو شامل کر کے ملّی نغمہ نگاری کی روایت کو اجاگر کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔

اردو ملّی نغمہ کی روایت میں قومی و ملّی رہنماؤں پر لکھے گئے شعر پارے ایک ایسا موضوع ہے جو قیام پاکستان کے دوران اور بعد بڑی تعداد میں شعرائے اردو کے قلم کا حصہ بنے اس لیے ملّی نغمہ نگاری کے موضوعات میں قومی ملّی رہنماؤں پر لکھے گئے ملّی و قومی نغمات سے اس روایت کا آغاز کیا جاتا ہے۔

## قومی / ملّی رہنماؤں پر لکھے گئے شعر پارے:

قومی و ملّی رہنما اردو ملّی نغمہ نگاری کی روایت میں ایک ایسا موضوع ہے جس کا دائرہ قدرے وسیع اور قدیم ہے۔ قیام پاکستان کے بعد اس روایت میں مزید اضافہ دیکھنے کو ملا کیونکہ قومی و ملّی رہنماؤں کے کارناموں کا اعتراف کرنے کے ساتھ ان کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا بہترین اظہار شعری وسیلۂ اظہار ہے لہٰذا پاکستان کے قومی و ملّی ہیرو، شہداء، اور نامور سیاسی و عسکری رہنما اس روایت کا موضوع بنتے آرہے ہیں۔ ملّی نغمہ نگاری کی اس روایت میں قیام پاکستان سے پہلے اور بعد سے حضرت محمد ﷺ کی ذات مبارکہ سے لے کر صحابہ کرامؓ، خلفائے راشدین، اہل بیت اجمعین، مسلم فاتحین، مسلم حکمران، جرنیل، مسلم سائنسدان، علمائے کرام اور کئی دیگر اسلامی مذہبی وسیاسی شخصیات بھی شامل ہیں۔

حضرت محمد ﷺ کی ذات مبارکہ پوری دنیا کے سب سے بڑے مدبر، جرنیل، رہنما اور معلم ہیں اور مسلمانوں کی یہ خوش نصیبی ہے کہ وہ آپؐ کے امتی اور پیروکار ہیں۔ پاکستان کے قیام کا مقصد دین اسلام کی ترقی و

ترویج ہے تو حضور ﷺ دونوں جہانوں کے لیے مشعل راہ بن کر تشریف لائے۔ آپؐ کی ذات مبارکہ کا فیض کسی خاص قوم یا فرد کے لیے مخصوص نہیں تھا۔ آپؐ کا درجہ عالم کل کے رہنما کا ہے اس ضمن میں کوئی آپؐ کا ہمسر نہیں۔ جو لوگ آپ پر ایمان لائے وہ مسلمان کہلائے اور پاکستان کی اساس ہی لا الہ الا اللہ ہے اور اس کے سرکردہ رہنماؤں (پاکستان بنانے والوں) نے آپؐ کی تعلیمات سے ہی روشنی حاصل کی تھی تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپؐ کی ذات مبارکہ ہی پاکستانی راہنماؤں کے لیے سرچشمۂ نور ہے اور حضرت محمد ﷺ ہی مسلمانوں کے رہنماے اولیٰ ہیں۔ اس کے بعد صحابہ کرام، اہلِ بیت اور وہ صالحین جن کے ذریعے سے دین اسلام ہم تک پہنچا اور مشاہیر پاکستان سمیت کئی اسلامی، مذہبی، سیاسی و عسکری شخصیات کو پاکستان کے قومی و ملّی رہنماؤں میں بالترتیب شمار کیا جاتا ہے۔ اردو ملّی نغمہ نگاری کی روایت میں ان تمام ہستیوں پر شعر پارے تخلیق ہوئے ہیں اس لئے ان کا ذکر کرنا لازمی ہے۔

اسلام کے اولین رہنما نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پوری دنیا کے انسانوں کی رہنمائی اور فلاح کے لئے رحمت العالمین بنا کر بھیجا گیا۔ آپؐ لاثانی صفات اور خصوصیات کے حامل ہیں جن کی گواہی دشمنانِ اسلام نے بھی دی ہے۔ آپؐ کی شان مبارک میں شعر کہنے کی روایت دورِ اسلام کے اول ایام سے جاری ہے اور دنیا کی ہر زبان و علاقہ میں آپ سے عقیدت و محبت کا شعری اظہار پایا جاتا ہے حتیٰ کہ غیر مسلموں نے بھی آپؐ کی شان مبارکہ میں شعر کہے ہیں۔ برصغیر میں اردو کی ابتدا سے اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ اردو کے بیشتر قدیم شعرا اپنی کسی بھی شعری تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی بڑائی کے بعد آپؐ کی تعریف کرنا لازم سمجھتے تھے۔ خاص کر اردو قصیدوں میں یہ روایت عام تھی۔ قیام پاکستان کے بعد بادشاہی نظام کے خاتمہ سے قصیدوں کی روایت میں بھی کمی آگئی لیکن آپؐ کی شان بیان کرنے میں کسی دور میں کمی نہیں آئی اور اب بھی ایسے شعرا کی کوئی کمی نہیں جن کا موضوع صرف حضرت محمد ﷺ کی ذات مبارکہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر زبان کی طرح اردو زبان میں بھی کثیر سرمایہ شعر آپؐ کی شان میں لکھا گیا ہے۔

حضور پاک ﷺ کی ذات مبارکہ تمام انسانوں میں ہر لحاظ سے افضل اور منفرد ترین ہے جن کا کوئی ثانی نہیں۔ آپؐ کو دنیا کے سب سے بڑے اور بلند تر و عظیم رہبر و رہنما کا اقرار کرتے ہوئے اقبال صلاح الدین اپنی نظم میں فرماتے ہیں:

دلرباؤں میں ہے تیری دلربائی بھی جدا
وصل بھی تیرا جدا، تیری جدائی بھی جدا

راہ تیری جنتی جلوؤں سے ہے آراستہ

رہروی تیری جدا ہے ، رہنمائی بھی جدا

دلنوازی میں جناب مصطفیٰؐ سب سے الگ

جاں نثاری میں ہے ان کا ہر فدائی بھی جدا

(دلرباؤں میں ہے تیری دلربائی بھی جدا، پاکستانی ادب)

حضرت امیر حمزہؓ آپ ﷺ کے رشتہ میں چچا تھے لیکن ہم عمر ہونے کی وجہ سے آپؐ کے بہت قریب تھے۔ غزوہ احد میں جہاں مسلمان کافی تعداد میں شہید ہوئے ان میں حضرت امیر حمزہؓ بھی شامل تھے۔ ان کی شہادت پر آپؐ بہت رنج و غمزدہ ہوئے تھے۔ ان کی شجاعت و بہادری کے قصے آج بھی اردو ملّی نغموں کا اہم موضوع ہیں۔ حفیظ تائب کے کلام سے اقتباس ہے:

اے نبیؐ کے اسد، اے خدا کے اسد

تیرے عزّ و شرف کی نہیں کوئی حد

تو کہ میرے پیمبر کا محبوب ہے

تیرے قربان ہوں میرے روح و جسد (حضرت امیر حمزہؓ، تعبیر)

حضرت علی، شیر یزداں، فاتح خیبر، داماد مصطفی ﷺ اور مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ کی ذات مبارکہ مجاہدینِ اسلام کے لیے بہادری و دلیری کی ایک علامت سمجھی جاتی ہے اور مسلم سپہ سالار اپنی افواج کا حوصلہ بڑھانے کے لیے میدان جنگ میں نعرہ تکبیر اور رسالت کے ساتھ نعرہ حیدری کو شامل کر کے دین اسلام سے محبت و عقیدت کے ساتھ عظمتِ علیؓ بیان کر کے عساکر کا جوش بڑھاتے ہیں۔ اس لیے اردو ملّی نغموں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو آپؐ کے بعد خاص اہمیت حاصل ہے اور پاکستانی افواج کے لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شخصیت، عظمت و بہادری اور شجاعت کا سب سے بڑا مظہر ہے جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستان کا سب سے بڑا فوجی اعزاز "نشانِ حیدر" حضرت علیؓ کی شجاعت و بہادری سے منسوب ہے۔ اردو شاعری میں حضرت علیؓ کی شجاعت کے نغمے، ملّی نغمہ نگاری کی روایت میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔

واصف علی واصف کی نظم "شیر یزداں" سے انتخاب:

علیؑ مولائے رندانِ جہاں ہے

علیؑ نورِ ھدیٰ کا رازداں ہے

علیؑ شیدا محمد مصطفی کا
علیؑ گویا مکینِ لا مکاں ہے!
علیؑ کی ضرب ہے ضرب الٰہی
علیؑ کا نام نصرت کا نشاں ہے (شیر یزداں، شبِ چراغ)

حضرت عمر فاروقؓ کی شجاعت و دلیری سے اہل کفر کانپ اٹھتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی وفات کے بعد مسلمانوں کے خلیفہ بنے تو اسلامی مملکت کی فوجیں فتح مبین کے ساتھ دنیا کے بیشتر علاقوں میں پھیل گئیں۔ شام، عراق، ایران جیسے طاقتور ممالک کو فتح کرنے کا شرف آپؓ کے دور میں اسلامی افواج کو حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ حضرت عمر فاروقؓ نے فوج کو باقاعدہ ایک ادارہ کی شکل دی اور پولیس کا نظام متعارف کروایا۔ حضرت عمرؓ کی اسلام کے لیے بیش بہا خدمات ہیں جن کا اعتراف آج بھی کیا جاتا ہے۔ فاروقِ اعظمؓ اسلامی تاریخ میں متحرک ترین کردار ہیں اور ان کی شخصیت سے اسلام کو بہت ترقی ملی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شعرا حضرت عمر فاروقؓ کی ذات کو ملّی نغموں کا ناگزیر موضوع خیال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کے کلام سے اقتباس ہے:

فاروقؓ، کائنات دہر میں مراد رسول تھے
پھیلی ہوئی خزاؤں میں وہ مثل پھول تھے
سینہ سپر وہ ہو گئے باطل کے سامنے
کفار ان کے سامنے پاؤں کی دھول تھے
حد نگاہ پھیل گئی ان کی سلطنت
میدان کارزار میں حق کا نزول تھے (حضرت عمر فاروقؓ، ارمغانِ وطن)

حضرت امام حسینؓ نواسہ رسول، گوشہ بتولؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے جگر کے ٹکڑے تھے۔ اسلامی تاریخ میں آپؓ کی شہادت یعنی واقعہ کربلا ایک ایسا سیاہ دھبہ ہے جس کو کوئی بھی مٹا نہیں سکا۔ واقعہ کربلا اس وقت پیش آیا تھا جب اسلامی اقتدار خلفائے راشدین کے ہاتھوں سے نکل کر حاکمیت کے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔ حضرت امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد ان کے جانشین اور بیٹے یزید نے اقتدار سنبھالا تو حضرت امام حسینؓ نے اس کے خلاف علم جہاد بلند کیا کیونکہ یزید کی شخصیت اور اعمال و احکام اسلامی شریعت کے خلاف تھے۔ حضرت امام حسینؓ نے بہتّر (۷۲) ساتھیوں سمیت جان کا نذرانہ پیش کر کے باطل کے سامنے جھکنے کے بجائے حق پر قائم رہنے اور جہاد کرنے کی ایسی روایت قائم کی جو پوری دنیا میں بے مثال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقیدت مند شانِ حسینؓ اور واقعہ کربلا سے آج تک شعری و نثری سرمایہ میں مسلسل اضافہ کرتے آ رہے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد بھی

شعرائے اردو نے عظمت حسینؓ میں کئی ملّی نغمے لکھے ہیں جو اہل بیت سے عقیدت کا اظہار اور ملّی نغمہ نگاری کی روایت میں گراں قدر اضافہ ہیں۔

رہِ وفا پہ وہ ان مٹ نشان چھوڑ گیا
محبتوں کے سفر میں ، یہ عظمتیں ہیں قلیل
تھی کیسی پیاس کہ جذبوں کو دے رہی ہے نمو
وہ صبر کیا تھا ، اب تک ہے روشنی کی دلیل
عطا ہو کاش ہمیں بھی حسینؓ کے صدقے
وہ حوصلے کہ فقط ہیں عطائے رب جلیل (غم حسینؓ، ارمغانِ وطن)

قیام پاکستان کے سلسلے میں بات کریں تو مسلمانانِ برصغیر کو یہ خوش بختی حاصل ہوئی کہ ان کو حضور اکرم ﷺ کے امتی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ آپ ﷺ کے امتی اور عاشق علامہ محمد اقبالؒ نے مغرب کے مادی فلسفہ کو لگام دی اور بیسویں اور اکیسویں صدی کے مسلم ترجمان کہلائے۔ علامہ اقبال نے خطبہ الٰہ آباد میں نظریہ پاکستان پیش کر کے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے جس سلطنت کی بنیاد رکھی، قائد اعظم نے اسی نظریہ کو شب و روز محنت سے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اقبال اور اقبال کی شخصیت کو انسانی اور خاص کر امت مسلمہ کے لیے پر خلوص خدمات کے عوض ان کی زندگی میں ہی شعر و نثر میں خراج عقیدت پیش کرنے کا سلسلہ چل نکلا تھا اور ان کی وفات کے بعد اس روایت میں تیزی آئی۔ قیام پاکستان کے بعد اقبال پاکستان کے قومی شاعر کہلائے اور قومی و ملّی نغمہ نگاری میں قیام پاکستان کے بعد بھی اقبال کی شخصیت اور ان کا کلام عالمی دنیا اور مسلمانوں کے لیے سرمایہ افتخار ثابت ہوا۔ اقبال کو خراج عقیدت پیش کرنے والے اشعار و نظموں کو ڈاکٹر راشد جمیل نے اقبال کی سو سالہ یوم پیدائش کے موقع پر مرتب کر کے اکادمی ادبیات اسلام آباد سے شائع کیا جو قومی و ملّی نغمہ نگاری کی روایت میں اہم اضافہ ہے۔ اقبال کو خراج عقیدت کے اس شعری سرمائے کو "جاوداں اقبال" کا نام دیا گیا ہے۔ جاوداں اقبال کے مرتب ڈاکٹر راشد حمید اقبال کو خراج عقیدت پیش کرنے والوں کے بارے لکھتے ہیں:

"شاعر مشرق کی زندگی میں ہی انھیں مختلف شعبہ ہائے حیات سے متعلق افراد نے اپنے اپنے انداز میں خراج تحسین پیش کیا اور رحلت کے بعد تو جیسے خراج عقیدت پیش کرنے والوں کا کوئی شمار ہی نہ رہا۔ اس باب میں اہل قلم بھی کسی سے پیچھے نہ رہے اور درحقیقت یہ انھیں کا میدان تھا۔ اہل قلم میں سے بھی شاعروں نے اپنے قبیلے کے

سرخیل کی خدمت میں عقیدت کے جو پھول نچھاور کیے، یقیناً تاریخ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔"(۴۰)

بلاشبہ اقبال کا فلسفہ اور کلام ارتقائی عمل سے گزرنے کے ساتھ بہتر سے بہترین کی طرف گامزن رہا جس نے نہ صرف عام آدمی بلکہ خواص کے دل بھی موہ لیے، جن میں وہ شعرا بھی شامل ہیں جن کی وجہ شہرت ہی طنز و مزاح کے نشتر ہیں لیکن کلام اقبال سے متاثر ہو کر وہ بھی شاعرانہ داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ مراد اکبر الٰہ آبادی سے ہے جنھوں نے ۱۹۱۲ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں پڑھی جانے والی اقبال کی مشہور نظم "شمع اور شاعر" کے بارے "زمیندار" رسالہ میں تعریفی کلمات دیکھ کر اور نظم کے چند بند پڑھ کر ایک تعریفی رباعی پیش کی۔(۴۱) اقتباس ہے:

اس نظم کا نقطہ نقطہ ہے منبع نور
ہر حرف سے ہے تجلی حق کا ظہور
اوج ملکوت کا ہے عالم ہر لفظ
ہر بیت اقبال کی ہے بیت المعمور (دادِ کلام اقبال، جاوداں اقبال)

اقبال کی زندگی میں انقلاب اس وقت برپا ہوا تھا جب وہ یورپ میں دوران تعلیم وہاں کی ظاہری چمک دمک سے مرعوب ہونے کے بجائے اس چمک کی اصلیت کو پہنچ گئے اور وطن آ کر یورپی مصنوعی خوشی کا اپنے کلام میں واضح لفظوں میں اظہار کیا۔ اقبال نے مسلم قوم کو سائنسی تمدن کی ظاہری ترقی سے مرعوب ہو کر احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی بجائے خودی کی عظمت سے واقفیت عطا کی۔ کیونکہ اقبال کی نظر میں انفرادی زندگی کا تسلسل خودی کو مستحکم کرنے پر منحصر ہے اور غیر سے سوال کرنے یا اس کے دست نگر ہونے سے خودی کمزور ہوتی ہے اور خود دار انسان کو کسی کا احسان نہیں اٹھانا چاہیے۔ عشق الٰہی اور محبت رسول سے خودی مضبوط ہوتی ہے، جبکہ نفی خودی مغلوب اور مفتوح قوموں کی ایجادات ہیں تاکہ غالب اور فاتح قومیں بھی ان کے ساتھ کمزور ہو جائیں حالانکہ زندگی مسلسل جستجو اور تلاش کا نام ہے اور انسانی خودی سے کائنات کی ظاہری اور مخفی قوتوں کو مسخر کرنا مقصود ہے۔ نفی خودی دراصل خود کو مٹانے اور شکست تسلیم کر لینے کا نام ہے جس کی اقبال سختی سے ممانعت کرتے ہیں۔

اقبال کے تصورِ خودی کی نہ صرف برصغیر پاک و ہند میں پذیرائی ہوئی بلکہ عالمی دنیا اور خاص کر یورپ میں اس کے کئی تراجم ہوئے اور اقبال کو بین الاقوامی سطح پر سراہا جانے لگا۔ جس کی بدولت اقبال کو خراج عقیدت پیش کرنے کا جو سلسلہ چل نکلا وہ ابھی تک قائم ہے۔ قمر یزدانی اقبال کے فلسفہ خودی پر خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

قوم کے اقبال ! تو ہے فلسفہ دانِ خودی
ہے تیرے دم سے بہاروں پر گلستان خودی
جرأت بے باک ، ضبط نفس اور نگہ بلند
تیری تعلیمات ہیں تزئین ایوانِ خودی
گونجتے ہیں محفلوں میں آج بھی نغمے ترے
ہے گلستان سخن میں تو غزل خوانِ خودی (نذرِ اقبالؒ، زندہ و پائندہ باد)

تصورِ پاکستان کے بانی علامہ محمد اقبال نے جس انداز اور طریقے سے علیحدہ وطن کی آواز بلند کی اور قائد اعظم کو قائل کرنے میں کامیاب ہوئے، یہ ان کا مسلمانانِ برصغیر پر بہت بڑا احسان ہے جو پاکستان کے قائم و دائم رہنے تک پوری قوم کے لیے رہے گا۔ اقبال خود تو پاکستان بننے تک زندہ نہ رہ سکے لیکن پاکستانی قوم اقبال کی بہت بڑی قدر دان ہے۔ اکرم باجوہ کے الفاظ میں:

ہے تیرے خواب کی تعبیر ارض پاکستان
غریب قوم پہ ہے لطف جاودانہ ترا
تو مرد دانا و عارف تو مومن کامل
دل و نظر ، لب و لہجہ پیمبرانہ ترا

(نذرِ اقبال، تکبیر کا رنگ للکار ہوا)

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ کو اقبال اس دنیا فانی سے کوچ کر گئے تو پوری امت مسلمہ غم سے نڈھال ہو گئی۔ اقبال کی وفات کی خبر سے لوگ سرکاری دفاتر اور کاروباری مراکز بند کر کے اقبال کی آخری زیارت کرنے کو بھاگے آئے۔ اقبال کی زیارت کو آئے ہوئے ہر طبقہ زندگی سے متعلق کے لوگوں ساتھ شعرا بھی شامل تھے جنھوں نے اقبال کی وفات کے وقت اپنے تاثرات قلم بند کیئے۔ اکبر لاہوری اقبال کی وفات کے تاثرات کو وقتِ وفاتِ اقبال پر لکھے گئے پہلے مرثیہ میں فرماتے ہیں:

آج وہ مردِ خوش بیاں چپ ہے
جس کی چپ سے بس اک جہاں چپ ہے
لالہ و گل کا ترجماں نہ رہا
سخت صدمہ ہے گلستاں چپ ہے

آج چپ لگ گئی ستاروں کو
جن کی گردش کا راز داں چپ ہے
کیوں نہ غم سے نڈھال ہو وہ قوم
جس کی عزت کا پاسباں چپ ہے (اقبال کا پہلا مرثیہ، جاوداں اقبال)

اقبال کی وفات پر پوری قوم نے آہ وزاری کی اور ان کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں سیاسی، مذہبی، سماجی اور ادبی شخصیات شامل تھیں۔ قائداعظم نے اپنی تقریر میں اقبال کی وفات پر فرمایا:

> "ڈاکٹر سر محمد اقبال کی موت مسلم ہندوستان کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ وہ میرے دوست تھے۔ انھوں نے ایسی نظمیں کہیں جو دنیا میں بہترین ہیں۔ وہ اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اسلام زندہ ہے۔ ان کی اعلیٰ شاعری ہندوستانی مسلمانوں کی تمناؤں کی ترجمان ہے اور اس کے اثرات عالیہ سے ہم نسلاً بعد نسل فوائد حاصل کرتے رہیں گے۔" (۴۲)

قائداعظم نے یہ تعزیتی کلمات اقبال کی وفات کے بعد ۱۹۳۸ء میں پٹنہ میں ہونے والے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں کہے تھے۔ واضح رہے کہ قائداعظم عام طور پر انگریزی میں تقریر کرتے تھے لیکن قائداعظم کی تقریر کے یہ الفاظ اردو میں ادا ہوئے تھے جس سے قائداعظم پر اردو سے لاعلمی کا دھبہ لگانے والے عناصر کی نفی بھی ہوتی ہے۔

اقبال اور ان کے کلام سے محبت ہر ذی شعور اور اہل ذوق انسان کو تھی اس لیے اقبال کو خراج تحسین پیش کرنے والوں کی بھی کوئی کمی نہ تھی لیکن رحلت اقبال کے بعد اقبال کو خراج عقیدت پیش کرنے والوں کا گویا تانا بندھ گیا اور اردو کے شعرا نے بڑی تعداد میں اس باب میں اضافہ کیا۔ قمر یزدانی اقبال کی وفات پر نظم "آہ وہ دانائے راز" میں ملت اسلامیہ کی حالت زار کا نقشہ کھینچتے ہیں:

وائے قسمت ، رونق بزم جہاں جاتا رہا
آفتاب علم ، اقبال زماں جاتا رہا
ماتم اقبال میں ہیں آج مرغانِ چمن
بن کے آیا جو بہار گلستاں جاتا رہا
آج ملت پر ہے اک افسردگی چھائی ہوئی
ملک و ملت کا تھا جو روح رواں جاتا رہا

جس کا دل تھا واقفِ اسرار ہستی اے قمر!

بزم ہست و بود سے وہ راز داں جاتا رہا (آہ دانائے راز، زندہ و پائندہ باد)

اقبال شمیم بھیروی علامہ اقبال کو ایشیا کے نور اور بطل جلیل جیسے القابات سے نوازتے ہیں لیکن رحلت اقبال سے رنجیدہ اور چہرہ آنسوؤں سے تر ہے۔ وہ اقبال کی وفات کو پوری اولاد آدم کے لیے بہت بڑا نقصان سمجھتے ہیں۔ ان کی نظم نذر اقبال سے اقتباس ہے:

ایشیا کے نور اے اسلام کے بطل جلیل

تیری پروازِ تخیل ہم نوائے جبرئیل

نسل آدم مدتوں روئے گئی تیری یاد میں

اور دلیل زندگی ہو گا ترا فکر جمیل (نذر اقبال، جاوداں اقبالؒ)

اقبال شمیم بھیروی کی اس نظم کا ایک ایک شعر نذرانہ اقبال میں عقیدت سے لبریز ہے، وہ اقبال کو اسلام کے لیے بے مثل نعمت خدا کہتے ہوئے فرماتے ہیں:

رنگ بدلے گی ہزاروں گردش دوراں مگر

غیر ممکن ہے کہ پیدا ہو سکے تیرا مثیل

لے کے آیا بارگاہ قدس میں تیری شمیم

آنسوؤں کے چند قطرے یعنی اک نذر قلیل

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

سبزۂ نورستہ تیرے در کی دربانی کرے (نذر اقبال، جاوداں اقبالؒ)

صوفی غلام مصطفی تبسم بچپن سے علامہ اقبال کی شعر و سخن کی بلندیوں کو سنتے آئے تھے۔ لہٰذا بچپن سے ہی اقبال سے عقیدت ہو گئی تھی اسی وجہ سے صوفی تبسم کی شاعری میں بھی علامہ اقبال کا اسلامی رنگ نظر آتا ہے۔ صوفی تبسم علامہ اقبال کے انجمن حمائیت اسلام کے جلسوں میں اکثر نیاز اقبال حاصل کرتے۔ محبت و عقیدت بڑھتے ہوئے ملاقاتوں اور خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا تو اقبال کا مزید قرب حاصل ہوا۔ حتیٰ کہ صوفی تبسم کے اقبال سے تعلقات شوخی کی حد تک پہنچ گئے۔ بقول ڈاکٹر تاثیر "صوفی تبسم ان چند دست دراز لوگوں میں سے تھے جو ڈاکٹر صاحب کے حقے پر ہاتھ ڈال دیا کرتے تھے۔" (۴۳) زمانہ طالب علمی سے قائم محبت و عقیدت کا یہ سلسلہ تادمِ آخر تک قائم و دائم رہا اس دوران صوفی تبسم نے اقبال اور شعر اقبال کے حوالے سے گراں قدر

تحقیقی و تنقیدی کام سے اقبال کی عظمت کو سراہا۔ صوفی تبسم نظم "اقبالؒ "میں اقبال کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وہ چلا رہ کہ کھلیں راہروؤں کی آنکھیں
کارواں چونک پڑا ، بانگ درا جاگ اٹھی
ذہن انساں میں چمکنے لگا پیمانِ ازل
شوق بیدار ہوا خوئے وفا جاگ اٹھی
پھر دمکنے لگا خورشید کا روئے تاباں
پھر سے سوئی ہوئی کرنوں کی ضیاء جاگ اٹھی (اقبالؒ، سو بار چمن مہکا)

علامہ اقبال کی شخصیت نہ صرف مسلمانانِ برصغیر اور دنیائے اسلام بلکہ پوری عالم انسانیت کے لیے خدا کا بہت بڑا عطیہ تھی۔ ایسی شخصیت بلا شبہ صدیوں بعد پیدا ہوتی ہے اور خدا کی سب سے بڑی عطا یہ ہوئی کہ یہ سعادت مسلمانان ہند کو نصیب ہوئی۔ چونکہ مسلمانان ہند کسی بھی پیغمبرِ خدا سے محروم رہے ہیں اور اگر قدیم دور میں کوئی پیغمبر برصغیر کی سرزمین پر تشریف لائے بھی تھے تو ان کی تعلیمات اور ان کے بارے پختہ علم سے موجودہ انسان نابلد ہیں اور صرف قیاس کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ دور میں برصغیر کے باشندوں کو دین اسلام کی روشنی اور اقبال کی ہستی کا نصیب ہونا سب سے بڑی خوش قسمتی ہے جس پر جتنا فخر کیا جائے، کم ہے۔ کیونکہ پیغمبروں کے آنے کا سلسلہ تو رک چکا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے امتیوں میں اقبال کی شخصیت مسلمانان برصغیر کے حصے میں آنا بلاشبہ اللہ کا بہت بڑا انعام ہے۔

اقبال بطور قومی و ملّی شاعر اور قومی و ملّی نغموں میں اقبال کو خراج عقیدت پیش کرنے کا قلیل دور میں طویل سلسلہ ہے جس کا احاطہ کرنا اس مقالے کے محدود صفحات میں ناممکن ہے لیکن ملّی نغمہ نگاری کی روایت میں پاکستان و ملت اسلامیہ کے قومی رہنما کے طور پر اقبال کی اہمیت مسلّم ہے جس میں آئے روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اسلام کے زندہ رہنے تک اقبال کا نام بھی زندہ و جاوید رہے گا۔

اردو ملّی نغمہ نگاری کے بنیادی موضوعات میں قائد اعظم محمد علی جناح بطور قومی و ملّی رہنما کا موضوع مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ قائد اعظم کی شخصیت ایک عظیم مدبر، ماہر قانون اور بڑے سیاسی رہنما کے طور پر تاریخ عالم میں شمار ہوتی ہے جن کی شب و روز محنت، پختہ عزم اور استقلال سے پاکستان کا ظہور و قوع پذیر ہوا۔ حصولِ پاکستان کی بدولت پوری دنیا ان کی ولولہ انگیز قیادت، بے مثال فراست، بے لوث جدوجہد اور پر خلوص دیانت کا اعتراف کرتی ہے۔ حصول آزادی کی لگن نے قائد کو عزم و عمل کا پیکر بنا دیا اور انھوں نے مسلمانانِ برصغیر کو جس

ولولے اور جوش سے سرشار کر کے ان کی امنگوں میں آزادی اور آرزو کی ترنگ بھر دی اس کی مثال بھی کم ہی ملتی ہے یہی وجہ تھی قائداعظم کی ہر دلعزیز قیادت کے آگے نہ صرف مسلمانانِ برصغیر نے سر تسلیم خم کیا بلکہ ان کی شخصیت کو قدر و منزلت بھی عطا کی۔ قائداعظم کی شخصیت کو نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر مسلموں نے بھی خراج عقیدت پیش کیا اور وہ عوام وخواص میں ہر سطح پر مقبول ہو گئے۔

قائداعظم کی مدبرانہ شخصیت نہ صرف سیاسی میدان میں عظمت و رفعت کی نگاہ سے دیکھے جانے گئی بلکہ شعر و ادب میں بھی قائد کے حسنِ عمل کو خوب تذکرہ پذیرائی ملّی اور اردو کی قومی و ملّی شاعری میں قائداعظم کی شخصیت ایک ایسا موضوع بن گئی جس نے شعرا کو اپنی عقیدت کا اظہار نظموں میں قلم کرنے پر اس قدر اکسایا کہ یہ موضوع ایک روایت بن گیا۔ اس عنوان کی روایت علامہ سید سلیمان ندوی کی اولین نظم سے لے کر آج تک چلی آرہی ہے اور تادمِ پاکستان قائد سے عقیدت و محبت کی یہ روایت چلتی رہے گی۔

قائداعظم پر ملّی نظم لکھنے کا مرحلہ ۱۹۱۶ء سے اس وقت شروع ہوا جب آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے موقعے پر قائداعظم نے مسلم لیگ کے جلسے کی پہلی دفعہ صدارت کی تھی۔ لکھنؤ میں ہونے والے اس اجلاس میں سید سلیمان ندوی نے بھی بہ نفس نفیس شرکت فرمائی تھی اور وہ قائداعظم کی تقریر سے خاصے متاثر تھے تو انھوں نے قائداعظم سے نذرانہ عقیدت کے طور پر ملّی نظم پیش کی۔ ڈاکٹر محمود الرحمن، سید سلیمان ندوی کے قائداعظم بارے تاثرات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"سید سلیمان ندوی نے قائداعظم محمد علی جناح کو پہلی مرتبہ اسی جلسہ گاہ میں دیکھا تھا اور ان کی ولولہ انگیز تقریر سنی تھی۔ عظیم رہنما کی باوقار شخصیت، ان کی قائدانہ صلاحیت اور قوت خطابت سے وہ بے حد متاثر ہوئے تھے۔ برصغیر میں مسلمانوں کی سیاسی زبوں حالی کے ازالے کے لیے قائداعظم جو جذبہ لے کر اٹھے تھے، اس سے مولانا خاصے پر امید تھے۔ انھوں نے اپنی اس نظم میں جو دوران جلسہ موزوں کی گئی تھی۔ اپنے خیالات کا برملا اظہار کر دیا تھا۔ نظم کے چند اشعار پیش ہیں:

بادہ حبّ وطن کچھ کیف پیدا کر سکے
دور میں یوں ہی اگر یہ ساغر و مینا رہا
علت دلیریں سے گو اصلی قویٰ بیکار ہیں
گوش شنوا ہے نہ ہم میں دیدہ بینا رہا
پر مریض قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ امید
ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جناح رہا (۴۴)

یہ وہ دور تھا جب قائد اعظم کو مسلم لیگ میں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن سید سلیمان ندوی کی ژرف نگاہی نے بہت جلد یہ راز ڈھونڈ لیا تھا کہ مسلمانوں کی ڈوبتی کشتی کو اگر کوئی نکال سکتا ہے تو صرف قائد اعظم محمد علی جناح کی باشعور شخصیت ہے۔ لہٰذا اس وقت سے شعرا کی طرف سے قائد اعظم کے کارناموں کی ستائش کا سلسلہ شروع ہوا اور ان کے پیغامات کو دل نشیں اور مؤثر انداز میں عوام و خواص تک پہنچا کر قائد اعظم کی ذات کو حوصلہ بخشا۔

قائد اعظم کی رفعت و عظمت پر جو نظم سب سے زیادہ مقبول ہوئی اور جس نے آناً فاناً پورے برصغیر میں شہرت حاصل کر لی وہ رسالہ "ہمایوں" کے ایڈیٹر میاں بشیر احمد کی نظم "ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح" ہے جو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے دوران ۱۹۴۰ء میں پڑھی گئی۔ میاں بشیر احمد کی اس نظم کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ قیام پاکستان کے بعد بھی اس نظم کی شہرت کو دوام حاصل رہا اور جب ۲۰۰۶ء میں اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے قائد اعظم کے یوم پیدائش کے موقع پر بانی پاکستان کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے منظوم سرمائے کا انتخاب کیا گیا تو اس سرمائے کے مرتب کردہ خورشید ربانی نے اس منظوم انتخاب کا نام میاں بشیر کی اس نظم کا پہلا مصرعہ "ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناحؒ" رکھا۔ یعنی اس نظم کی مقبولیت و شہرت اسی برس گزرنے کے باوجود کم نہیں ہوئی، بلاشبہ اس کا ایک ایک شعر پوری پوری نظم پر بھاری ہے اور آج بھی یہ نظم خواص و عام کی زباں پر زدِ عام ہے۔

قائد اعظم کی خداداد صلاحیتوں، تدبر، حوصلہ اور پر خلوص جذبۂ خدمت کی ستائش کرنے والوں میں علامہ سیماب اکبر آبادی بھی شامل ہیں جو احساس ذمہ داری کے ساتھ قائد اعظم کی شخصیت اور نظریات کو بنیاد بنا کر مسلمانانِ برصغیر کے لیے علیحدہ وطن اور آزادی کی کاوش میں مصروف رہے۔ سیماب اکبر آبادی کی متعدد نظمیں ایسی ہیں جن میں انقلابی آواز پائی جاتی ہے۔ قائد اعظم سے انھیں دلی عقیدت تھی جس کا اثر ان کی متعدد نظموں میں نظر آتا ہے۔ علامہ کی قومی و ملّی نظموں کے مجموعے کو ان کے بیٹے مظہر صدیقی نے "قائد کی خوشبو" کے عنوان سے سیماب اکادمی کراچی سے شائع کیا۔ مظہر صدیقی "قائد کی خوشبو" کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ میرے والد علامہ سیماب اکبر آبادی نے آزادی کی جنگ میں اپنے قلم کے ذریعہ وہ کردار ادا کیا تھا جسے مؤرخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔"(۴۵) سیماب اکبر آبادی کی نظموں کے اس مجموعہ میں قائد اعظم کے ایک سو دسویں(۱۱۰) یوم پیدائش کے موقع پر قائد کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے قائد اعظم پر لکھی نظموں پر مشتمل سیماب اکبر آبادی کی ۱۹۴۶ءسے ۱۹۴۹ءکے دورانیے کی نظمیں شامل ہیں۔ اس مجموعے میں شامل قومی و

مِلّی نظمیں قاری کے شعور کو بیدار کرتی ہیں کیونکہ علامہ نے اپنے شعری تجربے اور صلاحیتوں سے مسلمانوں کے اندر عزم وہمت اور استقلال وخودداری پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس میں موجود سیماب اکبر آبادی کی مقبول نظم "میر کارواں" سے اقتباس ہے:

تو لے کے ساتھ قافلہ اپنا ہوا رواں
ہو اک قدم زمین ترا ایک آسماں
اے میر کارواں
گم گشتگانِ قوم کا رہبر کہیں تجھے
یا رحمتِ مجسّم داور کہیں تجھے
جہد و عمل کا کیوں نہ پیمبر کہیں تجھے
تو پر شباب اور تیری روح ہے جواں
اے میر کارواں (میر کارواں ، قائد کی خوشبو)

سیماب اکبر آبادی نے اپنی بصیرت و تدبر سے قائد اعظم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مسلمانوں کا ولولہ و جوش کو تازہ کیا۔ قیام پاکستان کے بعد سیماب کی نظم "شکریہ اے قائد اعظم" میں قائد اعظم کا خصوصی شکریہ ادا کرتے ہوئے آزادی کی عظمت واہمیت بیان کرتے ہیں:

مل گیا مرکز ہمیں بخت آزمائی کے لیے
آئینہ ہم کو ملا جلوہ نمائی کے لیے
ذہن و دل آزاد ہیں ، لوح و قلم آزاد ہیں
شکریہ اے قائد اعظم کہ ہم آزاد ہیں (قائد اعظم، قائد کی خوشبو)

قائد اعظم کی قومی و مِلّی خدمات اور سیاسی بصیرت کو خراج تحسین پیش کرنے والوں میں بابائے اردو صحافت مولانا ظفر علی خان بھی شامل ہیں۔ مولانا ظفر علی خان قومی و مِلّی شاعر، مدبر صحافی اور سیاستدان بھی تھے۔ وہ رسالہ "زمیندار" کے ایڈیٹر تھے جس میں انھوں نے اسلامی شعائر اور آزادی کے لیے بیش بہا خدمات کیں۔ مولانا قائد اعظم کی شخصیت کے قائل تھے، انھیں بھی باقی مسلمانانِ برصغیر کی طرح قائد اعظم سے بہت سی توقعات وابستہ تھی وہ اپنی نظم "قائد اعظم سے خطاب" میں ہندو شاعر ٹیگور کی قومی شاعری پر اپنے مِلّی نغموں کو فوقیت دیتے ہوئے قائد سے آزادی کے قافلہ کی رفتار مزید تیز کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں:

ملت کا تقاضا ہے کہ اے قائد اعظم
اسلامیوں کی شان میں کچھ چاند لگا اور
ہے سست عناں قافلہ اور دور ہے منزل
اس قافلہ کی گرمی رفتار بڑھا اور
وہ ہند میں گرجا تو یہ آفاق میں گونجا
ٹاگور کا گیت اور ہے اور نغمہ مرا اور

(قائداعظم سے خطاب، ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح)

قائداعظم کی پر شوکت شخصیت کے نہ صرف مسلمان معترف تھے بلکہ غیر مسلم شعرا نے بھی قائد کی شان میں نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔ جس میں اہل زباں اور غیر زباں، سیاسی و ادبی تمام لوگ شامل ہیں۔ ایسا ہی ایک نذرانہ جو قائداعظم کے حضور برصغیر کی ممتاز سیاستدان، یوپی کی گورنر، ہندکانگرس کی مقتدر شخصیت مسز سروجنی نائیڈو نے انگریزی زبان میں منظوم صورت میں پیش کیا اور قائداعظم کو ہندو مسلم اتحاد کا سفیر قرار دیا(۴۶):

In the moon, tide hours
O' dove secure and strong
I need thee not
But in the desolate hour of mid night
When
An ecastasy of starry silence sleeps
On the still mountains and the soundless deep
And my soul hungers for the voice.

عظیم رہنما و شخص عام انسانوں کی طرح مر نہیں جاتے بلکہ وہ ابد ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ نظامِ قدرت ہے کہ ایک خاص وقت کے بعد انسان کے جسد خاکی سے روح پرواز کر جاتی ہے۔ قائداعظم بھی قدرت کی اس کاری گری سے محفوظ نہیں رہ سکے اور قیام پاکستان کے ایک سال اور کچھ مہینوں بعد ان کی روح خالق حقیقی سے جاملی۔ قائداعظم کی وفات مسلمانانِ پاکستان کے لیے کسی بڑے صدمہ سے کم نہ تھی کیونکہ وہ پوری قوم کے لیے مرکز کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کی شخصیت سایہ درخت کی تھی جو کڑی دھوپ میں آرام پہنچاتا ہے اور ابھی تک بہت

سے دشوار راستوں سے قوم کو گزرنا تھا جہاں قدم قدم پر قائد کی رہنمائی کی ضرورت تھی لیکن حکم خدا کے آگے کس کا بس چلتا ہے اب مسلمانوں کو یہ عظیم صدمہ سہنا پڑا۔ قائداعظم کی وفات پر عالمی دنیا میں غم کا اظہار کیا گیا اور شعرا نے قائداعظم کے سوگ پر ان کی شخصیت کو بے پناہ خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ غم اور دکھ کا اظہار کیا۔

قائداعظم کی رحلت کے بعد شعرا کی بڑی تعداد نے قائد کی شخصی خوبیوں کا احاطہ نظموں میں قلم بند کیا ان شعرا میں نامی گرامی اور خاص و عام سب شامل ہیں ۔ پاکستان پر جب بھی کوئی مشکل وقت آیا ہمیں قائد کی قدروا ہمیت اور ضرورت محسوس ہوئی۔ قائد نے جس مقصد کے لیے ہمہ تن قوت وہمت سے ملک حاصل کیا تھا وہ مقاصد حاصل نہ ہو سکے اور ملک جاگیر داروں اور سرمایہ داروں کی میراث بن گیا۔ جس آزادی کے ملک وملت کے باشندوں نے خواب دیکھے تھے وہ پورے نہ ہو سکے اور ایک خاص طبقہ نے عوام کی آزادی سلب کر لی اور اقبال و قائد کے فرمودات کو یکسر فراموش کر دیا۔ واصف علی واصف ملکی حالت زار پر نظم ''قائداعظم'' میں قائد سے یوں مخاطب ہیں:

آ دیکھ ذرا رنگ چمن قائد اعظم
بے رنگ ہوئے سروِ سمن قائد اعظم
تنظیم و اخوت ہے نہ اب عزم و یقین ہے
ہم بھول گئے عہد کہن قائد اعظم
وہ رنگ دکھائے ہیں نئے شیشہ گروں نے
پردیس بنا اپنا وطن قائد اعظم
کیا تجھ سے کریں گردش افلاک کا شکوہ
کھانے لگی سورج کو کرن قائد اعظم (قائداعظم، شبِ چراغ)

رحلت قائداعظم پر افسوس اور غم زدہ صرف پاکستانی قوم اور مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے بلکہ عالمی دنیا میں مختلف شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والوں کی طرف سے دکھ کا اظہار کیا گیا جن میں سیاسی شخصیات اور شعرا و ادیب خاص کر شامل تھے۔ انتقال قائداعظم پر چین کے معروف شاعر ''لوہ ینگ'' نے ان الفاظ میں قائداعظم کو خراج عقیدت پیش کیا:

(ترجمہ) ''جناحؒ! اے مقاومت، جہاد اور انقلاب کے نشاں
جسے صحراؤں کے خانہ بدوش بھی پہچانتے تھے اور گنگا کے کنارے بسنے والے بھی جانتے تھے

میرا کمزور دل آج غم کے مقابلہ سے عاجز ہے، میں رونے پر مجبور ہوں
اگرچہ آنسو میرے غم کی شدت کے اظہار سے قاصر ہیں
جناحؒ! روحِ انسانی تجھے کبھی بھول نہ پائے
حکمرانوں کی ناخوت اور دشمنوں کی لذت خون آشامی
برقرار رہے گی لیکن صبر و اطمینان سے اپنی آنکھیں بند کر لے
کیونکہ جنگلوں میں، اور ساحلوں پر تیرے بیٹے ہی نہیں بیٹیاں بھی تلواریں ہاتھوں میں لیے حق
کی حمایت کرتی رہیں گی۔ وہ تیرے طویل جہاد کو از سرِ نو شروع کریں گے اور یہ تحریک ہی تیرا
کام پایۂ تکمیل کو پہنچائے گی۔ یہ نوحہ نہیں ایک حلف ہے۔" (۴۷)

قائداعظم دنیا سے رخصت ضرور ہو گئے لیکن وہ پاکستان کی صورت میں آج بھی زندہ ہیں۔ انھوں نے سخت محنت اور جانفشانی سے ہمیں جو آزادی کی نعمت عطا کی ہم اس کے احسان مند ہیں اور ان کا یہ احسان لفظوں کی بیانی سے ادا نہیں ہو سکتا۔

قومی و ملّی رہنماؤں میں کئی مذہبی، سیاسی اور ادبی شخصیات شامل ہیں، جن پر شعرا نے ملّی نغموں کی صورت میں قلم آزمائی کر کے اس روایت میں بھرپور حصہ ڈالا ہے۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ اور علامہ اقبالؒ کے بعد جس اہم قومی و ملّی رہنما کا نام سرفہرست آتا ہے وہ مولانا ظفر علی خان ہیں۔ مولانا ظفر علی خان نے رسالہ زمیندار کے ذریعے مسلم قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی پوری کاوش کی۔ وہ ایک وقت میں قومی و ملّی شاعر، ادیب، نعت گو، خطیب، صحافی، سیاستدان اور مجاہد اسلام تھے۔ قیام پاکستان کے سلسلے میں ان کی خدمات سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شعرا نے جہاں قائد اور اقبال کو خراج عقیدت کا نذرانہ پیش کیا ہے وہیں مولانا ظفر علی خان کی عظمت و شوکت کو نظمیہ رنگ دے کر الفت کا اظہار کیا ہے۔ جعفر بلوچ کی نظم "ظفر علی خان" سے اقتباس:

حکایت حریت کا عنوان ظفر علی خاں
جہاد اور انقلاب کی جاں ظفر علی خاں
وہ اک ثنا گر خدا و پیغمبر خدا کا
ادب شناسِ حدیث و قرآن ظفر علی خاں
نہ دب سکا وہ، نہ جھک سکا وہ، نہ بک سکا وہ
کہ تھا جسور و غیور انساں ظفر علی خان (ظفر علی خان، برسبیلِ سخن)

مولانا ظفر علی خان کو آزادی کی آواز بلند کرنے پر کئی دفعہ برطانوی استعماریت کا سامنا کرتے ہوئے جیل کی ہوا کھانا پڑی لیکن ظفر علی خان کا پختہ ایمان راستے کی تمام رکاوٹوں کو عبور کرتا رہا اور کوئی بھی دشواری ان کو اپنے منصوبے سے نہ ہٹا سکی۔ مولانا ظفر علی خان کی عظمت و رفعت پر لکھے گئے مِلّی نغموں میں حفیظ تائب کی نظم "مولانا ظفر علی خان" میں وہ مولانا سے حاصل شرف تلمذ کا ذکر کرتے ان کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

مجدد فنِ نعت گوئی وہ شاعر عصر گیر و یکتا

ظفر علی خان جس سے میں نے ثنا گیری کا سلیقہ سیکھا

خطیب شعلہ نوا ، ادیب شہیر ، روشن بیاں مترجم

ہر ایک میداں میں اس کے تیور تھے جرأت آموز و قائدانہ (مولانا ظفر علی خان، تعبیر)

قائد اعظم کی رحلت کے بعد پاکستان جن مسائل سے دوچار تھا، ان میں بھارت کی طرف سے دراندازی، مہاجرین کے مسائل اور کشمیر ریاست، جونا گڑھ اور حیدر آباد دکن پر بھارتی فوج کا قبضہ تھا۔ ان حالات میں جس سیاسی شخصیت نے ان ملکی مسائل کا دلیرانہ و دانشمندانہ مقابلہ کیا، وہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نواب لیاقت علی خان تھے۔ لیاقت علی خان کی شبانہ روز محنت اور خلوصِ نیت پوری قوم کے ساتھ قائد اعظم پر بھی عیاں تھی۔ قائد کی وفات کے بعد انھوں نے قائد اور قوم کی توقعات پر پورا اترنے کی حتی الوسع کوشش کی۔ لاکھوں مہاجرین ابھی تک کیمپوں میں بے یار و مددگار زندگی بسر کر رہے تھے۔ معاشی اور معاشرتی مسائل سے بھی ملک دوچار تھا لیکن لیاقت علی ہمت، حوصلہ اور اولوالعزم سے ان تمام مسائل کو حل کرنے کی ملکی اور بین الاقوامی سطح پر کوشش کی۔ بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں کے مسائل اس سے الگ تھے جو اب ہندو تعصب پسندوں کے رحم و کرم پر تھے اور انھوں نے فرقہ وارانہ فسادات شروع کر رکھے تھے۔ اس صورت میں لیاقت علی خان نے نہرو لیاقت معاہدہ کر کے حالات کو وقتی سنبھالا دیا لیکن بھارت کی طرف سے مسلم علاقوں میں فوج کشی نے ملکی قیادت کو مسلسل پریشانی سے دوچار رکھا۔ ان تمام مسائل کا لیاقت علی خان نے مردانہ وار مقابلہ کیا لیکن اب لیاقت علی خان کے قریبی ساتھیوں (اقتدار کے پجاریوں) نے ان کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کر دیں اور لیاقت علی خان کی مشکلات میں مزید اضافہ کیا۔

اکتوبر ۱۹۵۱ء میں پاکستان کے خلاف اندرونی و بیرونی سازشیں کسی حد تک کامیاب ہوئیں اور دشمنان پاکستان کے راستے کی بڑی رکاوٹ لیاقت علی خان کو راولپنڈی میں شہید کر دیا گیا۔ اس طرح قائد اعظم سے محروم قوم کو ایک اور دھچکا لگا اور وہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم اور اہم رہنما سے بھی محروم ہو گئی لیکن پاکستانی قوم کے

دلوں میں لیاقت علی ہمیشہ کے لیے جاوداں ہو گئے اور انھیں " شہید ملت " کا خطاب عطا کیا۔ عوام کے دلوں میں محبت و عقیدت لاکھ سازشوں کے باوجود کم نہ کی جا سکی بلکہ بقول طاہرہ نیر " قائد اعظم کے بعد اگر کسی سیاسی رہنما کو قوم کی طرف سے بھرپور خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے تو وہ لیاقت علی خان ہی کی شخصیت ہے۔ "(۴۸) پاکستانی قوم ابھی قائد اعظم کی رحلت کا غم بھلا نہ سکی تھی کہ اسے ایک دوسرا صدمہ وزیر اعظم پاکستان اور قائد کے مخلص ساتھی کی شہادت کی شکل میں برداشت کرنا پڑا۔ لیاقت علی کی شہادت کے بعد امید فاضلی ان کو ملت کی نبض، خطہ کے نگران اور قوم کے دل کی دھڑکن سے خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ لیاقت علی کی شہادت کو سرخی شفق اور ان کی شخصیت کو شمع عرصہ جاں اور دست خزاں سے پاک گل سے تشبیہ دیتے ہیں۔ امید فاضلی کی مِلّی نظم "شہید ملت" سے اقتباس ہے:

قوم کے دل میں دھڑکتا ہے ترا قلب تپاں
سرخی رنگِ شفق تیرے لہو کا عنوان
تو ہے وہ شمع جو روشن ہے عرصہ جاں
تو وہ گل ہے کہ جسے چھو نہ سکے دست خزاں
تیری خوشبو سے مہکتا ہے دماغ ہستی
خون سے تیرے فروزاں ہے چراغ ہستی (شہیدِ ملّت، پاکستان زندہ باد)

لیاقت علی خان کی شہادت بلاشبہ پاکستانی قوم کے لیے ایک بڑا نقصان ثابت ہوئی کیونکہ شہادت کے بعد ملک میں جو سیاسی عدم استحکام پیدا ہوا وہ عشروں ختم نہ ہو سکا اور فوج نے جمہوریت کا بوریا بستر گول کر کے ملک کا اقتدار سنبھال لیا جس کے نتیجے میں ہمیں سقوطِ ڈھاکہ کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ قومی و مِلّی نغمہ نگاری کی روایت میں قومی و مِلّی رہنماؤں پر لکھے گئے شعر پارے ایک بنیادی اور اہم موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں اور قومی رہنماؤں پر لکھے گئے مِلّی نغموں کی روایت میں شبانہ روز اضافہ ہو رہا ہے۔

### فسادات اور ہجرت:

برصغیر پاک و ہند میں جب سے مسلم اقتدار کا سورج غروب ہوا اسی وقت سے برصغیر کی غیر مسلم اقوام کی سرکش اور انتہا پسند قوتوں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف فسادات کا ایک ایسا طویل سلسلہ شروع ہوا جس نے تحریک پاکستان کے دور میں مزید شدت اختیار کر لی۔ کیونکہ شدت پسند عناصر اب مسلمانوں کو اپنی غلامی میں

دیکھنا چاہتے تھے اور ان سے مسلمانوں کے آباؤ اجداد کی طویل حکومت کا بدلہ چکانا چاہتے تھے۔ لیکن برصغیر کے مسلمانوں کی دانشوری اور فہم و فراست نے یہ خطرہ بروقت محسوس کر لیا اور علیحدگی کی راہ اختیار کی۔

برصغیر کے مسلم رہنماؤں نے جب ہندوؤں کے شدت پسند عناصر سے بچنے اور انتقام کا نشانہ بننے کے بجائے مسلمانانِ برصغیر کے سیاسی، سماجی، مذہبی اور ثقافتی مسائل کو ہمیشہ کے لیے حل کرنے کے لیے برصغیر کی تقسیم کا مطالبہ کیا تو اس وقت ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس مطالبہ کا نتیجہ کیا ہو گا؟ انسانی آبادیوں کی تقسیم کے بے رحمانہ نتیجے میں زمین و فلک خون سے ابر آلود ہو جائیں گے اور آہ و بکا کی آوازیں آزادی کے ترانوں کو اپنے سحر میں لے لیں گی۔ خوشی کے شادیانے بجانے کے بجائے آہ و زاری و ماتم داری ہو گی۔ عزت کی حفاظت کے لیے ہزاروں معصوم دوشیزاؤں کی عزتیں قربان ہو جائیں گی۔ تقسیم کے نتیجے میں ہنستے بستے گھر اجڑ جائیں گے اور یتیموں اور بیواؤں کو سہارا دینے والا بھی کوئی نہیں رہے گا۔ سب سے بڑا المیہ یہ ہوا کہ جس مذہب، تہذیب و ثقافت، معاشی اور معاشرتی فرق کی بنیاد پر یہ نئی اسلامی ریاست حاصل کی گئی۔ تقسیم کے بعد اس اسلامی ریاست میں مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت والے معاشرے کو راسخ العقیدگی کا نام دے کر اس کا مذاق اڑایا جائے گیا۔ لاکھوں قربانیاں دینے سے اگر مستقل مقصد حل ہو جائے تو قربانی بھی راس آ جاتی ہے اور بجائے دکھ اور افسوس کے قربانی دینے کی خوشی حاصل ہوتی ہے لیکن یہاں معاملہ کچھ اس کے برعکس نکلا اور لاکھوں قربانیاں بھی رائیگاں گئیں۔ عزتیں اور جانیں لٹانے کے بعد عزت اور جان محفوظ نہ رہ سکی۔ جس سامراج سے آزادی کی خاطر سب کچھ قربان کیا تھا تقسیم کے کچھ عرصے بعد ہی یہ احساس ہو گیا کہ اقتدار جن مقامی لوگوں کے ہاتھ لگا وہ دراصل اُسی سامراج کے تربیت یافتہ ہیں اور اب آقا بدیسی کے بجائے دیسی ہو گیا ہے جس نے اپنے مغربی آقا کی روایت برقرار رکھتے ہوئے دو قومی نظریہ کا مفہوم غیر مسلم اور مسلم اقوام کی بجائے حکمران اور رعایا کے معنوں میں بدل دیا۔ دوسرے لفظوں میں امیر طبقہ اور غریب طبقہ (حکمران اور رعایا) کے درمیان واضح فرق دو قومی نظریہ کی نفی اور اسلامی تعلیمات کی سراسر خلاف ورزی اس اسلامی ریاست میں نظر آئی۔

آزادی کی اس قدر خون آلود صبح کو جس میں لاکھوں انسان ملبے تلے دب گئے یا راکھ کا ڈھیر بن گئے اور ہجرت کے دوران خوابوں کی سرزمین کی طرف جاتے ہوئے انتقام کا نشانہ بن گئے اور بے شمار عورتیں پاکیزگی کی چادر سے محروم ہو گئیں۔ معصوم بچوں کو پل بھر میں یتیم ہوتے ہوئے دیکھا گیا۔ اس بات کا اندازہ لگانا ممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے کہ ان تمام متاثر شدہ انسانوں کی تعداد کیا ہے؟ ایک اندازے کے مطابق یہ تعداد ستر اسی لاکھ سے زیادہ ہے لیکن اس کی صحیح تعداد کسی کو معلوم نہ ہو سکی۔ سید حسن ریاض لکھتے ہیں:

> "۱۹۴۹ء تک حکومت پاکستان کا تخمینہ یہ تھا کہ کشمیر کے پناہ گزینوں کے علاوہ مبادلہ، آبادی میں کم و بیش ۶۵ لاکھ مہاجر پاکستان آئے۔ ان میں ۵۲ لاکھ مشرقی پنجاب اور مشرقی پنجاب کی ریاستوں کے تھے، ۳ لاکھ ۶۰ ہزار صوبہ دہلی اور بقیہ ہندوستان کے ان علاقوں کے، جہاں ہندؤوں نے مسلمانوں پر زیادہ مظالم کیے۔ اندازہ یہ ہے کہ پانچ لاکھ مسلمان قتل ہوئے۔ ان ہی میں وہ تعداد بھی ہے جن کو اغوا کیا گیا۔ مغربی پاکستان سے ۵۵ لاکھ سکھ اور ہندو گئے۔ اس طرح پاکستان کی آبادی میں دس لاکھ نفوس کا اضافہ ہوا۔" (۴۹)

ان تمام دہشت زدہ کیفیات اور درد انگیز فسادات نے ہر خواص و عام کو متاثر کیا۔ بقول طاہرہ نیر "تقریباً تین سال تک یہ خونیں المیہ اردو شاعری کا مستقل اور سب سے زیادہ جاندار موضوع بنا رہا۔"(۵۰) ادیب و شاعر اس سانحے سے اس قدر فکری و جذباتی حد تک رنجیدہ تھے کہ انھوں نے آزادی کے گیت گانے کے بجائے ظلم و تشدد کے واقعات کو موضوع سخن بنایا اور مذہب کے نام پر انسانوں کی اس بے رحمانہ تقسیم کو انسانیت کے تمام تقاضوں کے خلاف سمجھا۔

مصنفین کی جانب سے تقسیم کے اس بے رحمانہ عمل کی جس نے سب سے زیادہ مذمت کی وہ زیادہ تر ترقی پسند شعرا و ادبا تھے۔ گو کہ آزادی کے کچھ سالوں کے بعد ترقی پسندوں کو پابندی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن ترقی پسندوں کا نظریہ جس قدر شعرا و ادبا میں سرائیت کر چکا تھا اس کا یکسر ختم ہو جانا دشوار تھا لہٰذا تقسیم اور فسادات کے موضوع پر کئی سال تک شعر و نثر میں اظہار ہوتا رہا۔ شاعری کی نسبت افسانوں میں اس کا زیادہ کھل کر اظہار ہوا اور اردو کے سبھی افسانہ نگاروں نے اس موضوع پر کئی اچھے اور پر تاثیر افسانے لکھے۔

تقسیم اور فسادات کے موضوع پر اردو شاعری میں اس کا اظہار زیادہ تر غزل میں ہوا ہے اور ناصر کاظمی نے اردو غزل میں ماضی کی یاد کو مستقل موضوع بنایا۔ جبکہ دیگر شاعروں میں فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، ظہیر کاشمیری، منظور احمد منظور، شور علیگ، احمد ریاض، منیر نیازی، ساغر صدیقی اور کئی دوسرے ترقی پسند شعرا شامل ہیں جنھوں نے فسادات اور تقسیم کی سخت الفاظ میں مذمت کی اور مایوسی کا اظہار کیا۔

اردو شاعری نے جس عہد میں آنکھ کھولی وہ ایک زوال پذیر معاشرہ تھا۔ اس کے شاعروں نے سماجی بدحالی اور معاشرتی، معاشی اور سیاسی زوال کو شعر و شاعری کا موضوع بنایا۔ لہٰذا اردو شاعری میں رنج و غم کی جو داستاں روز اول سے چلی آ رہی تھی، پاکستانی شعرا نے نئے اسلوب و ہیئت اور موضوعات میں جدیدیت پیدا کر کے اس روایت کو ترقی بخشی۔ فسادات اور ہجرت کے موضوع پر احمد ریاض کی نظم "چھوٹا دریا" طنز و تلخی کی کاٹ

سے بھرپور ہے۔ وہ پنجاب کے پانچ دریاؤں میں ایک چھٹا دریا یعنی ہجرت کے دوران ظلم کی ہولناکیوں سے بہنے والے خون کو دریا سے تشبیہ دیتے ہیں(۵۱) نظم سے اقتباس:

مرے پنجاب کے بلور و جواں سینے پر
پانچ شفاف چمک دار لکیریں تھی رواں
کھینچ دی کس نے یہ اک اور لہو رنگ لکیر
پانچ شفاف چمک دار دار لکیروں کے درمیاں
کس کی بے رحم سیاست نے اٹھا کر خنجر
پانچ دریاؤں کی دھرتی کا جگر چیر دیا

(چھٹا دریا، موجِ خون)

ہجرت و فسادات کے تناظر میں ہونے والی تباہی و بربادی کے حوالے سے ناصر کاظمی کی شاعری کو خاص اہمیت حاصل ہے جنھوں نے اس تلخ حقیقت کو جشن طرب کے ساتھ نوحہ غم کو شامل کر کے طنز، تلخی اور اذیت کو ایک نیا رنگ عطا کیا:

شہر در شہر جلائے گئے
یوں بھی جشن طرب منائے گئے
اک طرف جھوم کر بہار آئی
اک طرف آشیاں جلائے گئے
کیا کہوں کس طرح سرِ بازار
عصمتوں کے دیے بجھائے گئے
آہ وہ خلوتوں کے سرمائے
مجمع عام میں لٹائے گئے (شہر در شہر جلائے گئے، برگ نے)

ناصر کاظمی کی شاعری میں ہجرت کے مناظر کو جس فنی انداز اور منظر کشی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے وہ ہجرت کے واقعات کی بہترین عکاسی اور قاری پر سحر انگیز اثر چھوڑتی ہے۔ ہجرت کی اپنی روداد کو ناصر کاظمی نے جس طرح خوبصورت انداز سے شعری زاویے میں سمیٹا ہے اس سے شعری رویوں میں انفرادیت اور اجتماعیت کا حسین امتزاج پیدا ہوتا ہے:

دیتے ہیں سراغ فصل گل کا
یادوں کے بجھے ہوئے سویرے
روداد سفر نہ چھیڑ ناصر
پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے (یہ شب یہ خواب و خیال تیرے، برگ نے)

ہجرت کے مناظر کو اکرم باجوہ نے جہاں ایک طرف خواہشات کی تکمیل اور آزادی حاصل کرنے پر خوشی کا اظہار کیا ہے تو ساتھ ہی تقسیم کی مخالفت کرنے والوں کے ظلم اور ہجرت کے دلخراش مناظر کی منظر نگاری بھی کرتے ہیں اور حقائق سے پردہ فاش کرتے ہیں ان کی نظم "ہجرت" سے اقتباس ہے:

منظور جس گھڑی ہوا رب قدیر کو
تقسیم اس نے کر دیا برصغیر کو
مظلوم کتنے لوگ تھے ، کفار شیر تھے
جس سمت آنکھ اٹھتی تھی لاشوں کے ڈھیر تھے
نیزوں کی تیز نوک میں بچے پرو دیے
رنگیں تھے جو خون سے رستے بھی دھو دیے (ہجرت، تکبیر کا رنگ للکار ہوا)

وقت سب سے بڑا مرہم ہے جو زخموں کو بھر دیتا ہے۔ ہجرت اور فسادات کے نتیجے میں لگنے والے زخم بھی آہستہ آہستہ بھرنے لگے اور حالات نے نئی کروٹ لی۔ شعرا اور ادبا کے لیے نئے موضوعات جنم لیتے گئے اور کچھ شعرا نے حالات سے مفاہمت کر کے "جس حال میں جینا مشکل ہو اس حال میں جینا لازم ہے" سیکھ لیا اور رونے دھونے کی بجائے نئی زندگی کی ابتدا کی۔ نئی زندگی کی ابتدا سے نئے مسائل نے جنم لیا جس سے ادب کا موضوع بھی بدل گیا۔

ہجرت کر کے آنیوالوں نے یہ سوچ رکھا تھا کہ پاکستان میں ہمارے مسلم بھائی ہمارے لیے پلکیں بچھائے ہوئے ہوں گے اور جو بہترین سلوک حضرت محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ مدینہ والوں نے کیا تھا، برصغیر میں بھی ہجرت کرنے والوں کے لیے وہ سب کچھ ان کا منتظر ہو گا۔ لیکن ہر دفعہ ایسا نہیں ہوتا۔ بلاشبہ پاکستان ریاست مدینہ کی طرح نظریاتی ریاست تھی جو اسلام کے نام پر قائم ہوئی تھی لیکن اس کے مکین کے دل مدینہ والوں جیسے نہیں تھے اور نہ ہی ہجرت کرنے والوں میں مکی مہاجرین والا جذبہ تھا۔ ان حقائق کو ن م۔ راشد نے اپنی نظم "اے وطن اے جان" میں عمدگی سے بیان کیا ہے:

اے وطن ترکے میں پائے تو نے وہ خانہ بدوش
جن کو تھی کہنہ سرابوں کی تلاش
اور خود ذہنوں میں اُن کے تھے سراب
جن سے پسپائی کی ہمت بھی کبھی ان میں نہ تھی (اے وطن اے جان، کلیاتِ راشد)

لہٰذا یہاں مہاجرین کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ایک دردناک داستان ہے۔ مہاجرین کو کئی سالوں تک جھونپڑیوں میں گزر بسر کرنا پڑی اور وہ جھونپڑیاں سردیوں اور بارشوں کو برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ مہاجرین میں بیماریوں کی وبا الگ سے پھیل چکی تھی اور جو زخمی تھے وہ مرہم کے لیے تڑپ رہے تھے۔ اشفاق حسین ہجرت کے بعد کی صورت حال بارے نظم کرتے ہیں:

دل اجنبی دیس میں لگا ہے
آندھی سے دیے کا رابطہ ہے
ٹوٹے ہوئے لوگ ہیں سلامت
یہ نقل مکانی کا معجزہ ہے
کوئی بھی نہیں یہاں پہ آزاد
دھوکہ یہ فقط نگاہ کا ہے

(دل اجنبی دیس میں لگا ہے، پاکستانی ادب ۱۹۴۷ء۔۲۰۰۸ء)

اس صورت حال کو اگر پاکستانی حکومت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ بڑی مشکلات میں گھری ہوئی تھی۔ ہندو ساہوکار سرمایہ سمیٹ کر لے گیے تھے اب اگر مہاجرین کو بسانا تھا تو اس کے لیے سرمایہ کی اشد ضرورت تھی جو کہ میّسر نہیں تھا لیکن اس تمام صورت حال کے باوجود حکومت اور پاکستانی عوام نے مہاجرین کے لیے بہت کچھ کیا۔ ان گنت رضاکاروں نے علاج، خوراک اور دوسرے ضروری سامان کے لیے چندہ اکٹھا کیا اور مہاجرین بھائیوں کے مسائل حل کرنے کی کوشش کی لیکن مہاجرین اتنی زیادہ تعداد میں تھے کہ حکومت اور رضاکاروں کو مسائل کے پاس وسائل کم اور مسائل زیادہ تھے جس کی بدولت کافی عرصہ تک مہاجرین کو گھمبیر حالات سے گزرنا پڑا۔

دوسری اہم بات یہ کہ مفاد پرست عناصر ہر جگہ اور ہر دور میں موجود رہے ہیں یہ الگ بات ہے کہ کبھی ان عناصر کا پلڑا بھاری یعنی یہ لوگوں کے ایثار و قربانی پر حاوی ہو جاتے ہیں اور کبھی ان مفاد پرستوں کی نہیں چلتی۔ کچھ ایسا ہی ہجرت کے بعد ہوا کہ مفاد پرست ٹولہ ہر طرف حاوی ہو گیا۔ حکومت میں بھی اور عوام میں بھی۔ جس کی وجہ سے ایثار پرستوں کا ایثار کم نظر آیا۔ پھر یہ بھی ہوا تھا کہ کچھ ایسے مفاد پرست لوگ جو انگریزوں کی ہر طرح

کی خدمت کرنے میں پیش پیش ہوتے تھے، آزادی کے بعد وہ اقتدار میں آ گئے اور انھوں نے اپنی کم ظرفی ظاہر کر دی۔ رئیس امروہی ایسے بے ملوث اور انگریزوں کے غلاموں کو کالے انگریز کا نام دیتے ہیں: رئیس امروہی کا قطعہ ملاحظہ کیجیے:

بڑے انمول جوہر ہیں ہمارے حکمرانوں کے
یہ انگریزی حکومت کے صدف کے بے بہادر ہیں
وہی انگریز کی خوبو ہے لیکن فرق اتنا ہے
وہ گورے تھے یہ کالے رنگ کے صاحب بہادر ہیں (قطعات رئیس امروہی، جلد اول)

آزادی کے بعد شعرا و ادبا کی طرف سے حالات کے مطابق زیادہ تر گلہ شکوہ اور حکمرانوں کو برا بھلا کہا گیا ہے لیکن اس تمام صورت حال کے باوجود کچھ ادیب ایسے بھی تھے جو ان حالات میں قنوطیت کی بجائے رجائیت کا رنگ بھرنے میں مصروف تھے۔ ایسے مصنفین کا نصب العین یہ تھا کہ اب تمام احوال کو حقیقت کی نظروں سے تسلیم کیا جائے اور پاکستان کو دل و جان سے قبول کر لینے کے بعد مستقبل کا لائحہ عمل طے کیا جائے تاکہ ان مسائل سے نکل کر ہم پاکستان کو عظیم سلطنت بنا سکیں اور اپنے طے شدہ مقاصد حاصل کر سکیں۔ ان میں احمد ندیم قاسمی بھی شامل ہیں۔ لکھتے ہیں:

کس لیے آج کی شب جشن چراغاں نہ کروں
دیس کی جنت ویراں کو فروزاں نہ کروں
اس زمین پر بھی اندھیروں کو نہ جمنے دوں گا
اپنی دیرینہ اڑانوں کو نہ تھمنے دوں گا
قمقمے برق کے مرمر کے دریچوں میں جلے
ان گھروندوں پہ مرا خون چراغوں میں جلے (جشنِ چراغاں، شعلہ گل)

احمد ندیم قاسمی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے باوجود ایک سچے پاکستانی کی طرح قوم کو مایوس کرنے کی بجائے دلاسہ دیتے ہیں۔ مایوسی اور تاریکی کے دور میں کسی کو آسرا دینا ایک مسلمان اور انسان دوست کی پہچان ہے جو احمد ندیم قاسمی کی شاعری کی بنیادی خصوصیت ہے۔

جب زخم کچھ مندمل ہو گئے تو آہستہ آہستہ شعرا و ادبا کی زیادہ تعداد نے قنوطیت کی بجائے رجائیت کو اپنا کر قوم کو نیا عزم اور بہتر نصب العین عطا کرنے میں اپنی کوششیں صرف کیں اور ملکی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کرنے میں توانائیاں صَرف کیں۔

## تعمیرِ ملک و قوم کے حوالے سے عزم کا اظہار:

ادب اور سماج کا رشتہ اس وقت سے قائم ہے جب سے انسان ادب سے متعارف ہوا لیکن جب بیسویں صدی میں دنیا کے مختلف ممالک میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریکیں چلیں تو یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔ دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح اردو ادب نے بھی تحریک آزادی ہند میں متحرک کردار نبھایا۔ تقسیم کے نتیجے میں دو آزاد مملکتیں وجود میں آئیں۔ ان میں پاکستان کی نسبت بھارت کے مسائل کم تھے اور وسائل پاکستان کے تناسب سے زیادہ تھے۔ علاوہ ازیں اس نے پاکستان سے الحاق شدہ ریاستوں پر بھی قبضہ جمانا شروع کر دیا جس سے پاکستان کو ملکی خود مختاری کا خطرہ پیدا ہو گیا اور آخر بھارت پاکستان کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔

اب پاکستانی قوم کا حوصلہ دیکھیے جس نے غربت و افلاس، بدامنی اور دیگر مسائل کے باوجود پاکستان کی تعمیر نو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور خود سے کئی گنا بڑے دشمن کے مقابلے میں ہمیشہ سینہ سپر رہی۔ اس نے کبھی بھی امید کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا اور تمام تر طوفان و آلام کے باوجود ملکی تعمیر و ترقی کا دیا بجھنے نہ دیا اور لاکھوں افراد کے خون سے لکھی تحریروں کو نیا عزم و فکر عطا کیا۔ عدو کی لاکھ سعی کے باوجود ملکی پرچم کو سرنگوں ہونے سے محفوظ رکھا کیونکہ آزادی کے خواب دیکھنے اور پایہ تکمیل تک پہنچانے والوں کے دل میں خدا کی رضا اور دین اسلام کے سربلندی تھی لہٰذا اس کے رہنے والوں کے دل میں بھی نعرہ تکبیر کی تاثیر باقی تھی اور اسی تاثیر کی بدولت انھوں نے اس کی دیواروں کو مسمار نہ ہونے دیا بلکہ نئے عزم اور ولولے سے اس کی فصیلوں کو وہ مضبوطی اور قوت عطا کی کہ دنیا دیکھتی ہی رہ گئی اور پاکستان عالمی دنیا اور عالم اسلام کے لیے مرکزی کردار کی حیثیت اختیار کر گیا۔

ہجرت و فساد اور غربت و افلاس سے دوچار قوم کی تعمیر نو میں دیگر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ ساتھ شعرائے اردو نے بھی نمایاں حصہ لیا۔ شعرائے اردو نے ملکی تعمیر کے عزم سے بھرپور ملّی نغموں سے قوم میں وہ قوت بخشی جس سے قوم نے ذاتی مسائل کو پس پشت ڈال کر نئے جذبہ اور ترنگ سے ملک و قوم کی تعمیر اور خواب اقبال کی تعبیر میں خوب کردار ادا کیا۔ احمد ندیم قاسمی کی نظم "اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ" اس نظریے کی عکاسی کرتی ہے:

خزاں سے رک سکا کب موسم گل
یہ اصل اصول زندگی ہے
اگر ہے جذبہ تعمیر زندہ
تو پھر کس چیز کی ہم میں کمی ہے (اگر ہے جذبہ تعمیر زندہ، محیط)

پاکستانی قوم میں جذبۂ تعمیر زندہ کرنے میں اردو شعرا کا اہم کردار ہے۔ انھوں نے شعری نغموں سے مایوس و ناامید قوم میں امید و یاس کی نئی روح ڈال دی۔ ماہر القادری پاکستانی قوم کو نئی طلوع اور امنگوں کے ساتھ بیدار ہونے کا مفہوم بتاتے ہیں۔ ان کی نظم "چلو" سے اقتباس ہے:

بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھاتے ہوئے چلو
ایقان کے چراغ جلاتے ہوئے چلو
جن کو مٹا سکے نہ کوئی دورِ انقلاب
کچھ ایسے نقش بھی تو بناتے ہوئے چلو
اب وقت ہے کہ شعر و ادب کی زبان سے
مفہومِ لا الہ بتاتے ہوئے چلو (چلو، فردوس)

بلاشبہ یہ وقت کانٹوں کی تکلیف سے کراہنے کا نہیں تھا بلکہ کانٹوں پر سے گزرتے ہوئے آگے بڑھنے کا موقع تھا اور وہ نعرہ جو قیامِ پاکستان سے پہلے میاں بشیر احمد کی آواز میں سب مسلمانوں نے لگایا تھا یعنی "پاکستان کا مطلب کیا۔ لا اِلہ الااللہ"، اب اس نعرے کو عملی جامہ پہنانے کا قیمتی موقع تھا۔ لہٰذا آزادی کے چند سالوں بعد تعمیرِ وطن کے عزم و استقلال کی ایسی لہر اٹھی جس نے ہر ذی شعور پاکستانی کو لپیٹ لیا اور وہ شعرا بھی جو اپنے گھر کا چراغ روشن دیکھ کر چپ تھے یا پھر اوروں کی طرح تماشائی بنے ہوئے تھے، اپنے خواب سے چونک اٹھے اور گزرے لمحوں پر ملامت کرتے ہوئے ان کو یہ احساس پیدا ہو گیا کہ وطن ہے تو ان کی ذات اور ان کا فن محفوظ ہے۔ ملک کے بغیر ان کا وجود بھی باقی نہیں رہے گا۔ لہٰذا انھوں نے اپنے فن کو ملکی اثاثہ سمجھ کر اس کی تعمیر کے لیے نغمے تحریر کرنے کا عہد کیا۔ احمد فراز کی نظم "اے مری ارضِ وطن" سے اقتباس ہے:

آج سے میرا ہنر پھر سے اثاثہ ہے ترا
اپنے افکار کی نس نس میں اتاروں گا تجھے
وہ بھی شاعر تھا کہ جس نے تجھے تخلیق کیا
میں بھی شاعر ہوں تو خون دے کر سنواروں گا تجھے
اے مری ارض وطن، اے مری جاں، اے مرے فن
جب تلک تابِ تکلم ہے پکاروں گا تجھے (اے مری ارض وطن، شب خون)

احمد فراز کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جو مزاحمتی ادب کے صفِ اوّل کے تخلیق کاروں میں سرِ فہرست ہیں اور جنھوں نے مارشل لاء کے دوران میں بھی جھکنا گوارہ نہ کیا اور عہد جبر میں جب ساری آوازیں خاموش ہو

گئیں یا مدھم پڑ گئیں تو احمد فراز کی آواز نے حق کے لیے آواز بلند کیے رکھی لیکن وہ سب وطن کی محبت کے لیے تھا۔ احمد فراز کو وطن سے عقیدت تھی جو ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے اور ان کی شخصیت سے بھی حب الوطنی عیاں ہوتی ہے۔ انھوں نے وطن کی خاطر جلاوطنی بھی کاٹی اور غریب الوطنی کا عذاب بھی چکھا۔ محبوب ظفر احمد فراز کی حب الوطنی اور دور مشکلات کے بارے لکھتے ہیں کہ فراز ایسے شاعر ہیں جو ان سب کربناک لمحوں سے گزرے ہیں۔ وہ جہاں کہیں بھی رہ رہے ہوں، ان کی سوچ کی ایک کھڑکی وطن کی طرف ضرور کھلتی ہے۔ انھیں اپنی مٹی سے والہانہ محبت ہے۔ اس کا اظہار ان کے ترانوں اور نغموں میں جا بجا ملتا ہے۔"(۵۲) فراز کو معلوم تھا کہ ارض وطن کی آزادی کے لیے کس قدر خار دار کانٹوں سے گزرنا پڑا ہے اور کتنے لوگ جان کی بازی ہار گئے۔ اسی طرح جب ملک دولخت ہوا تو دیگر حب الوطن شعرا کی طرح فراز بھی خون کے آنسو روئے اور پھر یہ آنسو شعروں کی صورت میں کاغذوں کی زینت بنے۔

فراز نے وطن کی محبت اور مٹی کی خوشبو کے حوالے سے کئی ترانے اور نغمے لکھے۔ فراز کا گلہ شکوہ صرف ان غاصبوں اور مفاد پرست طبقے سے تھا جن کو وطن کی تعمیر سے زیادہ اقتدار اور حوس اقتدار عزیز تھا۔ فراز چاہتے تھے کہ ملک میں حقیقی معنوں میں جمہوریت قائم ہو جو اس کی تعمیر و ترقی میں کلیدی کردار ادا کرے۔ فراز کو وطن اور وطن کی مٹی اور کھیتوں و کھلیان سے بھی محبت تھی جس کا اظہار وہ اپنی شاعری میں کرتے ہوئے صحراؤں کو گلزار بنانے کا عزم کرتے ہیں:

یہ کھیت ہمارے ہیں یہ کھلیان ہمارے
پورے ہوئے اک عمر کے ارماں ہمارے
ہم وہ جو کڑی دھوپ میں جسموں کو جلائیں
ہم وہ ہیں کہ صحراؤں کو گلزار بنائیں
ہم اپنا لہو خاک کے تودوں کو پلائیں (یہ کھیت ہمارے ہیں یہ کھلیان ہمارے، شب خون)

ملّی نغمہ نگاری کی روایت میں سید ممتاز علی سرمد بخاری کی خدمات کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہیں جنھوں نے اپنے عہد کے جذباتی و ذہنی رویوں کا انعکاس، خونی رشتوں کے ٹوٹنے اور ذہنی تکالیف کو عارضی سمجھ کر شعری لفظوں سے قوم و ملت میں نئے عزم سے تعمیرِ وطن کا حوصلہ پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ سرمد بخاری کے خون میں آزادی کی امنگ شامل تھی کیونکہ ان کے والد سید مبارک علی شاہ ایک صوفی صفت اور خوش طبع انسان تھے جبکہ ان کی والدہ نے اپنے دور کی خواتین میں اسلامی شعور اور حصول پاکستان کی جدوجہد اور ترنگ پیدا کر دی تھی۔ وہ سٹیج پر ہزارہا خواتین کو سیاسی بیداری کے موضوع پر لیکچر دیتیں ۔ جبکہ سرمد بخاری کے ماموں سید عبد العزیز شہید

جالندھری نے بھی پنجاب بھر میں مسلم لیگی جلسوں سے خطاب اور تشکیل پاکستان میں عملّی طور پر حصہ لیا تھا۔اس لیے سر مد بخاری نے وراثت میں پائی جانے والی جدوجہد آزادی کو انھوں نے تعمیر پاکستان کے لیے وقف کر دیا اور ملّی نغموں سے قوم کی ایک مثبت اور تعمیری کردار سے رہنمائی کی۔"نقش بول اٹھے" سرمد بخاری کا پہلا شعری سرمایہ ہے جو انھوں نے پاکستان اور تعمیر پاکستان کے لیے وقف کیا۔بلاشبہ سرمد بخاری نے اس شعری مجموعے میں حب الوطن ہونے اور اپنے آباؤ اجداد کی وراثت کو نبھانے میں اہم ثبوت فراہم کیا ہے جو قابل تعریف و قابل عمل ہے۔

سرمد بخاری اپنی نظم "قائداعظم" میں قوم کو قائد کے تین اصول تنظیم، اتحاد اور یقین پر عمل پیرا ہونے کا درس دیتے ہیں اور پاکستانی قوم کی کامیابی کو ان اصولوں سے وابستہ کرتے ہیں:

قائد کو یوں خراج عقیدت ادا کریں
اس کشور حسین کی حفاظت کریں
احسان اس کا یاد رکھیں اور دعا کریں
جو حریّت مزاج ہیں وہ فیصلہ کریں
اس پاک سرزمیں کو ایسا دوام ہو
سرمد ہر اک زباں پہ اسی کا ہی نام ہو (قائداعظم، نقش بول اٹھے)

مشہور ملّی نغمہ "تیرا پاکستان ہے یہ میرا پاکستان ہے" کے خالق بشیر فاروق کا ذہن ہمیشہ ملک و ملت اور اسلامی تعلیمات کا شفاف آئینہ رہا ہے۔ان کے تمام شعری مجموعے اسلام اور پاکستان کی تعمیر و ترقی کا پرتو ہیں۔بشیر فاروق کے کلام کی خوبی یہ ہے اس میں مصور پاکستان علامہ اقبال اور بابائے صحافت مولانا ظفر علی خان کے فکر و خیال کی روانی نظر آتی ہے۔چونکہ مندرجہ بالا دونوں شخصیات عظیم شاعر اور محب رسول ﷺ تھیں لہٰذا یہ اثرات بشیر فاروق کے ملّی نغموں میں پائے جاتے ہیں۔

بشیر فاروق کے ملّی نغمے صرف تعمیر پاکستان اور ملت اسلام کی ترقی کے لیے نہیں بلکہ تحریک پاکستان سے قیام پاکستان، مشاہیر پاکستان و اسلام، شہر پاکستان، شہیدان اسلام اور مسلمانانِ اسلام کے کئی تاریخ ساز واقعات ان کے قلم کی زینت بنے ہیں لیکن ان کا یہ ملّی نغمہ "تیرا پاکستان ہے یہ میرا پاکستان ہے" نے بشیر فاروق کو شہرت و عزت کی بلندیوں تک پہنچایا۔مزید ان کا نغمہ "پاکستان کا مطلب کیا۔لا الہ الااللہ" جیسے جاودانی نغموں نے بشیر فاروق کی حب الوطنی اور اسلام پسندی پر مہر ثبت کر دی ہے۔ان کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے ملّی نغمے اسلوب بیان کے حوالے سے بھی فکری پختگی اور جوش و ولولہ سے معمور ہیں۔روزنامہ جنگ کے ایڈیٹر چیف

میر خلیل الرحمان ۱۴ جنوری ۱۹۸۵ء کو ان کے شعری مجموعے " بوئے گل" کی اشاعت پر بشیر فاروق کے کلام کو سراہتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بشیر فاروق نے کئی نظمیں اور گیت لکھے ہیں جو قومی اور ملّی شاعری کی صف میں آتے ہیں۔ ان نظموں اور گیتوں میں محبت، اخوت، حب وطن، وطن دوستی اور اسلام پسندی کی ترغیب اور تحریک پائی جاتی ہے۔ یہ کہنا بجا نہ ہو گا کہ دور حاضر اس قسم کے قومی ترانوں اور ملّی گیتوں کی تخلیق کا متقاضی ہے اور بشیر فاروق اس تقاضے کی تکمیل بڑی کامیابی سے کر رہے ہیں "(۵۴)بشیر فاروق کے کئی ملّی نغمے خواص وعام کی زبانِ زدِ عام بھی ہو چکے ہیں جس وجہ سے ان کی شہرت و مقبولیت اور عزت و تکریم میں اضافہ ہوا ہے۔

بشیر فاروق نے ملّی نغموں میں ملک کے تمام علاقوں اور تہذیبوں سے تعلق رکھنے والوں کو اپنے موضوع کا حصہ بنا کر تعمیر ملک و ملت کے لیے راستہ ہموار کیا ہے اور ہر فکر و مکتب کے دل میں ملّی جذبہ بیدار کرنے کی سعی کی ہے۔ تعمیرِ ملک و قوم کے حوالے سے ان کا نغمہ "ہر لب پہ یہ نغمہ ہے یہ دیس ہمارا ہے" میں وہ تمام پیشہ ہائے زندگی سے وابستہ افراد کی ترجمانی پاکستان کی تعمیر سے محبت کا اظہار سے کرتے ہیں:

اس کے گل و لالہ کو ہم خوں سے نکھاریں گے
اس کے مہ و انجم کو دنیا میں ابھاریں گے
ہر دل کی یہ ٹھنڈک ہے ہر آنکھ کا تارا ہے
ہر لب پہ یہ نغمہ ہے یہ دیس ہمارا ہے

(ہر لب پہ یہ نغمہ ہے یہ دیس ہمارا ہے، تیرا پاکستان ہے یہ میرا پاکستان ہے)

بشیر فاروق نے ملّی نغموں میں پاکستان کو مستقبل میں عالم اسلام میں مرکزی حیثیت حاصل ہونے کی پیش گوئی بھی کی ہے یعنی آنے والے دور میں پاکستان اسلام کا قلعہ ہو گا جس کے بل بوتے پاکستان کی تعمیر خالص اسلامی تعلیمات کے مطابق ہو گی۔ جہاں پہ پوری دنیا کے مسلمان اکٹھے ہو کر کفر کے خلاف جہاد کا آغاز کریں گے۔ بشیر فاروق کا ملّی نغمہ "بلند اک ساتھ ہوں گی پھر مسلمانوں کی تکبیریں" سے اقتباس ہے:

اٹھیں گی حق کی بنیادوں پہ پاکستان کی تعمیریں
لکھی جائیں گی خونِ دل سے پھر قرآن کی تفسیریں
مرے ذروں کو بخشی جائیں گی سورج کی تنویریں
بلند اک ساتھ ہوں گی پھر مسلمانوں کی شمشیریں
بلند اک ساتھ ہوں گی پھر مسلمانوں کی تکبیریں

(بلند اک ساتھ ہوں گی پھر مسلمانوں کی تکبیریں، تیرا پاکستان ہے یہ میرا پاکستان ہے)

ملکی تعمیر و ترقی اور بلندیوں کو چھو لینے کا عزم صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی شاعری میں بھی عیاں ہے۔ وہ آزادی کو اجالا اور نور سے تشبیہ دیتے ہیں اور اجالے میں اجالے کو ترسنے یعنی ترقی پسند تحریک والوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ اسی نور سے اجالا کر لیں اور مزید کسی اجالا کا انتظار چھوڑ دیں کیونکہ پاکستان جیسی نعمت ہمارے لیے سب سے بڑا اجالا ہے۔ اس طرح صوفی غلام مصطفی تبسم شکوہ کرنے والوں کی مثبت رائے سے اصلاح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی نظم "صبح آزادی" سے اقتباس ہے:

کیوں ترستے ہو اجالے میں اجالے کے لیے
یہ اجالا ہے اسی صبح منور کی ضیاء
جس کی کرنوں سے مٹے اپنی غلامی کے نشاں
جس کی کرنوں نے کیا اپنی جبیں کو بے داغ
آؤ اس نور سے ہم دل کو منور کر لیں
آؤ اس نور میں اک اور اجالا بھر لیں (صبح آزادی، سو بار چمن مہکا)

فیض احمد فیض اردو شاعری اور ترقی پسند تحریک میں کلیدی مقام رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری خالص ترقی پسندوں کے فکر و خیال کی انعکاس ہے وہ اردو شاعری میں مزاحمتی ادب کے شعرا میں بھی سر فہرست ہیں۔ ان کی شاعری میں زیادہ رجحان ریاست اور حکمران ریاست کے خلاف پایا جاتا ہے لیکن در اصل انھوں نے پسے ہوئے طبقے کی آواز بلند کرنے کی ہمت کی ہے۔ جب دیکھا کہ ریاست اور اصول ریاست میں بہتری آ رہی ہے تو انھوں نے اس بہتری کو خوش آمدید کہا۔ ان کی نظم "اگست ۱۹۵۲ء" میں ان کو امید و یاس کی تھوڑی سی جو کرن نظر آتی ہے اس کو تعمیرِ پاکستان کے سلسلہ میں شمار کیا جا سکتا ہے:

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں
اب بھی خزاں کا راج ہے لیکن کہیں کہیں
گوشے رہ چمن میں غزل خواں ہوئے تو ہیں (اگست ۱۹۵۲ء، نسخہ ہائے وفا)

تعمیر پاکستان کے حوالے سے لکھے گئے شعر پاروں کی تخلیق میں دیگر کئی شعرا نے حصہ لیا ہے جن میں محشر بدایونی، ناصر کاظمی، فضل کریم فضلی، طفیل احمد جمالی، اثر صہبائی، صہبا لکھنوی، روش صدیقی، قتیل شفائی اور بہت سے معروف و غیر معروف شعرا شامل ہیں۔ ان شعرا نے ملّی نغموں کی تخلیق سے تعمیر ملک و قوم کا اظہار اس

اندازسے کیا کہ قارئین بھی شعرا کی فکر میں شامل ہو کر معمار پاکستان کی فہرست میں شامل ہو گئے لہٰذا ان شعرا کا پاکستان کو مستحکم کرنے اور عالمی قوت بنانے میں کردار لائق تحسین ہے۔

## مناظرِ پاکستان کو نمایاں کرنے والے شعر پارے:

قدرتی مناظر ہوں یا انسانی فن کے شاہکار، دیکھنے والوں کے دل کو تسکین پہنچانے کا سامان مہیا کرتے ہیں لیکن شعرا کے لیے یہ مناظر ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو نکھارنے کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ شاعر کی تخلیقی کاوشوں میں غمزدہ چہرے پر درد کی تحریریں، لبوں پر پھیلی ہلکی مسکراہٹ اور دل غم سے لبریز، چمکتی آنکھوں میں شوخ جذبے اور دل میں اترنے والے قدرتی مناظر کو الفاظ کی عرق ریزی سے شعر کا جامہ پہنا کر پڑھنے اور سننے والوں کو ایسے اسرار و رموز سے آشنا کرتے ہیں، جہاں عام اذہان کی رسائی ناممکن ہوتی ہے۔ کائنات اور اس میں موجود تمام اشیاء بہت خوبصورت ہیں لیکن ان کو دیکھنے اور محسوس کرنے کے لیے ذوق والی نگاہ کا ہونا ضروری ہے۔ جہاں تک شعرا کا تعلق ہے تو وہ عام انسانوں سے زیادہ حساس ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ قدرت کے ان مناظر یا انسانی تخلیقی کاوشوں کو نہ صرف دیکھتے ہیں بلکہ دل کے تاروں سے ان کو محسوس بھی کرتے ہیں اور پھر ان میں اپنی تخلیقی کاوشوں سے ایسا رنگ بھرتے ہیں کہ قارئین عش عش کر اٹھتے ہیں، مرزا غالب ارتقاءِ کائنات اور اس میں ہونے والی تغیر پذیری کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

(بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے، دیوانِ غالب)

ہر شاعر کا حسنِ کائنات کو دیکھنے کا انداز الگ ہو سکتا ہے لیکن ایک چیز جو تمام شعرا میں مشترک ہے وہ ان کا حسنِ بیان ہے۔ شاعر قدرت کی کاریگریوں اور انسانی شاہکاروں کو اس خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں کہ قارئین ان مناظر کے ساتھ شاعر کی تخلیق کاریوں سے بھی لطف اٹھاتے ہیں۔

خطۂ پاکستان کا شمار دنیا کے ان مقامات میں ہوتا ہے جو دل آویز اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے مالا مال ہے اور بقدرت نے اسے خوبصورت اور دلکش مناظر سے نوازا ہے۔ ہر سال لاکھوں ملکی و غیر ملکی سیاح ان مناظر کا نظارہ کرنے اور حِظ اٹھانے کے لیے سینکڑوں میل سفر طے کر کے اور کئی تکالیف اٹھا کر ان مقامات تک پہنچتے ہیں۔ پاکستان میں برف پوش پہاڑوں اور وادیوں، وادی کشمیر جنت نظیر اور کئی دیگر مقامات ایسے ہیں جو سیاحوں اور شعرا دونوں کے لئے خاص دلچسپی کا باعث ہیں۔ ان مقامات کو اردو شعرا نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور گلوکاروں

اور موسیقاروں نے ان کی بہترین گلو خلاصی کر کے مِلّی نغموں کی روایت میں اضافہ کیا ہے۔ ان مِلّی نغموں سے پاکستان کے ان مناظر کی عالمی سطح پر خاصی پذیرائی ہوتی ہے۔ قتیل شفائی پاکستان کی دلکشی کو اپنے شاعرانہ لفظوں میں خطہ بے مثالی کہتے ہیں کہ جس کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں ہے:

ہر ایک ذرے کی دلکشی میں ، دمک رہا ہے ضمیر اپنا
سدا مہکتی رہے وہ مٹی ، اٹھا ہے جس سے خمیر اپنا
بنی ہوئی ہیں نشان منزل تمام تر اس کی شاہراہیں
جواب رکھتا نہیں جہاں میں ، یہ خطہ بے نظیر اپنا

(وطن کے لیے ایک غزل، ہزارہ میں مِلّی شاعری)

بادشاہی مسجد اسلامی فنِ تعمیر اور عہد مغلیہ کے جمال کی ایک علامت ہے جس کی مناظر پاکستان میں گراں قدر اہمیت مسلّم ہے۔ یہ مسجد اورنگزیب عالمگیر نے ۱۶۷۳ء میں لاہور میں بنوائی۔ شاہی قلعہ، داتا دربار، مینار پاکستان، شالیمار باغ اور مزار اقبال سمیت دیگر مناظر کی طرح یہ مسجد بھی لاہور شہر کی پہچان ہے۔ یہ مسجد فیصل مسجد اسلام آباد کے بعد پاکستان کی سب سے بڑی مسجد ہے جس میں بیک وقت ساٹھ ہزار نمازی نماز ادا کر سکتے ہیں۔ اسلم انصاری بادشاہی مسجد کی جمالیات اور اسلامی فن تعمیر کی عظمت کو اس طرح نظم کرتے ہیں:

دستِ عالمگیر ہو یا تیشہ محنت کشاں
اس کی زیبائی ہے رہنِ سرخیٔ خون جگر
تین صدیوں سے فزوں مدت سے ہے ٹھہرا ہوا
یہ ابد کی شاخ پر تخلیق کا تازہ ثمر
رفعتِ تخیل پر ہے اس عمارت کی اساس
مہر و مہ سے ہم سخن ہوتے اس کے بام و در

(بادشاہی مسجد، منتخب کلیات اسلم انصاری)

گلگت بلتستان جو شمالی علاقہ جات کے نام سے مشہور دنیا کے بلند ترین اور دشوار گزار پہاڑی سلسلوں قراقرم، ہمالیہ اور کوہ ہندوکش پر واقع خوبصورت ترین علاقہ ہے جس کے مقامی مجاہدین نے ۱۹۴۸ء میں آزادی کی جنگ لڑ کر پاکستان میں شمولیت اختیار کی۔ گلگت بلتستان کے محاذ پر پاکستان بھارت سے تین جنگیں (۱۹۴۸ء، کارگل اور سیاچین) لڑ چکا ہے جس سے اس علاقے کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ گلگت بلتستان میں دنیا کے تین بڑے گلیشئر پائے جاتے ہیں اور دنیا کی دوسری بڑی چوٹی کے۔ٹو بھی اسی خطے میں واقع ہے اس کے علاوہ کئی

خوبصورت مناظر اس کی دلکشی میں اضافہ کرتے ہیں۔ اقبال عاصی گلگت کی خوبصورت زمین اور قدرتی مناظر کو ان الفاظ میں نظم "گلگت" میں ادا کرتے ہیں:

سبز وادی ، کوہساروں کی زمیں
بہتے جھرنوں اور چناروں کی زمیں
ہر بلندی تجھ سے ہی منسوب ہے
چاند سورج اور ستاروں کی زمیں
سبز زار اور لہلہاتی کھیتیاں
ٹھنڈے چشموں ، مرغزاروں کی زمیں

(گلگت، شمالی علاقے کا اردو ادب)

کے۔ٹو کی چوٹی دنیا کی دوسری بڑی چوٹی ہے وہ بھی شمالی علاقے میں واقع ہے اور سرزمین پاکستان کا حصہ ہے۔ پاکستان کے مناظر میں عالمی سطح پر جن مقامات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ان میں یہ پہاڑ کے۔ٹو بھی شامل ہے۔ بشیر فاروق کے۔ٹو کی عظمت ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:

یہ کے۔ٹو عزم و ہمت کا نشاں ہے
کئی صدیوں سے وقفِ امتحاں ہے
سبق ہے اس کی ہستی بہر انساں
معمر ہے مگر ہر دم جواں ہے

(کے۔ٹو، تیرا پاکستان ہے یہ میرا پاکستان ہے)

۲۳مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد پاکستان آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ لاہور میں قائداعظم محمد علی جناح کی صدارت میں منظور ہوئی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد قرارداد کی جگہ جو کہ منٹو پارک کہلاتی تھی، یادگار تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ منصوبہ ۱۹۶۰ء میں شروع ہو کر ۱۹۶۸ کو پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس قومی عمارت کو مینار پاکستان کے نام سے منسوب کیا گیا اور جس جگہ مینار تعمیر کیا گیا اس پارک کو منٹو پارک کے بجائے اقبال پارک کے نام سے نسبت دی گئی۔

مینارِ پاکستان پاکستانی معماروں اور انجینئرز کے فن تعمیر کا بہترین شاہکار ہے۔ اس مینار کی تعمیر میں جو کمیٹی تشکیل دی گئی اس میں مختار مسعود بھی شامل تھے۔ مختار مسعود مینار کی تعمیر کے حوالے سے اپنی شاہکار تخلیق "آوازِ دوست" میں لکھتے ہیں کہ مینار کی ابتدائی صورت دفاعی ضرورت کے تحت وجود میں آئی، پھر اس کی

علامتی حیثیت قائم ہوئی۔ اس کے بعد یہ دین کا ستون بنا اور آخر کار نشان خیر کے طور پر بنایا جانے لگا۔ مینارِ قرارداد ان ساری حیثیتوں پر محیط ہے۔ یہ نظریاتی دفاع کی ضرورت، تحریک آزادی کی علامت، دین کی سرفرازی کا گواہ اور ہماری تاریخ کا ایک نشان خیر ہے۔"(۵۴) یہی وجہ ہے کہ پوری پاکستانی قوم مینار پاکستان کو قومی سلامتی کی علامت سمجھ کر قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

مینارِ پاکستان آزادی کی تعبیر، عظمتِ اسلام اور پاکستانی عوام کے دل کی دھڑکن ہے۔ یہ قائم ہے تو پاکستان قائم ہے اور پاکستان کے قائم رہنے سے ہی پاکستانی قوم بھی دنیا کے نقشے سے ایک آزاد قوم کے طور پر متعارف ہو سکتی ہے۔ لہٰذا مینارِ پاکستان سے ملک کا بچہ بچہ پیار کرتا ہے اور شعرا نے اس کو ملّی نغموں کی زینت بنایا ہے جو ہر پاکستانی کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اکرم باجوہ نظم "مینار پاکستان" میں اس کی شان و شوکت کو یوں ادا کرتے ہیں:

پاکستان کا دل لاہور ہے تو لاہور کی جان
تیرا روشن قدِ بالا، عظمت کا عنوان
تیرے دم سے نظم، اخوت، تنویرِ ایمان
تو کہ حسنِ نور سحر ہے اور قصرِ ایقان

تو میرے اسلاف کے استقلال کی موجِ نور
تو میرے مینائے وطن کا اجلا کوہِ طور
تو ہے اک نشانِ منزل معروف و مشہور
تو ہے اک مینار روشن نقشِ پاکستان

(مینارِ پاکستان، تکبیر کا رنگ للکار ہوا)

اکرم باجوہ اپنی شاعری میں وطن سے محبت، افواج پاکستان سے پیار اور پاکستان سے محبت و حفاظت میں اپنا خون بہانے والوں کو وہ جذبات کی حد تک پلکوں پر بٹھا لیتے ہیں۔ ان کی شاعری کا بنیادی موضوع اسلام اور پاکستان ہے۔ اسلام ان کا ایمان ہے اور پاکستان ان کے ایمان کی تکمیل، وہ پاکستان اور پاکستان کی مٹی سے بے پناہ محبت کرتے ہیں جو ان کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔ انھوں نے ملّی نغموں میں ہیئت اور موضوع کے کئی دریچے کھولے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ اکرم باجوہ قلم سے جہاد کر رہے ہیں اور پاکستانی فوج کے قلمی سپاہی ہیں جو اپنے خون کے قلم سے وطن اور اہل وطن کے لیے ملّی نغموں کی صورت میں عسکری ساز و سامان تیار کر رہے ہیں۔ یوسف عالمگیرین جو ماہنامہ ہلال کے مدیر ہیں۔ اکرم باجوہ کی قومی و ملّی شاعری کے بارے لکھتے ہیں:

"اگر یوں کہا جائے کہ اکرم باجوہ کی شاعری سے اپنی مٹی کی خوشبو آتی ہے تو
بے جا نہ ہو گا، "پاکستان" ان کے وجود کا حصہ ہے۔ وہ پاکستان اور اس کی وادیوں
پر صرف خود ہی نثار نہیں ہوتے بلکہ اپنے ہم وطنوں سے بھی الفت اور رغبت کا
تقاضا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔" (۵۵)

اکرم باجوہ نے قومی و ملّی نغمہ نگاری میں جن موضوعات کو حرفِ قلم بنایا ہے ان میں ایک "نشانِ حیدر" بھی ہے۔ نشانِ حیدر پاکستان کا سب سے بڑا فوجی اعزاز ہے جو اب تک دس شہدا کو مل چکا ہے جنھوں نے وطن کی عزت و حفاظت کے لیے شجاعت و بہادری کے جوہر دکھائے اور اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا اور وطن کی مٹی کو اپنے خون سے سیر اب کیا۔ نشانِ حیدر دراصل حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لقب کی نسبت سے رکھا گیا ہے جو بہادری اور دلیری میں ضرب المثل ہیں۔ نشانِ حیدر کو پاکستان کے قومی اثاثوں میں شمار کیا جاتا ہے جو ملکی اور عالمی سطح پر بھی پاکستان کی پذیرائی میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اکرم باجوہ نظم "نشان حیدر" میں تمغۂ نشان حیدر کے بارے فرماتے ہیں:

بہادری کا ، شجاعتوں کا ، یہ جانثاری کا پاک ، تمغا
یہ شیر یزداں ، یہ فاتحِ خیبر، علی کی نسبت کا خاص طُغرا
وارِ ملّت ہے، فخرِ عسکر
نشانِ حیدر، نشانِ حیدر

(نشانِ حیدر، تکبیر کا رنگ للکار ہوا)

وطنِ پاکستان کا چپہ چپہ خوبصورت اور جمال خلد بریں سے ممثل ہے۔ اس میں سال کے چار موسم، زرخیز زمینیں، بہتے دریا اور ہری بھری فصلیں اس کے نظاروں کو چار چاند لگا دیتی ہیں۔ بہار کے موسم میں یہ ملک ایک سجی دلہن سے کم نہیں ہوتا جبکہ موسم برسات میں بارشوں سے ندی نالے بھر جانے سے اس کے حسن و جمال اور دلکشی بڑھ جاتی ہے۔ شعرائے پاکستان ان دل نشیں نظاروں کو ملّی نغموں میں ڈھال کر ملّی نغمہ نگاری کی روایت میں اضافہ کے ساتھ ملک و ملت سے محبت کا کھلا اظہار کرتے ہیں، ایسے ہی ایک حبِ وطن شاعر محمود الرحمن کے قلم سے انتخاب ہے:

بہر گام پر کیف و رنگیں فضائیں
طرب خیز و جاں بخش ٹھنڈی ہوائیں
فلک پر رواں کالی کالی گھٹائیں

عروس چمن کی یہ دل کش ادائیں
یہ اپنا وطن ہے یہ اپنا وطن

(بہر گام پر کیف ورنگیں فضائیں، قومی نظمیں)

پاکستان کے خوبصورت اور دلکش نظاروں میں دریا بھی اضافہ کرتے ہیں، خاص کر صوبہ پنجاب اور خیبر پختونخوا کو ملانے والا دریائے سندھ کا پل جو اٹک پل کے نام سے بھی مشہور ہے۔ یہاں جب دریائے کابل اور دریائے سندھ کے پانی ملتے ہیں تو ملاپ کے باوجود دور فاصلوں تک دونوں دریا اپنی الگ شناخت بر قرار رکھتے ہیں اور دیکھنے والے اس پر لطف نظارہ سے معزوز ہوتے ہیں۔ شاعر بھی اس منظر کی دلکشی سے محفوظ نہ رہ سکا اور یوں گویا ہوا:

یہ راوی کے دلکش کناروں کا منظر
اٹک کے یہ پر نور دھاروں کا منظر
یہ بولان کے کوہساروں کا منظر
یہ مہران کے رنگیں نظاروں کا منظر
یہ اپنا وطن ہے یہ اپنا وطن

(بہر گام پر کیف ورنگیں فضائیں، قومی نظمیں)

مناظرِ پاکستان میں شاہراہ قراقرم کو خاص اہمیت حاصل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شاہراہ پاکستان اور چین کو زمینی راستے سے ملانے کا بڑا ذریعہ ہے۔ گو کہ اب پاک وچائنہ اقتصادی راہداری پہ کام کی رفتار کافی تیز ہے لیکن شاہراہ قراقرم کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ یہ عظیم شاہراہ کوہ قراقرم اور کوہ ہمالیہ کے بہت بڑے پہاڑی سلسلوں کو کاٹ کر بیس سال کے عرصے یعنی ۱۹۸۶ء میں مکمل ہوئی۔ شاہراہ قراقرم کی تعمیر میں سینکڑوں جانیں ضائع ہوئیں۔ اس کی لمبائی تیرہ سو کلو میٹر ہے اور یہ چین کے صوبہ سنکیانگ کے شہر کاشغر سے شروع ہو کر پاکستان کے شمالی علاقہ جات (گلگت، ہنزہ وغیرہ) سے گزرتی ہوئی صوبہ خیبر پختونخواہ کے علاقوں ایبٹ آباد ہزارہ سے ہو کر حسن ابدال کے مقام پر جی ٹی روڈ سے جاملتی ہے۔ شاہراہ قراقرم کو دنیا کی بلند ترین شاہراہ ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے اور اسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ بھی کہا جاتا ہے۔

پاکستان کے دوسرے خوبصورت اور مشہور مناظر کی طرح شاہراہ ریشم کو بھی شعرا نے ملّی نغموں کی روایت میں شامل کیا ہے۔ کیونکہ یہی مناظر پاکستان کا سرمایہ اور ورثہ ہیں۔ سب سے اہم بات یہ کہ شاہراہ قراقرم

پاکستان چین دوستی کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ اکرم باجوہ "شاہراہ قراقرم" کے عنوان سے لکھی مِلّی نظم میں یوں گویاہیں:

میری ارضِ پاک کی جانبِ شمال
اک کشادہ رہ گزر ہے با کمال
حسن فطرت سے مزین ، مالا مال
ششدر و حیراں کرے جس کا جمال

(شاہراہ قراقرم، تکبیر کا رنگ للکارہوا)

اس کے علاوہ بھی پاکستان میں کئی دیگر مناظر ہیں جن کو شعرا نے مِلّی نغموں میں ادا کیا ہے ان مناظر میں فیصل مسجد اسلام آباد، مزار قائد کراچی، شاہی قلعہ لاہور و دیگر شامل ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو پاکستان کا کونہ کونہ ایک خوبصورت دلکش اور الگ منظر پیش کر رہا ہے جن کی مثالیں دنیا کے دوسرے ممالک میں بہت کم ملتی ہیں۔

## مِلّی نغموں میں پاکستان چین دوستی کا اظہار:

اسلامی تاریخ میں مملکتِ "چین" آج سے چودہ سو سال پہلے کا متعارف ہے لیکن اگر موجودہ دور میں جس حوالے سے بھی دیکھیں، تو اس ملک کی اہمیت کی پیش گوئی سو فیصد درست ثابت ہو رہی ہے۔ علم و ہنر، ٹیکنالوجی اور دیگر علوم میں آج جس مقام کی طرف چین گامزن ہے، اس سے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ آنے والے دور میں چینی علوم و فنون کو حاصل کیے بغیر دنیا کی ترقی ادھوری ہو گی۔ چین کی ابھرتی ہوئی معیشت سے دنیا کی طاقتور طاقتیں خوفزدہ ہیں لیکن پاکستان کی طرف سے اس ترقی کو سراہا جارہا ہے۔

چین موجودہ دور کی ریاستوں میں قدیم ریاست تصور کی جاتی ہے جس کی تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب بیرونی دباؤ اور اثر و رسوخ سے محفوظ رہا ہے۔ چین کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے اور صدیوں تک چین دنیا کی ترقی یافتہ قوموں میں شمار کیا جاتا رہا ہے جس کے اثرات بیرون ممالک میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔

۱۹۴۹ء میں چین میں ماؤ زے تنگ نے عوامی جمہوریہ چین کی بنیاد رکھی تو ۱۹۵۰ء میں پاکستان پہلا اسلامی ملک تھا جس نے چین کی آزادی کو تسلیم کیا(۵۶) اور دونوں ممالک کے تعلقات کے اک نئے دور کا آغاز ہوا جس میں ستر سالوں سے مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ تعلقات بڑھتے ہوئے دوستی کی گرہ سے بندھ گئے اور دونوں ممالک معاشی، دفاعی اور توانائی کے شعبوں میں ایک دوسرے کے دست و بازو بن چکے ہیں۔

دونوں ممالک کے تعلقات میں اس وقت ایک نیا موڑ آیا جب پاکستان نے چین اور امریکہ کے تعلقات بہتر کرنے میں بھرپور کردار ادا کیا اور امریکہ کے وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے چین کا دورہ کیا۔ جس کے بعد چین اور امریکہ کے تعلقات میں نہ صرف بہتری آئی بلکہ چین کو عالمی برادری میں بھی بلند مقام حاصل ہوا اور وہ اقوام متحدہ کا مستقل رکن بن کر ویٹو کا حق استعمال کرنے لگا۔

کہا جاتا ہے کہ دشمن کا دشمن بھی دشمن اور دوست کا دوست بھی دوست ہوتا ہے ایسا کچھ پاکستان اور چین کی دوستی میں بھی ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں چین کا بھارت کے ساتھ سرحدی تنازعہ پیدا ہوا تو پاکستانی قیادت نے بھارت کو اپنا روایتی دشمن خیال کرتے ہوئے چین کے ساتھ تعلقات کو مزید مستحکم کرنے اور چین کو خطے میں مضبوط کرنے کے لیے سفارتی سطح پر مدد فراہم کی۔ اسی طرح جب ۱۹۶۵ء میں پاک بھارت جنگ چھڑی تو چین نے ہر طرح سے پاکستان کے ساتھ تعاون کیا اور دونوں ممالک کے درمیان دفاعی اور اقتصادی رابطے مزید مستحکم ہو گئے۔ مزید جب پاکستان اور چین کے درمیان تجارت کے لیے زمینی راستے شاہراہ قراقرم کا سنگ بنیاد رکھا گیا تو دونوں ممالک میں تجارت اور رابطوں میں قابلِ قدر بہتری ہوئی۔

اب یہ بات صرف شاعری کی حد تک نہیں رہی بلکہ حقیقت کا روپ اختیار کر چکی ہے کہ پاک چین تعلقات ہمالیہ سے بلند اور سمندروں سے گہرے ہیں۔ اگر گزشتہ ستر سالہ دورانیے پر نظر ڈالی جائے تو دونوں ممالک اس پر پورا اترتے دکھائی دیتے ہیں۔ چین ہمیشہ سے پاکستان کی خیر خواہی اور مختلف شعبوں میں تعاون کر رہا ہے جن میں توانائی، دفاعی اور معاشی منصوبے شامل ہیں۔

اکیسویں صدی میں پاک چین تعلقات میں مزید گرم جوشی دکھائی دیتی ہے جس میں چین نے جے ایف سیونٹین (۱۷) تھنڈر پروگرام میں پاکستان کا بھرپور ساتھ دیا۔ ۲۰۱۳ء سے اقتصادی راہداری منصوبہ شروع کرنے کے بعد چین اور پاکستان کے نہ صرف مفادات مشترک ہو گئے ہیں بلکہ دونوں کو بھارت اور امریکہ کے گٹھ جوڑ سے برابر خطرہ ہے کیونکہ یہ دونوں مشترکہ دشمن سی پیک منصوبہ کو سبوتاژ کرنا چاہتے ہیں لیکن پاک چین کی دوستی اور یگانگت سے یہ گٹھ جوڑ کچھ بھی حاصل نہیں کر سکے گا۔ لہٰذا پاک چین دوستی، محبت اور باہمی تعاون دونوں ممالک کے لیے لازم و ملزوم ہو چکے ہیں۔

پاک چین دوستی اور محبت کے تعلقات نہ صرف سیاسی سطح پر قائم ہیں بلکہ عوامی سطح پر بھی مضبوط ہیں جس کا ذکر مصنفین نے شعر و نثر میں کیا ہے۔ چین کے حوالے سے کئی سفر نامے لکھے گئے ہیں اور شعرا نے نظمیں بھی قلم بند کی ہیں۔ پاک چین دوستی نے ملّی نغمہ نگاری کی روایت کو بھی متاثر کیا ہے اور ان نغموں میں دوستی کے

گیت لکھے اور گائے جارہے ہیں۔ پاک چین دوستی کا موضوع ملّی نغمہ نگاری کی روایت میں ایک مستقل موضوع بن چکا ہے۔ حسن رضوی اپنا شعری مجموعہ ''کبھی کتابوں میں پھول رکھنا'' میں قومی و ملّی نغموں میں ''چینی پاکستانی بھائیوں کا مشترکہ گیت'' کے عنوان سے ملّی نغمہ رقم کرتے ہیں:

پاکستان اور چین ہمیشہ ایک ہیں ایک رہیں گے
پیار محبت کے یہ دونوں دریا ساتھ بہیں گے
پیار سے ہم سیراب کریں گے ہر وادی ہر گلشن
چاہت کی مہکیں گی کلیاں گھر گھر آنگن آنگن
پھولوں سے بھرتے ہی رہیں گے اک دوجے کا دامن
الفت کی راہوں میں دونوں یونہی ساتھ چلیں گے
پاکستان اور چین ہمیشہ ایک ہیں ایک رہیں گے

(چینی پاکستانی بھائیوں کا مشترکہ گیت، کبھی کتابوں میں پھول رکھنا)

حسن رضوی کا یہ ملّی نغمہ پاک چین حکومت اور عوام کے دل کی آواز ہے جسے انھوں نے نغمہ میں ڈھال کر پاکستان کے ساتھ چین سے محبت کا حق ادا کیا ہے۔ مزید یہ کہ اس نغمہ کو ''چو شائن اینگ'' سے شعری صورت میں ترجمہ کرواکر چینی زبان میں بھی منتقل کروایا ہے تا کہ اس نغمہ سے نہ صرف پاکستانی عوام بلکہ چینی عوام بھی دل کی آواز کو شعروں میں پڑھ سکیں۔

پاکستان کا مشہور و معروف ملّی نغمہ ''جیوے جیوے پاکستان'' کے خالق جمیل الدین عالی نے پاکستان سے محبت و عقیدت میں کئی ملّی نغمے لکھے جو متنوع عنوانات کو سمیٹے ہیں۔ ان میں ایک اہم موضوع پاک چین دوستی کو بھی انھوں نے نغموں کی زینت بنایا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ ''جیوے جیوے پاکستان'' میں انھوں نے ''پاک چین دوستی'' کے عنوان سے ملّی نغمہ تخلیق کیا ہے۔ اس ملّی نغمہ کی انفرادیت یہ ہے کہ اس کے اسلوب میں اردو اور چینی زبان و ادب کا مشترکہ رنگ پایا جاتا ہے جو اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ پاکستانی اور چینی عوام نہ صرف زبان بلکہ دل سے بھی ملے ہوئے ہیں۔ جمیل الدین عالی کے ملّی نغمہ سے اقتباس ہے:

پا چُن یو یی وان سوئے
پاک چین دوستی زندہ باد
پا چُن دوستی وان سوئے
پاک چین یو یی زندہ باد

چین اور تمام چینیوں کے نام
پاک سرزمین کے عوام کا سلام
پاک چین کے عوام مرحبا
انقلاب کے پیام مرحبا
پا چن یو یی وان سوئے
پاک چین دوستی زندہ باد

(پاک چین دوستی، جیوے جیوے پاکستان)

پاکستان اور چین کی دوستی بھائی چارے میں بدل چکی ہے اور یہ بھائی چارہ ملک کے کونے کونے میں پھیل چکا ہے جس کا اظہار وقتاً فوقتاً شعرا و ادبا اور سیاست دانوں کے ذریعے ہوتا رہتا ہے۔ پاکستان کے شمالی علاقہ جات یعنی گلگت بلتستان کی سرحدیں چینی صوبہ سنکیانگ کے ساتھ ملتی ہیں لہٰذا پاک چین قربتوں کی لہریں پاکستان کی شمالی سرحدوں سے لے کر جنوب میں بحیرہ عرب تک پھیلی ہوئی ہیں۔ گلگت بلتستان سے تعلق رکھنے والے شعرا میں سے حامد اللہ بیگ نے "پاک چین دوستی" کے عنوان سے ملّی نغمہ لکھ کر اس محبت و دوستی پر فخر کا اظہار کیا ہے:

مرحبا اھلاً و سہلاً دوستانِ ملکِ چین
پیکرِ مہر و وفا اخلاص و الفت کے امیں
استواری رشتۂ انسانیت کو مل گئی
عہدِ ہائے ارضِ پاکاں وعدہ ہائے صدرِ چین

(پاک چین دوستی، شمالی علاقے کا اردو ادب)

پاک چین دوستی کی جڑیں اتنی مضبوط ہو چکی ہیں کہ پاکستانی قوم جہاں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک اس بھائی چارے کا دم بھرتی ہے وہیں جوان، بوڑھے اور بچے سب کو اس دوستی پر فخر ہے اور خلوص دل سے اس دوستی کی قدر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں پاکستانی پنجاب کے ضلع سرگودھا کے دیہات سے تعلق رکھنے والی نوجوان شاعرہ جس کی تخلیقی صلاحیتوں کی کلیاں کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئیں، اپنے پہلے اور آخری شعری مجموعہ "ہجرت مجھ سے لپٹ گئی ہے" میں "پاک چین دوستی" کے عنوان سے تخلیق کیا گیا ملّی نغمہ ایک بہترین کاوش ہے۔ مراد اردو کی نوجوان شاعرہ فرزانہ ناز سے ہے جو ۲۴ اپریل ۲۰۱۷ کو اسلام آباد میں منعقدہ قومی کتاب میلہ کی اختتامی تقریب کے دوران اسٹیج سے گر کر ہمیشہ کے لیے موت کی وادی میں اتر گئیں۔ فرزانہ ناز کی موت نے ہر اہل ادب کو سوگوار کر دیا۔ فرزانہ ناز اپنی کتاب کی تقریب رونمائی سے چند دن پہلے ہی اپنے پرستاروں سے بچھڑ گئیں۔ لہٰذا کتاب کی تقریب رونمائی میں ہر آنکھ اشک بار تھی۔

فرزانہ ناز نے شاعری میں حال کو موضوع بنایا ہے، جس میں پاک چین کی باکمال دوستی کا تذکرہ بھی موجود ہے ان کی نظم "پاک چین دوستی" سے اقتباس ہے:

یہ پاک چین دوستی ازل سے بے مثال ہے
یہ سلسلہ خلوص کا ، امر ہے لازوال ہے
سدا سے یہ کھڑے رہے ہیں ڈٹ کے ہر محاذ پر
یہ ایسے ہم قدم ہیں جن کو روندنا محال ہے

(پاک چین دوستی، ہجرت مجھ سے لپٹ گئی ہے)

فرزانہ کے خیالات ہر پاکستانی کی فکر کا عکاس ہیں کیونکہ پاکستان اور اس کے عوام کو چین کی دوستی پر بہت زیادہ ناز ہے اور اس دوستی کے لیے کوئی بھی قربانی دینے کے لیے بھی تیار ہیں اور اپنے مخلص دوست سے کسی صورت جدا نہیں ہوسکتے۔ چین بھی پاکستان دوستی کا دم بھرتا ہے اور اب دونوں ملکوں کے عوام دوستی اور بھائی چارہ سے بڑھ کر شادی کے بندھنوں میں بندھ رہے ہیں، حالانکہ پاکستان ایک خالص اسلامی ملک ہے اور چین میں ملحدانہ فکر کا غلبہ ہے لیکن اس کے باوجود چینی مرد وخواتین اسلام قبول کر کے اور شادی کے بندھن میں جیون بھر کا ناتا جوڑ کر اس دوستی کو ناقابل تسخیر بنا رہے ہیں۔

اردو ملّی نغمہ نگاری کی روایت میں پاک چین دوستی کا موضوع بلاشبہ ایک اہم پیش رفت ہے جس میں آئے روز اضافہ دیکھنے کو مل رہا ہے جس کی اہم مثال حال ہی میں لاہور سے شائع ہونے والی کتاب "پاک چین دوستی کی داستاں" از خالد عباس الاسدی ہے جس میں خالد عباس نے پاک چین دوستی، ارتقا اور دعا کو موضوع سخن بنایا ہے۔ آنے والے ادوار میں پاک چین دوستی کے موضوع کو ملّی شاعری میں مرکزی حیثیت اختیار کر جانے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

## پاکستانی شہروں سے اظہارِ محبت کے آئینہ دار نغمے:

خطۂ پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے مختلف انعامات سے نوازا ہے جن میں زرخیز میدان، بلند وبالا اور معدنیات سے بھرے پہاڑ، خوبصورت بہتے ندی نالے، جھیلیں، حتیٰ کہ پاکستان کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے قدرت کا حسن نہ چھلکتا ہو۔ اس حسن وجمال کے ساتھ پاکستان بھر کے شہروں کی دلکشی بھی لاثانی ہے۔ ویسے تو پاکستانی قوم اور شعرا کو پاکستان کا چپہ چپہ عزیز ہے لیکن پورے پاکستان کے ساتھ اس کے مختلف شہروں، دریاؤں اور مختلف خطوں کو الگ الگ منظوم تصویروں میں ڈھال کر نہ صرف شعرا بلکہ قارئین وسامعین بھی خوب لطف اندوز ہوتے

ہیں۔ پاکستانی شعرانے مِلّی نغمہ نگاری کی روایت میں جہاں پاکستان، اس کی عوام اور اسلام کی عظمت و برتری کو مِلّی نغموں کا موضوع بنایا ہے وہیں، اس ملک کے مختلف شہروں کے حسین چہروں کی نقاب کشائی کی ہے۔

پاکستانی شہروں کی مدح سرائی میں تقریباً ان تمام شعرانے حصہ لیا ہے جنھوں نے مِلّی نغموں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے لیکن کچھ شعرانے بطورِ خاص پاکستانی شہروں کے حسن و جمال اور ان سے اظہار محبت کو مِلّی نغمہ نگاری میں متعارف کروایا ہے۔ انھوں نے پورے مجموعہ میں پاکستانی شہروں کی خوبصورتی کو اپنے جذبوں میں پرو کر شعری رنگ میں ڈھالا۔ ان میں ایک شاعر محمد شریف المعروف حافظ امر تسری سر فہرست ہیں۔ حافظ امر تسری کا شعری مجموعہ "میرا سوہنا پاکستان" میں مثنوی کی ہیئت میں پاکستان کے تمام شہروں کے بہت پیارے انداز میں خاکے بیان کیے گئے ہیں۔ ان خاکوں میں شہر کا تاریخی پس منظر، بود و باش، مختلف ادوار کے حوالے سے ان شہروں میں ہونے والی تبدیلیاں، ان کے قدرتی مناظر اور قدرت کی نوازشات کو نظم کی رنگ آمیزی میں پوری طرح ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حافظ امر تسری نے پنجاب، سندھ، کشمیر، خیبر پختونخواہ اور بلوچستان کے تمام اہم شہروں کا عکس کھینچا ہے لیکن مقالہ کے اختصار کی وجہ سے چند شہروں کے بارے قلم کاری کو موضوع کا حصہ بنایا جائے گا۔ جن میں پنجاب کے شہر لاہور کو اولیت حاصل ہے۔ لاہور قدیم تاریخی شہر ہے جس نے کئی ادوار اور حکمران دیکھے اور شعرانے اس شہر کو خاص طور پر موضوعِ سخن بنایا ہے۔ حافظ امر تسری کا شعر پارہ سے اقتباس ہے:

شعر و نغمہ ادب کا گہوارہ
ارتقا کا عظیم شہ پارہ
علم و فن پرورش جہاں پائے
زندگی اس میں نور بن جائے (لاہور، میرا سوہنا پاکستان)

حافظ امر تسری کے یہ الفاظ حرف بہ حرف درست ہیں کیونکہ علم و ادب کے ساتھ لاہور شہر میں کوئی ایسی مقناطیسی قوت پائی جاتی ہے کہ جو بھی یہاں آیا وہ اسی کا ہو کے رہ گیا۔ اس کے علاوہ لاہور شہر کے بارے مقامی سطح پر کئی روایات مبالغہ آرائی کی حد تک بھی قائم ہیں مثلاً "جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا" ان روایات کی ابتدا کے بارے معلومات اندھیروں میں گم ہیں لیکن یہ روایات لاہور آنے والوں کی آنکھوں اور لاہور کے حسن و جمال کی زندہ جاوید حکایات ہیں جو دور دور سے ہر قسم کے افراد کو لاہور میں کھینچ لاتی ہیں پھر لاہور کا ان پہ ایسا سحر ہو جاتا ہے کہ چاہتے ہوئے بھی واپسی کا خیال پیدا نہیں ہوتا۔ بقول ناصر کاظمی:

شہر لاہور تری رونقیں دائم آباد
تیری گلیوں کی ہوا کھینچ کے لائی مجھ کو

(اولین چاند نے کیا بات سمجھائی مجھ کو، برگ نے)

لاہور کی ہوا صرف ناصر کاظمی کو کھینچ کے نہ لائی بلکہ ہر اس شخص کو جو علم و فن اور شعر و ادب کا ذوق رکھتا ہو، اس کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ لاہور کو پاکستان کا دل، شہر اقبالؒ اور داتا گنج بخشؒ کی نگری کہا جاتا ہے اور سب سے اہم بات کہ قطب الدین ایبک جنھوں نے برصغیر پاک و ہند میں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی تھی اور برصغیر کا پہلا اسلامی درالخلافہ لاہور کو بنایا تھا۔ ان کا تعلق بھی لاہور سے تھا۔ بقول فاروق بشیر:

ذرہ ذرہ ہے حریف کہکشاں لاہور کا
پتہ پتہ رنگ و رعنائی کی جاں لاہور کا
جس نے قائم کی یہاں پر سلطنت اسلام کی
وہ تھا قطب الدین ایبک حکمراں لاہور کا (لاہور، تیرا پاکستان ہے یہ میرا پاکستان ہے)

لاہور شہر کو قلعہ اسلام بھی کہا جاتا ہے کیونکہ برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے قدم سب سے پہلے لاہور میں مضبوط ہوئے تھے اور کئی حکمرانوں نے صدیوں تک اس کو سلطنت اسلامی کا دارالخلافہ بنائے رکھا اور اس کی تعمیر و ترقی میں نمایاں حصہ ڈالتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج شعرا اس کو جنت ثانی کہنے لگے ہیں۔ جعفر بلوچ کی نظم ”میرا لاہور“ سے اقتباس ہے:

یہاں آ کے میں نے بہت فیض پایا
جو میرا ہے سرمایہ سرمدی بھی
یہ اک عافیت زار ہے بلکہ جنت
مری بھی ، مری آل و اولاد کی بھی
رہے شاد و آباد لاہور یا رب
زیادہ ہو اور اس کی زندہ دلی بھی (میرا لاہور، بر سبیل سخن)

زندہ دلوں کے شہر لاہور کی جتنی خوبیاں اور مدح بیان کی جائے کم ہے کیونکہ بقول اقبال ”لاہور لہور اے““ اور لاہور شہر کی رونقیں ایسی ہیں جو مردہ دلوں کو زندہ، غمگین روحوں کو شاد اور بے ذوق و بے ادب اذہان کو اہل ذوق و باادب بنا دیتی ہیں۔ اس لحاظ سے پاکستان کے تمام شہروں میں جو مرکزیت و اہمیت لاہور کو حاصل ہے وہ کسی اور شہر کے مقدر میں نہیں آئی۔

لاہور کے بعد پاکستان کے جس شہر کو اہمیت حاصل ہے وہ پاکستان کا سب سے بڑا شہر کراچی ہے جس کو روشنیوں کا شہر اور غریبوں کی ماں کہا جاتا ہے۔ کراچی ساحل سمندر پر واقع پاکستان کا سب سے بڑا تجارتی مرکز اور بندر گاہ ہے۔ کراچی کو یہ انفرادیت بھی حاصل ہے کہ مسلم فاتحین نے سب سے پہلے کراچی اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں میں مسلم حکومت قائم کی۔ قیام پاکستان کے سلسلے میں اس کو بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کا جائے پیدائش اور مدفن ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے پھر اردو ادب کے حوالے سے اہم شخصیت مولوی عبدالحق بھی اسی شہر میں مدفون ہیں جن کو اردو ادب کا روح رواں اور بابائے اردو کہا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ہجرت کے نتیجے میں کراچی شہر نے مہاجرین کو سب سے زیادہ سکونت عطا کی اسی لیے اس شہر کو کسی ایک گروہ، ذات یا فرقے کا شہر نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس میں تمام پاکستانی جو ملک کے مختلف حصوں سے تلاش معاش میں سرگرداں ہجرت کے مارے ہوئے آئے، سب آباد ہیں۔ اس لیے کراچی کو کسی ایک صوبے کا شہر کہنے کی بجائے پورے پاکستان اور پاکستانی قوم کا شہر کہنا زیادہ مناسب ہے اور ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کی بیشتر تعداد کے کراچی آباد ہونے کی وجہ سے یہ اردو بولنے والوں کا شہر بھی کہلاتا ہے۔

کراچی شہر ساحل سمندر کے پاس ہونے کی وجہ سے یہاں ملوں و فیکٹریوں اور کاروباری مراکز کی تعداد بہت زیادہ ہے اور پورے پاکستان سے آئے ہوئے مزدوروں اور تاجروں کا پیٹ پال رہا ہے۔ ساحل سمندر پر کراچی کے خوبصورت نظارے کافی مقبول ہیں۔ کلفٹن، ہاکس بے اور سی ویو جیسی جگہوں پر دور دراز سے آئے سیاح لطف اندوز ہوتے ہیں۔ صوفی بزرگ سید عبداللہ شاہ غازیؒ بھی ساحل سمندر کے ساتھ کراچی میں مدفون ہیں۔ گویا کراچی ہر رنگ و نسل کے انسان کی پناہ گاہ اور روزی کمانے کا مقام ہے۔ کراچی شہر میں علم و ادب کئی کے مراکز بھی قائم ہیں جن سے لاتعداد طلبا زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو کر ملک و قوم کی خدمت اور اس کا نام روشن کر رہے ہیں۔ حافظ امرتسری شہر کراچی کے حسن وجمال اور علم و عرفان کے بارے فرماتے ہیں:

یہ کراچی نگارِ مشرق ہے
شوخ چنچل بہارِ مشرق ہے

ہر قدم روشنی کے فوارے
اجلے اجلے تمام نظارے

فاتح سندھ کے قدم اس پر
کارنامے کئی رقم اس پر

(کراچی، میرا سوہنا پاکستان)

کراچی شہر میں چونکہ کئی گروہ اور قبیلے آباد ہیں اس لیے یہاں امن و امان کی صورتحال میں بھی ہلچل رہتی ہے جس سے یہاں کی تعمیر و ترقی متاثر ہوتی رہتی ہے لیکن اس کے باوجود شہر کراچی سے پاکستان اور پاکستانی عوام کا روح اور جان کا رشتہ قائم ہے۔

شاہینوں کا شہر سرگودھا صوبہ پنجاب کے وسط میں واقع ہے۔ سرگودھا کی زرخیز مٹی اور مالٹوں کی وادی نے تحفظ پاکستان کے لیے ایسے شیر دل فرزند پیدا کیے ہیں جنھوں نے دھرتی پاکستان کی حفاظت کے لیے جان کا نذرانہ پیش کیا اور ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے۔ دشمنانِ پاکستان کی آنکھ کے خار شہر سرگودھا پر ۱۹۶۵ کی جنگ میں کئی حملے کیے گئے لیکن اس کے شاہینوں نے نہ صرف دشمن کے حملوں کو ناکام بنا دیا بلکہ دشمن اپنے جہازوں کی تباہی کا داغ لئے بھاگنے پر مجبور ہو گیا جس کے بعد سرگودھا کو دفاع پاکستان میں مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر "سرزمینِ سرگودھا کو سلام" کے عنوان سے لکھی نظم میں فرماتے ہیں:

سرگودھا ترا نام سرفراز رہے گا
صدیوں تری جرأت پہ ہمیں ناز رہے گا

شہباز ترے - تیری فضاؤں کے محافظ
وہ تیرے محافظ ہیں - خدا ان کا محافظ

(سرزمینِ سرگودھا کو سلام، جنگ ترنگ)

سرگودھا شہر میں پاکستان فضائیہ کی چھاؤنی ہے اور پاک فضائیہ کی وردی نیلی ہونے کی وجہ سے شعرا اس شہر کو نیلی فام کے شہزادوں کی دھرتی قرار دیتے ہیں اور اس کی عظمت و رفعت کے گن گاتے ہیں۔ ڈاکٹر ہارون الرشید کی نظم "شاہینوں کا شہر مرا سرگودھا زندہ باد" سے اقتباس ہے:

جانبازوں کی اک بستی ہے یہ فردوس ارضی
چرخِ نیلی فام کے شہزادوں کی ہے یہ دھرتی
سرگودھا کے شاہینوں کی دھوم ہے نگری نگری

قید نہیں کر سکتا ان کو کوئی بھی صیاد
شاہینوں کا شہر مرا سرگودھا زندہ باد

(شاہینوں کا شہر مرا سرگودھا زندہ باد، ارمغانِ وطن)

شہر سیالکوٹ نے بھی ایسے ہیرے، موتی اور جواہر کے مماثل جواں پیدا کیے ہیں جن پر سیالکوٹ تو کیا پورا پاکستان اور دین اسلام جتنا ناز کرے کم ہے۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور مسلمانان

برصغیر میں آزادی کا شعور پیدا کیا اور عالم اسلام کو نئی منزلوں کا پتہ بتایا تاکہ وہ کفرانِ اسلام کے مقابلے میں اپنی قوت کو بڑھا سکیں۔ اس کے علاوہ ہر دل عزیز شاعر فیض احمد فیض کا تعلق بھی سیالکوٹ سے ہے۔

معرکہ ۱۹۶۵ء میں سیالکوٹ کی خدمات نمایاں ہیں۔ اہلیانِ سیالکوٹ نے پاک فوج کے شانہ بشانہ یہ جنگ لڑی اور ملک و قوم کو فتح سے ہمکنار کیا۔ اس لیے شعرا نے سیالکوٹ کی سرزمین کی عظمت کے گیت لکھے اور گائے ہیں۔ جون ایلیا "گہوارہ اقبال سیالکوٹ" کے عنوان سے سیالکوٹ کے حسن و جمال اور شان و شوکت کے حوالے سے فرماتے ہیں:

سیالکوٹ تیری آن بان کیا کہنا
ہے تو ثبات و خودی کی چٹان کیا کہنا
جو خون سے نکھری وہ ادا یاد رہے گی
اے شہر وفا تیری وفا یاد رہے گی (گہوارہ اقبال سیالکوٹ، جنگ ترنگ)

صفدر میر کی طویل نظم "سیالکوٹ کی فصیل" ۱۹۶۵ء کی جنگ میں لکھی گئی۔ دشمن نہتے شہریوں کو خون میں نہلا رہا تھا لیکن اس کے باوجود وہاں کے عوام بھاگنے اور جان بچانے کے بجائے ہتھیاروں سے لیس دشمن سے نبرد آزما رہے جس سے پاکستانی فوج کے حوصلے مزید بلند ہوئے۔ صفدر میر اس نظم میں سیالکوٹ اور اس کے باسیوں کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہیں:

ہزار سال سے بلند
سیالکوٹ کی فصیل
آج بھی بلند ہے
اس ہزار سال میں
ہر اک سموم تند و تیز
غرب اور شرق سے
جنوب اور شمال سے
اس فصیل پر بڑھی
پلٹ گئی (سیالکوٹ کی فصیل، جنگ ترنگ)

سیالکوٹ شہر کی شان و شوکت و عظمت پر بہت سے شعرا نے نغمے لکھے ہیں جن میں جمیل الدین عالی بھی شامل ہیں۔ جمیل الدین عالی نے نظم "سیالکوٹ کو لے جا صبا پیام مرا" ۱۹۶۵ء میں اس وقت لکھی جب اس کی غیور عوام کی بہادری اور دلیری کے چرچے ہر سو پھیل گئے۔ نظم سے اقتباس ہے:

سیالکوٹ کو لے جا صبا پیام مرا
ترے ہی نام سے اونچا ہوا ہے نام مرا

یہ شہر شہر شہیداں بنا ہے میرے لیے
یہ شہر زِیست کا امکاں بنا ہے میرے لیے

(سیالکوٹ کو لے جا صبا پیام مرا، جیوے جیوے پاکستان)

رقبہ کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ بلوچستان ہے۔ پانی کی قلت اور صحرائی زمین کی وجہ سے اس کی آبادی بہت کم ہے بلکہ بعض جگہوں پر دور دور تک آبادی کا نام و نشان بھی ناپید ہے۔ بلوچستان کے لوگ بہادر اور جفاکش ہیں جن کا زیادہ تر گزر بسر گلہ بانی اور زراعت پر ہے۔ بلوچستان کی سرحدیں ایک طرف بحیرہ عرب اور دوسری طرف ایران اور افغانستان سے ملتی ہیں۔ بلوچستان کے کچھ علاقے بہت خوبصورت ہیں جو دیکھنے والوں کی نگاہوں اور دل کو موہ لیتے ہیں۔ بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کی زندگی کے آخری آیام بھی "زیارت" بلوچستان کے علاقے میں گزرے تھے۔ زیارت ایک پر کشش جگہ ہے جس کی آب و ہوا اور ماحول صاف ستھرا اور پر سکون ہے۔ شعرائے اردو نے پاکستان کے دیگر علاقوں کے حسن و جمال کی طرح بلوچستان کے ان شہروں کی مِلّی نغموں میں خوبصورت تصویر کشی کی ہے۔ حافظ امر تسری کی نظم "زیارت" سے اقتباس ہے:

اک پہیلی ہے اک بجھارت ہے
یہ بہار آفریں زیارت ہے
عقل و افکار کی طرح روشن
مثلِ جنت سجا ہوا گلشن

(زیارت، میرا سوہنا پاکستان)

بلوچستان کا دارالحکومت کوئٹہ ہے۔ کوئٹہ بلوچستان صوبے کا سب سے بڑا شہر ہے اور بہترین پھلوں کی پیداوار کے لئے شہرت رکھتا ہے۔ کوئٹہ شہر چاروں طرف سے خشک پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے جہاں سردیوں میں برفباری کے ساتھ شدید سردی بھی پڑتی ہے اور درجہ حرارت منفی ڈگری سینٹی گریڈ میں چلا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود اس شہر میں سارا سال کاروباری سرگرمیاں قائم رہتی ہیں۔

کوئٹہ اور اس کے مضافات کے علاقے صدیوں تک ایران کا حصہ رہے ہیں جنھیں سب سے پہلے ہندوستان کے عظیم شہنشاہ اکبر اعظم نے ۱۵۹۵ء میں اپنی سلطنت کا حصہ بنایا تھا۔ مغلوں کے زوال کے بعد یہ علاقہ ریاست قلات کے قبضے میں چلا گیا جسے انگریزوں کے اقتدار میں برطانوی سامراج کا حصہ بنالیا گیا۔ قیام پاکستان کے وقت اس کے قبائل نے پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا تو یہ علاقہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا حصہ بنا۔

کوئٹہ شہر جغرافیائی لحاظ سے ایران اور افغانستان کے تجارتی راستوں پر ہونے کی وجہ سے کاروباری حوالے سے کافی اہمیت رکھتا ہے جہاں سے زیادہ تر مال ایران سے افغانستان اور پاکستان کے دیگر علاقوں کو منتقل کیا جاتا ہے۔ کوئٹہ کی اپنی پیداوار میں خشک میوہ جات اور تازہ پھل زیادہ مشہور ہیں۔ ان تمام خوبیوں کی بنا پر کوئٹہ شہر بھی اردو شعرا کے قلم کی زینت بنا اور انھوں نے کوئٹہ کی دلکشی اور حسن و جمال سے ملّی نغموں کو حسن بخشا ہے۔ حافظ امر تسری کی نظم "کوئٹہ" سے اقتباس ہے:

کوئٹہ ہے کہ شہر خوباں ہے
خندہ دل خندہ لب غزل خواں ہے
اس کے پھولوں میں دلکشی کا سماں
اس میں کلیوں کے قہقہے رواں

(کوئٹہ، میرا سوہنا پاکستان)

پشاور صوبہ خیبر پختونخواہ کا دارالخلافہ اور اہم شہر ہے۔ یہ شہر بھی قدیم اور تاریخی ہے۔ افغانستان کی سرحد قریب ہونے کی وجہ سے اس کی تہذیب و ثقافت پر افغانستان کی پشتون برادری کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ صوبہ خیبر پختونخواہ کا پرانا نام شمالی مغربی سرحدی صوبہ تھا جسے پاکستان کی اٹھارہویں آئینی ترمیم کے ذریعے تبدیل کر کے خیبر پختونخوا کا نام دیا گیا۔ اس صوبے کے زیادہ تر لوگ پشتو بولتے ہیں اور پٹھانوں کے مختلف قبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ جری، بہادر، محنت کش اور مہمان نواز مشہور ہیں اس لیے خیبر پختونخواہ کو "میزبانوں" کی سرزمین بھی کہا جاتا ہے لیکن دورِ جدید میں یہ میزبانی تیزی سے کم ہوتی جارہی ہے۔

خیبر پختونخواہ کے لوگ تعلیمی میدان میں باقی صوبوں سے آگے ہیں۔ یہ لوگ حصول علم کے لیے نہ صرف اپنے صوبے کی درس گاہوں پر انحصار کرتے ہیں بلکہ دوسرے صوبوں اور بیرون ملک میں زیورِ تعلیم سے آراستہ ہونے کے لیے سفر کرنا باعث مسرت سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس صوبے کے لوگوں میں دین اسلام کی تعلیمات پر عملداری باقی صوبوں کے عوام کی نسبت زیادہ ہے۔ اسی طرح کاروباری حوالے سے دیکھا جائے تو پشاور شہر صوبے کا اہم کاروباری مرکز بھی ہے اور اس صوبے کے کئی بڑے تاجر ایسے ہیں جو قومی و بین الاقوامی

شہرت رکھتے ہیں۔ دریائے کابل پشاور اور اس کے متعلقہ علاقوں کو سیر اب کرتا ہوا اٹک کے قریب دریائے سندھ سے مل جاتا ہے۔ جس سے ان علاقوں کی زمینیں زرخیز اور ہر قسم کی فصل کے لیے موزوں ہیں۔ طاہر لاہوری، خیبر پختونخواہ اور اس کی عوام کے متعلق نظم کرتے ہیں:

یہ سرحدوں کے محافظ یہ مردِ میداں ہیں
صلوٰۃ و صوم کے پابند سادہ انساں ہیں
یہ خان زادے یہ مہمان نوازیوں کے امیں
ذہانتوں کے فراست کے مہر تاباں ہیں

(طاہر لاہوری، قطعہ، میرا سوہنا پاکستان)

پشاور شہر کو اس صوبے کی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ پشاور کی تاریخ بہت قدیم ہے اور اس پر کئی قوموں نے حکومت کی۔ بالآخر قیام پاکستان کے وقت اس کے سیاست دانوں نے پاکستان میں شمولیت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ مستقل پاکستان کا حصہ بن گیا۔

پشاور شہر پہاڑوں میں گھرا ہوا، درہ خیبر کے قریب واقع ایک خوبصورت شہر ہے جس کے حسن و جمال کی تعریف شعرا نے نظم کی ہے۔ حافظ امر تسری کے کلام سے انتخاب ہے:

یہ ثریا جبیں پشاور ہے
اس پہ ہر ایک دل نچھاور ہے
حسن مشرق کی بات ہے اس میں
حسن مغرب کی بات ہے اس میں

(پشاور، میرا سوہنا پاکستان)

اسلام آباد پاکستان کا دارالخلافہ اور ایک خوبصورت شہر ہے جو راولپنڈی کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ اسلام آباد کی آب و ہوا میں قدرت کے ایسے کرشمے شامل ہیں کہ یہ سدا بہار پر لطف اور خوشگوار رہتی ہے۔ اسلام آباد میں بلند و بالا عمارتیں ہونے کے باوجود اس کی سڑکیں وسیع اور بازار کھلے ہیں جس کی وجہ سے اس میں دوسرے بڑے شہروں کی طرح دم نہیں گھٹتا۔ اس شہر کو قیام پاکستان کے بعد آباد کیا گیا اور اس کا نام بھی اسلام سے وابستگی کی بدولت اسلام آباد رکھا گیا۔ فیصل مسجد سعودی عرب کے بادشاہ، شاہ فیصل کی طرف سے اسلام آباد کے لیے حسین تحفہ ہے۔ اس شہر کی خوبصورتی کو بھی شعرا نے ملّی نغموں کی زینت بنایا ہے۔ بشیر فاروق "اسلام آباد" کے

عنوان سے مِلّی نغمہ کے آخر میں ایک پیش گوئی بھی کرتے ہیں جس کے سچ ثابت ہونے کا سب پاکستانیوں کو انتظار ہے۔ نظم سے اقتباس ہے:

کشور پاک غلامانِ محمد کا دیار
خطہ پاک کی تاسیس خدا کی امداد
سربراہانِ عرب ہوں کہ عجم کہتے ہیں
ہے یہی آج بزرگانِ حرم کا ارشاد
مرکز عالم اسلام بنے گا اک دن
نام جس شہر کا فاروق ہے اسلام آباد

(اسلام آباد، تیرا پاکستان ہے یہ میرا پاکستان ہے)

پاکستان کے کسی بھی صوبہ یا علاقہ کے تمام شہر خوبصورت ہیں اور ان کا حسن و جمال شاعری میں جھلکتا ہے پورا ملک مثلِ خلد ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تمام نعمتیں پیدا کی ہیں دوسرے لفظوں میں اس ملک کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے کیونکہ اس کے لوگ خوبصورت، اس کے شہر حسین، اس کے کھیت لہلہاتے، اس کے دریا بہتے اور اس کے پہاڑ سر سبز ہیں۔

## کشمیر اور مِلّی نغمہ نگاری:

کشمیر پاکستان کا وہ علاقہ ہے جو سب سے حسین و جمیل ہے اور ابھی تک دشمن کے قبضے میں ہے البتہ اس کا کچھ حصہ آزاد ہے جو آزاد کشمیر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ کشمیر جنت نظیر حسن و جمال، تہذیب و ثقافت اور دلفریب قدرتی مناظر میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا۔ جس وجہ سے شعرا کے مِلّی نغموں میں بھی سب سے زیادہ ذکر اسی وادی کشمیر کا ہوا ہے۔ کہیں اس کی خوبصورت رعنائیوں کا ذکر ملتا ہے تو کہیں اس میں ہونے والے اسلام دشمنوں کے ظلم و جبر کے قصے سننے کو ملتے ہیں لیکن اس کے جانباز عوام ہر ظلم کے آگے آہنی دیوار بن کے کھڑی ہوئے ہیں اور اپنی جنت کو آزاد کروانے کے لیے مسلسل کوشاں ہیں۔ دنیا میں اتنی طویل جدوجہد آزادی کی مثالیں کم ملتی ہیں۔

کشمیر کی پر سحر خوبصورتی کا ذکر اردو شاعری میں کثرت سے ملتا ہے جس میں خاص و عام ہر قسم کے شعرا شامل ہیں۔ کشمیر کے حسن و جمال اور دلفریب نظارے اردو شاعری کا ایک اہم موضوع ہیں جس میں کشمیر کے پر کشش اور دلکش مقامات کے ساتھ سیاسی، سماجی اور تاریخی واقعات نے اس سر زمین کے اپنے شعرا کشمیر سے

خرجی شعرا کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے لیکن قیام پاکستان کے بعد اس خطہ ارضی میں ہونے والے ظلم و ستم اور بھارتی فوج و حکومت کی سفاکیوں نے نہ صرف شعرا کو بلکہ عام لوگوں کو بھی، جو انسانی حقوق کی پامالی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اپنی طرف راغب کیا ہے۔

قدیم دور میں کشمیر کے پر کشش مقامات اور ماحول نے ادب میں خاص مقام حاصل کیا ہوا تھا لیکن اب اس کے موضوع میں مزید وسعت آچکی ہے جس نے موضوعات اور اصناف ادب کی روایت میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ اردو شاعری میں موضوع کشمیر قومی و ملّی جذبات کا ترجمان ہے جس میں اس کے دلفریب مناظر کے ساتھ جغرافیائی صورت حال اور عسکری کاروائیوں کا کثرت سے ذکر ملتا ہے۔ کشمیر کا ادب چونکہ اسلام اور پاکستان سے بالواسطہ ہے اس لیے اس کے موضوع پر ہونے والی تمام قومی و ملّی شاعری کو ملّی نغمہ نگاری کہا جا سکتا ہے۔ کشمیر کے موضوع پر ہونے والی ملّی نغمہ نگاری جہاں مختلف موضوعات اور جہتیں اپنے اندر سمیٹے ہے وہیں متنوع ہیئتی اصناف میں اس کا اظہار کیا گیا ہے۔

کشمیر کی طلسمی سرزمین برف پوش پہاڑوں، خوبصورت وادیوں اور سبزہ زار درختوں سے ڈھکی ہوئی ہے اس کے حسن و جمال پر کئی شعرا نے قلم اٹھایا ہے۔ کشمیر کا حسن شعرا کے تخیل میں اتر کر ایسے فن پارے تخلیق کرنے میں کامیاب ہوا ہے جو اردو ادب میں کشمیر کی طرح سدا بہار اور دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ حفیظ جالندھری اپنی نظم "تصویر کشمیر" میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہیں:

معرکہ درپیش ہے جذبات کی تفسیر کا
ہو رہا ہے تذکرہ کشمیر میں کشمیر کا
کھینچنا تصویر کا لانا ہے جوئے شیر کا
رنگ بھر دے اے قلم الفاظ میں تاثیر کا

لطف جب ہے کہ اٹھے ہر نقش اس تحریر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(تصویرِ کشمیر، فغانِ کشمیر)

حفیظ جالندھری کی نظم "خون کے چراغ" کشمیر کے موضوع پر ایک شاہکار نظم ہے جو کشمیری مجاہدین کی شہادت اور ان کے مزاروں سے آنے والی پکار کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ غلام نبی خیال، حفیظ جالندھری کی اس نظم بارے لکھتے ہیں کہ شہر سری نگر میں حضرت خواجہ معین الدین نقشبندیؒ کی زیارت گاہ کے صحن میں ۱۳ جولائی ۱۹۱۳ء کے جن شہیدوں کا مزار موجود ہے ان پر کہی ہوئی حفیظ جالندھری کی نظم "خون کے چراغ" آج بھی عید

گاہ کے مزار میں دفن ہونے والے ان حقیقی شہیدانِ کشمیر کے حال پر صادق آتی ہے جو ۱۹۹۰ء کی مسلح جدوجہد کے بعد وہاں ابدی نیند سو رہے ہیں اور جنھوں نے اپنا آج (Today) قوم کے "کل" (Tomorrow) کی خاطر نچھاور کر دیا۔" (۵۷) حفیظ جالندھری کی اس نظم سے اقتباس ہے:

سرخ پھولوں سے زمیں کشمیر کی ہے سرخ رو
لالہ بن کر پھوٹ نکلا ہے شہیدوں کا لہو

چھوٹے چھوٹے ڈھیر مٹی کے قطار اندر قطار
راہِ آزادی میں لڑنے مرنے والوں کے مزار

معرکہ اس خاک پر گذرا ہے داروگیر کا
لالہ زار اس کو نہ سمجھو کھیت ہے شمشیر کا (خون کے چراغ، فغانِ کشمیر)

حفیظ جالندھری کی طرح احمد ندیم قاسمی بھی کشمیر کے جلال و جمال کو خون آلود اور ایک لٹا ہوا چمن کہتے ہیں جس کے زخموں پر پھولوں نے پردہ کیا ہوا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی نظم "کشمیر" سے اقتباس ہے:

ہر گل کی جبیں پر شکن ہے
کشمیر لٹا ہوا چمن ہے

پھولوں نے چھپا رکھا ہے ورنہ
زخموں سے اٹا ہوا بدن ہے (کشمیر، محیط)

صوفی غلام مصطفٰی تبسم کی نظم "اے وادی کشمیر" میں کشمیر کے قدرتی مناظر اور حسن و جمال کو انھوں نے خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ نظم سے اقتباس ہے:

ہر گوشہ ترا گلشن فردوس کی تصویر
حوروں کے، فرشتوں کے حسین خواب کی تعبیر
اے وادی کشمیر (اے وادئ کشمیر، سو بار چمن مہکا)

خوشی محمد ناظر کشمیر کے موضوع پر ہونے والی ملّی نغمہ نگاری کی روایت میں اہم شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کشمیر کے موضوع پر ان کی نظم "فردوس زمیں" سے اقتباس ہے:

کبھی گلشن کبھی ویرانہ دیکھا
مری آنکھوں نے بھی کیا کیا نہ دیکھا
مگر عالم میں اے گلزارِ کشمیر

کوئی خلد بریں تجھ سا نہ دیکھا (فردوس زمیں ، نغمہ فردوس)

صہبا اختر کی نظم "اے میرے کشمیر" ملّی جذبات کی ترجمان نظم ہے جس میں وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک تسبیح کے دانے کہتے ہیں اور کشمیری عوام سے اظہار یکجہتی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ہے تب و تاب خودی ہر دور میں اپنا اصول
غیر کی محکومیت ہرگز نہیں کرتے قبول
صرف بندے ہیں خدا کے ہم غلامانِ رسول ﷺ
ٹوٹ بھی جائیں تو کیا اپنوں سے بیگانے ہیں ہم
ایک ہی تسبیح کے بکھرے ہوئے دانے ہیں ہم

(اے میرے کشمیر، فغانِ کشمیر)

احمد فراز کی نظم "نیا کشمیر" میں جہاں کشمیر کے قدرتی نظاروں کا ذکر کرتے ہیں وہیں استحصالی قوتوں پر کڑی تنقید کرتے ہیں:

میری فردوس گل و لالہ و نسریں کی زمیں
تیرے پھولوں کی جوانی ترے باغوں کی بہار
تیرے چشموں کی روانی ترے نظاروں کا حسن
تیرے کہساروں کی عظمت ترے نغموں کی پھوار
کب سے ہیں شعلہ بداماں و جہنم بکنار

(نیا کشمیر، شب خون)

کشمیر اور تحریک آزادیِ کشمیر کے موضوع کے حوالے سے بات کریں تو اردو شاعری میں علامہ اقبال کو اولین شاعرِ کشمیر ہونے کا اعزاز حاصل ہے جنھوں نے اپنی شاعری کے دیگر پہلوؤں کے ساتھ تحریکِ آزادیِ کشمیر کو بھی موضوعِ سخن بنا کر اس کی آزادی کا علم بلند کیا ہے۔ اقبال کا خاندان خود بھی کشمیری تھا اس لیے انھیں کشمیر کی غلامی کا شدت سے احساس تھا، ارمغان حجاز میں فرماتے ہیں:

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
سینہ افلاک سے اٹھتی ہے آہ سوز ناک
مر د حق ہوتا ہے جب مرعوب سلطان امیر

(آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر، ارمغان حجاز)

کشمیر کے موضوع پر جب شاعری کا ذکر آئے تو شاعرِ کشمیر یعنی محمد دین فوق کے ذکر کے بغیر یہ روایت مکمل کر نہیں ہوتی۔ محمد دین فوق کا وطن بھی کشمیر ہے اور انھوں نے کشمیر کی آزادی کے لیے اپنی آواز شاعری میں بلند کی ہے۔ اقتباس ہے:

سبب شورشِ کشمیر تو جو کچھ ہے مگر
آج کشمیر یہ کہتا ہے کہ بیدار ہوں میں

(شورش کشمیر، فغان کشمیر)

محمد دین فوق کی نظم "پیش گوئی" میں کشمیر کی آزادی اور انقلاب کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں اور کشمیر کی آزادی کی آس لگائے ہوئے ہیں:

ہاں مگر اک وقت آنے کو ہے بعدِ انقلاب
فطرت باری کا ہو گا پھر ارادہ کامیاب
ہاں نہ گھبرا رحمت حق مہربان ہو جائے گی
جنتِ کشمیر اک دن پھر جواں ہو جائے گی

(پیش گوئی، فغانِ کشمیر)

اردو زبان و ادب میں کشمیر کا موضوع بنیادی حیثیت اختیار کر چکا ہے جس میں آئے روز اضافہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ بقول اعجاز احمد "اردو شعر و ادب میں کشمیر ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ اس موضوع کو اردو شعرا نے ایک سچے قوم پرست کی طرح پر خلوص اور جذباتی انداز میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے اپنی شعری تخلیقات میں کشمیر کی خوبصورتی، حالات و مسائل اور کشمیری قوم کے جذبات و احساسات کو دل کی گہرائیوں سے بیان کیا ہے"(۵۸) کشمیر کے موضوع پر شعر و سخن کے علاوہ اردو نثر میں بھی ادبا کے قلم رکے نہیں ہیں اور وہ بھی مسلسل اس کی آزادی کے لیے قلم سے جہاد کر رہے ہیں ۔ کشمیری عوام اور مجاہدین آزادی کی خاطر بتوں کے پجاریوں سے کئی سالوں سے نبرد آزما ہیں اور انشاءاللہ آزادی ان کے مقدر میں لکھی جا چکی ہے بس ان لمحوں کا انتظار ہے جب برصغیر کے مسلمانوں کی جنت نظیر کافروں سے آزاد ہو گی۔

## اَخلاقی روایات کے آئینہ دار نغمے:

اردو ملّی نغمے اخلاقیات، تہذیب و تمدن اور حسن سلوک کے آئینہ دار ہیں جو معاشرتی زندگی کے لیے رہنما اصول مہیا کرتے ہیں اور ملّی نغمہ نگار کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں۔ ان نغموں میں اخلاقی جرأت، بہترین معاشرتی

اصول، معراجِ انسانیت اور انسانی ترقی کے بہترین اور مثبت اصول کارفرما ہوتے ہیں جن سے نہ صرف اہل زبان و علاقہ بلکہ زبان و علاقہ سے ماورا تمام اہلِ علوم و اہل ذوق کو مستفید ہونے کا یکساں مواقع ملتے ہیں۔ اخلاقی روایات کے نغموں کی وضاحت سے پہلے لفظ اخلاق اور اس کی امت مسلمہ میں اہمیت پر بحث ضروری ہے۔

اَخلاق، خلق کی جمع ہے جس کے معنی کسی انسان کی فطری و طبعی عادات و خصلت کے ہیں جن کا انسان اپنی زندگی میں بلاحجت اظہار کرتا ہے یا اس سے ہوتا ہے۔ فیروز الغات کے مطابق "خلق کی جمع، پسندیدہ عادتیں، اچھی خصلتیں۔ وہ علم جس میں تہذیب نفس اور سیاستِ مُدن پر بحث کی جاتی ہے"(۵۹) یعنی اخلاق سے مراد کسی انسان کی وہ خصوصیات جو اس کی زندگی کا حصہ بن چکی ہوں اور وہ ارادی یا غیر ارادی طور پر اس سے صادر ہو رہی ہوں، اخلاق کے زمرے میں آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایسا عمل جو اس کی طبیعت و گھٹی میں شامل ہو چکا ہو اور اس کے باعث تمام اعمال بڑی آسانی سے سرانجام پاتے ہوں اور ان کے کرنے کے لیے انسان کو سوچ بچار کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ عام طور پر کسی انسان کی باطنی کیفیت اور ظاہری کیفیت کی یکسانیت کو اس کے اخلاق کے دائرہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ اگر یہ کیفیات و عادات معاشرے میں مثبت کردار ادا کریں تو اس کو حسنِ اخلاق اور منفی کردار کی صورت میں بد اخلاق کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا چکا ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اور مسلمانوں کے رہبر رسول کریم ﷺ ظاہری اور باطنی اخلاق و خصائل کے لحاظ سے دنیا میں بہترین نمونہ ہیں جن کے حسن اخلاق کی تصدیق خالق کائنات نے خود کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "و انک لعلی خلق عظیم"(۶۰)(اور (اے نبی) بیشک آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہیں)۔ دین اسلام اخلاق کی بنیاد پر قائم ہوا ہے جس میں سماجی اور معاشرتی و انفرادی زندگی کی تعلیمات اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق قائم ہوئیں اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جو اخلاقیات اور روحانیت کی مستقل بنیادوں پر قائم ہوا نہ کہ مادی مفادات اور دنیاوی اغراض و مقاصد کے۔ اسلام میں خدائی احکامات کو دنیاوی اور مادی مفاد پر ہر لحاظ سے ترجیح حاصل ہے اور رسول اکرم ﷺ کی زندگی اخلاقِ حسنہ کا بہترین نمونہ ہے۔

دین اسلام اور امت محمدیہ ﷺ میں آپ کی زندگی عملی نمونہ کے طور پر پیش کی گئی ہے اور زندگی کے تمام امور کے لیے احسن بنیادوں پر انجام دہی کا حکم ہے۔ کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی، فحاشی اور بدکاری سے منع کیا گیا ہے اور پاکیزگی و انصاف اور رحمدلی سے پیش آنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

مسلمانوں کے اخلاق حسنہ سے متاثر ہو کر غیر مسلم جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔ مسلمان اکابرین و تاجروں نے اخلاق کا عملی نمونہ ہر جگہ پیش کیا جس سے اسلام پوری دنیا میں پھیل گیا۔ دوسرے لفظوں میں اسلام کی اشاعت و ترقی، اخلاق حسنہ کی مرہون منت ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا اور رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی تمام زندگی اللہ رب العزت کے احکام کے مطابق اخلاقی روایات کی پاسداری میں عالمی دنیا کے لیے ایک نمونہ پیش کرتے ہوئے گزری۔ مراد یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے پاس اعلیٰ اخلاق نہ ہوتا تو کچھ شک نہیں کہ اسلام اس قدر نہ پھیلتا لیکن چونکہ اسلام دین کامل ہے اور انسانی معاملات میں اخلاق کو سب سے برتری حاصل ہے اس لیے اچھا اخلاق ہر مسلمان کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے اور تمام انسانوں کے اتحاد و اتفاق کا راز بھی اچھے اخلاق میں پوشیدہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے:

ولوکنت فظا غلیظ القلب لا لفضو من حولک(۶۱)

(اگر تم بد گو اور سخت دل ہوتے تو یہ سب لوگ تمہارے ارد گرد سے تتر بتر ہو جاتے)

لہٰذا اس یہ ظاہر ہوا کہ اسلام میں اچھے اخلاق کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور زندگی کے تمام معاملات میں ہر ایک کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آنا ہی کامیابی کی پہلی سیڑھی ہے۔ اچھا اخلاق صرف یہ نہیں کہ کسی کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش آیا جائے بلکہ زندگی کے تمام معاملات جن میں بغض، کینہ، حسد، غیبت، بخل، چغلی، گالم گلوچ، چوری، جھوٹ، زنا، ڈاکہ زنی وغیرہ سے سختی سے بچنے اور صابر، شاکر، راست گفتار، نیکوکار، کثیر العمل، کثیر الاصلاح، رفیق، حلیم، پارسا، شفیق اور صاحب وقار جیسے اعمال کی انجام دہی اچھے اخلاق کے خصائص ہیں۔

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے جس میں تمام انسانیت کی فلاح و بہبود اور دنیا و آخرت کی کامرانی کے لیے انسان کی رہنمائی کے لیے اصول وضع کیے گئے ہیں۔ انسانیت کی تبلیغ صرف اچھے اخلاق اور زریں اصولوں کی بدولت ممکن ہے جبکہ معاشرہ کا قیام انسانی زندگی میں فطرت کے اصولوں کے مطابق ہے اور معاشرے میں انسانوں کو مل جل کر رہنے کی ضرورت پیش آتی ہے لہٰذا اچھے اخلاق سے معاشرہ کی کامیاب تکمیل ممکن ہے جس کی اسلام دعوت دیتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر اگر دنیا کے تمام انسان اسلامی اصولوں کے مطابق اپنی اصلاح کر لیں یعنی اسلام نے انسانی فلاح کے لیے جس اخلاق حسنہ کی تاکید فرمائی ہے اس پر من و عن عمل کر لیں تو یقیناً پوری دنیا ایک درست اور مثالی معاشرہ کی شکل اختیار کر لے گی۔ جو مثالی اسلامی معاشرہ کہلانے کا حقدار ہو گی۔ امت محمدیہ نے اخلاقیات کے وہ اصول جو انسانیت کی فلاح اور اصلاح کے لیے لازم اور احکامات الٰہی ہیں، ان اصولوں کے ذریعے سے دوسرے غیر مسلموں کو تبلیغ کی ہے جس میں زبان اور تحریر بنیادی ذرائع ہیں۔ تحریری طریقہ کار میں

شاعری ایک ایساذریعہ ہے جس سے انسان جلد اور دیرپا اثر لیتا ہے لہٰذا شاعری کا دیگر مقاصد کے ساتھ ایک مقصد اخلاقی روایات کی تبلیغ و ترویج بھی ہے تا کہ انسانیت اسلامی اصولوں کے مطابق ایک عالمگیر اخلاقی و فلاحی معاشرہ میں ڈھل سکے۔

چونکہ پاکستان کا قیام اس سلسلے کی ایک کڑی ہے کہ جس میں پاکستان کو حکمِ خدا کے مطابق ایک اسلامی معاشرہ میں ڈھال کر پوری انسانیت کے لیے ایک مثال قائم کرنا اور پھر اقوام عالم کو اس مثالی اسلامی معاشرہ کی تکمیل کے لیے تبلیغ کرنا ہے لہٰذا ان مقاصد کے لیے علما کرام کے ساتھ معاشرے کے دیگر افراد نے بھی اپنی بہترین کاوش کی ہے جن میں شعرا بھی شامل ہیں۔ شعرا نے ملّی نغموں کے ذریعے اخلاقی روایات کا درس دیا ہے اور خدا تعالیٰ کے احکامات اور اسلامی فلاحی معاشرہ کے قیام کے لیے شعری اظہار کے ساتھ عملی زندگی میں ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی حتیٰ الامکان کاوش کی ہے۔ اردو شاعری میں اخلاقی اقدار کی روایت نے اخلاقی قدروں کے ساتھ ملّی نغمہ کی روایت اور عزت و تکریم اور ملّی نغموں کے سرمائے میں بھی گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ ملّی نغموں میں اخلاقی روایات کے آئینہ دار نغموں کو اس روایت میں شامل نہ کرنا بہت بڑی ناانصافی ہو گی۔

قیام پاکستان کے فوراًبعد شعرا کی اکثریت کا پسندیدہ موضوع ہجرت اور فسادات تھا لیکن اس دور میں بھی کچھ شعرا اخلاقی روایات کا درس دیتے رہے۔ جب ہجرت و فسادات کا غبار چھٹا تو باقی شعرا نے بھی اخلاقی روایات اور قدروں کی طرف توجہ کی اور انسانی فطرت کے ان پہلوؤں کی طرف بھی متوجہ ہوئے جو ایک عام زندگی میں انسانی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔

ہجرت کے بعد جب برصغیر کے مکینوں کا چہرہ خاک و خون میں لتھڑا ہوا تھا اور مصنفین ہجرت کی حکایات و شکایات کو سپردِ قلم کر رہے تھے۔ ایسے میں احمد ندیم قاسمی جیسے انسان دوست شاعر کو نہ صرف ہجرت میں لٹے پٹے انسانوں کا غم تھا وہیں وہ ادیبوں کو ان غریب انسان کی طرف بھی متوجہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جو جھونپڑی میں بے بس اور بے یار و مددگار بیٹھا تھا اور انسانیت کے دشمن اخلاقی اقدار کو روندتے ہوئے اس کے تمام حقوق پر قبضہ کرنے پر تلے ہوے تھے۔ "فن برائے فن" سے اقتباس ہے:

بڑے ادب کے بجائے بڑا سوال یہ ہے
کہ اس کے ہاتھ سے نوچے ہوئے نوالوں کو
کوئی نگل نہ سکے
نگل سکے تو یہ بن جائیں ایسے انگارے
جنھیں اگل نہ سکے (فن برائے فن، شعلہ گل)

احمد ندیم قاسمی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اور ترقی پسند تحریک کا بنیادی مقصد ہی انسان اور انسانیت تھا لہٰذا اس تحریک کے دیگر شعرا میں بھی اخلاقی روایات کا رنگ پایا جاتا ہے لیکن یہ تحریک نظریہ مارکیسیت کی مرہون منت تھی اور اسلامی اقدار سے اس کا دور دور کا کوئی تعلق بھی نہ تھا اس کے باوجود کچھ شعرا کے کلام میں انسان دوستی اور اخلاقی روایات کے دائرہ کار میں رہ کر اسلامی شعائر کا عکس بھی پایا جاتا ہے ان میں احمد ندیم قاسمی بھی شامل ہیں۔ انسانیت سے پیار احمد ندیم قاسمی کی تمام شاعری میں نمایاں ہے جبکہ اخلاقی روایات بھی انسان اور انسانیت سے محبت سکھاتی ہیں اور اسلام میں اخلاق کا اعلیٰ درجہ خدمتِ انسانیت ہے۔ اکرم باجوہ فرماتے ہیں:

ہم مسلمان ہیں یہ سارا زمانہ سن لے
نار نمرود کو گلزار بنا دیتے ہیں
عدل و انصاف کا دنیا کو سبق دیتے ہیں
ہم ہیں جو قوموں کا کردار بنا دیتے ہیں

(قائد اعظم، تکبیر کا رنگ للکار ہوا)

اسلامی اخلاقی روایات میں ہمدردی کا جذبہ، احترام انسانیت اور خدمتِ انسانیت اہم پہلو ہیں۔ سوچ کو مثبت رکھنا اور دوسروں کے لیے ہمیشہ فائدہ مند رہنا اخلاقی اصولوں میں شامل ہیں۔ اسی طرح کسی کو دکھ، درد اور تکلیف کی حالت میں دیکھ کر اس کو حوصلہ دینا اور دعا کرنا بھی بہترین اخلاق ہے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید نے ۱۹۸۱ء میں سال معذورین کے موقع کی مناسبت سے نظم "۱۹۸۱ء سال معذورین" کے عنوان سے لکھی۔ نظم میں معذوروں سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ہمارے معذور بھائیوں پر خدائے برتر کی رحمتیں ہوں
رہے سلامت شعور ان کا بلند ان کی بصیرتیں ہوں
الٰہی معذور بھائیوں کا ہمارے، دنیا میں یہ چلن ہو
نیا تبسم نئی بصیرت ہو دھن اور نئی لگن ہو

(۱۹۸۱ء سال معذورین، ارمغانِ وطن)

اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی پیغمبر اور رسول بھیجے وہ سب انسانوں کے لیے معلم بن کر آئے۔ یعنی علم سیکھنا اور سکھانا قرب خدا حاصل کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ انسانوں میں علم سکھانے کا بنیادی مقصد بھی ان کی اخلاقیات کو بلند کرنا ہے۔ وہ علم جو اخلاقیات اور احترام انسانیت سے دور کر دے وہ علم نافع نہیں ہو سکتا بلکہ اس علم کو علمِ ناقص کہیں گے۔ علم کا بنیادی مقصد انسانیت کی فلاح اور انسانوں کے چہروں پر خوشی بکھیرنا ہے جو علم ان خوبیوں سے

معذور ہو اس کے سیکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ علم ایک ایسی طاقت ہے جو اندھیروں کو روشنی میں بدل دیتا ہے۔ حفیظ تائب قومی نظمات میں علم کی اہمیت وافادیت اور اس سے پوری دنیا کے لیے روشنی مہیا کرنے کا عزم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حق نے آدم کو سکھائے نام سب
مرتبہ ایسے جتایا علم کا
جس نے ٹھہرایا حصول علم فرض
ہے نبیؐ میرا مدینہ علم کا

(علم کی اہمیت، تعبیر)

مقاصدِ پاکستان کی تکمیل کے لیے شعرا نے ملّی نغموں میں اخوت اور محبت کا پیغام دیا ہے جس کا مقصد پاکستان کی سربلندی اوراسلامی تعلیمات پر عملداری ہے۔ بعض شعرا اور ان کی شاعری نے معاشرے کو اخلاقی گراوٹ کا شکار بھی کیا ہے جس وجہ سے شعرا اور شاعری کو کچھ دانشوروں نے ناپسند کیا جن میں افلاطون بھی شامل تھا در حقیقت ان کے پیش نظر شاعری کے منفی پہلو تھے لیکن شاعری کو مثبت پہلوؤں سے لکھا اور برتا جائے تو یہ بہت ہی کارآمد ہوتی ہے۔ قمر یزدانی اپنے کلام میں ان شعرا سے مخاطب ہیں جن کے کلام میں سستی شہرت کی خاطر فحاشی وعریانی پائی جاتی ہے۔ ایسی شاعری نہ صرف شاعر بلکہ معاشرے کو بھی اخلاقی لحاظ سے کمزور کر دیتی ہے۔ قمر یزدانی کی نظم "آج کچھ کہنا ہے مجھ کو شاعرانِ قوم سے" سے اقتباس ہے:

ہو خفا جس سے خدا وہ شعر کہنا چھوڑ دو
چھوڑ دو رومان کی وادی میں رہنا چھوڑ دو
ہاں اٹھو ، پیغام خود داری دو اپنی قوم کو
اٹھ کے اب درس وفاداری دو اپنی قوم کو
نوجوانِ وطن کو لذتِ احساس دو
کچھ تو اہل قوم کو اپنے سلف کا پاس ہو

(آج کچھ کہنا ہے مجھ کو شاعرانِ قوم سے، زندہ وپائندہ باد)

اسلام کے نام پر قائم ہونے والے ملک کے اسلامی معاشرے میں چند سیکولروں نے بے حیائی کو فروغ دینے کے لیے عورت کو حقوق حاصل کرنے کے نام پر ہتھیار بنالیا ہے حالانکہ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو عورت کے لیے سب سے زیادہ اور سب سے پہلے اسلام نے حقوق وضع کیے تھے۔ تمام حقوق گھر کی چار دیواری اور

پردے میں رہ کر دیے اور عورت کو اس کا اصلی مقام اسلام نے ہی عطا کیا۔ لیکن جب مسلمان کا ایمان کمزور ہو جائے تو وہ عورت کو آزادی کے نام پر مغرب سے متاثر ہو کر آوارگی کی حمایت کرنے لگتا ہے جس سے معاشرے میں سب سے بڑا اخلاقی بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اور خواتین کے عالمی دن کے موقع پر ہمارے مسلمان گھرانوں کی مائیں، بہنیں چند بے دین عناصر کے ہاتھوں میں کھیل کر ایسے ایسے مطالبات کرتی نظر آتی ہیں کہ انسان کیا جانور بھی شرما جائیں۔ ''میرا جسم میری مرضی''، جیسے نعرے تخلیق کیے ہیں اور ان کی باقاعدہ تشہیر کی جاتی ہے۔ خواتین کے عالمی دن یعنی ہر سال ۳۱ مارچ کو ایسے بد اخلاق اور بد چلن نعروں کے پوسٹر بنا کر ریلیاں نکالی جاتی ہیں۔ یہ معاشرے کے اخلاقی زوال کی انتہائی حالت کہی جا سکتی ہے۔ قمر یزدانی اس بد اخلاقی کی حقیقت بیان کرتے ہوئے دلچسپ انداز میں نظم ''یہ'' میں فرماتے ہیں:

دیکھتے ہیں دخترانِ قوم کا رقص و سرور
یہ مسلماں ہیں کہ آقائے فرنگی کے غلام
جس کو اب ''قومی ثقافت'' کہہ رہے ہیں اہل عقل
اصل میں عصمتِ نسوانیت کا قتل عام
ہو اگر بے پردہ عورت تو عورت ہی نہیں
لفظ ''عورت'' ہی میں پوشیدہ ہے عورت کا مقام

(یہ، زندہ و پائندہ باد)

کسی بھی معاشرے میں جھوٹ کو بہت بڑی اخلاقی برائی سمجھا جاتا ہے اور صادق کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کیونکہ سانچ کو آنچ نہیں۔ اردو ملّی نغموں میں بھی جھوٹ جیسی اخلاقی برائیوں سے اجتناب کرنے اور صداقت کو اپنانے کی تلقین کے ساتھ اس کے فوائید و اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قمر یزدانی کی نظم ''صداقت'' سے اقتباس ہے:

صداقت جاودانی ہے، صداقت غیر فانی ہے
صداقت ہی زمانے میں کلید کامرانی ہے
صداقت شانِ مسلم ہے صداقت جزو ایماں ہے
''صداقت پر رہو'' یہ سرور عالم کا فرماں ہے

(صداقت، زندہ و پائندہ باد)

جھوٹ کی طرح رشوت خوری بھی بنیادی اخلاقی برائیوں میں شمار ہوتی ہے۔ رشوت خوری میں گرفتار معاشرے جلد ہلاک ہو جاتے ہیں اور قومیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ اسلام نے بھی رشوت خور اور رشوت دینے والوں کے لیے سخت وعید سنائی ہے۔ اردو ملّی نغمہ نگاروں نے ملّی نغموں میں اخلاقیات کی بہتری اور اسلامی معاشرے کی فلاح کے لیے رشوت کے نقصان اور اس کی کارستانیوں کا ذکر کیا ہے:

حقوق نوح انساں کے لیے زنجیر ہے رشوت
جو ایماں کا گلا کاٹے وہ اک شمشیر ہے رشوت

یہ رشوت آدمی سے آدمیت چھین لیتی ہے
حمیت چھین لیتی ہے شرافت چھین لیتی ہے

(رشوت، زندہ و پائندہ باد)

اردو شاعری میں اخلاقیات کی فراوانی پائی جاتی ہے اس کی بنیادی وجہ شعرا کی مذہب سے وابستگی ہے۔ اخلاقیات انسان کو آدمیت سکھاتی ہے اور اس کے بغیر دنیا کی کوئی قوم تسلسل سے ترقی نہیں کر سکتی۔ مسلمان بھی جب اخلاقیات کے اعلیٰ معیاروں پر قائم رہے تو انھوں نے دنیا پر اپنا اثر و رسوخ قائم رکھا لیکن اخلاقی زوال کے ساتھ ہی وہ سیاسی زوال کا بھی شکار ہو گئے اور دوسری قوموں نے مسلمانوں کو دبانے اور صفحہ ہستی سے مٹانے کی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس لیے حب الوطن شعرا ملّی نغموں میں اخلاقیات کا درس دینے کا خصوصی خیال رکھتے ہیں تاکہ وقت کے ساتھ ساتھ مسلمان بلند اوصاف کی طرف رخ کریں اور اخلاقی زوال سے محفوظ رہیں۔

### مذہبی روایات کے آئینہ دار نغمے:

دین اسلام ایک ضابطہ حیات اور گزشتہ ادیان کی اصلاح و تعلیمات پر مبنی ایک توحیدی دین ہے جو اللہ کی واحدانیت کے پیغام کے ساتھ عالمی دنیا کو ایک مثالی فلاحی معاشرے کی تشکیل پر زور دیتا ہے۔ مثالی معاشرے کی بنیاد رکھنے والی ذات اللہ کے آخری نبی الزماں ﷺ ہیں جن کی ذات مبارکہ خود بھی مثالی ہے اور ان کی تعلیمات بھی فلاحی معاشرے کی تعمیر و تکمیل میں مثالی حیثیت رکھتی ہیں۔ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کے احکامات و تعلیمات کی آخری الہامی کتاب ہے جو آپ پر تقریباً تیئیس برس پر محیط عرصے میں مکمل ہوئی۔ احکامات خداوندی کی تشریح و توضیح آپ کی احادیث مبارکہ سے ہوتی ہے۔

قرآن کریم اور احادیث مبارکہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ تاقیامت تمام دنیائے عالم کے لیے مشعل راہ ہیں جن کی بدولت مثالی انسانی فلاحی معاشرہ کی تکمیل ممکن ہے اور تمام انسانوں کو لڑائی جھگڑوں اور اخلاقی برائیوں

سے ماورا ہو کر ایک لڑی میں پرونے کی اہلیت رکھتی ہیں کیونکہ اسلامی تعلیمات ذاتی مفاد سے بالاتر ہو کر انسانی خدمت کی تلقین کرتی ہیں۔ جن معاشروں، قوموں اور قبیلوں نے ان اسلامی روایات کو اپنایا وہ ترقی کی منازل طے کرتی ہوئی دنیا پر چھا گئیں۔ موجودہ دور میں مغرب کی ترقی بھی اسلامی روایات کا دامن تھامنے کا نتیجہ ہے۔ مسلمان جب تک ان تعلیمات پر عمل پیرا رہے وہ دنیا پر چھائے رہے لیکن جیسے ہی انھوں نے ان تعلیمات کو اپنانے میں سستی کا مظاہرہ کیا یا پھر ان میں غیر اسلامی تعلیمات نے فروغ پانا شروع کیا تو زوال ان کا مقدر ٹھہرا۔

اردو شاعری اور ملّی نغموں میں اسلامی تعلیمات اور مذہبی روایات کے آئینہ دار کلام کا آغاز بہت عرصہ پہلے ہی سے ہو چکا ہے۔ دیگر الفاظ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں اسلام کے تعارف سے ہی ان روایات کا آغاز ہو گیا تھا جو بعد میں آنے والے ادوار میں باقاعدگی کے ساتھ ارتقاء کے مدارج طے کرتا رہا۔ قیامِ پاکستان کے بعد تخلیق ہونے والے ملّی نغموں میں بھی یہ روایات و تعلیمات قرینے کے ساتھ شامل ہوتی آئی ہیں۔ شعرا نے اسلامی روایات کا امین بن کر اخوت، بھائی چارے اور آدمیت کا مظاہرہ کرنے کے لیے ملّی نغموں کو فروغ دیا۔ طفیل ہوشیارپوری مسلمانوں کو اخلاقی روایات کی پاسدار اور آدمیت کی علمبردار قوم کہتے ہوئے نظم ''آدمیت کے علمبردار ہیں'' میں فرماتے ہیں:

بے کسوں اور بے بسوں کا آسرا
سرورِ عالم محمد مصطفےٰؐ
ہادیِ برحق ہمارا رہنما
جان و دل سے اسی کے پیروکار ہیں
ہم مسلماں پیکرِ ایثار ہیں

(آدمیت کے علمبردار ہیں، میرے محبوب وطن)

اسلام کے پانچ بنیادی ارکان کلمہ طیبہ، نماز، روزہ، زکوۃ اور حج دراصل اخلاقی روایات کی بنیادیں ہیں۔ شعرا نے ملّی نغموں میں ان اسلامی ارکان کو روایت کا حصہ بنایا ہے۔ عبد العزیز المعروف اے عزیز جو ''للکار'' پشاور کے چیف ایڈیٹر رہے ہیں، وہ ''مسلم خوابیدہ اٹھ بیدار ہو، تیار ہو'' کے عنوان سے لکھے گئے شعری مجموعہ میں اسلامی و اخلاقی روایات، حب الوطن اور حب الاسلام سے سرشار ہو کر نغمے لکھتے ہیں۔ وہ اسلامی رکن ''زکواۃ'' کے احکامات و اہمیت و افادیت کے بارے قطعہ میں فرماتے ہیں:

زکوۃ ہم پہ فرض ہے، اللہ کا یہ فرمان ہے
چاروں طرف نظر دوڑا، کون لاچار، پریشان ہے

کس کے ہاں غذا ، دوا کا بھی فقدان ہے
یہ مشکلیں آسان کر ، گر تو صاحب ایمان ہے

(زکواۃ، مسلم خوابیدہ اُٹھ، بیدار ہو تیار ہو)

اسلام ایک نظامِ حیات ہے جس کی تعلیمات پر عمل کرنے سے اقوام میں اخوت و بھائی چارہ کی عمدہ روایت قائم ہوتی ہے۔ اس میں زکوۃ و صدقات کے ذریعے غریب کی عزتِ نفس مجروح ہونے سے بھی محفوظ رہتی ہے اور معاشرے میں غربت کا خاتمہ بھی عین ممکن ہو جاتا ہے اس لیے تو اس دین کو مثالی اور لاثانی مذہب کا درجہ حاصل ہے جس میں تمام تعلیمات مکمل اور آفاقی ہیں۔

اسلامی بنیادی ارکان میں زکوۃ کی طرح روزہ کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ روزہ دراصل صاحب ایمان میں وہ احساس پیدا کرتا ہے جس سے اس کو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر ہوتی ہے اور وہ رب کعبہ کا قرب حاصل کرلیتا ہے۔ جس سے وہ فقرا اور غربا کی طرف اپنے خزانے کے منہ کھول کر اللہ اور اس کی مخلوق کو راضی کرتا ہے۔ اے عزیز اپنے مجموعے میں ماہ رمضان کے موضوع پر نغمہ ''ماہِ صیام آیا'' میں فرماتے ہیں:

ماہِ صیام آیا، جنت کا پیام لایا
روزے جو رکھے ہم نے ، اللہ سے انعام پایا
قرآن بھی پڑھا ہم نے، قرآن بھی سنا ہم نے
اس سعادت سے ہم نے ، جنت میں مقام پایا

(ماہ صیام آیا، مسلم خوابیدہ اُٹھ، بیدار ہو تیار ہو)

ماہ رمضان مسلمانوں کے لیے رحمتوں کا مہینہ ہے جس میں چھوٹے بڑے سب سحری کے اوقات میں جاگ کر روزے رکھنے کے سعادت حاصل کرتے ہیں اور شام کو افطاری کی دعوتیں چلتی ہیں۔ رات کو مسجدوں میں تراویح کی نماز میں قرآن پاک سننے سے عجیب لطف حاصل ہوتا ہے پھر ماہ رمضان کے آخر میں عید الفطر کے موقع پر جو خوشی اور سرور ملتا ہے وہ کدورتیں اور نفرتیں ختم کر کے دل میں محبتوں کے چراغ جلا دیتا ہے۔

اسلامی عقائد اور روایات کے مطابق مسلمان اپنے آبائی وطن سے محبت ضرور کرتے ہیں لیکن وہ غیر مسلم مذاہب کی طرح وطن کی پوجا نہیں کرتے۔ اسلام میں پوجا اور پرستش صرف اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کی ہو سکتی ہے۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کے لیے پوری کائنات ہی ان کا وطن ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا خالق و مالک ہے۔ مسلمانوں نے اس عقیدے کا عملی ثبوت فراہم کیا کہ وہ جہاں بھی گئے وہاں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کی اور اسی علاقے کو اپنا وطن سمجھا۔ اسلامی روایات کے مطابق مسلمان جس علاقے میں بھی مقیم ہوئے ان کی حب

الوطنی اور محبت اسی علاقے کے ساتھ وابستہ ہو گئی اور اس ملک کی عوام کی فلاح و بہبود و اصلاح کے لیے انھوں نے عملی اقدامات کیے اور اس کی حفاظت و آزادی کے لیے شجاعت و مردانگی سے جانیں بھی قربان کر کے عملی وفاداری کا ثبوت فراہم کیا۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم مسلمانوں کی اس مذہبی روایت کو اپنی نظم "مسلمان ہیں ہم مسلمان ہیں ہم" میں قلم کرتے ہیں:

جہاں جا کہ ٹھہرے وطن ہے ہمارا
جہاں چہچہائیں ، چمن ہے ہمارا
ہر اک ملک کی ، دیس کی شان ہیں ہم
مسلمان ہیں ہم ، مسلمان ہیں ہم
رہ حق پہ چلنا ہے عادت ہماری
ہے عزت سے جینا فضیلت ہماری
وطن کی حفاظت شجاعت ہماری
وطن کے تحفظ پہ قربان ہیں ہم
مسلمان ہیں ہم ، مسلمان ہیں ہم

(مسلمان ہیں ہم، سو بار چمن مہکا)

مسلمان جب تک اسلامی روایات اور اخلاقی قدروں پر عمل پیرا رہے انھوں نے اتحاد و یگانگت کی مثالیں قائم کیں وہ کفر کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کے کھڑے ہو جاتے اور قہر بن کر ان پر برس پڑتے لیکن جب آپس میں ملتے تو ان کے دل نرم و ملائم ہوتے۔ دراصل ان کے یہ تمام افعال پوری دنیا میں امن قائم کرنا اور اسلامی مثالی معاشرے کی تشکیل کے آئینہ دار تھے۔ امید فاضلی کفارانِ اسلام سے مخاطب ان کو انتباہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو آپس میں نرم دیکھ کر یہ مت سمجھنا کہ وہ کمزور ہیں بلکہ حق اور باطل کی لڑائی میں وہ کسی بڑے طوفان سے کم نہیں ہیں۔ امید فاضلی کی نظم "انتباہ" سے اقتباس ہے:

ہم امن کے سفیر وفا کا جمال ہیں
فاروقؓ کا شعور، نوائے بلالؓ ہیں
لیکن بوقت جنگ علیؓ کا جلال ہیں
جو بت کدوں میں گونجی ہے ہم وہ اذان ہیں
آگے بڑھیں تو موج ، رکیں تو چٹان ہیں

(انتباہ، پاکستان زندہ باد)

اسلامی تاریخ میں واقعہ کربلا ایک سیاہ باب ہے لیکن اس سے ہمیں تاریخ کا بے مثال سبق بھی ملتا ہے کہ مومن کٹ تو سکتا ہے لیکن باطل کے سامنے جھک نہیں سکتا اور حضرت امام حسینؓ نے اس کی عملی مثال قائم کی اور اپنے قریبی ساتھیوں اور اہل خانہ سمیت بہتر ساتھیوں کے ساتھ باطل کے خلاف ڈٹ گئے حتیٰ کہ تمام ساتھی شہید ہو گئے اور خود بھی جام شہادت نوش فرمایا اور اسلامی تاریخ میں سید الشہدا کا لقب پایا۔ شہادت امام حسینؑ اور واقعہ کربلا اسلامی تاریخ کا اتنا بڑا سانحہ ہے کہ صدیاں گزرنے کے باوجود امام حسینؓ کا غم منانے کی روایت چلی آ رہی ہے اور اس کو اسلامی مذہبی روایات میں اہم مقام حاصل ہے۔ شعرا نے اس واقع سے متاثر ہو کر کئی مرثیے، قصیدے، نوحے اور سلام لکھے ہیں۔ اسی طرح اردو شعرا نے ملّی نغموں کی روایات میں جن مذہبی روایات کو شامل کیا ہے ان میں غمِ حسینؓ کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ افتخار عارف "بحضور سیّد الشہداؑ" کے عنوان سے حضرت امام حسینؓ کی عظمت و مرتبہ کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

کربلا کی خاک پر کیا آدمی سجدے میں ہے
موت رسوا ہو چکی ہے زندگی سجدے میں ہے
وہ جو اک سجدہ علیؑ کا بچ رہا تھا وقتِ فجر
فاطمہؑ کا لال شاید اب اسی سجدے میں ہے
سنتِ پیغمبر خاتمؐ ہے سجدے کا یہ طول
کل نبی سجدے میں تھے آج اک ولی سجدے میں ہے (بحضور سیّد الشہداؑ، جہاں معلوم)

اسلامی مذہبی روایات میں میلاد مصطفیٰ ﷺ کے موضوع پر شعرا نے ملّی نغمے اور نعت رسول مقبول لکھی ہیں۔ اسلامی سال کا بارہ ربیع الاول کا دن ان نغموں سے گونج اٹھتا ہے۔ اس کے ساتھ جلسے جلوس، ریلیاں اور گھروں کو جھنڈیوں سے سجائے جانے اور گھروں میں محفل میلاد منعقد کرنے کی روایت تقویت پا چکی ہے۔ ملّی نغموں میں مذہبی روایات کے حوالے سے میلاد شریف کا موضوع خصوصیت کا حامل ہے۔ واصف علی واصف "میلاد النبی" کے عنوان سے نظم لکھتے ہیں:

مبارک اہل ایماں کو کہ ختم المرسلیںؐ آئے
مبارک ہو کہ دنیا میں شہِ دنیا و دیں آئے
چراغ طور آئے، زینتِ عرش بریں آئے
کہ حسنِ ذات، دینے کے لیے ذوق یقیں آئے
مبارک ہر جہاں کو رحمتہ اللعالمیںؐ آئے (میلاد النبیؐ، شب چراغ)

مسلمانوں کی مذہبی روایات میں جہاد فی سبیل اللہ مجاہدین اسلام کا خوش کن فعل رہا ہے۔ مسلمانوں کا عروج، غلبہ اور کفار کے غرور کو خاک میں ملانے کے پیچھے نہ صرف مسلمانوں کا بلند اخلاق کار فرما تھا بلکہ اخلاقی بلندی کے ساتھ فریضہ جہاد کی ادائیگی پر بھی منحصر تھا۔ آپؐ کی تربیت کردہ جماعت نے آپؐ کی حیات مبارکہ میں ہی جزیرہ عرب کو فتح کر لیا تھا۔ آپؐ کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ نے اُس وقت کی سپر طاقتوں روم و فارس کو منطقی انجام تک جہاد کی بدولت ہی پہنچایا اور روئے زمین پر ہر قسم کی فتنہ انگیزی کے خاتمے کی کوششیں کیں۔ کوئی بھی غیر مسلم اس قابل نہ رہا تھا کہ وہ مسلمانوں کی املاک کو نقصان پہنچا سکے۔ ان کی عزتیں اور آقا دو جہاں ﷺ کی عزت پامال کر سکے یا قرآن پاک کو نذرِ آتش کر سکے۔ مسلمانوں کے کسی بھی علاقے میں دراندازی کرے، دہشت گردی پھیلائے اور الزام مسلمانوں پر لگائیں۔ لیکن جیسے ہی مسلمانوں نے جہاد جیسے مقدس فریضے کو ترک کرنا شروع کیا تو مسلمان ذلت کی گھاٹیوں میں اترے چلے گئے حتیٰ کہ کفار نے ان کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

موجودہ دور میں بھی مسلمانوں کی جہاد سے بیزاری سے منکرانِ اسلام ان کو ہر طرح سے زک پہنچا رہے ہیں۔ دنیا کے کئی مسلم علاقوں پر غیر مسلم قابض ہیں اور مسلمانوں کی عزتیں و جان و مال مسلسل خطرے میں ہیں۔ آزاد مسلم ملکوں میں بھی کچھ غیر مسلم ممالک اس حد تک دخل اندازی رکھتے ہیں کہ ان کی حکومت، تحفظ اور معیشت کا کنٹرول غیر محفوظ ہے اور وہاں کے مسلمان عیش پرستیوں میں پڑے ہیں اور منبر و محراب جہاد کے بارے خاموش ہیں۔ مسلمانوں میں جو ممالک جہاد کی فضیلت کو سمجھتے ہوئے اپنے دفاع اور ملکی تحفظ کو صف اول میں شمار کرتے ہیں، ان میں پاکستان بھی شامل ہے۔ پاکستان کے ناقابلِ تسخیر دفاع کی وجہ سے کفار اس ملک سے خوفزدہ ہیں اور اس کو مٹانے یا اس کا دفاعی نظام ختم کرنے اور جذبہ جہاد کی بجائے سیکولرازم کی طرف رخ موڑنے کے پورے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔

پاکستان کے مضبوط دفاع اور جذبہ جہاد کے زندہ ہونے کی وجہ سے دوسرے مسلمان ممالک اس پر فخر کرتے ہوئے اسے قلعہ اسلام تسلیم کرتے ہیں۔

پاکستان میں جہاد کی تبلیغ اہم مذہبی فریضہ سمجھ کر نہ صرف محراب و منبر سے شروع ہوتی ہے بلکہ اردو شعرانے مِلّی نغموں میں اس کام کو اہم مذہبی روایت اور فریضہ سمجھ کر تبلیغ کرنے کا پورا حق ادا کیا ہے۔ احسان دانش کی نظم ''ترانہ جہاد'' سے اس کی مثال پیش کی جاتی ہے:

مجاہدین صف شکن بڑھے چلو بڑھے چلو

روشن روشن چمن چمن بڑھے چلو بڑھے چلو

جبل جبل دمن دمن بڑھے چلو بڑھے چلو

بکش بکش ہزن ہزن بڑھے چلو بڑھے چلو

مجاہدین صف شکن بڑھے چلو بڑھے چلو

(ترانۂ جہاد، جنگ ترنگ)

دعوت جہاد ہو یا دیگر مذہبی روایات، اردو شعرا نے ان کو اس روایت کو ملّی نغموں کا حصہ بنایا ہے جو تسلسل کے ساتھ جاری ہے اور اس میں مزید اضافہ وارتقا دیکھنے کو آرہا ہے۔

### وحدت عالم اسلامی اور پاکستانی ملّی نغمے (اسلامی کانفرنس ۱۹۷۴ء):

مسلمانوں کے مشترکہ دشمن اکھٹے ہو کر خلافت کو ختم کر کے اسلامی دنیا کو تقسیم کرنے کے بعد اس بات پر بغلیں بجارہے تھے کہ وہ اب عنقریب ایک ایک کر کے مسلمانوں اور ان کے مقدس مقامات کو مٹادیں گے اور ان کی املاک پر قبضہ جمالیں گے لیکن ایک فیصلہ باطل کرتا ہے اور ایک فیصلہ رب کائنات کا ہوتا ہے جو حق اور سچ پر مشتمل ہوتا ہے اور اللہ کے حکم کے مطابق غالب ہمیشہ حق ہی رہا ہے۔ دشمنان اسلام نے ۱۹۶۹ء میں مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانے کے لیے مسجد اقصیٰ میں آگ لگانے کی ناپاک سازش کی۔ اس سازش نے مسلمان سربراہوں کو اکٹھے ہو کر سوچنے پر مجبور کر دیا اور آخر کار اسلامی ملکوں کے اتحاد سے اسلامی سربراہی کونسل کا قیام عمل میں آیا اور اس کا پہلا اجلاس مراکش کے شہر رباط میں مراکش کے شاہ حسین ثانی کی سربراہی میں ہوا جس سے یہ امید پیدا ہوئی کہ مسلمان عالمی مسائل کامل کر مقابلہ کریں گے یعنی ملت اسلامیہ کفار کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک صفحے پر متفق ہو گئی۔ شیخ عبدالخالق اپنے کالم "اسلامی سربراہی کانفرنس: چند یادیں" میں لکھتے ہیں کہ اسلامی سربراہی کانفرنس کے پہلے اجلاس کے وقت پاکستان کے صدر جنرل یحیٰ خان تھے جو پاکستان کی نمائندگی کرنے کے لیے کانفرنس ہال میں پہنچے تو دیکھا کہ مسلم سربراہان کے درمیان ایک سکھ بھی براجمان ہے جس پر یحیٰ خان نے اعتراض کیا۔ صدر پاکستان کو بتایا گیا کہ یہ بھارت کا نمائندہ ہے۔ صدر موصوف نے پھر سوال اٹھایا کہ یہ اسلامی ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس ہے، بھارت یا بھارت کا نمائندہ اس میں کیسے شامل ہو سکتا ہے (کیونکہ بھارتی ہندوستان کو ایک ہندو ریاست اور مسلمانوں کو اقلیت تسلیم کرتے ہیں بلکہ بھارت کو اپنی ہندو ماتا کہتے ہوئے مسلمانوں کو اپنے لیے بوجھ سمجھتے ہیں اور اسی بوجھ کی بنیاد پر برصغیر کے مسلمانوں نے علیحدگی اختیار کر

کے مسلمانانِ برصغیر کے لیے پاکستان قائم کیا تھا لہٰذا اسلامی سربراہی کانفرنس میں بھارت کے نمائندے کی شمولیت پاکستان کے دو قومی نظریہ کی نفی تھی۔ دوسری بات یہ کہ تمام مسلمانوں میں ایک غیر مسلم، مسلمانوں کی نمائندگی کیسے کر سکتا ہے) لہٰذا یحییٰ خان صدر پاکستان نے اس اجلاس میں شرکت سے معذرت کر لی اور آخر سکھ نمائندے کو اجلاس سے باہر بھیجا گیا اور پہلی باقاعدہ کانفرنس کا آغاز ہوا"(۶۲)

دوسری اسلامی کانفرنس کا انعقاد ۲۲ فروری ۱۹۷۴ کو ذوالفقار علی بھٹو وزیر اعظم پاکستان کی کوششوں سے پاکستان میں ہوا جس میں تقریباً سینتیس (۳۷) اسلامی ممالک کے سربراہان نے شرکت کی۔ اسلامی سربراہان کی آمد کی خوشی میں شہر لاہور کو دلہن کی طرح سجایا گیا کیونکہ اسلام کی تاریخ میں مسلمان حکمرانوں کا اتنا بڑا اکٹھ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اس کانفرنس کی رونق اس وقت دوبالا ہو گئی جب جمیل الدین عالی کا لکھا ہوا ترانہ پیش کیا گیا۔ اس ترانے کو پی ٹی وی سے نشر کیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ ترانہ پاکستانی عوام کے دلوں میں اتر گیا اور زبان زد عام ہو گیا۔ اس ترانہ کی مقبولیت کے متعلق نیشنل بک فاؤنڈیشن کے اس وقت کے ڈپٹی ڈائریکٹر محمود الرحمن لکھتے ہیں کہ مسلم سربراہوں کی جو تاریخی کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی تھی اس کے لیے انہی (جمیل الدین عالی) کا نغمہ "اللہ اکبر" منظور ہوا تھا اور اس کا ترجمہ عربی کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی میں بھی کیا گیا ہے۔"(۶۳) جمیل الدین عالی کے اس ملّی نغمہ سے اقتباس ہے:

ہم تابہ آبد سعی و تغیر کے ولی ہیں
ہم مصطفویؐ مصطفویؐ مصطفویؐ ہیں
ہم مصطفویؐ ہیں
دین ہمارا دین مکمل
استعمار ہے باطل ارزل
خیر ہے جدوجہد مسلسل
عنداللہ
عنداللہ
اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر

(اللہ اکبر، جیوے جیوے پاکستان)

اسلامی سربراہی کانفرنس دنیا کے تمام مسلمانوں کے لیے ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جس میں تمام مسلمان اتحاد و اتفاق کا وہ عملی نمونہ پیش کرتے ہیں جس کے بارے اقبالؒ نے فرمایا تھا:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر (خضر راہ، بانگِ درا)

مؤتمر عالم اسلامی، اسلامی ممالک کی سب سے بڑی اور اقوام متحدہ کے بعد دنیا کی دوسری بڑی تنظیم ہے جس کا تین سال بعد معمول کے مطابق اجلاس ہوتا ہے اور اس میں سربراہانِ مملکت اکٹھے ہوتے ہیں جس کی میزبانی مختلف اسلامی ممالک کرتے ہیں جبکہ سال میں ایک دفعہ وزرائے خارجہ کانفرنس ہوتی ہے جس میں اس کانفرنس کے نکات پر عمل درآمد کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ او آئی سی کا مستقل دفتر سعودی عرب کے شہر جدہ میں ہے۔ کوئی اہم مسئلہ در پیش آنے کی صورت میں اسلامی کانفرنس کا اجلاس کسی بھی وقت بلایا جاسکتا ہے اس سلسلہ میں ۱۹۹۷ء میں اسلام آباد میں اس کا غیر معمولی اجلاس بلایا گیا۔ ۱۹۹۷ء میں عالمی اسلامی کانفرنس کے موقع پر بھی ملّی نغمے تحریر کیے گئے اور عالمی اسلامی اتحاد کو پرجوش طریقے سے سراہا گیا۔ ۱۹۹۷ء میں عالمی اسلامی کانفرنس کے موقع پر حفیظ تائب کا کہا گیا ملّی نغمہ سے اقتباس ہے:

جذبے چہروں سے آشکار ہیں
زیب لب حرف ہیں صداقت کے
عدل و احساں کے ہیں علمبردار
گویا خادم ہیں آدمیت کے
خاتم المرسلین کے پیرو ہیں
ہم امیں ہیں پیام وحدت کے

(نام لیوا رسولؐ رحمت کے، تعبیر)

اسلامی سربراہی کانفرنس تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے دلی عقیدت و محبت کی ترجمان تنظیم ہے لیکن کفار کی سازشوں کے سامنے اس قدر متحرک نہیں ہے جتنی اس کو ہونا چاہیے۔ یہ عالمی دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک کو سوائے مذمت کے اور کچھ خاص کرنے سے عاجز ہے لیکن پھر بھی امت محمد مصطفی ﷺ کو اس سے کافی امیدیں وابستہ ہیں اور وہ امید رکھتے ہیں کہ جس طرح اس کانفرنس کی صورت میں مسلم حکمرانوں کا اتحاد ممکن ہوا ہے۔ اس طرح یہ ایک دن اس قدر فعال بھی ہو جائے گی کہ تمام عالم کے مسلمان حکم رسول ﷺ کے مطابق ایک جسم اور ایک جان بن جائیں گے۔ اس کانفرنس کے اجلاسوں میں دوسرا اجلاس جو لاہور میں منعقد ہوا تھا جو پاکستانی قوم کے لیے عظیم یادگار ہے کیونکہ اس وقت عالم اسلام کے متحرک رہنما اس میں شریک ہوئے تھے اور دشمنانِ اسلام کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں جس کے بعد انھوں نے اسلام اور مسلم حکمرانوں کے خلاف ایسا سازشوں کا جال تیار کیا کہ ان متحرک مسلم رہنماؤں کو ایک ایک کر کے شہید کروا دیا گیا جس سے اس تحریک کا جلال کم ہو گیا لیکن مسلمانان اسلام کے دلوں کا جلال آج بھی تر و تازہ ہے اور وہ بکھرے

ہوئے حکمرانوں کے اتحاد کی امید رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم لاہور میں ہونے والی اسلامی سربراہی کانفرنس کو ملّی نغمہ "اسلامی کانفرنس لاہور" کے عنوان سے رقم کرتے ہیں۔ اس نغمہ سے اقتباس ہے:

ہو گیا تیرہ فضاؤں میں اجالا ہر سو
جس گھڑی جہد مسلسل کے حسین دیپ جلے
پھر سے یکجا ہوئے ملت کے پریشاں اجزا
ایک پرچم کے تلے ایک ہی پرچم کے تلے

(اسلامی کانفرنس لاہور، ارمغان وطن)

۲۵ ستمبر ۱۹۶۹ کو مراکش کے شہر رباط میں قائم ہونے والی تنظیم مؤتمر اسلامی ۲۸ جون ۲۰۱۱ء میں قازقستان کے شہر آستانہ میں وزرائے خارجہ کے اڑتیسویں اجلاس کے دوران اس کا نام تبدیل کر کے تنظیم تعاون اسلامی رکھا گیا اور اس کا لوگو بھی تبدیل ہو گیا(۶۴) لیکن کارکردگی میں بہتری نام تبدیل کرنے سے نہیں آتی بلکہ اس کے لیے ٹھوس اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ ملت اسلامیہ کی مضبوطی اور قوت اتفاق و اتحاد پر منحصر ہے اور مسلم ممالک کا اتحاد او آئی سی کے لیے سب سے بڑا ہدف ہے۔

## سیاسی و سماجی حوالے:

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاست کا آغاز انسانی معاشرتی زندگی سے ہوا ہے۔ جب انسان خاندان سے بڑھ کر قبیلوں اور گروہوں کی شکل میں رہنے لگا تو معاشرہ کا وجود ممکن ہوا۔ معاشرہ کے قیام سے انسان کو کسی ایسے ضابطہ کی ضرورت محسوس ہوئی کہ جس کی مدد سے اس معاشرہ اور خطے کے تمام افراد احسن بطریق اور اجتماعی طور پر بہتر زندگی بسر کر سکیں۔ ضابطہ اخلاق بننے کے بعد اس کے اطلاق کے لیے کسی طاقت یا مقتدر قوت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لہٰذا اسی خطہ معاشرہ سے چند افراد کو قوت یا اقتدار دے کر ان ضابطوں کی عمل داری کو یقینی بنانے کی کوششیں کی گئیں۔ ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے سزائیں مقرر کی گئیں تاکہ معاشرہ کے تمام افراد یکساں اور بہتر زندگی بسر کر سکیں۔

معاشرے کے قیام اور ضابطہ اخلاق و آئین بن جانے کے باوجود معاشرے میں ایک خاص طبقہ جو مقتدر طبقہ کہلاتا تھا زیادہ بااثر اور طاقت پکڑنے لگا اور اس نے آئین و قانون کی خلاف ورزیاں کرتے ہوئے اپنی پسند و ناپسند کو قانون سمجھنا شروع کر دیا جس سے معاشرے میں اخلاقی، سماجی، سیاسی اور معاشرتی بگاڑ پیدا ہونا شروع

ہوا۔ اس بگاڑ پر قابو پانے کے لیے مقتدر طبقہ نے بزور شمشیر اور ظلم و استبداد اپنے سے کمتر انسانوں کو دبانا شروع کر دیا۔ یہیں سے بذریعہ طاقت انسانوں پر حکمرانی کرنے اور عوام کو اپنی رعایا خیال کرنے کی سوچ کا آغاز ہوا۔

مقتدر طبقے کی عیش و عشرت، رعب و دبدبہ، پیسے کی فراوانی اور کئی دیگر لوازمات سے دوسرے کئی انسانوں میں بھی قوت اقتدار کی حوس بڑھی اور انھوں نے حصول اقتدار کے لیے مختلف طریقوں پر عمل کیا جن میں عوام کی ہمدردی، معرکہ آرائی، دانائی اور کئی دیگر طریقے شامل تھے۔ اقتدار اور تمام طریقہ ہائے حصولِ اقتدار کے اس نظام کو باقاعدہ سیاست کا نام دیا گیا۔ لفظ سیاست کے لغوی معنی فیروز الغات کے مطابق "حکومت، سلطنت، ملکی معاملات، رعب داب، دھمکی۔ گوش مالی اور سزا کے ہیں" (۶۵) بعض اوقات یہ لفظ حکمت و دانائی اور ریاستی انتظام و انصرام چلانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں اس لفظ کو عام طور پر مثبت کی بجائے منفی پروپیگنڈہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر لفظ سیاست عوام اور ریاست و حکومت کے درمیان تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔

جہاں تک ادب اور سیاست کا تعلق ہے تو یہ دونوں عوامل معاشرتی زندگی کے اہم پہلو ٹھہرتے ہیں اور دونوں پہلوؤں کی انسانی اور معاشرتی زندگی سے گہری وابستگی ہے۔ ادیب و شاعر اپنی تخلیقات کے لیے اساطیری مواد معاشرے سے حاصل کر کے اسے اپنے تخیل کی بھٹی میں پکا کر معاشرے کو کئی گنا بہتر انداز میں لوٹاتا ہے اس کے متوازی سیاست دان انسانوں میں سیاسی بصیرت و شعور پیدا کر کے ریاست کو ترقی و خوشحالی کی حدوں تک لے جاتا ہے اور ایک بہترین معاشرہ کی تخلیق میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ تخلیق کار یعنی شاعر و ادیب اسی معاشرے کا فرد ہوتا ہے لیکن اس میں عام لوگوں کی نسبت دانش و حکمت اور حساسیت زیادہ ہوتی ہے اور وہ ملکی سیاسی صورت حال سمیت دیگر تمام معاشرتی پہلوؤں سے باخبر ہوتا ہے۔ اسے عام انسانوں کی نسبت امور سلطنت چلانے والوں کی ذمہ داریوں اور ان کے مناصب کا زیادہ ادراک ہوتا ہے؟ وہ ان کے بارے اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے اور بہتر ملکی انتظام اور معاشرے کی خوشی و خوشحالی پر سیاست دانوں اور حکومت کو سراہتا ہے۔ اسی طرح وہ ظلم و جبر اور غاصب حکمرانوں کے خلاف مزاحمت اور احتجاج کی صورت میں اپنی آواز بلند کرتا ہے۔ معاشرتی ناہمواری جو اکثر سیاسی نظام میں خرابی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس کو اپنی ادبی صلاحیت سے عوام و حکمرانوں میں ذمہ داری کا الگ الگ احساس ابھارنے کی کوشش کرتا ہے۔

اردو شاعری اور اس کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شاعری میں ہر دور کی سیاسی اور سماجی زندگی کا عکس پایا جاتا ہے۔ جنگ آزادی اور اس کے بعد آزادی کی تحریکوں میں شعرا نے ہر مرحلے پر عوام

میں سیاسی شعور پیدا کرنے کے لیے اپنی تخلیقات کو بہت بڑے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ حتیٰ کہ مسلمانانِ برصغیر کے لیے علیحدہ مملکت کا خواب دیکھنے والا بھی فارسی اور اردو کا ایک مایہ ناز شاعر یعنی اقبال کی بلند ذات تھی جنھوں نے مسلمان قوم میں شاعری سے وہ آگاہی اور بیداری پیدا کی کہ مسلمانان برصغیر ان کی وفات کے بعد بھی اقبال کی تعلیمات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حصول پاکستان میں کامیاب و کامران ٹھہرے۔

قیام پاکستان کے بعد اردو شاعری میں سیاسی شعور کے لحاظ سے کئی شعرا خاص شہرت رکھتے ہیں جن میں ن۔م راشد، فیض، احمد فراز، حبیب جالب، مجید امجد اور منیر نیازی قابل ذکر ہیں۔ ان شعرا نے پاکستان کو مثالی فلاحی ریاست بنانے کے خواب کو جب شرمندہ تعبیر نہ ہوتے دیکھا تو وطن سے گہری محبت اور قومی شعور کی بدولت اپنے شعری پیرایوں میں سیاسی رہنماؤں و حکمرانوں پر کڑی تنقید کی۔ ان شعرا میں ن۔م راشد ایسے شاعر ہیں جن کا شاعری میں سیاسی نقطہ نظر نہ صرف ملّی بلکہ بین الاقوامی ہے۔ انھوں نے اپنی ملازمت کا زیادہ عرصہ بیرون ملک گزارہ تھا اس لیے وہ بین الاقوامی سیاست پر خوب نگاہ رکھتے تھے۔ بقول ڈاکٹر آفتاب احمد "راشد ہمارے ان چند جدید شاعروں میں سے ہیں جن کے ہاں معاشرتی اور سیاسی مسائل کا نہایت گہرا اور شدید احساس ملتا ہے۔"(٦٦) راشد کی شاعری کا پہلا مجموعہ "ماورا" ہے جو ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا اور جس میں عہد غلامی کے دور کی نظمیں ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد راشد کا جو شعری مجموعہ پہلی دفعہ منظر عام پر آیا وہ "ایران میں اجنبی" ہے۔ اس مجموعہ میں جہاں کچھ نظمیں عہد غلامی سے تعلق رکھتی ہیں وہیں راشد نے ایران کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کو قلم بند کیا ہے۔ ایران میں راشد کی سیاسی بیداری کے حوالے سے ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری لکھتے ہیں "ایران میں اجنبی' میں راشد کی سیاسی بصیرت (Political Vision) برصغیر پاک و ہند کی جغرافیائی سرحدوں کو عبور کر کے پورے ایشیاء کا احاطہ بھی کر گئی ہے۔"(٦٧) یعنی راشد کی شاعری کا نقطہ نظر برصغیر سے پورے ایشیا کے درد کو اپنے حصار میں سمیٹ لیتا ہے راشد اپنی نظم "من و سلویٰ" میں فرماتے ہیں:

بس ایک زنجیر،  
ایک ہی آہنی کمند عظیم  
پھیلی ہوئی ہے،  
مشرق کے اک کنارے سے دوسرے کنارے تک،  
مرے وطن سے ترے وطن تک  
بس ایک ہی عنکبوت کا جال ہے کہ جس میں  
ہم ایشیائی اسیر ہو کر تڑپ رہے ہیں (من و سلویٰ، ماورا)

راشد کی شاعری سیاسی و سماجی شعور کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ ان کا تخیل آفاقی ہے وہ ایشیا کی محکومی پر اور یورپ کی برتری پر دل گرفتہ ہیں۔ فتح محمد ملک، راشد کی شاعری میں سیاسی شعور کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ”راشد کی شاعری ایک انقلابی سیاسی شعور کے ساتھ سیاسی غلامی کے تہذیبی، معاشرتی اور نفسیاتی اثرات کے تجزیہ اور تنقید سے پھوٹی ہے یہ شاعری محض اصوات یا الفاظ کا کھیل نہیں، بلکہ قارئین کے افکار میں ہیجان پیدا کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔“ (۶۸) بلاشبہ راشد کی شاعری اردو ادب میں سیاسی نقطہ نظر سے قومی و مِلّی زندگی میں ایک اضطراب پیدا کرتی ہے۔

اردو شاعری میں سیاسی فکر و دانش کے حوالے سے اقبال کے بعد جس شاعر کا نام لیا جا سکتا ہے وہ فیض احمد فیض ہیں بلاشبہ اقبال کی شاعری میں اسلامی رنگ غالب ہے اور فیض اشتراکیت کے زیر اثر مزدوروں اور کسانوں کی بات کرتے ہیں۔ وہ حکومت سے اقتدار اور انعام کے لالچ کے بغیر حق اور سچ کو زبان پر لاتے رہے جس کی پاداش میں ان کو کئی بار جیل بھی جانا پڑا لیکن وہ یہ سب کچھ سہہ کر بھی ان مظلوموں کے لیے آواز بلند کرتے رہے جن کو اشرافیہ آزادی کے بعد بھی آزاد نہیں سمجھتی تھی۔ آزادی صرف حکمران طبقے کی تھی جن کو اقتدار ہاتھ آیا۔ عام مزدور کے لیے تو وہی مشقت اور مالک کا ظلم و ستم ہی مقدر بنا۔ وہ تو اب بھی آقا کی گرفت میں اس کی مرضی اور خواہشات کا پابند تھا۔ فیض احمد فیض انہی لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخاب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن ، مگر کیا کیجیے

(مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ، نقش فریادی)

فیض احمد کو وطن سے محبت صرف اس کے حسن و جمال کی وجہ سے نہ تھی بلکہ وہ اس وطن میں رہنے والوں سے محبت کرتے تھے جس میں ابھی تک مزدوروں اور بے کسوں کی آزادی کا سورج طلوع نہیں ہوا تھا اور مارشل لاء لگنے کے بعد کسی کو بھی سر اٹھا کر اپنی مرضی سے جینے کا حق نہیں رہا بلکہ حکومت کی خوشنودی اور مرضی کے ساتھ مرضی اور ہاں میں ہاں ملانا پاکستانی عوام کی مجبوری بن گیا تھا کسی کو اختلاف رائے کا کوئی حق نہیں تھا تو اس صورت میں فیض فرماتے ہیں:

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے ، جسم و جاں بچا کے چلے

(نثار میں تری گلیوں گلیوں کے، دستِ صبا)

پاکستان میں اربابِ اختیار کے ہاں یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ ان کی نظر میں محب وطن اور ملک کا سچا وفادار وہ ہوتا ہے جو حکومت کے صحیح و غلط تمام کارناموں کو من و عن قبول کرنے کے ساتھ اُس حکومت کی اطاعت و بندگی اور اس کے ہر جائز و ناجائز حکم کے آگے آنکھیں بند کر کے سر تسلیم خم کر لے۔ اگر کوئی شخص حکومت سے اختلاف یا اعتراض کرے تو اسے وطن کا غدار شمار کر لیا جاتا ہے۔ فیض احمد فیض یہ اخلاقی و سیاسی جرأت کر کے عوام کی حالت زار پہ دل پر گزری کیفیت بیان کرتے ہیں:

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے ، رقم کرتے رہیں گے
ہاں تلخی ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہل ستم ، مشقِ ستم کرتے رہیں گے (لوح و قلم، دستِ صبا)

فیض احمد فیض کو نہ صرف ملکی سیاسی قیادت سے اختلاف اور بے بس عوام کا درد تھا بلکہ عالمی دنیا کے مظالم پر ان کی پوری نظر تھی۔ وہ عالمی سطح پر ہونیوالی سیاسی تبدیلیوں سے مکمل باخبر تھے اور اس کے رد عمل میں اظہار کرتے رہتے تھے۔ جب ۱۹۶۷ء میں عرب اسرائیل جنگ چھڑی تو انھوں نے نظم "سر وادی سینا" لکھی جس میں فلسطینی قوم سے اظہار ہمدردی اور اسرائیلیوں کے جبر کی بھرپور مذمت کی۔ سبط حسن کے بقول ان کی نظر میں یہ جنگ فقط عربوں اور اسرائیلیوں کی جنگ نہ تھی بلکہ دنیا بھر کے مظلوموں و محکوموں کی جنگ تھی"(۶۹) وہ اس نظریہ سیاست کے قائل تھے جس میں تمام انسانوں کو برابر کے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ نام و نسب، مال و دولت اور جاہ و منصب جیسی خصوصیات ان کی نظر میں انسانی برتری و کمتری پر اثر انداز نہیں ہوتیں مگر وہ جس دنیا اور معاشرے میں رہتے تھے وہاں کا انداز ہی نرالا تھا۔ اس سماج میں عام آدمی کو ذلت آمیزی کے تمام درجوں سے گزارا جارہا تھا۔ فیض احمد ایسے انسانوں کی زندگی کو انسانی فہرست سے خارج، حیوانوں میں شمار کرتے ہیں، ان کی نظم "کتے" میں علامتی طور پر موجودہ انسان واضح طور پر نظر آتا ہے۔

یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے
یہ فاقوں سے اکتا کے مر جانے والے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں
کوئی ان کو احساس ذلت دلا دے
کوئی ان کی سوئی دم ہلا دے

(کتے، نقشِ فریادی)

فیض احمد فیض آزادی فکر، احترام انسانیت، آزادی اظہار اور انسانی قدروں کی بحالی اور پاسداری کے حق میں تھے اور ان مقاصد کے لیے وہ ساری زندگی آواز بلند کرتے رہے بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> ”فیض جبر و استحصال کے دشمن تھے۔ عدل و انصاف کے داعی تھے۔ عوام کو انسانی قوتوں کا سرچشمہ سمجھتے تھے۔ وہ عوام جن سے قوموں کی کھیتیاں سرسبز و شاداب ہو جاتی ہیں۔ صنعت و حرفت پھلنے پھولنے لگتی ہے اور زندگی کے چشمے ابلنے لگتے ہیں۔ ان کی شاعری عوام کی اس قوت کی ترجمان ہے۔“ (۷۰)

فیض اور راشد کی طرح ان کے ہم عصر شاعر مجید امجد بھی سیاسی کھوکھلے پن اور کھوکھلے سماجی ڈھانچے کو محسوس کرتے ہیں۔ مجید امجد کسی بڑی شہری آبادی سے دور جھنگ میں پیدا ہوئے لیکن ان کا سیاسی شعور ایک جیتا جاگتا اور تمام سیاسی حالات سے آگاہ انسان کا شعور تھا۔ وہ جس معاشرے میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے وہ معاشی ناہمواریوں کی آماج گاہ تھا۔ جہاں جاگیر داروں نے کمزور طبقے کو غلاموں سے بدتر اور حیوانوں سے غلیظ سمجھ رکھا تھا۔ مجید امجد اس معاشرتی ناانصافی اور جبر و استبداد کے رد عمل کا اپنی شاعری میں اظہار کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک حساس انسان کا درد ہے جو شب و روز ان مظلوموں کو دیکھتا ہے جو ابھی تک آزادی کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ طبقاتی تفاوت اور سماجی ناانصافی سے ان کے ہاں بے اطمینانی اور احتجاج ابھرتا ہے۔ یہ بے اطمینانی زندگی بھر ان کے ساتھ رہی۔

مجید امجد کے ہاں بھی دیگر کئی شعرا کی طرح مشرق اور مغرب کے نمایاں فرق اور سماجی ناہمواری پر آواز بلند کی گئی ہے۔ وہ نسلِ آدم کو مشرق و مغرب اور ماضی و حال کے امتیاز سے بالاتر ہو کر دنیاوی خداؤں کے جبر و استبداد سے نکلنے والی انسانی کراہوں اور انسانوں کی غیر مساویانہ تقسیم کے نتیجے میں ہونے والے ظلم و جبر کو اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں۔ ان کی نظم ”رودادِ زمانہ“ سے اقتباس ہے:

ان کی شعلہ سی زباں ہے کہ ازل سے اب تک
چاٹتی آئی ہے ان کانپتی روحوں کا لہو'
جن کے ہونٹوں کی ڈلک' جن کی نگاہوں کی چمک
زہر میں ڈوب کے بھی بجھ نہ سکی' بجھ نہ سکی

(روداِدِ زمانہ، شب رفتہ)

مجید امجد کے مندرجہ بالا مصرعوں میں ان کے ہاں نہ صرف اپنے ملک کے سیاسی و سماجی حالات اور پسے ہوئے طبقے کے ساتھ جبر اور معاشرتی ناانصافی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے بلکہ وہ وطن کی حدود سے نکل کر نسلِ انسانی کی بقا اور درد کی صدا کو بلند کرتے ہیں۔ بلراج کومل مجید امجد کی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ مجید امجد کے کلام کی سماجی اور معاشرتی سطح پر ادراکِ حقیقت، کرب احساس اور جذبہ بغاوت سبھی جہتیں موجود ہیں۔ بعض اوقات کھلے الفاظ میں، بعض اوقات اشاروں کی شکل میں، بنیادی وصف جذبہ ہمدردی ہے جو ان سب جہتوں کو منور کرتا ہے۔"(۷۱) جذبہ ہمدردی کے حوالے سے ان کی نظم "جاروب کش" سے اقتباس ہے:

آسمانوں کے تلے، سبز و خنک گوشوں میں
کوئی ہو گا جسے اک ساعتِ راحت مل جائے
یہ گھڑی تیرے مقدر میں نہیں ہے، نہ سہی
آسمانوں کے تلے ، تلخ و سیہ راہوں پر
اتنے غم بکھرے پڑے ہیں کہ اگر تو چن لے
کوئی اک غم تری قسمت کو بدل سکتا ہے (جاروب کش ، شب رفتہ)

مجید امجد دھیمے لہجے میں بہت بڑی بات کر جانے میں ماہر نظر آتے ہیں۔ وہ دل کا سکون خدمت لینے کی بجائے، انسانیت کی خدمت کرنے میں محسوس کرتے ہیں۔ ان کو اپنے ارد گرد کے انسانوں سے انس ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ تنگ و تاریک گھاٹیوں میں غیبی مدد کا انتظار کرنے کی بجائے جذبہ ہمدردی سے آپ لوگوں کے کام آئیں تو آپ کو دنیا کی تمام خوشیاں مل جائیں گی اور اس سے آپ شادماں ہو سکتے ہیں۔

پاکستان کے سیاسی منظر نامے میں جن شعرا کو شہرت حاصل ہوئی اور شہرت کے ساتھ ساری زندگی تکالیف و مصائب میں گزاری ان میں حبیب جالب اہم مقام رکھتے ہیں۔ حبیب جالب ایسی شخصیت ہیں جن کی آواز سیاسی حلقوں میں حکومت کے خلاف بلند ہوتی رہی ہے۔ وہ ہر اہم واقعے پر گہری نگاہ رکھتے تھے اور ظلم و ناانصافی کے خلاف بولنے اور فوجی حکمرانوں پر تنقید کرنے کی پاداش میں کئی سال جیل میں بھی گزارنا پڑے لیکن وہ

آخر تک اپنے مؤقف پر قائم رہے۔ انھوں نے جب عوامی جمہوری حکومت کو بھی عوام کے توقعات پر پورا اترتے نہ دیکھا تو اس کے خلاف بھی قلم اٹھایا۔ حبیب جالب کی نظم "بیس گھرانے" ان کے مؤقف کی واضح تائید ہے جس کے مطابق پاکستان میں دولت اور حکومت چند گھرانوں تک محدود ہے اور وہ خوشحال زندگی گزار رہے ہیں جبکہ باقی پورا ملک کسمپرسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ "بیس گھرانے" سے اقتباس ہے:

گلی گلی میں جنگ ہوئی
خلقت دیکھ کے دنگ ہوئی
اہل نظر کی ہر بستی
جہل کے ہاتھوں تنگ ہوئی
وہ دستور ہمیں بخشا ہے
نفرت ہے جس کی بنیاد

صدر ایوب زندہ باد (بیس گھرانے، کلیاتِ حبیب جالب)

حبیب جالب صدر ایوب زندہ باد کہہ کر ایوب خان اور اس کی حکومت کا مذاق اڑاتے اور ان پر نشتر کے تیر چلاتے ہیں۔ سعید پرویز اُن کی اس نظم "بیس گھرانے" سنانے کا واقعہ حبیب جالب کی زبانی سناتے ہیں:

"جس روز ضمانت ہوئی اس روز لارنس گارڈن لاہور میں محترمہ فاطمہ جناح کے اعزاز میں لاہور کے شہریوں کی جانب سے استقبالیہ دیا جا رہا تھا۔ قصوری صاحب مجھے جیل سے سیدھے لارنس گارڈن لے گئے۔ وہاں ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع تھے انھوں نے مجھے دیکھ کر تالیاں بجائیں اور نعرہ زن ہوئے اور میرا یہ عالم تھا کہ لوگوں کی اپنے لیے محبت اور چاہت دیکھ کر میں حیرت زدہ تھا اور خوش بھی تھا۔ اسٹیج پر مادر ملت بیٹھی تھیں۔ متحدہ حزب اختلاف کے صف اول کے اکابرین بھی موجود تھے۔ مجھے اسٹیج پر چڑھا دیا گیا اور لوگوں نے مجھ سے نظم سنانے کے لیے نعرے لگائے، میں نے مائیک پر آ کے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں جیل سے ایوب خان کا قصیدہ لکھ کر لایا ہوں جس نے مجھے یہ عزت بخشی، شہرت بخشی، جو آج مجھے یہ مقام ملا ہے۔ اس کے صلے میں، میں نے ایوب خان کا قصیدہ لکھا ہے جو آپ کو سناتا ہوں اور میں شروع میں کئی بار یہی مصرعہ دہرایا "صدر ایوب زندہ باد، صدر ایوب زندہ باد"۔ لوگ بار بار یہ سن کر پریشان ہو گئے اور سمجھے کہ جالب پر بڑا تشدد ہوا ہے اور وہ ڈر گیا ہے اور وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے۔

بہر حال جب میں نے نظم آگے بڑھائی تو لوگوں کو اطمینان ہوا اور انھوں نے میرے حق میں نعرے بلند کیے۔" (۷۲)

حبیب جالب ایسے شاعر ہیں جنھوں نے نہ صرف سیاسی طور پر پسے طبقے اور حکمرانوں کے خلاف آواز بلند کی بلکہ عملی طور پر سیاست میں حصہ لیا۔ وہ پہلے محترمہ فاطمہ جناح کے صدارتی الیکشن میں محترمہ کے بڑے سپورٹر تھے۔ اس کے بعد جب ملک میں پہلی دفعہ جمہوری حکومت قائم ہوئی تو وہ پیپلز پارٹی کے ایک متحرک رکن بن گئے لیکن بعد میں ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ بھی اختلاف پیدا ہو گئے اور انھوں نے ذوالفقار علی بھٹو اور اس کی حکومت کو تنقید کا نشانہ بنایا۔

اردو شاعری کے سیاسی افق پر منیر نیازی بھی قابل ذکر ہیں ۔ منیر نیازی ان لوگوں میں شامل ہیں جو ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ وہ دل میں حسین خوابوں کا سمندر لیے ہوئے تھے لیکن جب ان خوابوں کو ٹوٹتا اور بکھرتا دیکھا تو بہت مایوس ہوئے۔ منیر نیازی کی نظم "آشوب شہر" میں قومی سطح کے فکری اور سیاسی انتشار اور بحیثیت قوم منزل کا تعین نہ ہونا، بہت بڑا المیہ قرار دیتے ہیں۔ وہ فکری انتشار کو شہر آشوب سے تعبیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اس خلائے شہر میں صورت نما ہوتا کوئی
اس فکر کے کاخ و کو میں بت کدہ ہوتا کوئی
منتشر افکار کی تجسیم تو ہوتی کہیں
سامنے اپنی نظر کے جسم سا ہوتا کوئی
یوں نہ مرکز کے لیے بے چین پھرتا میں کبھی
پیکر سنگیں سہی اپنا خدا ہوتا کوئی

(آشوب شہر، پہلی بات ہی آخری تھی)

منیر نیازی کا کوئی سیاسی ایجنڈا نہیں تھا اور نہ ہی وہ کسی سیاسی جماعت سے وابستہ تھے۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ملک میں ایک مستقل آئینی حکومت قائم ہو اور سیاسی خلا کا خاتمہ ہو تا کہ ملک ترقی کرے اور آگے بڑھے اور اس کا کوئی نصب العین متعین ہو سکے۔ عبنزین تبسم منیر نیازی کی شاعری میں سیاسی شعور پر بحث کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ منیر ایک مخصوص فکر، مختلف طرز ادا اور اپنی انفرادیت کے باوجود اپنی شاعری اور اپنی نظموں میں کہیں زیریں اور کہیں بالائی سطح پر گہرے سیاسی شعور کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ منیر نے اپنے عہد کی سیاسی اور سماجی صورت حال کو اپنی جذباتیت کے ساتھ ملا کر پیش کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں سیاسی رویہ اس طرح کا نہیں

ہے جیسا کہ ان کے پیش روؤں اور ان کے معاصرین کے ہاں موجود ہے۔"(۷۳)منیر نیازی اور ان کے ہم عصر شعرا میں بنیادی فرق سیاسی وابستگی کا تھا۔ منیر نیازی کسی بھی سیاسی جماعت کی وابستگی سے بالاتر ہو کر سماجی مسائل کا حل چاہتے تھے۔ وہ اپنے ملک سے محبت کرتے تھے اور اس کی ترقی وعوام کی خوشحالی ہی ان کا سیاسی نصب العین تھا جس کا اثر منیر کی شاعری میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ وہ صرف حکومت کو بدحالی کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتے بلکہ ان کے خیال میں سماج اور حکومت کو مل کر بہتری کی کوشش کرنی چاہیے۔

اردو ملّی نغمہ نگاری کی روایت میں سیاسی و سماجی پہلو کو خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ شاعری سماج سے ہی شروع ہو کر سماج پر ہی ختم ہوتی ہے لیکن اس کے درمیانی وقفہ یعنی ابتدا سے آخر تک یہ ساری کائنات کی تہوں سے آسمانوں کی بلندیوں کو چھوتی ہے بلکہ آسمانوں سے آگے دوسرے جہانوں پر پہنچ کر اور وہاں سے معلومات کا ذخیرہ حاصل کرنے کے بعد سماج کو مستفید کرتی ہے اس لیے شاعری کا جتنا تعلق سماج سے ہے اتنا کسی اور شے سے نہیں ہے۔

## مزاحمتی حوالے:

مزاحمتی ادب سے مراد ایسا ادب جس میں کسی نظریہ، فکر یا نظام کو ماننے سے انکار کر کے اس کے خلاف مزاحمت (Risistance) پیدا کی جاتی ہے۔ مزاحمت کئی طرح کی ہو سکتی ہے جس میں اپنے معاشرے اور ماحول کی فرسودہ روایات، راسخ العقیدہ مذہبی عناصر یا پھر حکومت کے قائم کردہ نظام، جو شاعر و ادیب کے فلسفیانہ دلائل کے متضاد ہوں۔ جب مصنف کے اپنے ذہن میں آئیڈیل یا مثالی تصورات ابھرتے ہیں اور اس کا ہم عصری نظام ان مثالی تصورات کی نفی کرے تو اس کی تخلیقی تحریروں میں مزاحمتی رویے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اگر تخلیق کار معاشرتی، سماجی اور استعماری قوتوں یا ان کے جبر کے ساتھ مصلحتاً یا مجبوراً مفاہمت اختیار کرے اور حالات کی رو میں بہنا سیکھ لے اور ادب میں بھی مفاہمت ہی کار فرما ہو تو اس کو مفاہمتی ادب کہا جائے گا۔ البتہ کچھ ناقدینِ ادب، مزاحمتی ادب کی اصطلاح سے متفق نظر آتے محسوس نہیں ہوتے۔ پروفیسر عثمان رمز اپنے مضمون "مزاحمتی ادب ایک تجزیہ" مشمولہ ماہنامہ سیارہ (۱۹۹۱ء) میں مزاحمتی ادب پر بحث کرتے ہوئے اس ادب کو کیفیت اور کمیت دونوں پہلوؤں سے اسے ناقابل قبول قرار دیتے ہیں۔(۷۴) اسی طرح غزل گو اور کالم نگار ظفر اقبال نے روزنامہ پاکستان میں اپنے قسط وار کالم "مزاحمتی ادب کے بارے میں چند ٹوٹے پھوٹے خیالات" میں لکھتے ہیں کہ "ادب تو صرف ادب ہوتا ہے۔ مزاحمتی، مفاہمتی اور انتقامی وغیرہ نہیں ہو سکتا۔ مزاحمتی شاعری کو تاہی فن کو چھپانے ہی کا ایک حیلہ اور وسیلہ ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔"(۷۵)

مزاحمتی ادب کی اصطلاح سے انکار کرنے والوں کی طرح اس کے حق میں دلائل دینے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ ابرار احمد اپنے مضمون "مزاحمتی ادب" میں پابلونیرودا کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ادب تخلیق کرنا، بذات خود ایک مزاحمتی عمل ہے کیونکہ ادیب اپنے گردوپیش سے Confirm نہیں کر پاتا اور اس کشمکش کی بنیاد پر وہ ادب تخلیق کرتا ہے۔ ایک طرح سے تو سارا ادب مزاحمتی ہے اور ہر ادیب باغی۔"(۷۶)

ادب کسی بھی عہد میں معاشرے کی اخلاقی، سماجی اور سیاسی اقدار کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ادب سماج کے ارتقا اور ترقی میں مددومعاون ہوتا ہے اور ایک سچا ادیب و شاعر حق بات کہنے میں اپنے ضمیر کو جواب دہ رہتا ہے وہ ظلم و جبر اور استعماری قوتوں کے سامنے جھکنے کی بجائے کلمہ حق بلند کرنا اپنے لیے اعزاز سمجھتا ہے۔ اس لیے اس صورت میں تخلیق ہونے والا ادب جو حقیقت پسند افراد کے دل کی آواز اور طاقتور قوتوں کے لیے ناپسند سمجھا جائے اسے مزاحمتی ادب ہی کہیں گے۔ مزاحمتی ادب تخلیق کرنے والا شاعر و ادیب حق بات اور دل کی آواز بلند کرنے میں جس جرأت کا اظہار کرتا ہے اس کو ہمیشہ تاریخی لحاظ سے مزاحمتی کردار کی حیثیت سے یاد رکھا جاتا ہے حالانکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ سچ بات کہنے پر اسے زہر کا پیالہ بھی پینا پڑے گا لیکن پھر بھی وہ اصول پسندی کو مفاہمت پر ترجیح دیتا ہے اور انسانی رویوں کے تضادات اور ریاستی جبر و اقتدار پر براجمان حکمرانوں کے ظلم و ستم اور ناانصافیوں کے خلاف انسانیت کی بقا اور تحفظ کے لیے نئی قدروں کو تخلیق کر کے معاشرے کی ریاکاری، منافقت، مفاد پرستی اور خوشامدانہ کلچر کو اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کے ذریعے مٹانے کی سعی کرتا ہے۔ بقول ابرار احمد "مزاحمتی ادب کو عام طور پر ادب عالیہ میں شمار نہیں کیا جاتا۔ اور اسے ہنگامی اور وقتی ادب قرار دیا جاتا ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ازلی وابدی حقیقتوں پر نگاہ رکھنے والا ادیب، اپنے اردگرد موجود حقیقت سے کس طرح چشم پوشی کر سکتا ہے۔ 'روحِ عصر' کو سمجھے اور اس کے ساتھ چلے بغیر کوئی ادب سچا ادب نہیں کہلا سکتا۔ موجود سے انکار بذات خود ایک ایسا جرم ہے جو باشعور، باضمیر اور ذمہ دار ادیب سے سرزد نہیں ہو سکتا۔"(۷۷) لہٰذا مزاحمتی ادب باشعور اور باضمیر قوموں میں مخصوص سماجی ماحول اور سیاسی صورت حال کے پیش نظر تخلیق ہونا لازمی امر ہے۔

اردو ادب میں مزاحمتی شاعری کی روایت جعفر زٹلی سے لے کر جنگ آزادی تک اور جنگ آزادی سے قیام پاکستان تک مختلف رویوں اور پہلوؤں پر منحصر ہے جس میں زیادہ رجحان بدیسی حکمرانوں کے جبر اور ابنائے وطن کی بے وفائی و نااہلی کے موضوع پر پایا جاتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ابتدائی چند برسوں میں ہجرت و فسادات

کے موضوعات غالب رہے اس دوران ترقی پسند تحریک بھی پاکستان میں نئے سورج کی تلاش میں سرگرداں نظر آئی لیکن جب نیا سورج طلوع ہوتے کہیں دکھائی نہ دیا تو فیض احمد فیض کہہ اٹھے:

یہ داغ داغ اجالا ، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا ، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں ، جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

(صبح آزادی اگست ۱۹۴۷ء، دست صبا)

لیکن پاکستانی قوم اس دور میں ایک نئے عزم اور استقلال کے ساتھ ایک نئی قوم بننے کے لیے کوشاں تھی ایک ایسی قوم جو اسلامی دنیا میں ریاست مدینہ کی مثال پیش کر سکے لیکن بد قسمتی سے صاحبِ اقتدار نااہل اور مفاد پرست طبقہ نے سیاسی طور پر اس مملکت کو مضبوط نہ ہونے دیا اور سیاست دانوں کی چپقلش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فوج اقتدار پر قابض ہو گئی اور ۱۹۵۸ کو ملک پہلی دفعہ مارشل لا کی زد میں آ گیا۔ مارشل لاء لگنے کو جہاں کچھ ناعاقبت اندیش لوگوں نے خوش آمدید کہا وہیں سے اردو میں مزاحمتی ادب کا باقاعدہ آغاز ہوا اور حبیب جالب جو مزاحمتی شاعری میں بلند مقام رکھتے ہیں، نے مارشل لاء کے خلاف بغاوت کا اعلان کرتے ہوئے اس نظام کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ان کی مشہور زمانہ نظم "دستور ۱۹۶۲ء" ان خیالات کی عکاسی کرتی ہے۔

ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا
میں بھی خائف نہیں تختہ دار سے
میں بھی منصور ہوں کہ دو اغیار سے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار سے
ظلم کی بات کو ، جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا ، میں نہیں مانتا

(دستور ۱۹۶۲ء، کلیات حبیب جالب)

حبیب جالب نے حقیقی معنوں میں مزاحمتی شاعر ہونے کا حق ادا کیا اور اس کو وہ اپنی خوش نصیبی کہتے ہیں کیونکہ وہ آمرانہ قوتوں کے سامنے جھکنے کی بجائے ان کے سامنے سینہ سپر ہونے کو ترجیح دیتے ہوئے خود کو خوش نصیب شاعر سمجھتے ہیں۔ ان کا قطعہ "میں خوش نصیب شاعر" میں فرماتے ہیں:

ہر دور کے بھکاری شاعر ادیب سارے

بکتے قدم قدم پہ دیکھے خطیب سارے

بیچا نہیں ہے میں نے اپنا ضمیر جالب

میں خوش نصیب شاعر اور بد نصیب سارے

(خوش نصیب شاعر، کلیات حبیب جالب)

حبیب جالب کی نظم ''نیلو'' کو مزاحمتی شاعری میں ''دستور'' کے بعد سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی جس میں حبیب جالب حکومت کے آمرانہ اقدام پر خوب طنز کرتے ہیں۔ اقتباس ہے:

طبع شاہانہ پہ جو لوگ گراں ہوتے ہیں

ہاں انھیں زہر بھرا جام دیا جاتا ہے

تو کہ ناواقفِ آداب شہنشاہی تھی

رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

(نیلو، کلیات حبیب جالب)

حبیب جالب ذوالفقار علی بھٹو کی عوامی جمہوری حکومت کے بڑے دلدادہ تھے اور اس کے لیے انھوں نے نظمیں بھی لکھیں لیکن جب دیکھا کہ ان میں بھی آمرانہ خیالات پائے جاتے ہیں تو انھوں نے مزاحمتی اور احتجاجی شاعری سے بھٹو حکومت پر بھرپور انداز سے وار کیا۔ حبیب جالب کی نظم ''ممتاز'' ملاحظہ ہے:

قصر شاہی سے یہ حکم صادر ہوا ، لاڑکانے چلو

ورنہ تھانے چلو

اپنے ہونٹوں کی خوشبو لٹانے چلو ، گیت گانے چلو

ورنہ تھانے چلو

منتظر ہیں تمہارے شکاری وہاں کیف کا ہے سماں

اپنے جلوؤں سے محفل سجانے چلو ، مسکرانے چلو

ورنہ تھانے چلو

(ممتاز، کلیات حبیب جالب)

حبیب جالب نے ہمیشہ آمرانہ قوتوں کے خلاف آواز بلند رکھی اور ان کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ ان کی زیادہ تر شاعری کا موضوع مزاحمتی ہے۔ اردو ادب میں حبیب جالب کا نام مزاحمتی شاعر کے طور پر ہمیشہ زندہ

رہے گا۔ دوسری طرف فیض احمد فیض ترقی پسند تحریک پر پابندی لگنے کے باوجود مخصوص کلاسیکی اور دھیمے لہجے میں ان آمرانہ قوتوں کے خلاف مزاحمت کر رہے اور خاموش رہنے والوں کو اپنے حقوق کے مفاد اور تحفظ کے لیے بولنے پر اکساتے رہے۔ نظم "بول" سے انتخاب ہے:

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول ، زباں اب تک تیری ہے
بول ، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و جاں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول ، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے!

(بول، نقش فریادی)

فیض احمد فیض حقائق کی پردہ پوشی کو خلاف عادت سمجھتے ہیں اور وہ حق اور سچ بات کہنے میں کسی قسم کی منافقت نہیں کرتے اور نہ ہی وہ ان حقائق کے بیان کرنے میں کسی جان ومال کے چلے جانے کی پرواہ کرتے ہیں۔ وہ آمرانہ قوتوں کے خلاف آواز آٹھانے کو جان جانے سے بھی بڑا معرکہ سمجھتے ہیں۔

افتخار عارف ضیاءالحق کے مارشل لاء لگانے اور ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے وقت نوجوان ابھرتے ہوئے شاعر تھے۔ وہ ان سانحات پر علامتوں کا استعمال کرتے ہوئے مزاحمتی شاعری میں بھرپور اظہار کرتے ہیں۔ ان کی نظم "اور ہوا چپ رہی" سے اقتباس ہے:

شاخِ زیتون پر کم سخن فاختاؤں کے کتنے بسیرے اجاڑے گئے
اور ہوا چپ رہی
بے کراں آسمانوں کی پہنائیاں بے نشیمن شکستہ پروں کی تگ و تاز پر بین کرتی رہیں
اور ہوا چپ رہی
زرد پرچم اڑاتا ہوا لشکر اماں گل زمینوں کو پامال کرتا رہا
اور ہوا چپ رہی

(اور ہوا چپ رہی، مزاحمتی ادب اردو)

مزاحمتی ادب لکھنے والوں میں احمد فراز کو بھی بنیادی مقام حاصل ہے۔ مزاحمتی ادب کے حوالے سے ان کی نظم "محاصرہ" میں وہ حاکموں اور غاصبوں کے قصیدے لکھ کر انعام و کرام پانے کی بجائے اپنے قلم کو اپنے ملک کی عوام کی امانت سمجھتے ہیں اور اور اپنے ضمیر کی آواز بلند کرنے پر اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ اقتباس ہے:

مرا قلم نہیں کردار اس محافظ کا،
جو اپنے شہر کو محصور کر کے ناز کرے
مرا قلم نہیں ادراک اس سخنور کا،
جو غاصبوں کو قصیدوں سے سرفراز کرے
مرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی
مرا قلم تو عدالت مرے ضمیر کی ہے

(محاصرہ، مزاحمتی ادب اردو)

احمد فراز کا یہ عقیدہ ہے کہ ایک دن ظلم ضرور مٹ جائے گا اور حق کو فتح حاصل ہو گی یوں ظالم اور ظلم دونوں کا خاتمہ ہو گا اور حق ہمیشہ زندہ رہے گا۔

احمد فراز، فیض اور حبیب جالب کے بعد مزاحمتی ادب کی روایت میں احمد ندیم قاسمی کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی نظم "ایک نوحہ" مزاحمتی شاعری کی ترجمان ہے:

لہو لہو پتیوں سے شب سرخ ہو رہی تھی
کہ ایک گل کا یہ آخری رقص جانکنی تھا

(ایک نوحہ، لوح خاک)

مزاحمتی ادب کے حوالے سے ساغر صدیقی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ محمد اختر ساغر صدیقی کا جاندار مزاحمتی رویہ اور ان کے اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ وہ وقت کے آمروں کو جنھوں نے خود کو خدا تصور کر لیا تھا، ان سے مخاطب ہیں:

راہزن آدمی رہنما آدمی
بارہا بن چکا ہے خدا آدمی
ہائے تخلیق کی کار پردازیاں
خاک سی چیز کو کہہ دیا آدمی

(راہزن آدمی رہنما آدمی، کلیات ساغر صدیقی)

مزاحمتی ادب کی شعری روایت میں ہماری خواتین شعرا بھی پیچھے نہیں رہیں اور انھوں نے اپنے عہد کے ظلم و جبر کو شعری روایت کا حصہ بنایا ہے۔ خواتین شعراء میں کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر سر فہرست ہیں۔ موجودہ دور کی مزاحمتی شاعری میں ڈاکٹر ناہید قمر ان خواتین شعرا میں شامل ہیں جن کا کلام ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے پختہ اور پر اثر ہے۔ وہ ابن آدم کے غیر منصفانہ رویوں اور اقتدار میں آکر فرعون بن جانے والوں کے خلاف قلم سے تلوار چلانے کا فن خوب جانتی ہیں۔ عصری فرعونوں کے خلاف مزاحمتی شاعری لکھنے کا جو انداز انھوں نے اپنایا ہے وہ اردو ادب میں ایک رجحان ساز پہلو کی حیثیت رکھتا ہے۔ ناہید قمر کی نظم "ہوا جانتی ہے" سے اقتباس ہے:

نار کو نور
تعصب کو مساوات لکھو
عہد ابلیس کو آدم کی فتوحات لکھو
خودکشی قتل کو
چیخوں کو مناجات لکھو
لبِ گویا کی جزا سلسلہ طوق لکھو
جھوٹ لکھنا ہے مؤرخ
تو بصد شوق لکھو (ہوا جانتی ہے، زندگی کے حاشیے پر)

ڈاکٹر ناہید قمر نے چند شعری مصرعوں میں زمانے کی اس قدر حقیقتوں کو سمیٹا ہے جو قابل تعریف ہیں اور مِلّی نغموں کی روایت میں جدت پیدا کرتی ہیں۔ ناہید قمر اپنی علمی استعداد کی بدولت خواتین شعرا میں سبقت لے جانے کی پوری اہلیت رکھتی ہیں۔ اس طرح قومی و مِلّی نغمہ نگاری کی روایت میں مزاحمتی شاعری ایک جاندار موضوع ہے جس میں شعرا نے جزا و سزا کی پرواکیے بغیر پاکستان اور پاکستانی عوام کے ساتھ ہونیوالی ناانصافیوں کے خلاف قلم کے ہتھیار سے جہاد کیا اور حب الوطنی و قومی و مِلّی حمیت کا ثبوت فراہم کیا۔ اس لحاظ سے مِلّی نغمہ نگاری کی روایت میں مزاحمتی شاعری ایک مضبوط اور جاندار اضافہ ہے۔

## پاکستان کا قومی ترانہ اور قومی پرچم سے متعلق نغمے:

دورِ جدید میں کسی بھی آزاد ملک کی پہچان کے لیے اس ملک کا قومی ترانہ یا قومی نغمہ کا ہونا ضروری ہے۔ قومی ترانہ یا قومی نغمہ دھنوں یا اشعار اور بعض اوقات صرف دھنوں یا صرف اشعار اور اکثر قومی ترانے اشعار اور

دھنوں کو ملا کر تیار کیے گئے ہیں۔ قومی ترانہ آزاد ملک کی نمائندگی کرتا ہے اور ماضی، حال اور مستقبل کا ترجمان ہوتا ہے۔

دنیا کے دیگر ممالک کی طرح پاکستان کا قومی ترانہ آزادیِ پاکستان کی علامت ہے جو اشعار اور دھنوں سے تیار کیا گیا ہے۔ پاکستانی قومی ترانہ کے اشعار کے خالق ابوالاثر حفیظ جالندھری ہیں جبکہ اس کی دھنوں کو ترتیب دینے کا اعزاز احمد جی چھاگلہ کو حاصل ہوا۔ قیام پاکستان یعنی ۱۹۴۷ء کے بعد محب وطن شخصیات نے سوچا کہ دنیا کے دیگر آزاد ممالک کی طرح پاکستان کا قومی ترانہ بھی ہونا چاہیے جو پاکستان کی پہچان کے ساتھ ساتھ پاکستانی قوم کے دلوں میں حرارت پیدا کرنے کا باعث بھی ہو۔ اس مقصد کے لیے ۲۳ فروری ۱۹۴۹ کو ایس ایم اکرم کی نگرانی میں سردار عبد الرب نشتر، پیرزادہ عبد الستار، پروفیسر چکرورتی، چوہدری نذیر احمد، ذوالفقار علی بخاری، اے ڈی اظہر، نسیم الدین اور حفیظ جالندھری پر مشتمل ۹ نورکنی کمیٹی تشکیل دی گئی جس نے فن موسیقی کے ماہر احمد غلام علی چھاگلہ کی بنائی ہوئی دھن کو قومی ترانہ کی دھن منظور کر لیا۔ پاکستان کے قومی ترانہ کی دھن جن حالات میں تیار ہوئی اس کو یونس کمال لودھی ہنگامی حالت کہتے ہوئے قومی ترانے کی ترتیب و تاریخ کے بارے لکھتے ہیں:

> "۵ مارچ ۱۹۵۰ کو شہنشاہ ایران حکومت پاکستان کی دعوت پر تشریف فرما ہونے والے تھے۔ مذکورہ "ترانہ کمیٹی" کو اپنی سفارشات جلد مکمل کر کے پیش کرنے کا تقاضا کیا گیا تاکہ مکرم و معظم شاہی مہمان کی آمد کے موقع پر قومی ترانے کی دھن بجا کر حسب دستور استقبال کیا جا سکے۔ چنانچہ شاعروں اور موسیقاروں کو متوجہ کیا گیا کہ وہ اپنے ترانے اور دھنیں تیار کر کے جلد پیش کریں۔ ۱۹۵۰ء میں مذکورہ بالا اعلان پر متعدد دھنیں حکومت کو موصول ہوئیں تو ترانہ کمیٹی نے فوری طور پر غور کر کے بالآخر مسٹر احمد جی چھاگلہ کی تیار کردہ دھن کو منظور کرنے کی حکومت کو سفارش کی۔" (۷۸)

خصوصی مہمان کی آمد اور استقبال کے موقع پر اسی دھن سے کام لیا گیا جس کی لفظی صورت بھی موجود نہ تھی لیکن حالات کا تقاضا پر بہ امر مجبوری ایسا کرنا پڑا۔ لیکن حیرانگی کی بات یہ کہ ۱۹۵۴ء تک اسی دھن کو ریڈیو پاکستان کے مختلف اسٹیشنوں سے نشر کیا جاتا رہا اور تمام شعرائے کرام کو اس دھن کے مطابق پاکستان کا قومی ترانہ لکھنے کی عام دعوت دی جاتی رہی۔ آخر کمیٹی کے پانچ سال کے عرصے میں مغربی اور مشرقی پاکستان کے دونوں حصوں سے ۷۲۲ شعرا کے ترانے موصول ہوئے جن کو ترانہ کمیٹی نے بغور مطالعہ کے بعد شارٹ لسٹ کر کے کابینہ کو بھیج دیا اور کابینہ نے حفیظ جالندھری کا لکھا ہوا قومی ترانہ منظور کر لیا اور اگست ۱۹۵۴ء میں یہ ریڈیو پاکستان سے باقاعدہ طور پر پہلی دفعہ نشر ہوا۔ اس طرح حفیظ جالندھری کا لکھا ہوا ترانہ ہی باقاعدہ طور پر پاکستان کا قومی ترانہ

کہلایا جو آج تک باقاعدگی سے جاری ہے۔ حفیظ جالندھری ترانہ لکھنے اور منظوری کے احوال کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"قیام پاکستان کے بعد مجھے سب سے قبل ترانہ لکھنے کی فرمائش راولپنڈی میں خان لیاقت علی خان (پاکستان کے پہلے وزیر اعظم) نے کی تھی۔ سات سو بائیس ۷۲۲ ترانوں میں سے میرا تخلیق کردہ ترانہ "پاکستان کا قومی ترانہ" قبول کیا گیا تھا۔ اس وقت پاکستان کے وزیر اعظم جناب محمد علی بوگرہ تھے اور ترانہ منظور ہوتے وقت انھوں نے مجھے راولپنڈی بلا کر بھری محفل میں ہاروں سے نوازا تھا اور جیت میری یہی تھی۔" (۷۹)

پاکستان کے قومی ترانہ کی دھن چونکہ پہلے سے تیار ہو چکی تھی جو مغربی رنگ میں مرتب ہوئی تھی اور اس دھن پر پورا اترتے ہوئے اردو میں ترانہ تخلیق کرنا اتنا آسان کام نہ تھا لیکن حفیظ جالندھری نے پاکستانی قوم کی شایان شان اور اسلامی روایات کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی خداداد صلاحیتوں سے گراں قدر کارنامہ انجام دے دیا جس کی بدولت حفیظ جالندھری کا نام پاکستان اور پاکستانی قومی ترانہ کی تاریخ کے ساتھ نقش ہو گیا ہے۔

دھن کے پہلے تیار ہونے اور ترانہ بعد میں لکھے جانے سے اس کی ہم آہنگی کا مسئلہ پیدا ہو سکتا تھا لیکن احمد جی چھاگلہ نے دھن میں ان خیالات کو مد نظر رکھتے ہوئے اتنی لچک ضرور رکھی تھی کہ یہ مسئلہ آسانی سے حل ہو سکے لہٰذا ترانہ کی تخلیق کے بعد یونس کمال لودھی نے چھاگلہ کی ترتیب دی ہوئی سروں کو کمال مہارت سے قومی ترانہ سے ہم آہنگی پیدا کی۔ اس لیے جہاں قومی ترانہ کے خالق اور اس کے موسیقار پاکستانی قوم سے داد کے مستحق ہیں وہیں یونس کمال لودھی کا کارنامہ بھی قابل تحسین ہے۔

قومی ترانہ پر تنقید کرنے والے عام طور پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہے اور قومی ترانہ فارسی زبان میں کیوں لکھا گیا اور اس کا صرف ایک حرف "کا" اردو کا ہے۔ میں ان ناقدین کے علم میں اضافہ کر دوں کہ لفظ "کا" بھی اردو کا نہیں بلکہ یہ سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ اس لیے ان ناقدین کے خیال کے مطابق پورا "قومی ترانہ" دوسری زبانوں پر مشتمل ہے۔

اردو زبان کی یہ بد قسمتی رہی ہے کہ اس کو کبھی اشرافیہ میں جگہ نہیں مِلّی بلکہ حکمرانوں کے لیے ہمیشہ سے سوتیلی اولاد جیسا سلوک کیا گیا اور کیا جا رہا ہے۔ اس کی مثال یہ سمجھ لیجیے کہ پاکستان کی قومی زبان ہونے، پاکستانی عوام میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے اور بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی وکالت اور حکم کے باوجود اس کو سرکاری سطح پر قبول نہیں کیا گیا۔ مغل عہد میں سرکاری زبان فارسی اور برطانوی عہد میں انگریزی رہی اور اردو چونکہ عوامی سطح پر بولی اور سمجھی جاتی ہے اس لیے حکومتی سطح پر اس کے ساتھ سیاسی طور پر تعصب اور بغض

ابتدا سے تاحال جاری ہے کیونکہ برصغیر میں ہندو مذہب کی عطا کردہ ذات پرستی کی جڑیں اس حد تک مضبوط ہیں کہ وہ برصغیر کے مسلمانوں کے خون میں بھی شامل ہو چکی ہیں۔ جس کی بنا پر حکمران طبقہ لسانی بنیادوں پر عوام کے درمیان تقسیم کا ایک لامتناہی سلسلہ، دیگر فاصلوں کی طرح قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

دنیا کی خواہ کوئی بھی زبان ہو، اس کے حیات و ارتقا کے لیے امر ضروری ہے کہ اس میں الفاظ و تراکیب متروک و مطلوب ہوتی رہیں۔ اردو زبان کی طرح دنیا کی دوسری زبانیں بھی کئی دیگر زبانوں کے الفاظ و تراکیب کے مجموعے سے بنیں۔ انگریزی کی مثال ہی لے لیں تو بارھویں و تیرھویں صدی عیسوی میں یہ دوسری زبانوں کے پاؤں پر کھڑی تھی لیکن ارتقا کے مراحل سے گزرنے کے بعد یہ ترقی یافتہ زبان بن گئی۔ اس زبان میں دنیا کی تقریباً سو زبانوں کے الفاظ موجود ہیں لیکن اس کو کبھی بھی لشکری زبان یا دیگر زبانوں کا ملغوبہ نہیں کہا گیا حالانکہ اس میں اردو زبان کے الفاظ یعنی بازار، جنگل اور تمبا کو وغیرہ بھی مستعمل ہیں۔ اسی طرح عربی زبان بھی عبرانی اور سریانی و دیگر زبانوں سے نکلی ہوئی ہے لیکن اس کے بولنے والوں نے اپنی زبان اور اس کے الفاظ کو کبھی غیر زبان نہیں کہا۔

جہاں تک قومی ترانہ کے الفاظ کا تعلق ہے تو وہ تمام خالص اردو کے ہیں کیونکہ کوئی لفظ جب کسی دوسری زبان میں مستعمل ہونا شروع ہوتا ہے تو اس کو اسی زبان سے نسبت ہو جاتی ہے جہاں وہ لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے قومی ترانہ کے دیگر الفاظ جن میں ملک، قوم، منزل، مراد، سلطنت، استقلال، ذوالجلال وغیرہ بھی اردو میں مستعمل ہیں اور ان الفاظ کو کسی دوسری زبان سے نسبت دے کر اپنی زبان کی تحقیر کرنا کے مترادف ہے۔

قومی ترانہ کے مخالفین حفیظ جالندھری سے بھی اس کی تخلیق کا اعزاز چھیننے کے لیے کوشاں ہیں۔ وہ پاکستان کے پہلے قومی ترانہ لکھنے کا اعزاز بھارت کے نامور شاعر جگن ناتھ آزاد کو دینے کی سعی کرتے ہیں۔ اس ضمن میں بھارت نے پاکستان مخالفت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے پاکستان کے قومی ترانہ کو متنازعہ بنانے کی بھرپور کوشش کی اور اس میں قائداعظم محمد علی جناح کی ذات گرامی کو بھی شامل کرنے کی سعی کی۔ بھارتی میڈیا نے جگن ناتھ آزاد کے انتقال یعنی ۲۴ جولائی ۲۰۰۴ء کے بعد بھارتی صحافی "لوپوری" کی جانب سے واویلا شروع کیا۔ ڈاکٹر انور سدید اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ بھارتی صحافی لوپوری کی یہ کہانی ایجاد بندہ اور سراسر جھوٹ پر مبنی ہے۔۔۔ خود جگن ناتھ آزاد نے اپنے بے شمار دوستوں سے اس موضوع پر بات چیت کرتے ہوئے کبھی قومی ترانہ نہیں کہا۔ اور اس اہم نظم کو جگن ناتھ آزاد نے اپنے کسی شعری مجموعے میں شامل نہیں کیا۔"(۸۰) اس کے باوجود بھارتی میڈیا

ڈھٹائی کے ساتھ پاکستان دشمنی کے عزائم پر کاربند رہتے ہوئے حفیظ جالندھری سے اعزاز چھیننے کے ساتھ قومی ترانہ کو متنازعہ بنانے کی سازش وروش پر قائم ہے۔

قومی ترانہ اور ملّی نغمہ میں فرق ہوتا ہے۔ کسی بھی ملک و قوم کا صرف ایک ہی قومی ترانہ ہوتا ہے جس کی تکریم سب پر قانوناً اور اخلاقاً فرض ہوتی ہے لیکن قومی و ملّی نغمے ہر دور میں کئی ایک لکھے گئے ہیں۔ دراصل قیام پاکستان کے وقت اور بعد میں بہت سے شعرا نے قومی و ملّی نغمے اور ترانے لکھے جن میں جگن ناتھ آزاد بھی شامل تھے۔ جگن ناتھ پاکستان کے شہر میانوالی کے رہنے والے تھے اور تقسیم کے بعد وہ ہندوستان جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے کیونکہ وہ پاکستان سے محبت رکھتے تھے۔ لہٰذا باقی شعرا کی طرح پاکستان سے محبت میں انھوں نے بھی قومی ترانہ لکھا جس کے بول حسب ذیل ہیں:

اے سرزمین پاک

ذرے ذرے تیرے ہیں آج ستاروں سے تابناک

روشن ہے کہکشاں سے کہیں آج میری خاک

تندیِ حاسداں پر ہے غالب رسواک (۸۱)

ایسا ہی ایک قومی ترانہ سید بشیر حیدر کنول نے بھی ۱۹۴۲ء میں لکھا تھا جس کی تصدیق پروفیسر بشیر احمد سوز کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ پاکستان پر لکھے جانے والے ترانوں میں پہلا "قومی ترانہ" ہے۔ہندوستان میں تحریک آزادی عروج پر تھی۔ آزادی کا سورج لب بام آرہا تھا۔ ایک روشن مستقبل کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ شعرا اور ادیب صبح آزادی اور اسلامیان ہند کے لیے ایک آزاد وطن کے تصور سے پر امید تھے۔ سید بشیر حیدر کنول نے آنے والے حسین دور اور مسلمانوں کے روشن مستقبل کے پیش نظر پاکستانی قوم کے لیے ایک ترانہ لکھا۔ اس ترانے کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ اہم تقریبات اور اجتماعات میں اس ترانے کو ترنم سے پیش کیا جاتا تھا۔ تعلیمی اداروں میں ہر صبح تلاوت کلام پاک کے بعد طلبہ اسے گاتے تھے۔"(۸۲) اس ترانہ کی تصدیق پروفیسر صادق زاہد "قیام پاکستان کا مقدمہ...... تاریخ کی عدالت میں" کی جلد دوم میں ص۔۸۱۷ پر بھی کرتے ہیں۔ اس قومی ترانہ کے چند بول حسبِ ذیل ہیں:

ذرہ ذرہ خاکِ وطن کا خور ہے چاند ستارا ہے

سارے جہاں سے بڑھ کر ہم کو پاکستان پیارا ہے

ماٹی اس کی سونا اگلے پتھر نیلم پارا ہے

وادی وادی سینا اس کا حسن کا جو گہوارہ ہے (۸۳)

اس طرح پاکستان سے محبت میں کئی قومی ترانے لکھے گئے جو قیام پاکستان سے پہلے اور بعد کے ادوار پر مشتمل ہیں۔ اس سلسلے میں سید بشیر حیدر کنول کے قومی ترانہ کو پاکستان کا پہلا قومی ترانہ کہا جا سکتا ہے لیکن ملک کا اصل قومی ترانہ وہی ہوتا ہے جو حکومت کی طرف سے منظور اور اطلاق شدہ ہو جو پاکستان کی تاریخ میں صرف حفیظ جالندھری کا لکھا قومی ترانہ ہی ہے۔

قومی ترانہ کی طرح قومی پرچم بھی آزاد قوم وملک کی حیاتِ جاوداں میں ایک مقدس اور بے بہا سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ قومی پرچموں کی تاریخ ترانہ سے کہیں زیادہ پرانی ہے کیونکہ دور قدیم سے کسی ملک، قوم یا قبیلے کی نمائندگی علامتی طور پر پرچم سے ہوتی آرہی ہے۔ قومی پرچم قوم کی شان وشوکت اور آزادی کی پہچان کے ساتھ اس قوم کے نصب العین کا اظہار اور عزائم وامنگوں کا ترجمان ہوتا ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قوموں میں نشان وعلامت کی روایت مصریوں سے پڑی۔ قدیم مصری دوران جنگ لکڑیوں کے تختے لے کر نکلتے تھے جن پر مختلف رنگ اور نشان کندہ ہوتے تھے۔ مصر سے نکل کر یہ روایت رومی تہذیب میں پہنچی جہاں لکڑی کے تختوں کے بجائے لکڑی کے کونے پر کپڑے کے ٹکڑے کو باندھ کر جھنڈا بنانے کی ابتدا ہوئی پھر روم سے یہ روایت دنیا کے دوسرے کونوں میں پھیلتی گئی اور مرور ایام کے ساتھ اس میں بہتری اور جدیدیت آتی گئی حتیٰ کہ موجودہ دور میں ہر ملک وقوم کا پرچم الگ ہے جو اس قوم کی تاریخ اور نصب العین کو ظاہر کرتا ہے۔

اسلامی تاریخ میں پرچم کا رواج آپؐ کی ہجرت مدینہ کے ساتھ ہوا اور حضور ﷺ نے پہلا پرچم اپنا عمامہ مبارک اتار کر نیزہ سے باندھا اور حضرت بریدہؓ بن خصیب کو عطا کیا۔ حضرت محمد ﷺ کے عہد میں مسلمانوں کے عموماً دو قسم کے پرچم ہوتے تھے جن میں ایک کا نام "رایہ" یعنی بڑا پرچم اور دوسرا "نواء" یعنی چھوٹا پرچم تھے۔ یونس کمال لودھی کے بقول "بڑا پرچم یعنی "رایہ" نمرہ قسم کے مستطیل کپڑے کا بنا ہوتا تھا۔ نمرہ اس کپڑے کو کہا جاتا تھا جس پر سیاہ وسفید متوازی دھاریاں ہوتی تھیں۔ اس مرکزی پرچم کا نام "عقاب" رکھا ہوا تھا۔ یہی پرچم معرکۂ بدر اور غزوۂ موتہ میں صحابہ کرامؓ نے لہرایا اور سربلند رکھا۔ پرچم پر عقاب (شاہین) کی تصویر بنی ہوئی نہیں ہوتی تھی بلکہ رسول اکرم نے اپنے اس مرکزی یعنی بڑے پرچم کا نام "عقاب" اس لیے تجویز فرمایا تھا کہ اس میں مومن کی فکری پرواز کی سربلندی کی طرف اشارہ تھا۔ چھوٹا پرچم جسے "نواء" کہتے تھے وہ سفید رنگ کا ہوتا تھا جو سرداروں، امیروں اور سالاروں کے خیمے پر لہراتا تھا۔"(۸۴) اسلامی تاریخ کے بعد کے ادوار میں پرچم کے رنگوں اور ڈیزائنوں میں اضافہ ہوتا گیا اور ترکوں کے عہد میں اسلامی جھنڈے میں ستارہ وہلال کی روایت شروع ہوئی اور اسلامی پرچم کو ہلالی پرچم کے جزو سے نسبت پیدا ہوئی۔

پاکستان کا قومی پرچم سبز ہلالی رنگ کا ہے جس میں سبز رنگ مسلمانوں کی نمائندگی کو ظاہر کرتا ہے اور سفید رنگ کی پٹی سے اس میں بسے والی اقلیتوں کی نشاندہی ہوتی ہے جو جھنڈے کا ایک چوتھائی حصہ ہے۔ قومی پرچم کی تشکیل کے لیے بننے والی کمیٹی میں قائداعظمؒ، خان لیاقت علی خان اور سردار عبدالرب نشتر شامل تھے۔ قومی پرچم کا ڈیزائن امیر اللہ قدوائی نے قائداعظم سمیت کمیٹی اراکین کی ہدایت پر مرتب کیا تھا اور پاکستان کا پہلا "ہلالی پرچم" ٹیلر ماسٹر الطاف حسین اور افضال حسین نے سلائی کیا تھا۔ ہلالی پرچم کے سبز حصے میں موجود چاند (ہلال) اور ستارہ (پانچ کونوں والا) ہوتا ہے جس میں چاند ترقی اور چاند کے ساتھ دکھایا جانے والا ستارہ روشنی اور علم کو ظاہر کرتا ہے۔

پاکستان کے سبز ہلالی پرچم کا یہ ڈیزائن دستور ساز اسمبلی کی منظوری کے لیے گیارہ اگست ۱۹۴۷ء کو پیش کیا گیا جو قائداعظم کی صدارت میں دستور ساز اسمبلی سے اسی دن منظور ہوا اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو رات بارہ بج کر ایک منٹ پر لہرایا گیا اور اس کو لہرانے کا اعزاز تحریک پاکستان کے نامور مذہبی اور علمی شخصیت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کو حاصل ہوا۔

پاکستان کا قومی پرچم اپنے تمام اعزازات کے ساتھ قیام پاکستان سے لہرا رہا ہے اور انشاءاللہ تا قیامت یہ ہمیشہ ہواؤں کے دوش بلندیوں پر لہراتا رہے گا۔ پاکستانی پرچم کا لہرانا پاکستانی قوم کے قومی وملّی جذبات میں اضافہ کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہمارے شعرانے ان جذبات کا اظہار کرتے ہوئے قومی ہلالی پرچم کی شان میں کئی ملّی نغمے لکھے ہیں جو پرچم کی شان و شوکت میں اضافہ کرتے ہیں۔

پاکستانی پرچم پاکستان کی عظمت وسلامتی کی علامت ہے اور اس کا احترام پوری قوم پر فرض ہے کیونکہ اس کی بلندی اور شان میں پاکستان کی شان ہے۔ اصغر سودائی سبز ہلالی پرچم کی شان بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

سبز ہلالی پرچم سے ہے شان وطن اور آن وطن
یہ پرچم ایمان وطن ، ایقان وطن ، عرفان وطن
اس پرچم کو اونچا رکھنا قومی فرض ہمارا ہے
میرے وطن کا سبز ہے پرچم جس پر چاند ستارہ ہے

(اُجلا اُجلا پیارا پیارا امیدوں کا تارا ہے، قومی نظمیں)

پاکستان کا سبز ہلالی پرچم حسن و جمال کے لحاظ سے کسی پرچم سے کم نہیں ہے لیکن پاکستانی قوم اس سے عقیدت کی حد تک محبت کرتے ہیں کیونکہ پاکستان کے پرچم کی سربلندی اور عظمت پوری ملت اسلامیہ کی عزت و شان میں اضافہ کرتی ہے۔ لہٰذا پاکستانی پرچم نہ صرف پاکستانی قوم بلکہ عالم اسلام کا پرچم ہے جو ہر پاکستانی اور

مسلمان کی آنکھوں کا تارا بن چکا ہے۔ ساقی جاوید پاکستانی پرچم کو ان نغمات کی شکل میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

چاند سے اُجلا جان سے پیارا پرچم پاکستان کا
جگمگ جگمگ روشن روشن ایک ورق قرآن کا

پرچم پاکستان کا

ہاتھ یہ ہر معصوم بہن کا ہر ماں کا یہ آنچل ہے
ماتھوں کا یہ اجلا جھومر آنکھوں کا یہ کاجل ہے
آرزوؤں کا روشن تارا کھلتا پھول ارمان کا

پرچم پاکستان کا

(چاند سے اُجلا جان سے پیارا پرچم پاکستان کا، قومی نظمیں)

پرچم اور قوم کے درمیان ہم آہنگی ضروری ہے یعنی کسی بھی ملک و قوم کے پرچم میں یہ خصوصیت ضرور ہونی چاہیے کہ پوری قوم اپنے ذاتی غم اور رنجش بھلا کر کسی قومی و ملّی مقصد کے لیے متفق ہو سکے۔ پاکستان کے سبز ہلالی پرچم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ پوری قوم اوراس کا قدر دان ہے اور اس کے سائے تلے متفق و متحد ہونے کا مکمل عزم و حوصلہ رکھتی ہے۔ اس حوالے سے اردو کے شاہکار ملّی نغمہ کے مایۂ ناز شاعر و ملّی نغمہ نگار احتشام الٰہی جنھوں نے کلیم عثمانی کے قلمی نام سے شہرت پائی، قومی پرچم اور قوم کے درمیان حسین امتزاج کو ملّی نغمہ میں پروتے ہیں۔ کلیم عثمانی کا فلم "فرض اور مامتا" کا مشہور و معروف ملّی نغمہ جو پوری قوم کی آواز بن چکا ہے، اس ملی نغمہ سے اقتباس ہے:

اس پرچم کے سائے تلے ، ہم ایک ہیں
اس پرچم کے سائے تلے ہم ایک ہیں ، ہم ایک ہیں
سانجھی اپنی خوشیاں اور غم ایک ہیں ، ہم ایک ہیں
ایک چمن کے پھول ہیں سارے ، ایک گگن کے تارے
ایک گگن کے تارے
ایک سمندر میں گرتے ہیں سب دریاؤں کے دھارے
سب دریاؤں کے دھارے

(روزنامہ " جنگ " ملتان: ۲۹ اگست ۲۰۱۶ء)

اس خوبصورت ملّی نغمہ کے خالق بلاشبہ پوری پاکستانی قوم کی طرف سے خراج تحسین کے مستحق ہیں۔ ان کا ایک اور ملّی نغمہ "یہ وطن تمھارا ہے، تم ہو پاسباں اس کے" پاکستانی قوم کو حمیت و غیرت کا احساس دلا کر تحفظ پاکستان کے لیے لہو گرماتا ہے۔ یہ نغمے نہ صرف کلیم عثمانی کے لیے بلکہ پورے پاکستان کے لیے باعث فخر ہیں۔

فاروق بشیر پاکستان کے مشہور و معروف ملّی نغمہ نگار ہیں انھوں نے جہاں دیگر موضوعات پر ملّی نغمے لکھے ہیں وہیں قومی پرچم کو پاکستان کی "آبرو" کہا ہے۔ ایک حقیقت بن چکی ہے۔ اقتباس ہے:

ہماری آبرو پرچم ہمارا
ہلالی سبز پرچم پیارا پیارا
اسے بابائے ملت نے سنوارا
اسے خون شہیداں نے نکھارا
اسے حیدرؓ نے خالدؓ نے ابھارا
ہماری آبرو پرچم ہمارا

(آبرو، تیرا پاکستان ہے یہ میرا پاکستان ہے)

طفیل ہوشیار پوری پاکستانی سبز ہلالی پرچم کو سدا ہواؤں میں لہراتا دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ پرچم شجاعت و بہادری کی علامت ہوتا ہے اور پرچم کا جھکنا اس قوم کے شکست و زوال کی پہچان ہے وہ ملّی نغمہ "پاکستان کا پرچم" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

حمیت کی قسم تم کو شجاعت کی قسم تم کو
جوانو اپنے آبا کی روایت کی قسم تم کو
فضائے دوجہاں پر چھائے پاکستان کا پرچم
یہ پرچم ہی حقیقت میں نشاں ہے سرفرازی کا
دل و جاں سے حفاظت اس کی ہے ایمان غازی کا
رہ عزم و یقیں دکھلائے پاکستان کا پرچم

(پاکستان کا پرچم، میرے محبوب وطن)

پاکستان ہمارے آباؤ اجداد کے لہو کا نذرانہ ہے۔ اس کی قدر و اہمیت اور سلامتی و تحفظ پاکستانی قوم کے خون میں شامل ہے۔ جو پاکستان کے پرچم کی سربلندی سے مزین ہے لہٰذا جب تک یہ سبز ہلالی پرچم ہوا کے دوش لہراتا رہے گا پاکستانی قوم اپنے وطن کی عظمت کے گن گاتی رہے گی۔

## دیگر موضوعات:

اردو شاعری میں قومی وملّی نغمہ نگاری ایک ایسا موضوع ہے جس کو وساطت کے لحاظ سے صحرا یا سمندر سے تشبیہ دی جاسکتی ہے کیونکہ اس میں شعرانے سیاسی، سماجی، معاشی، اخلاقی، مذہبی اور نفسیاتی پہلوؤں سمیت زندگی کے دیگر بہت سی جہات کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ مندرجہ بالا جن موضوعات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس کے علاوہ کئی دیگر موضوعات بھی ملّی نغمہ نگاری کا موضوع بنے ہیں جن میں موضوع بچوں کے لیے مخصوص نغمے، پاکستان کے ایٹمی طاقت بننے کا مظاہرہ، زلزلہ زدگان سے ہمدردی، سیلاب زدگان کے مسائل ومشکلات کا موضوع اور قومی کھیلوں کے حوالے سے لکھے جانے والے قومی و ملی نغمات سمیت کئی دیگر موضوع شامل ہیں۔ ان موضوعات کا مختصر مطالعہ پیش پیش کیا جارہا ہے۔

۲۸ مئی ۱۹۹۸ء کو پاکستان دنیا کے نقشے پر ساتویں عالمی ایٹمی طاقت بنا تو نہ صرف پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی، مسجدوں میں شکرانے کے نوافل ادا کیے گئے اور شعرانے اس خوشی میں کئی ملّی نغمے اس موضوع پر تخلیق کیے۔ پاکستان کا ایٹم بم دشمن کے لیے ایک بہت بڑا دھچکہ تھا اور وہ اس سے پہلے پاکستان پر کسی بھی وقت حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ڈاکٹر عبد القدیر اور ان کی ٹیم کی شبانہ روز محنت سے جب پاکستان ایٹمی طاقت بنا اور بلوچستان میں ایٹمی دھماکے کر کے ایٹمی طاقت ہونے کا باقاعدہ اعلان کیا تو کفار کے دلوں پر اسلام اور پاکستان کی ہیبت اور دھاک بیٹھ گئی۔

پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا مقصد جنگی جنون نہیں بلکہ خطے میں پائیدار امن ہے۔ پاکستان اپنے ان ارادوں کا پرچار کرتا رہتا ہے۔ جس سے دشمنانِ اسلام کے منفی پروپیگنڈوں کی نفی ہوتی ہے۔ ایٹمی دھماکے سے چونکہ نہ صرف پاکستان بلکہ عالم اسلام کو فتح حاصل ہوئی اس لیے اس دن کو یومِ تکبیر کا نام دیا گیا اور پاکستان کے ایٹم بم کو اسلامی ایٹم بم کہا گیا۔ راغب مرادآبادی پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کے دن کی نسبت سے ”اے یومِ تکبیر اللہ اکبر کے عنوان سے ملّی نغمہ تخلیق کرتے ہیں۔ اقتباس ہے:

ایٹم کی طاقت ، تسخیر کر لی
فتح مبیں کی تدبیر کر لی
حاصل نئی اک توقیر کر لی
ملت کی ہم نے تعمیر کر لی

اے یوم تکبیر اللہ اکبر
اللہ اکبر ، اللہ اکبر

(اے یومِ تکبیر اللہ اکبر، ماہنامہ آہنگ)

پاکستان کا ازلی دشمن بھارت، پاکستان سے پہلے خطے میں خوف و ہراس پھیلانے کے لیے ایٹمی دھماکے کر چکا تھا اور وہ آئے روز پاکستان پر ایٹمی حملے کی دھمکیاں دیتا رہتا تھا لیکن پاکستان کے ایٹمی طاقت بننے سے طاقت کا توازن قائم ہوا اور بھارت ایٹمی حملے کی دھمکیوں سے باز آیا۔ لہٰذا پاکستان کے ایٹم بم کو خالص امن کا پیغام اور خطے کی امن و سلامتی کا پاسبان کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر انعام الحق جاوید ان خیالات و جذبات کو ملّی نغمہ "امتحان" کے عنوان سے لکھتے ہیں۔ اقتباس ہے:

بھارت بنا رہا تھا بربادیوں کا خاکہ
اور زد پہ لا رہا تھا کشمیر کا علاقہ
طاقت کی جارحیت، طاقت سے روکنے کو
ہم نے بھی کر دیا پھر ایٹمی دھماکہ
امن اور آشتی کے اس امتحاں میں آخر
ہم سرخرو ہوئے ہیں، صد شکر ہے خدا کا

(امتحان، ہفت روزہ ہلال)

پاکستانی قوم کو اللہ پاک نے اتنی عقلی بصیرت عطا کی ہے کہ اس نے اپنی محنت اور دیانت داری سے ہر میدان میں فتح و کامیابی حاصل کر کے پاکستان کا نام روشن کیا ہے۔ ۱۹۹۲ء میں پاکستان کرکٹ ٹیم نے پاکستان کے موجودہ وزیر اعظم عمران خان کی قیادت میں عالمی کرکٹ کپ جیتا تو وہ خوشی پوری پاکستانی قوم کے لئے دیدنی تھی جس پر کئی شعرا نے ملّی نغمے تخلیق کیے۔ عالمی کرکٹ کپ کے اگلے مقابلے کے لیے بھی کئی ملّی نغمے لکھے گئے جن میں ایک مشہور ملّی نغمہ جو ہر پاکستانی کی زبان پر جاری ہوا "ہے جذبہ جنون تو ہمت نہ ہار" ، ہے۔ صابر ظفر کا لکھا ہوا یہ ملّی نغمہ جو پاکستان کرکٹ ٹیم سے منسوب ہے۔ یہ نغمہ پاکستانی قوم کے عزم و ہمت کی نشاندہی کرتا ہے۔

اسی طرح جون ۲۰۱۷ء میں پاکستان کرکٹ ٹیم کے کپتان سرفراز احمد کی قیادت میں پاکستان کرکٹ ٹیم نے ماہ رمضان کے مقدس مہینے میں اپنے پرانے سیاسی حریف بھارت سے عالمی چیمپیئن ٹرافی میں شاندار فتح حاصل کی تو پورے پاکستان میں خوشی سے شادمانے بجائے گئے اور شعرا نے جوش و جذبہ سے بھرپور اس ٹرافی کی فتح کے حوالے سے ملّی نغمے تخلیق کیے۔

امِّ سلطان کے مِلّی نغمہ سے اقتباس ہے:

ہم آ گئے ہیں چیمپئنز کے چیمپئین
ہم چھا گئے ہیں چیمپئنز کے چیمپئین
دشمن کو جھکا گئے ہیں چیمپئنز کے چیمپئین
چیمپئن ہیں ہم آگے بڑھنے کی لگن
چھوا ہے آسماں ہم ہیں چیمپئنز کے چیمپئین

(چیمپئنز ٹرافی ۲۰۱۷ء کا نغمہ، ماہنامہ آہنگ)

۲۰۱۶ء سے پاکستان کے زیرِ اثر شروع ہونے والے پاکستان سپر لیگ کے مقابلوں سے کرکٹ کے فروغ اور دلچسپی کے ساتھ کرکٹ سے جڑے مِلّی نغموں کی روایت اور مقبولیت میں بھی اضافہ دیکھنے کو مل رہا ہے۔ پاکستان سپر لیگ کے میچوں کا ہر سال باقاعدگی سے انعقاد ہو رہا ہے جس کی بدولت ہر سال کرکٹ کا موسم شروع ہوتے ہی مختلف ٹیموں کی انتظامیہ نئے نئے مِلّی نغمے تخلیق کروا کر اپنے کھلاڑیوں اور شائقین کا حوصلہ اور جوش و جذبہ بڑھانے کے لئے سرگرم رہتی ہیں۔ ان مِلّی نغموں سے جہاں پوری پاکستانی قوم کے جوش و جذبہ اور حب الوطنی میں اضافہ دیکھنے کو ملا ہے وہیں اردو مِلّی نغموں کو عالمی سطح پر بھی پذیرائی حاصل ہوئی ہے جو صنفِ مِلّی نغمہ کی قدر و اہمیت کا زندہ ثبوت ہے۔

ہمارے قومی و مِلّی شعرا نے کچھ مِلّی نغموں کو بچوں کی خاص تربیت کے لیے تخلیق کیا جن میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم بچوں کے ترانے لکھنے میں سب سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ کئی دیگر مِلّی نغمہ نگاروں نے مِلّی نغمہ نگاری کے ارتقا میں حصہ ڈالتے ہوئے بچوں کے لیے نغمے تخلیق کیے اور نوید ظفر نے "بچوں کے گیت" کے عنوان سے مقتدرہ قومی زبان کے فورم سے ایک مجموعہ بھی مرتب کیا ہے۔ بچوں کے حوالے سے لکھے گئے نغمے ہماری مِلّی نغمہ نگاری کی روایت میں گراں قدر اضافہ ہے کیونکہ ان نغموں سے بچوں کی اخلاقی تربیت کے ساتھ ان میں مِلّی و قومی حمیّت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔

اختر شیرانی کے مِلّی نغمہ سے اقتباس ہے:

آؤ ہم بن جائیں تارے
ننھے ننھے پیارے پیارے
دھرتی سے آکاش پہ جائیں
چمکیں دمکیں ناچیں گائیں

آئے بادل دھوم مچاتے

لیکر کالے کالے چھاتے

آؤ ہم بھی دھوم مچائیں

ان کے پروں میں چھپ جائیں

(آؤ ہم بن جائیں تارے، بچوں کے گیت)

اسی طرح خالد احمد کا ملّی نغمہ "ہم ہیں پاکستانی بچے" جو کافی مشہور ہوا، سے اقتباس ہے:

ہم ہیں پاکستانی بچے

بات کے پکے، قول کے سچے۔۔۔ پاکستانی بچے

ہم ہیں پاکستانی بچے

(ہم ہیں پاکستانی بچے، بچوں کے گیت)

پاکستان جب بھی کسی مشکل میں گھر ایا پاکستانی قوم پر امتحان کی گھڑی آئی ہے تو پوری پاکستانی قوم نے محبت و یگانگت کا عملّی ثبوت پیش کیا ہے۔ اسی طرح ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۵ کو آنیوالا زلزلہ ہو یا ۲۰۱۰ء میں سیلاب کی تباہ کاریاں۔ ہر موقع پر شعرا نے بھی ملّی نغمے لکھ کر متاثرین سے ہمدردی کا اظہار کرنے کے ساتھ پاکستانی قوم میں ایثار کا جذبہ بیدار کیا ہے۔ ایسا ہی ایک ملّی نغمہ نوجوان شاعرہ فرزانہ ناز نے "ذرا دیر" کے عنوان سے زلزلہ زدگان کے لیے لکھا ہے۔

نظم سے اقتباس درج ہے:

جو تمہارے تھے، تمہارے ہیں

تمہارے ہی رہیں گے

وہ تم کو ملّیں گے

پھر نئے موسم سے

نئے پھول کھلیں گے

بڑھتے ہوئے قدموں کو نہ رکنے دینا

ابھی امید کی شمع کو نہ بجھنے دینا

(ذرا دیر، ہجرت مجھ سے لپٹ گئی ہے)

اردو ملّی نغمہ کی روایت میں سب سے اہم موضوع عسکری حوالے سے ہونیوالی ملّی نغمہ نگاری ہے۔ کیونکہ پاکستان کو ازل سے ایک بڑے دشمن کا سامنا ہے اور کئی دفعہ اس کے ساتھ معرکہ آرائی بھی ہو چکی ہے۔ بنائے بریں اس موضوع پر کثیر تعداد میں نغمے تحریر کیے گئے۔ اس لیے موضوع کی وسعت کے پیشِ نظر اس کے لیے ایک الگ باب مختص کیا جا رہا ہے۔

## حواشی وحوالہ جات


۱۔گریوال،شیر محمد۔قیام پاکستان کے بنیادی محرکات۔ لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ، ۱۹۸۶ء۔ص،الف

۲۔انور سدید،ڈاکٹر۔اردو ادب کی تحریکیں ۔کراچی:انجمن ترقی اردو،۲۰۱۳ء۔ص۲۶۵

۳۔احمد سعید۔حصولِ پاکستان۔لاہور:الفیصل ناشران وتاجران کتب،۱۹۸۹ء۔ص۵۱

۴۔بحوالہ ایضاً۔ص۵۳

۵۔ فضل حق خیر آبادی،علامہ محمد ۔ آزادی کا منشور۔ (مترجمہ عبدالشاہد خان شروانی)۔ لاہور: عکس پبلیکیشنز،۲۰۱۸ء۔ص۲۸۔۲۹

۶۔حالی،خواجہ الطاف حسین۔حیاتِ جاوید۔ نئی دہلی:ترقی اردو بیورو،۱۹۹۰ء۔ص۷۸۸

۷۔ایضاً۔ص۷۹۰

۸۔ مدنی،مولانا حسین احمد۔تحریک پاکستان کا حقیقی پس منظر۔لاہور:مکی دارالکتب،۱۹۹۵ء۔ ص۱۶

۹۔بحوالہ احمد سعید۔حصولِ پاکستان۔ص۱۷۰

۱۰۔چیڑ جی ،بابو بنکم چندر ۔ آنند مٹھ۔ (مترجمہ ڈاکٹر گوکلچند نارنگ) ۔ میرٹھ : چودھری شیو ناتھ سنگھ، شانڈلیہ،۱۹۲۳ء۔ص۴۲۔۴۴

۱۱۔ریاض،سید حسن۔پاکستان ناگزیر تھا۔کراچی:کراچی یونیورسٹی،۱۹۸۴ء۔ص۱۹۰

۱۲۔ تاراچند،ڈاکٹر۔تمدن ہند پر اسلامی اثرات۔ (مترجمہ محمد مسعود احمد)۔ لاہور: مجلس ترقی ادب،۲۰۱۰ء۔ص۱۰۷

۱۳۔سبط حسن۔پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء۔کراچی:مکتبہ دانیال،۲۰۱۷ء۔ص۱۳۹

۱۴۔تاراچند،ڈاکٹر۔تمدن ہند پر اسلامی اثرات۔ص۱۰۹

۱۵۔سبط حسن۔پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء۔ص۱۶۰

۱۶۔ تاراچند، ڈاکٹر۔تمدن ہند پر اسلامی اثرات۔ ص۲۳۴

۱۷۔ ایضاً۔ ص۲۳۷

۱۸۔ بحوالہ جیلانی کامران۔قائد اعظم اور آزادی کی تحریک ۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۰ء۔ ص۱۵۳۔۱۵۴

۱۹۔ جیلانی کامران۔قائد اعظم اور آزادی کی تحریک ۔ص۱۴۱۔۱۴۲

۲۰۔ ذبیح، مولانا محمد اسماعیل۔"ارتھ شاستر۔ ہندو قوم کی خصوصیات کیا ہیں" مشمولہ، قیام پاکستان کا مقدمہ تاریخ کی عدالت میں، جلد دوم (مرتبہ پروفیسر صادق زاہد)۔لاہور: ندا پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔ ص۷۴۷

۲۱۔ ایضاً۔ ص۷۴۹

۲۲۔ ایضاً۔ ص۷۵۱

۲۳۔ بحوالہ جیلانی کامران۔قائد اعظم اور آزادی کی تحریک۔ص۱۶۶

۲۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر۔پاکستانی کلچر۔اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۸ء۔ ص۷۰

۲۵۔ بحوالہ عزیز احمد۔برصغیر میں اسلامی جدیدیت۔(مترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی)۔لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۸۹ء۔ ص۲۳۸۔۲۳۹

۲۶۔ قرۃ العین حیدر۔آگ کا دریا۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۹ء۔ ص۵۶۴

۲۷۔ عسکری، محمد حسن۔"پاکستان کا کلچر"، مشمولہ، کلچر......منتخب تنقیدی مضامین۔ (مرتبہ اشتیاق احمد)۔ کراچی: فضلی بک سپر مارکیٹ، ۲۰۰۷ء۔ ص۲۲۔۳۲

۲۸۔ ایضاً۔ ص۲۳

۲۹۔ محمد عثمان۔فکر اسلامی کی تشکیل نو۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء۔ ص۱۲۳۔۱۲۴

۳۰۔ طاہرہ نیّر، ڈاکٹر۔اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار۔کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۹ء۔ ص۱۰۹

۳۱۔ رشید امجد، ڈاکٹر۔پاکستانی ادب رویے اور رحجانات۔اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۰ء۔ ص۸

۳۲۔انور سدید،ڈاکٹر۔اردو ادب کی تحریکیں۔ص۵۵۰

۳۳۔ایضاً۔ص۵۵۱

۳۴۔اختر وہاب، مہر۔اردو میں اسلامی ادب کی تحریک۔مقالہ برائے ایم فل اردو(غیر مطبوعہ)۔اسلام آباد:علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،۲۰۰۴ء۔ص۶۲

۳۵۔عسکری، محمد حسن۔انسان اور آدمی۔الہ آباد:اسرار کریمی پریس،۱۹۷۶ء۔ص۱۳۶۔۱۳۷

۳۶۔انور سدید،ڈاکٹر۔اردو ادب کی تحریکیں۔ص۵۵۷

۳۷۔اختر وہاب،مہر۔اردو میں اسلامی ادب کی تحریک۔ص۱۹۲

۳۸۔رشید امجد،ڈاکٹر۔پاکستانی ادب رویے اور رحجانات۔ص۷

۳۹۔انور سدید،ڈاکٹر۔اردو ادب کی تحریکیں۔ص۵۶۳

۴۰۔راشد حمید،ڈاکٹر۔مرتب؛جاوداں اقبال۔اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۷ء۔ص۷۔۸

۴۱۔اکبر الہ آبادی۔مشمولہ،جاوداں اقبال۔ص۱۱۰

۴۲۔بحوالہ محمود الرحمن،ڈاکٹر۔قائد اعظم اور اردو۔اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،۱۹۹۶ء۔ص۱۶

۴۳۔تاثیر، ڈاکٹر محمد دین۔اقبال کا فکر و فن۔(مرتبہ افضل حق قریشی)۔لاہور:منیب پبلی کیشنز، ۱۹۷۷ء۔ص۱۲۶

۴۴۔محمود الرحمن،ڈاکٹر۔قائد اعظم اور اردو۔ص۲۴۔۲۵

۴۵۔مظہر صدیقی۔مرتب؛قائد کی خوشبو۔کراچی:سیماب اکادمی پاکستان،۱۹۸۶ء۔ص۶

۴۶۔بحوالہ خورشید ربانی۔ ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح۔اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۶ء۔ص۱۸

۴۷۔ایضاً۔ص۱۹

۴۸۔طاہرہ نیّر،ڈاکٹر۔اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار۔ص۱۷۱

۴۹۔ریاض،سید حسن۔پاکستان ناگزیر تھا۔ص۵۴۷

۵۰۔طاہرہ نیّر،ڈاکٹر۔اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار۔ص۱۱۵

۵۱۔احمد ریاض تقسیم کے بعد ہجرت کرنے والوں میں شامل تھے وہ ہندوستان (فیروزپور) سے پاکستان کی طرف ہجرت کر کے چک جھمرہ ضلع لائل پور میں رہائش پذیر ہوئے۔ انھوں نے ہجرت کے واقعات اور ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر شاعری کی جو ان کی حیات میں شائع نہ ہو سکی۔ بعد از مرگ ۱۹۶۱ء میں "موج خون" کے عنوان سے ان کا شعری مجموعہ لاہور سے شائع ہوا جو صحافیوں کی مخالفت اور ترقی پسند تحریک پر پابندی کے باعث ضبط کر لیا گیا کیونکہ احمد ریاض نے صرف پنجاب تک خون آلود مناظر کو محدود رکھا تھا حالانکہ ہندوستان کے دیگر علاقے بہار، دہلی وغیرہ میں بھی ظلم و بربریت جاری رہی تھی جس سے احمد ریاض کی شاعری علاقائی کی تعصب کی زد میں آ گئی لیکن اس کے باوجود ان کی نظم چھٹا دریا پنجاب میں فسادات کی سچی تصویر ہے۔

۵۲۔ محبوب ظفر۔ احمد فراز......شخصیت اور فن۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۶ء۔ ص ۱۳۳

۵۳۔میر خلیل الرحمن۔"پیغام" مشمولہ،تیرا پاکستان ہے یہ میرا پاکستان ہے۔ازبشیر فاروق۔ کراچی: احمد برادرز پرنٹرز، ناظم آباد، ۱۹۸۶ء۔ ص۸

۵۴۔ مختار مسعود۔آوازِ دوست۔لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت، ۲۰۱۷ء۔ ص ۱۳

۵۵۔یوسف عالمگیریں۔"سچے جذبوں کی شاعری"۔مشمولہ،تکبیر کا رنگ للکار ہوا۔از اکرم باجوہ،لاہور: نظمینہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء۔ ص ۲۳

۵۶۔نورانی،طاہر جمیل۔پاکستان اور چین کے لازوال دوستانہ تعلقات۔ لاہور: روزنامہ نوائے وقت، ۲۰ اپریل، ۲۰۱۵ء۔ ص ۱۵

۵۷۔خیال، غلام نبی۔ فغان کشمیر۔اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۱۹۹۹ء۔ ص ۱۶

۵۸۔اعجاز احمد۔ اردو ادب اور کشمیر۔ مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو (غیر مطبوعہ)۔لاہور: یونیورسٹی اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۹ء۔ ص ۲۴۲

۵۹۔ فیروز الدین، مولوی۔ مرتب؛فیروز الغات اردو۔لاہور:فیروز سنز، ۲۰۱۲ء۔ ص ۷۷

۶۰۔ القرآن۔۶۸:۴

۶۱۔ القرآن۔۳:۱۵۹

۶۲۔عبدالخالق، شیخ۔اسلامی سربراہی کانفرنس ......چند یادیں۔لاہور:روزنامہ پاکستان،۳ جنوری،۲۰۱۵۔ص۴

۶۳۔محمودالرحمٰن۔"دیباچہ"،جیوے جیوے پاکستان۔از جمیل الدین عالی۔کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن،۱۹۷۶ء۔ص۱۱

۶۴۔www.wikipedia.com; 16 Febuary, 2012

۶۵۔فیروزالدین،مولوی۔فیروز الغات اردو۔ص۸۷۱

۶۶۔آفتاب احمد،ڈاکٹر۔ن م راشدشاعر اور شخص۔لاہور:ماوراپبلشرز،۱۹۸۹ء۔ص۶۰

۶۷۔نوری، ڈاکٹر محمد فخر الحق۔مطالعہ راشد(چند نئے زاویے)۔فیصل آباد:مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء۔ص۱۸۶

۶۸۔فتح محمد ملک۔ن م راشد...... سیاست اور شاعری۔اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء۔ص۱۱

۶۹۔سبطِ حسن۔سخن در سخن۔کراچی:مکتبہ دانیال،۲۰۱۶ء۔ص۹۶

۷۰۔جمیل جالبی،ڈاکٹر۔معاصر ادب۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۱ء۔ص۲۲۰

۷۱۔بلراج کومل۔"مجید امجد ایک مطالعہ"۔مشمولہ، گلاب کے پھول۔(مرتبہ محمد حیات خان سیال)۔لاہور:مکتبہ میری لائبریری،۱۹۷۸ء۔ص۱۱۵

۷۲۔سعیدپرویز۔حبیب جالب ......شخصیت اور فن۔ اسلام آباد:اکادمی ادبیات، ۲۰۰۹ء۔ص۱۱۲۔۱۱۳

۷۳۔عنبرین شاکر تبسم۔جدید اردو نظم میں سیاسی شعور۔مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی اردو(غیر مطبوعہ)۔اسلام آباد:نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز،۲۰۱۰ء۔ص۲۴۶

۷۴۔بحوالہ غفور شاہ قاسم۔پاکستانی ادب ۱۹۴۷ءسے تاحال۔لاہور:بک ٹاک،۱۹۹۵ء۔ص۱۷۱

۷۵۔ایضاً

۷۶۔ابرار احمد۔" مزاحمتی ادب"۔ مشمولہ،مزاحمتی ادب اردو۔(مرتبہ ڈاکٹر رشید امجد)۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان،۱۹۹۵ء، ص۴۸

۷۷۔ ایضاً۔ ص۵۰

۷۸۔لودھی، یونس کمال۔ پاکستانی قومی پرچم اور ترانہ۔ اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن ، ۲۰۱۶ء۔ ص۱۷

۷۹۔حفیظ جالندھری۔"دیباچہ "، پاکستانی قومی پرچم اور ترانہ از یونس کمال لودھی۔ ص۱۴

۸۰۔انور سدید،ڈاکٹر۔پاکستان کا قومی ترانہ ۔ مشمولہ ، روزنامہ نوائے وقت۔ لاہور: ۱۴اگست،۲۰۱۵ء۔ ص۱۶

۸۱۔بحوالہ ایضاً۔ ص۱۶

۸۲۔سوز،بشیر احمد۔مرتب؛ہزارہ میں قومی و مِلّی شاعری۔راولپنڈی:ادبیات ہزارہ، حرف اکادمی ،۲۰۰۷ء۔ ص۴۵

۸۳۔کنول،سید بشیر حیدر۔ مشمولہ،ہزارہ میں قومی و مِلّی شاعری۔ص۴۵

۸۴۔لودھی،یونس کمال۔پاکستانی قومی پرچم اور ترانہ۔ص۳۰۔۳۱

باب چہارم　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　صفحہ نمبر

## قیامِ پاکستان کے بعد قومی وملّی نغمہ نگاری۔۔۔۔۔عسکری پس منظر میں　۳۲۰

## (الف) جنگ اور شاعری

انسانی تاریخ میں باہمی چپقلش کی ابتدا، انسان کے قدم رنجہ فرمانے کے ساتھ ہی ہو گئی تھی۔ دنیا میں پہلا خون حضرت آدمؑ کے بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر کے بہایا تھا، جس کی وجہ زن تھی۔ آنے والے ادوار میں زن کے ساتھ زر اور زمینی چپقلشوں میں بھی اضافہ ہوا جو اولادِ آدمؑ کی نسلوں کے ساتھ پروان چڑھتی گئیں۔ مرور ایام کے ساتھ یہ باہمی آویزشیں خاندانی جھگڑوں، قبائلی لڑائیوں اور بین الاقوامی جنگوں کی صورت اختیار کرتی چلی گئیں۔ کبھی عرب قبائل کے درمیان چالیس چالیس سال تک جاری رہنے والی لڑائیاں تاریخ کا حصہ بنیں تو کبھی پہلی اور دوسری جنگ عظیم جیسی ہولناک جنگوں نے تاریخ کے دامن کو تار تار کر کے رکھ دیا اور بیسیوں سال گزرنے کے باوجود بھی ایٹمی جنگوں کے اثرات انسانیت کو مفلوج کیے ہوئے ہیں۔ قاسم یعقوب نے اس کیفیت کو اس انداز میں بیان کیا ہے:

> "بیسویں صدی میں دو عالمی جنگوں نے نصف صدی کے اذہان کو بانجھ کر کے رکھ دیا۔ بعد کی نصف صدی اس کا خمیازہ بھگت رہی ہے جنگ اور ادب کا تعلق اتنا ہی پرانا ہے جتنا انسان اور معاشرے کا۔ انسان نے جب سے معاشروں کی شکل میں رہنا شروع کیا ہے اس وقت سے جنگ اس کی ضرورت ہے۔ معاشرے جوں جوں مہذب ہوتے چلے گئے جنگیں بھی اس قدر ترقی یافتہ ہوتی چلی گئیں۔ اور ان کے اثرات بھی اتنے ہی تباہ کن ہوتے گئے۔"(۱)

تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانوں کا جنگی جنون بھی پروان چڑھتا گیا اور جنگی ادب فروغ پذیر رہا۔ جنگی ادب جسے رزمیہ ادب کا نام دیا جاتا ہے، زمانہ قبل از مسیح سے ہی ترقی کی منازل طے کرتا آ رہا ہے۔ رزمیہ ادب کی تاریخ سمجھنے سے پہلے جنگ / رزم کا مفہوم سمجھنا ضروری ہے۔

رزم فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی لڑائی، جنگ، قتال محاربہ اور، معرکہ کے ہیں "وکی پیڈیا" انسائیکلوپیڈیا میں جنگ کی تعریف یوں کی گئی ہے:

> "A war is a state of armed conflict between states, governments, societies and informal paramilitary groups, such as mercenaries, insurgents and militias" (2)

فرہنگ آصفیہ میں جنگ کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے:

> "جدھ، لڑائی، رن، معرکہ، رزم، کارزار، عداوت، کینہ، دشمنی۔"(۳)

انسانوں نے جب سے سماجی رشتوں کی بنیاد رکھی اس وقت سے ہی باہمی منافرت اور کشیدگی بھی انسانی تعلقات کا لازمہ بن گئیں۔ انسان بنیادی طور پر جنگجو خصلت کا حامل ہے جو کسی کا اپنے نظریات اور مفادات سے تصادم برداشت نہیں کرتا اور فوری طور پر مزاحمت پر اتر آتا ہے اور یہی خصلتی مزاحمت جنگ کا باعث بنتی آئی ہے۔

جنگ دو یا دو سے زیادہ گروہوں کے مسلح تصادم کا نام ہے۔ جنگ کی بنیاد نظریات اور مفادات کے تصادم سے ہوتی ہے۔ رزم میں انسان اپنی نفسیاتی قوتوں کو مجتمع کرتا ہے اور اس کا مقصد مد مقابل کو زیر کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ اپنی نظریاتی اور جسمانی بالادستی قائم کر سکے۔ قاسم یعقوب کے الفاظ میں "رزم (War) ایک حیوانی جذبہ ہے جو انسانی شکل میں عسکری اظہار لے کر معرض وجود میں آتا ہے" (۴) انسانی جسم فطرت کے مقابلے میں کمزور اور محدود ہونے کے باوجود فطرت کو اسیر کرنے کے درپے ہے۔ زمانہ قدیم کے انسان نے عسکری طاقت کا اظہار شروع میں اپنے جسم کے سہارے کیا مگر رفتہ رفتہ عقل و شعور کے ارتقا سے جنگ کے لیے بھی آسان اور زیادہ موثر طریقے دریافت کرنا شروع کر دیے۔ تیر کمان، نیزہ، کلہاڑہ، برچھی، پتھر، منجنیق، توپ، ٹینک، میزائل، ہتھیاروں سے لیس جنگی ہوائی جہاز اور بحری بیڑے سب انسانوں کی جنگ پسند طبعیت کے مظہر ہیں۔ زمانۂ قدیم کا انسان دو بڑے شعبوں میں منقسم تھا۔ حصولِ رزق اور حصولِ دفاع۔ ان دونوں مقاصد کے لیے وہ پہاڑوں اور زمینوں میں چھپے خزانوں کو نکالتا جس کی بنا پر اس کی توجہ اور محنت کا زیادہ حصہ رزق اور دفاع کے حصول میں صرف ہوتا تھا۔

## جنگ کے محرکات:

رزم ایک طرف تو جارحیت پرست انسانی خصلت کی عکاسی ہے اور دوسری طرف انسان کی دفاعی خصلت کا مظہر بھی ہے۔ رزم اور رزق باہم منسلک سرگرمیاں ہیں۔ رزم کی زیادہ تر وجوہات بھی معاشی ہیں۔ انسان حصول معاش کی خاطر بھی جنگ و جدل میں مصروف پایا گیا ہے لیکن جنگ محض معاشی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے پیچیدہ نفسیاتی محرکات کارفرما ہوتے ہیں۔ بقول قاسم یعقوب:

> "گویا جنگ قدیم تہذیب کے مقابلے میں آج کے منظر نامے میں ایک غیر دانشورانہ یا غیر متوازن اذہان کا فیصلہ ہے۔ قدیم تہذیب کے فریقین زندگی کی اعلیٰ سماجی قدروں سے محروم معاشرتی زندگی کے باسی تھے۔ جنگ ان کا ناگزیر عمل بن کے سامنے آئی۔ آج کے معاشرتی پھیلاؤ میں جنگ کا استعمال غیر تہذیب یافتہ عمل ہے۔ قدیم تہذیب کا انسان جنگ و رزم کا استعمال واحد حل کے

طور پر کرتا تھا۔ مگر آج جنگ کا عمل تمام تہذیبی قدروں (جو انسانی تہذیب کا ورثہ بھی ہے) کی پامالی کے بعد ظہور میں آتا ہے۔" (۵)

جنگیں نظریاتی اور طبقاتی دونوں طرح کی ہوتی ہیں کیونکہ جنگ دو یا دو سے زیادہ طبقوں کی طبقاتی لڑائی کا نام ہے۔ بنیادی طور پر جنگ حاکم طبقہ کے تحفظات کے فروغ کا نام ہے جو محکوم طبقہ پر جبراً تسلط کر کے ممکنہ نتائج حاصل کرنے کے لیے لڑی جاتی ہے۔ جہاں طبقاتی نظام موجود ہو گا وہاں جنگ ناگزیر عمل ہو گا۔

جنگوں کے محرکات سماجی ہونے کے ساتھ مذہبی بھی ہوتے ہیں۔ سماجی محرکات میں معیشت، جغرافیہ اور نظریات کی بالادستی کی خواہشات نمایاں ہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب میں جنگ ایک قابل نفرت سرگرمی تصور کی جاتی ہے۔ مگر دنیا کا ہر مذہب کسی نہ کسی صورت میں جنگ سے منسلک رہا ہے۔ اسلام امن کا داعی ہے اور اس کے امن پسند مذہب ہونے میں کوئی شبہ نہیں مگر اسلام اپنے دفاع سے غافل رہنے کی تلقین بھی نہیں کرتا۔ قرآن پاک میں بارہا مقامات پر دشمن کے خلاف اپنی طاقت کے رعب کی خاطر جنگی تیاری اور جنگی طاقت کی نمائش کی تلقین کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو تم سے لڑتے ہیں، زیادتی نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"(۶)

ابتدائے اسلام سے مسلمانوں کو کفار مکہ اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں سے برسرپیکار رہنا پڑا تھا۔ حضور نبی اکرم ﷺ کے دور میں مشرکین مکہ اور دیگر مذاہب کے خلاف غزوات ہوئے تاہم ان غزوات کے متوازی امن کے کئی معاہدے بھی تاریخ کا روشن باب ہیں۔ اسی طرح یہودیوں کے قبیلہ بنو قریظہ اور بنو نضیر کے ساتھ مسلمانوں کی رنجشیں غزوہ خیبر جیسی بڑی غزوات کا سبب بنیں اور قلعہ خیبر میں حضرت علیؓ کے ہاتھوں عرب یہودیوں پر غلبہ مکمل ہوا۔ اسی طرح صلیبی جنگوں کے طویل دورانیہ کا بنیادی محرک بھی مذہب تھا جس میں عیسائیوں اور مسلمانوں کو کثیر جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

برصغیر میں بھی آمد کے ساتھ مسلمانوں کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مسلمانوں نے جن علاقوں پر بھی حملہ کیا وہاں ان کا بنیادی مقصد قیام امن تھا۔ مثال کے طور پر مسلمانوں نے برصغیر پر حملہ بحری بیڑوں پر بحری قزاقوں کے حملے اور مسلمان خواتین کی آبروریزی کے ردعمل کے طور پر کیا اور فتح حاصل کی۔ فتح کے بعد علاقے میں امن و امان قائم ہو گیا تاہم حکومت کمزور پڑتے ہی فتنے سر اٹھانے لگے اور مقامی لوگوں کے ساتھ لڑائیاں اور جنگیں جاری رہیں۔

مذہبی جنگوں میں جنگ کا اولین مقصد مذہب کی بقا اور بالادستی ہوتا ہے۔ صلیبی جنگوں کے محرکات میں مذہب بنیادی محرک رہا تاہم نشاۃ ثانیہ کے بعد عیسائیوں کی اولین ترجیحات میں اقتصادیات، معاشرت اور جدید معاشی نظریات کے پرچار قرار پائے۔ جنگوں میں یہودیوں اور عیسائیوں کی بالادستی ابھی تک موجود ہے۔ یورپی اقوام کے جنگی جنون نے دنیا کے امن کو تہس نہس کر رکھا ہے۔ دنیا کے ہر خطے میں کسی نہ کسی صورت میں جنگی صورت حال پیدا کر کے ان ممالک کی معیشت کو تباہ کر دیا گیا ہے اور کروڑوں عوام کو درماندگی اور غربت کی اس دلدل میں دھکیل دیا گیا ہے جس سے نکلنے کے لیے معجزے کی ضرورت ہے۔ اس وقت دنیا کے بیشتر ممالک بالخصوص اسلامی ممالک شام، عراق، کشمیر، فلسطین اور دیگر ممالک جنگ کی آگ میں جل رہے ہیں اور ان کے عوام کو ظلم وبربریت کی چکی میں دھکیل دیا گیا ہے۔ تاہم احادیث مبارکہ اور الہامی کتب میں عالمی اسلامی سلطنت کے اشارے بھی ملتے ہیں۔ علامہ محمد اقبال کی نگاہِ تیز اس دور کی نوید سناتی ہے جب تمام روئے زمیں پر اسلام کا غلبہ ہو جائے گا اور کوئی بھی خدا کا منکر نہیں رہے گا۔

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے ، لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شبِ گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمہ توحید سے

(شمع اور شاعر، بانگِ درا)

جنگیں آمدِ آدم سے جاری ہیں اور شاید انتہائے آدم تک جاری رہیں کیونکہ جذبہ مسابقت انسانی فطرت کا خاصا ہے۔ دوسروں پر سبقت حاصل کرنے کی خواہش، اپنے نظریات کو غالب کرنے کی تمنا اور اپنی بقا کی آرزو جنگ کے بنیادی اسباب ہیں۔ یہ تمام چیزیں انسانی خصلت میں شامل ہیں اور جب تک انسان کا اس دنیا میں وجود رہے گا وہ اپنی خصلت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے جیسے انسانوں کے خلاف برسرپیکار رہے گا تاہم جنگ کے ساتھ ساتھ امن کی خواہش بھی انسانی فطرت کا لازمی حصہ ہے بعض حالات میں تو جنگ قیام امن کے لیے ضروری

ہو جاتی ہے کیونکہ جارحیت پسند اقوام سے بغیر جنگ کے امن کے قیام کا تصور ممکن نہیں ہو پاتا اور انسان کو حصول امن کے لیے جنگ لڑنا پڑتی ہے۔

## جنگ اور شاعری کا تعلق:

انسان نے جب حرکات اور اشکال کے ذریعے اپنے جذبات کا آغاز کیا تو ان حرکات اور اشکال میں جنگوں کے اثرات نظر آتے تھے پھر انسان نے بولنا سیکھا تو جنگی جذبات کے اظہار کا آغاز ہوا لیکن نوشت و خواند کی ابتدا سے جنگی اور رزمیہ ادب کی تخلیق شروع ہوئی۔ زمانہ قدیم کی تمام تہذیبوں میں جنگی ادب کے آثار ملتے ہیں۔ سمیری تہذیب، وادی سندھ کی تہذیب، چینی تہذیب، مسلمانوں کی تہذیب، حتیٰ کہ دنیا کی ہر تہذیب میں جنگی ادب کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ جنگی ادب جسے رزمیہ، ساگا، حماسہ یا ایپک کا نام دیا جاتا ہے، اس کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی انسانی تہذیب۔ رزمیہ ادب کی تاریخ کے ساتھ رزمیہ، حماسہ، ساگا اور EPIC وغیرہ جیسی اصطلاحات کی وضاحت بھی ضروری ہے۔

رزم کے معنی جنگ و جدل کے ہیں جبکہ رزمیہ ادب سے مراد رزم سے معمور شعری اصناف ہیں جو جنگ پر مختلف انداز سے تخلیقی اظہار کا حصہ بنتی ہیں۔ رزمیہ نظموں کو انگریزی کے لفظ ایپک (EPIC) کے مترادف خیال کیا جاتا ہے البتہ رزم نامہ / جنگ نامہ اور رزمیہ شاعری میں اختلاف ہے۔ جنگ نامہ کی تعریف کرتے ہوئے ابو الاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں کہ جنگ نامہ وہ نظم ہے جس میں کسی تاریخی یا فرضی جنگ کے حالات و واقعات بیان کیے جائیں۔ جنگ نامہ میں جنگ کے اسباب و عوامل اور نتائج عواقب کا بھی ذکر ہوتا ہے "(۷) جنگ نامہ کے برعکس رزمیہ نظم میں اسلوب بیاں اور زبان کی چاشنی کے ساتھ جنگ کے فن کو معراج پر پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جمیل جالبی رزمیہ شاعری کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ زرمیہ نظم اس جامع و طویل، بیانیہ نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی قوم کی شجاعت و بہادری کے کارناموں کو اس طور پر بیان کیا گیا ہو کہ اس قوم کی تہذیب کی روح شاعرانہ اظہار بیان اور کرداروں کے ذریعے پوری گہرائی کے ساتھ سامنے آجائے۔ رزمیہ نظم (ایپک) کے لیے ضروری ہے کہ اس کا اسلوب پر وقار اور معنویت لیے ہوئے ہو اور اس میں واقعات، امن، شاعرانہ حدت اور نظم کی ساخت گھل مل کے ایک جان ہو گئے ہوں۔ "(۸) قدیم ادب کی طرح رزمیہ ادب بھی ابتدا میں سینہ بہ سینہ چلتی روایات پر مشتمل تھا جن کو مرور ایام کے ساتھ احاطہ تحریر میں لایا گیا۔ چونکہ ابتدا میں انسان اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار حرکات اور اشارے کنائے میں کرتا تھا پھر رفتہ رفتہ تصاویر اور اشکال میں کرنے لگا لہٰذا آج بھی زمانہ قدیم کی دستیاب دستاویزات میں جنگ و جدل کی تصاویر نمایاں ہیں۔ پھر انسان

زبان کے علم سے آراستہ ہوا تو زبان و بیان نے ایک طرف تو لفظی جنگ بازی کو جلا بخشی اور دوسری طرف جنگی جذبات کو ابھارا۔ ابتدا میں غیر مہذب اقوام میں بالعموم جنگ ناچ "War Dance" کی روایت ملتی ہے۔ جنگ کے موقع پر ناچ جنگجو لوگوں میں شجاعت و جرأت اور بہادری و دلیری کے جذبات ابھارنے کے لیے استعمال ہوتا تھا لیکن جوں جوں انسانی شعور بڑھتا گیا یہ روایت رزمیہ شاعری میں ڈھلتی گئی۔ جنگجوؤں کی شجاعت اور بہادری کے گیت گائے جانے لگے اور جرأت اور دلیری کی داستانیں تصنیف ہونے لگیں۔

کسی بھی قوم میں ان کے عظیم جنگجوؤں اور بہادر سپوتوں کے قصے زبان زدِ عام ہونا عام بات ہے۔ دنیا کی ہر تہذیب میں اس کی روایات ملتی ہیں۔ عراق کے تین عظیم بہادروں، جن کے دور کا آغاز ہزاروں سال قبل مسیح سے ہوتا ہے، ان میں "گل گامش" کی داستان کافی مشہور ہے۔ یہ داستان جن لوحوں پر تحریر تھی وہ ۱۸۴۱ء میں نینوا کی کھدائی کے دوران مِلیں اور بعد میں عکاری زبان سے واقفیت رکھنے والے ایک شخص نے اس کا ترجمہ کیا۔ ۱۸۷۲ء میں ایک انگریز نوجوان جارج سمتھ جو میوزیم کا ملازم تھا اس نے اپنے شوق سے گل گامش کی لوحوں کی مدد سے عکاری زبان سیکھی اور پھر اس داستان کو قابل مطالعہ بنایا۔

گل گامش کی داستان کی طرح سامری حکومت کے دوسرے دور سے تعلق رکھنے والے حکمران سار گون کے رزم کی داستان کو تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ اس کا دور ۲۷۰۰ سے ۲۵۰۰ قبل از مسیح کا ہے۔ یہ دور تہذیبی اعتبار سے بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ سار گون نے دجلہ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو فتح کر کے ایک بڑی حکومت قائم کر لی تھی۔ ان کے دور میں پتھر کی لوح کا ایک منظوم کتبہ دستیاب ہوا ہے جس میں سار گون کی پیدائش، اس کے حالات زندگی، اس کی فتوحات اور جنگی کارناموں کا ذکر ہے۔ سار گون کی سرگزشت کو فرمان فتح پوری نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "میں غریب عورت کا بیٹا ہوں اور اپنے باپ کا مجھے پتہ نہیں۔ میرے باپ کے بھائی پہاڑوں میں رہتے تھے۔ میری ماں مجھے پال نہ سکتی تھی اس لیے ٹوکری میں ڈال کر دریا میں پھینک دیا۔ ابشتر دیوی نے میرے حال پر شفقت کی اور بادشاہ بن گیا۔ میں نے چون سال حکومت کی۔" (۹)

برصغیر کی تاریخ میں آریاؤں کی قدیم رزمیہ نظمیں رامائن اور مہابھارت ہیں۔ مہابھارت تقریباً ۵۰۰ قبل از مسیح میں لکھی گئی اور اس کا مصنف ویاس خیال کیا جاتا ہے۔ یہ ایک طویل رزمیہ ہے جو تقریباً دولاکھ اشعار پر مشتمل ہے۔ رامائن اور مہابھارت میں آریاؤں کے رسم و رواج، ان کے فنون حرب و ضرب اور علمی و ادبی

رجحانات کا ذکر ملتا ہے جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جنگ میں باہم مقابلے کے لیے دو دو سورما آتے تھے۔ جو رتھوں میں سوار ہوتے اور مختلف قسم کے آلات حرب مثلاً تیر و کمان، خنجر و کمند وغیرہ سے لیس ہوتے جبکہ اپنے بچاؤ کے لیے زرہ بکتر بھی استعمال کرتے تھے۔ راجاؤں اور کھشتریوں کے بیٹوں کے لیے جنگی تربیت گاہیں مخصوص ہوتی تھیں۔ جہاں وہ سالہا سال جنگی تربیت حاصل کرتے تھے۔

یورپ میں اولاً یونانیوں کے کارناموں کو بالعموم منظوم شکل میں لکھا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں نمایاں نام یونانی شاعر "ہومر" کا ہے۔ مشہور رزمیہ نظمیں ایلیڈ اور اوڈیسی انھیں کی تخلیق ہیں۔ یہ یونان بھر میں گائی جاتی تھیں۔ ہومر کے نام سے بہت سی نظمیں منسوب ہیں مگر ایلیڈ اور اوڈیسی جیسی شہرت کسی اور کو حاصل نہیں ہوئی۔ اہل یونان نے فلسفہ و منطق، طب و جرأت اور ریاضی وغیرہ کے ساتھ ساتھ شاعری کو بھی درجہ کمال تک پہنچایا۔ اہل یونان کی شاعری خطہ یونان کی نمائندہ شاعری ہے جس پر دوسری زبانوں کے اثرات بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔ یہ شاعری سرزمین یونان میں پیدا ہوئی اور اسی سرزمین میں بار آور ہوئی اور اہل یونان نے اپنی مہارت سے اسے اوج کمال تک پہنچادیا۔

اہل یونان کے علم و ادب کے اثرات دیگر یورپی اقوم نے بھی قبول کیے۔ ملٹن جیسا شاعر بھی یونانی شاعری کے زیر اثر دکھائی دیتا ہے۔ ان کی کتاب "گمشدہ جنت" میں ہومر کا اثر نظر آتا ہے۔ ملٹن کی پیراڈائیز لاسٹ ایک رزمیہ ہے نظم جس میں شیطان کو خدا کے دربار سے راندہ درگاہ کرکے نکالا جاتا ہے۔ وہ بغاوت کا علم بلند کرتا ہے اور خدا کے فرشتوں کے خلاف کئی جنگیں لڑتا ہے آخر میں ذلیل ہو کر شکست کھاتا ہے۔ یوں "پیراڈائیز لاسٹ" ایک رزمیہ نظم قرار پاتی ہے۔

رزمیہ نظم کے ہم معنی الفاظ میں حماسہ یا ایپک بھی قابل ذکر ہیں۔ حماسہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "شدت" کے ہیں۔ عربوں کی شدت پسند طبیعت نے قبائلی جنگی جنون کو جنم دیا۔ سرزمین عرب میں جہاں حدت و حرارت اپنی انتہا پر ہوتی ہے وہیں ان لوگوں کے جذبات میں بھی حدت، حرارت اور جوشیلے پن کی انتہا ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ عربوں نے اپنے جنگی جنون کو انتہائی شدت کے ساتھ پیش کیا جو عرب میں رزمیہ شاعری حماسہ کہلائی اور وہاں کے مورخین نے اپنی کتب کے ناموں میں بھی لفظ "حماسہ" کا استعمال کیا ہے۔

ظہور اسلام کے ساتھ ہی کفار کے ساتھ غزوات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان غزوات کے حوالے سے عربوں نے شاعری کی۔ خود نبی پاک حضرت محمد ﷺ نے بھی جنگ کے موقع پر غیرت دلانے والے اشعار اور حوصلہ دینے والی شاعری کو پسند فرمایا۔ حضور ﷺ غزوات کے موقع پر شاعر صحابہ کی مدد سے مومنین کے دلوں

میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور عشق رسول کے جذبات ابھارتے۔ یہ دور مسلمانوں کے لیے کڑے امتحان کا دور تھا کیونکہ مومنین کے مقابلے میں ان کے خونی رشتہ دار ہوتے۔ ایسے مواقع پر مومنین کے دینی جذبات اور جوش ایمان کا انتہائی سطح پر ہونا ضروری تھا جو جنگی اشعار کے ذریعے ان کا جوش گرمایا جاتا۔ ان جنگی اشعار کو "رجز" کہا جاتا ہے۔ "رجز" عربی زبان کا لفظ ہے۔ علمی اردو لغت میں " رجز" کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے "وہ فخریہ اشعار جن میں سپاہی کی بہادری کی تعریف ہوتی اور میدان جنگ میں پڑھے جاتے ہیں"(۱۰)رجز کی روایت عرب کی قدیم روایت ہے۔ جنگ میں کفار مکہ کے ساتھ ان کی خواتین بھی ان کے ساتھ ہوتیں اور ایسے اشعار کے ذریعے جنگی سپاہیوں کا جوش وولولہ ابھارتیں۔ مسلمان لشکر میں یہ کام رجزیہ اشعار پڑھنے والے شعرا سرانجام دیتے۔ ابوالاعجاز صدیقی کے مطابق" رجز ان فخریہ اشعار کو کہتے ہیں جو میدانِ جنگ میں (یا فخر کے کسی اور موقع پر)اپنی اور اپنی قوم کی دلاوری اور عزو شرف جتانے کے لئے پڑھے جاتے ہیں۔" (۱۱)رجزیہ اشعار میں بنیادی طور پر اپنے خاندان کی بہادری وبرتری اور شجاعت کے کارناموں کا بیان کیاجاتا ہے تاکہ مخالف قبیلہ کی نسبت اپنے قبیلہ کے سپاہیوں میں زیادہ جنگی جوش پیدا ہوسکے۔

یورپ کی تاریخ میں ایسے اشعار کی مثالیں بھی ملتی ہیں جن کی بدولت ہاری ہوئی افواج نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا اور شکست کو فتح میں بدل دیا۔ زمانہ قدیم میں یونان میں ایتھنز اور مگاراوالوں میں جزیرہ سیلمس کی وجہ سے عرصہ دراز تک جنگ جاری رہی اس جنگ میں اہل ایتھنز کو کئی بار شکست کا سامنا کرنا پڑااور انھوں نے ہمت ہار دی یہاں تک کہ جنگ کا ذکر کرنے والے بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ اس دور میں مشہور یونانی شاعر سولن نے اپنی قوم کو غیرت دلانے کے لیے دیوانے کے روپ میں پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اشعار پڑھے۔ جن کا مفہوم کچھ یوں تھا۔

> " کاش میں ایتھنز میں پیدا نہ ہوا ہوتا بلکہ عجم یا بربر یا کسی اور ملک میں پیدا ہوتا جہاں کے باشندے میرے ہم وطنوں سے زیادہ جفاکش سنگ دل اور یونان کی علم وحکمت سے بے خبر ہوتے۔ اے عزیزو! جلد دشمنوں سے انتقام لو اور یہ ننگ وعار ہم سے دور کرو اور چین سے نہ بیٹھو جب تک کہ اپنا چھینا ہوا ملک ظالم دشمنوں کے پنجہ سے نہ چھڑالو۔" (۱۲)

ان اشعار کی بدولت اہل ایتھنز کی قومی غیرت بیدار ہوگئی اور انھوں نے جزیرہ سیلمس پر حملہ آور ہو کر جزیرہ پر قبضہ حاصل کرلیا۔

قدیم روایات میں شعری کہانیوں میں قومی حریت کے جذبے کو ابھارنے کے لیے سورماؤں کے واقعات درج کئے جاتے تھے۔ یہ واقعات سینہ در سینہ چلتے ہوئے ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے گئے۔ ان شعری قصوں کو "ساگا" کہا جاتا۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی "ساگا" کے بارے لکھتے ہیں "ادبی اصطلاح کے طور پر ساگا کا لفظ ان سوانح عمریوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو آئس لینڈ (اور ناروے) میں قرون وسطیٰ میں لکھی گئیں۔ ان کہانیوں کے ہیرو نویں صدی اور تیرھویں صدی عیسوی کے درمیان ناروے اور اس کے ماتحت علاقوں کے حکمران تھے۔"(۱۳) موجودہ دور میں ساگا کی معنوی حدود میں اضافہ ہو چکا ہے اور اب یہ لفظ بہادروں کے قصوں کے طور پر وسعت کے ساتھ استعمال ہونے لگا ہے۔ ساگا، رزمیہ، رجز اور حماسہ وغیرہ رزمیہ شاعری میں شمار کئے جاتے ہیں۔

موجودہ دور میں انسانوں کے پاس نہ تو اتنی فرصت ہے کہ وہ طویل رزمیہ نظمیں پڑھ سکیں اور نہ ہی وہ بادشاہ یا امراء رہے ہیں کہ شاعری میں جنگی داستانوں کی تخلیق میں صرف سالہا سال محنت کا بدلہ چکا دیں گے لہٰذا شعراء نے بھی ایسی نظموں کی تخلیق سے منہ موڑ لیا ہے اور اب انسان کی فراست کے مطابق مختصر نظموں نے طویل نظموں کی جگہ لے لی ہے جن کو اردو میں قومی اور مِلّی نغمے کہا جاتا ہے۔

اردو میں رزمیہ شاعری کی روایت:

دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح اردو شاعری میں بھی رزمیہ ادب کی روایت ملتی ہے۔ اردو کے بارے میں یہ گمان کرنا کہ یہ گل و بلبل کی شاعری ہے اور اس میں حسن و عشق کی داستانوں کے سوا کچھ نہیں، اردو شاعری کے ساتھ زیادتی ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ کے جائزہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اردو اصناف ادب مثلاً مثنوی، مرثیہ، نظم، شہر آشوب وغیرہ میں شعراء نے مختلف سیاسی، سماجی، اخلاقی، معاشی اور معاشرتی مسائل کو سمویا ہے اور حوادث زمانہ کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔ شان الحق حقی کے مطابق "آپ آسانی سے دنیا کی کسی اور زبان کا نام نہیں لے سکتے جس میں اتنا بڑا ذخیرہ ایسی نظم کا موجود ہو جو قومی جوش، غیرت، حریت پسندی کے جذبات اور سیاسی مقاصد کے شعور سے اس حد تک جلو ہو۔"(۱۴) اردو شاعری کا آغاز دکن سے ہوا، سرزمینِ دکن میں بہمنوں اور ان کے جانشینوں کے سوا تین سو سالہ عہد حکومت میں جنگ و جدل کا سلسلہ جاری رہا۔ دکنی دور میں تمام اصناف سخن میں اردو نے اپنی ارتقائی منازل طے کیں۔ ان اصناف سخن میں قصیدہ، مرثیہ، قطعہ، رباعی اور غزل نمایاں ہیں۔ یہ امر انتہائی حیران کن ہے کہ اردو میں نثر سے زیادہ شاعری پہلے پروان چڑھی۔ شاعری میں غزل اور مثنوی کو زیادہ اہمیت حاصل رہی۔ یہ مثنویاں عشقیہ، اخلاقی، فلسفیانہ اور رزمیہ مثنویاں تھیں۔ ان میں رزم و بزم

اور خلوت و جلوت کے مضامین سموئے گئے۔ دکنی شعرا واقعہ نگار تھے واقعہ نگاری میں ان کا پسندیدہ میدان جنگ کی واقعہ بندی رہا لہٰذا انھوں نے جنگ کے واقعات و حوادث کو شاعری کا حصہ بنایا۔ دکنی دور میں رزمیہ شاعری کو خوب ترقی حاصل ہوئی اور اس شاعری کی وجہ اس دور کے سیاسی و سماجی ماحول کا بیان ملتا ہے۔ رزمیہ مثنویات میں حسن شوقی کا "فتح نامہ نظام شاہ" اور ملک الشعرا نصرتی کا "علی نامہ" اہم ہیں۔ یہ مثنویاں اپنے اندر رزمیہ شاعری کی تمام خصوصیات سمیٹے ہوئے ہیں۔

سلطان علی عادل شاہ کے دور حکومت کی مختلف مہمات کو نصرتی کے رزم نامے "علی نامہ" میں بیان کیا گیا ہے۔ سلطان محمد عادل شاہ جو بیجاپور کے والی تھے، ان کے انتقال کے وقت عادل شاہ ثانی کی عمر ۱۸ سال تھی۔ اس دور میں بیجاپور پر مصائب کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اورنگزیب کے حملے اور امرا کی اندرونی سازشوں کی وجہ سے حالات بہت خراب ہو گئے تھے۔ ان دگرگوں حالات میں عادل شاہ ثانی نے عنان سلطنت سنبھالی اور میدان جنگ میں اتر آیا۔ اس نے اپنی بہادری کے بل بوتے پر مختلف حکمرانوں کو آگے بڑھنے سے روکا جن میں مرہٹوں کے سردار سیواجی بھی تھے۔ عادل شاہ ثانی نے ہی مغلوں کی بڑھتی ہوئی فوج کو روکا۔ نصرتی کا رزم نامہ انھی مہمات کو بیان کرتا ہے۔ نصرتی کے رزم نامے کے بارے میں مولوی عبدالحق کی رائے کچھ یوں ہے:

> "تاریخ سے واقعات کو ملا لیجیے تو کہیں فرق نہ پایئے گا بلکہ بعض باتیں شاید اس میں ایسی ملّیں گی جن کے بیان سے تاریخ قاصر ہے۔ باوجود اس کے واقعات کی تفصیل و مناظر قدرت کی کیفیت و رزم بزم کی داستان اور جنگ و جدل کا نقشہ کمال فصاحت و بلاغت اور صناعی سے کھینچا ہے۔" (۱۵)

نصرتی کے ساتھ ہی سلاطین دکن کا عہد بھی ختم ہو گیا اور مغلوں کے دور حکومت کا آغاز ہوا۔ حکومت کے بدلنے سے زندگی کے دیگر اقدار کی طرح شاعری کے رنگ و آہنگ میں بھی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اس دور کی ایک رزمیہ مثنوی "جنگ نامہ عالم علی خان" نمایاں ہے۔ اس کے خالق غضنفر تھے۔ یہ اتنی بلند پایہ تو نہ تھی جیسے علی نامہ تھا البتہ اس کی سادگی اور جنگی حالات کی تاریخ ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت مسلمہ ہے۔ اس کا موضوع اورنگ آباد اور برہان پور کے درمیان جنگ (جو بالاپور کے مقام پر ہوئی) ہے۔ دکنی شعرا نے اپنے دور کے حکمرانوں کے باہمی تصادم اور جنگی واقعات کو اردو شاعری کا نمایاں حصہ بنایا اور اردو شاعری میں رزمیہ کی کمی کو پورا کر دیا۔

دکن کے برعکس شمالی ہند میں میر و سودا کے دور میں رزمیہ شاعری شہر آشوب کی صورت میں نظر آتی ہے۔ جبکہ بعد کے ادوار میں مومن خان مومن کی "مثنوی جہادیہ" شمالی ہند کی تاریخ میں اہم حیثیت رکھتی ہے۔

پانی پت کی تیسری جنگ نے ہندوستان کی قسمت غیر ملکی حکمرانوں کے ہاتھوں میں دے دی۔ انگریز برصغیر پر قابض ہو گئے اور مغلوں کی اصلی طاقت جوان کا وجہ غرور تھی، وہ ختم ہو گئی۔ عسکری انحطاط، زوال، شورش، بدامنی اور حکمرانوں کی نااہلی شاعری کے بنیادی موضوعات رہے۔ شمالی ہند کی اس بدامنی اور زوال کے کئی مرثیے بھی لکھے گئے لیکن ان مرثیوں کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو بعد میں لکھنوی مرثیہ گو مرزا انیس اور دبیر کے مرثیوں کو حاصل ہوئی۔

وہ خصوصیات جو دکنی سلاطین میں پائی جاتی تھیں اور دکن کی رزمیہ شاعری کا موضوع بنیں تھیں، وہ لکھنوی شعرا نے حضرت امام حسینؑ کی ذات میں تلاش کر لیں۔ ان مرثیوں نے Epic کو رواج دیا۔ لکھنؤ کا ماحول بھی مرثیے کے مزاج کے لیے بہت موزوں تھا۔ لوگوں میں مذہب سے شغف بھی تھا اور سپاہ گری سے لگاؤ بھی۔ چنانچہ ضمیر، خلیق، انیس، دبیر اور دیگر شعرا نے لکھنو کے مزاج کے مطابق رزمیہ شاعری کی اور بے مثل نام کمایا۔

شمالی ہند میں مرثیہ نویسی کی روایت قائم رہی لیکن رزمیہ شاعری کا اصل مرکز دکن ہی رہا ہے۔ دکنی شاعری میں عسکری مناظر کی جھلکیاں دراصل ان ریاستوں کی مضبوط دفاعی طاقتوں کا بیرونی حملوں سے دفاع تھا جس سے ادبی سطح پر اثرات نمایاں ہوئے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

> "حقیقت یہ تھی کہ دکنی ریاستیں دل سے مغلوں کی برتری اور تفوق کو قبول نہ کرتی تھیں۔ جب مغل عساکر کا زور بڑھتا تو صلح ہو جاتی اور نذر و پیش کش کے وعدے بھی کر لیے جاتے مگر عملًا طور پر عمل بہت کم ہوتا تھا۔ مغل شہنشاہ بھی وقفوں کے بعد ان ریاستوں پر فوج کشی کرتے تھے۔ دلی سے بہت دور دکن کے میدانوں اور گھاٹیوں میں شب و روز مغلیہ افواج کے حملے ہوتے رہتے تھے اور فتح و شکست کے سلسلے مسلسل جاری رہتے تھے۔" (۱۶)

برصغیر میں مرکزی حکومت کے کمزور ہونے کے ساتھ ریاستوں میں خانہ جنگی کا سماں پیدا ہوا۔ پورے معاشرے میں جنگ تو نہ تھی تاہم جنگ کی سی کیفیت ضرور پائی جاتی تھی جس میں قدروں کی پامالی، بدعنوانی، اوہام پرستی، ماضی پرستی اور اخلاقی بدحالی نے جگہ پالی۔ ایسے میں حکمرانوں کی عیش پرستی نے معاشرے کو مزید انحطاط کا شکار کر دیا۔ انگریزوں نے دہلی کو امور سلطنت میں شامل کر لیا۔ مسلمانوں کے علاوہ مرہٹہ سرداروں و سکھوں اور

ہندوؤں نے بھی اس جنگ میں حصہ لیا۔ یہ جنگ باقاعدہ عسکری جنگ نہ تھی بلکہ ایک طرح کی بغاوت تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا

تاریخ نے ثابت کیا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ غدر نہیں تھی بلکہ آزادی کی جنگ تھی جو مسلمانوں اور ہندوؤں نے مل کر لڑی۔ تاہم یہ امر حیران کن ہے کہ جنگ کے اختتام پر جنگ کا تمام ملبہ مسلمانوں پر پڑا اور مسلمان انگریزوں کے انتقام کا نشانہ بنے۔ ہندوؤں بہت صفائی سے اس جنگ سے بری الذمہ قرار پائے اور جنگ کے اختتام پر ہندوؤں نے ترقی کے لیے دستیاب تمام تر مواقع سے خوب فائدہ اٹھایا۔

اس دور کی ہنگامہ خیزی نے شہر آشوب کی تخلیق کی راہ ہموار کی۔ ہنگامے، بدامنی، افراتفری اور غیر یقینی کی فضا ہر طرف محسوس ہونے لگی۔ اجڑے ہوئے شہروں کے مرثیے دراصل انسانوں کے اجڑے ہوئے دلوں کی کیفیات کا بیان ہے جبکہ میر انیس نے غدر کی عکاسی کرتے ہوئے کربلا کا منظر کھینچ دیا۔

داغ دہلوی کا شہر آشوب انتہائی مربوط ہے جس میں پہلے پر امن دلی کی فضا کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور بعد میں انگریزوں کے قہر و غضب کی وجہ سے ہنگامہ اور شورش پھوٹنے کے بارے میں بیاں ہوا ہے جبکہ آخر میں شہر کو شاد و آباد رکھنے کے لیے دعا کی گئی ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> "ان شہر آشوبوں میں شاعروں کا انفرادی تاثر نمایاں ہے۔ ہر کسی نے اپنے مخصوص حالات و مزاج اور طبیعت کے مطابق زوال اور اختلال کی اس داستان کو بیان کیا ہے۔ کسی نے المیہ کے صرف شاعرانہ ذکر پر اکتفا کیا ہے۔ کسی نے حکیمانہ نظر سے کام لیا ہے اور کسی نے ان واقعات کو امور خانہ نقطہ نظر سے دیکھا ہے۔ کوئی ایک بات سے مغموم ہے تو کوئی دوسری سے۔ کوئی دربار سے وابستہ تھا، کوئی بازار سے اور کوئی خانقاہ سے۔ کسی کو قلعے کے اجڑنے کا غم ہے اور کسی کو یہ دکھ ہے کہ دہلی کی تہذیبی اور معاشرتی برتری مٹی میں مل گئی اور یہاں کے آثار و عمارات کا نقش تک باقی نہ رہا۔" (۱۷)

"فغان دہلی" میں دہلی کی لوٹ مار اور بربادی سے متعلق چالیس شعرا کی نظمیں جمع ہیں۔ یہ نظمیں دہلی کے امرا اور شرفا کی بربادی کا حال بیان کرتی ہیں۔ اس کتاب کا لب و لہجہ لکھنؤ شعرا سے بہت ملتا ہے۔ یہ دراصل اجڑی ہوئی دہلی کا مرثیہ ہے۔ اردو شاعری برصغیر کے تہذیبی انتشار کے ساتھ ساتھ فکری انتشار کا شکار رہی۔

بیسویں صدی کے آغاز کے وقت ہندوستان کے بیشتر سیاسی رہنما قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے۔ اس لیے شعرا کے ہاں بھی باطل کی زنجیریں توڑ کر آزادی حاصل کرنے کی تڑپ محسوس ہوتی ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے لیے چلائی جانے والی مختلف تحاریک کے زیر اثر ہونے والی شاعری میں بھی رزمیہ عناصر

کی روانی ملتی ہے جس کو حریت پسند جذبہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا۔ مثال کے طور پر مولانا ظفر علی خان نے ترک موالات کی تحریک کے لیے شاعری کی اور مسلم ہندو رہنماؤں کی سرگرمیوں کو بیان کر کے مسلمانوں کے خون کو خوب گرمایا اور تحریک آزادی کی راہ ہموار کی۔ جس سے حریت پسند جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔

بیسویں صدی کا ایک بڑا نام علامہ اقبال ہیں۔ جن کی شاعری فلسفیانہ اور ناصحانہ ہونے کے ساتھ ساتھ شاعری کی تمام خوبیوں سے مزین ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے مسلمان قوم کے آزادی کے جذبات کو جگایا، بکھری ہوئی قوم کو یکجا کر دیا اور صحیح معنوں میں مسلمانوں کو ایک منزل کا تصور دیا۔ علامہ اقبال کی شاعری میں فکر و فلسفہ کے ساتھ حریت پسند قومی و ملّی جذبات کا گہرا تاثر پایا جاتا ہے۔

مسلمانانِ برصغیر کی آزادی کا قافلہ جو سراج الدولہ کی رہنمائی میں چلا تھا وہ مختلف منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ لاکھوں قربانیوں اور ہزار ہا رکاوٹیں عبور کرنے کے لیے اس قافلے کی رہنمائی سلطان حیدر علی اور ٹیپو سلطان جیسے بہادر حکمرانوں نے کی۔ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید نے اس قافلے کی راہ میں اپنی جانیں قربان کیں۔ جنگ آزادی کا یہ علم میدان جنگ میں ڈوبتا ابھرتا قائد اعظم محمد علی جناح کے ہاتھوں میں آگیا۔ وہ خواب جو علامہ اقبال نے دیکھا تھا، قائد اعظم محمد علی جناح کے ہاتھوں تعبیر بن گیا۔ اور پاکستان دنیا کی پہلی نظریاتی ریاست کے طور پر ابھرا۔

وہ جنگ جو برسوں سے برصغیر میں جاری تھی، قیام پاکستان کے ساتھ بھی اختتام پذیر نہ ہوئی بلکہ ایک نئے دور میں داخل ہو گئی۔ پاکستان اور بھارت دو الگ الگ ریاستوں میں تقسیم ہو گئے لیکن عیار سامراجی جاتے جاتے دونوں مملکتوں کے درمیان خونی لکیر کھینچ کر چلے گئے اور دونوں ریاستوں کو مسلسل جنگ کی بھٹی میں جھونک گئے۔ انگریزوں نے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی حکمت عملّی کے تحت آزادی کے جام شیریں میں زہر کی تلخی گھول دی۔ املاک کی غیر مساوی تقسیم، حد بندی کمیشن کی صریح دھاندلی اور مختلف ریاستوں کے مسائل کو ادھورا چھوڑ کر دونوں ملکوں کی عوام کو ایک دوسرے کے خلاف کر دیا۔ ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ دونوں ریاستیں ہمیشہ کے لیے سامراجی حکمرانوں کے مرہون منت رہیں۔ اس صورت حال کے بارے میں قاسم یعقوب لکھتے ہیں:

> "پاکستان پہلے ہی روز سے جنگ اور جنگی فضا کے زیر سایہ پروان چڑھتا آرہا ہے، گویا اس ملک کی نفسیاتی تخلیق ہی رزم حق و باطل کے جدلیاتی ماحول میں ہوئی وہ قومیں جو حلقہ یاراں میں ریشم کی طرح نرم ہوتی ہیں۔ ان کو معاشرتی

قدروں کی تعمیر کے لیے خاطر خواہ وقت مل چکا ہوتا ہے۔ پاکستان کی تخلیق کے ساتھ ہی کئی محاذ جنم لے چکے تھے۔ ان محاذوں پر توجہ نہ دینا اپنی سالمیت کو قربان کرنے کے مترادف تھا۔" (۱۸)

قیام پاکستان کے بعد مسائل دو انتہاؤں پر تقسیم ہو گئے۔ یہ بات عیاں ہو گئی کہ صدیوں ساتھ رہنے کے باوجود دونوں اقوام (مسلمانوں اور ہندوؤں) کے درمیان مشترکہ تہذیبی ورثے کی نشو نما نہ ہو سکی۔ نظریے اور عقیدے کا اختلاف آخر تک برقرار رہا۔ آزادی کے ابتدائی دنوں میں نقل مکانی، قتل و غارت اور حکمرانوں کی انتقامی کارروائیوں نے مسائل کو دوچند کر دیا۔ ۱۸۵۷ء میں سامراجی قوتوں نے عوام کے خون سے ہاتھ رنگے تھے جس کی بدولت ۱۹۴۷ء سے پہلے جدوجہد آزادی میں جوش و ولولہ تھا، منزل کی جستجو تھی۔ لیکن آزادی کے ساتھ ہی قتل و غارت گری، انسانیت کی پامالی اور ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ ہجرت تاریخ انسانی کی سب سے بڑی ہجرت قرار پائی۔ ان سانحات نے ہر دل پر چوٹ لگائی اور ہر آنکھ کو اشکبار کر دیا۔ آزادی کی خوشی کو سانحات کے غم نے کرکرا کر دیا۔ عوام آزادی کی خوشی منانے اور اپنوں سے بچھڑنے کا ماتم کرنے کے درمیان تذبذب کا شکار تھے۔ اس موقع پر شعرائے اردو نے بھی پامال آرزوؤں کا ذکر کیا جس سے تلخ لہجہ کا جنم ہوا۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ قیام پاکستان کے وقت ہی ایسے تنازعات نے جنم لے لیا تھا جن کی وجہ سے آنے والے دنوں میں سخت ترین حالات کی پیش گوئی بآسانی کی جا سکتی تھی اور آنے والے دنوں میں دونوں ممالک کے درمیان مستقل تنازعات کو بھانپا جا سکتا تھا۔ تقسیم افواج کے موقع پر ان تنازعات کی بو کو باآسانی بھانپ لیا گیا۔ ابتدا میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مشترکہ فوج کی تجویز دی لیکن قائداعظم نے اس تجویز سے اتفاق نہ کیا کیونکہ دو الگ الگ آزاد ریاستوں کی ایک مشترکہ فوج انتہائی عجیب ہو سکتی تھی اس لیے فوج کی تقسیم کا عمل شروع ہوا۔ آپس میں تحائف تقسیم کیے گئے اور دوستی برقرار رکھنے کے عہد و پیمان کیے گئے۔ ہندو اور سکھ فوجیوں نے مسلمان فوجیوں کو الوداعی ضیافتیں دیں۔ ہندوستانی فوج کے نئے سربراہ نے اپنے پاکستانی ہم منصب کو چاندی کی ٹرافی پیش کی اور کہا کہ ہم ایک دوسرے سے دوستوں کی طرح ملتے رہیں گے۔ شجاع نواز ہندوستان کے فوجی سربراہ کے ان الفاظ کا ردعمل پاکستان کے فوجی آفیسر کی زبانی بیان کرتے ہیں:

"اس وقت میجر آغا محمد یحییٰ خان نے چیف انسٹرکٹر S.D Verma سے کہا "سر ہم کس لیے خوشی منا رہے ہیں یہ تو سوگ منانے کا

دن ہے۔ ایک متحدہ ملک کی حیثیت سے ہم ایک مضبوط اور طاقتور ملک
ثابت ہوسکتے تھے۔اب تو ہم آپس میں لڑتے رہیں گے"۔"(۱۹)

بعد کے حالات نے یہ بات سچ ثابت کر دی۔ دوستی کے وعدے کرنے والے فوجی صرف ایک سال میں ہی ایک دوسرے کے مدِ مقابل نبرد آزما نظر آئے۔

## (ب) پاک بھارت جنگوں کا تسلسل

مسلمانوں نے اسلامی تعلیمات کی آزادانہ ادائیگی اور برصغیر میں اسلامی تہذیب و ثقافت کی حفاظت کے لیے الگ اسلامی مملکت کے حصول کو لازمی سمجھا لیکن ہندو ہمیشہ سے اکھنڈ بھارت پر حکمرانی کے خواب دیکھتے رہے۔ ان کے لیے ہندوستان کا دولخت ہونا کسی صدمے سے کم نہ تھا لہٰذا انھوں نے پاکستان کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ دلی طور پر وہ قیامِ پاکستان کے وجود کے سخت خلاف تھے اور ہر قیمت پر پاکستان کے وجود کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ ہندوستان نے اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے تقسیم کے وقت مسلمانوں کے خون سے بے دریغ ہاتھ رنگے اور پاکستان آنے والے مہاجرین کو چن چن کر قتل کیا۔ آزادی کی راہ میں مسلمانوں نے لاکھوں جانوں کے نذرانے پیش کیے۔ لاشوں سے اٹی ہوئی گاڑیاں جب پاکستان میں داخل ہوتیں تو ان لاشوں کے خون کی خوشبو وطن کی فضاؤں میں چار سو پھیل جاتی۔ ان خون آلود واقعات کو شاعروں نے اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا اور آنے والی نسلوں تک منتقل کیا۔ پروفیسر متین الرحمان مرتضیٰ اس حوالے سے لکھتے ہیں "وطنِ آزادی کا منظر نامہ اس اعتبار سے قومی امانت ہے کہ اس کے ذریعے آنے والی نسلوں کو علم ہو گا کہ جو آزادی انھیں میسر ہے اس کے حصول کی کیا قیمت ادا کی گئی۔"(۲۰) آزادی کی یہ قیمت لاکھوں عوام کی جان، مال اور عزت و آبرو کی قربانی تھی۔

انگریزوں نے برصغیر بے دلی اور مجبوری سے چھوڑا۔ وہ ہندو اور مسلمان دونوں کو آپس میں لڑا کر ہمیشہ انھیں ایک دوسرے کے مدمقابل رکھنا چاہتے تھے اور وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ہندوستان چھوڑنے کے باوجود دونوں ممالک پر ان کا کنٹرول قائم رہے۔ اس کے لیے ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان اور ہندوستان کے مشترکہ گورنر جنرل بننے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن قائداعظم محمد علی جناح نے ماؤنٹ بیٹن کی اس خواہش کو رد کر دیا اور دو الگ الگ ریاستوں کے مشترکہ گورنر جنرل کی تجویز ٹھکرا دی۔ دوسری طرف بھارت نے ماؤنٹ بیٹن کو اپنا پہلا گورنر جنرل بنا لیا۔ اس حمایت کے صلے میں انگریزوں نے تقسیم کے معاملے میں بھارت کا بھرپور ساتھ دیا۔ برطانوی حکومت نے دونوں ریاستوں کے مابین کچھ تنازعات پیدا کر کے

انھیں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑا کیا۔ مسئلہ کشمیر، گرداس پور اور حیدر آباد دکن کی ریاستوں کے مسائل اور وسائل آمدن کی تقسیم کے تنازعات پیدا کر دیے۔ یہی مسائل پاکستان اور بھارت کے درمیان مسلسل جنگوں کا باعث بنتے آرہے ہیں۔

تقسیم پاکستان کا مرحلہ انتہائی نامساعد حالات میں طے ہوا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالتے ہی نوابزادہ لیاقت علی خان کی سربراہی میں وزراء کی کونسل کا اعلان کیا۔ ان وزراء کے پاس دفاتر تھے اور نہ دفتری سامان، انتظامی مشینری ناپید تھی۔ سرکاری محکموں کی عمارتیں تھیں نہ فرنیچر، سٹیشنری، ٹائپ رائٹر اور دیگر سامان بھی نہ تھا۔ چھوٹا بڑا عملہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کی نئی ریاست کو ایک خیمے سے تشبیہ دی۔ چھوٹے ملازموں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی مزید برآں سرکاری ملازمین کی ہجرت کا عمل بھی مکمل نہ ہوا تھا۔ بٹوارہ کونسل کے فیصلے کے مطابق سرکاری ملازمین کی نقل مکانی بذریعہ ریل گاڑی ہونا تھی لیکن قیام پاکستان سے پہلے ہی فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ سکھوں کی قیادت میں فیروز پور و گورداسپور، جالندھر و امرتسر میں مسلمانوں کی نسل کشی اور بے دخلی کی جارہی تھی جبکہ ہجرت کرنے والے مسلمان ملازمین کی ریل گاڑیوں کو بھی پامال کیا گیا۔

پاک بھارت تنازعات کی فہرست کافی طویل ہے لیکن ان میں اہم ترین اور بنیادی تنازعات کو ذیل میں زیر غور لایا جارہا ہے۔

### تنازع کشمیر۔۔۔ ایک بنیادی تنازع:

پاکستان اور ہندوستان کے درمیان پیدا ہونے والے تنازعات میں سب سے بنیادی تنازع کشمیر کا تنازع ہے۔ یہ تنازع قیام پاکستان کے ساتھ شروع ہوا اور آج تک جاری ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان باقی تنازعات وقت کے ساتھ ساتھ حل ہوتے گئے لیکن کشمیر کا مسئلہ کبھی حل نہ ہو سکا۔ قیام پاکستان کے وقت ایک باؤنڈری کمیشن کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس کمیشن نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا کام کیا اور کمیشن کے انگریز سربراہ نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر بٹالہ اور گورداسپور کی تحصیلیں ہندوستان کے حوالے کر دیں۔ یہ تحصیلیں مسلم اکثریتی تحصیلیں تھیں۔ تقسیم کے اصول کے مطابق انھیں پاکستان میں شامل ہونا تھا لیکن ہندوؤں کی سازشوں اور انگریزوں کی بددیانتی کی وجہ سے انھیں ہندوستان کے حوالے کر کے اسے کشمیر تک مستقل رسائی دے دی گئی۔ تقسیم برصغیر کے لیے طے شدہ اصول کے مطابق ریاست جموں و کشمیر کی قسمت کا فیصلہ بھی ہونا تھا۔ زاہد چوھدری کے مطابق:

> ”ریاست جموں و کشمیر کی تقریباً چالیس لاکھ کی آبادی کا تقریباً ۷۷ فی صد حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے اور یہ خطہ تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے مغربی پنجاب کا ایک حصہ ہے اس لیے اس کے ہندو راجہ کو اس کا الحاق لازمی طور پر پاکستان کے ساتھ کرنا پڑے گا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کشمیر کی سرزمین جنت نظیر کے پکے ہوئے پھل کی طرح ان کی جھولی میں آ گرے گی وہ نہیں جانتے تھے کہ ہندوستان کی بورڈ و قیادت اور برطانوی سامراج کا مشترکہ منصوبہ ان کی ان توقعات کے ہوائی قلعہ کو یکا یک مسمار کر دے گا۔“ (۲۱)

پاکستان اور کشمیر کے خلاف ۱۹۴۷ء یا اس سے پہلے سے منصوبہ تیار کر لیا گیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوؤں کے ساتھ ساز باز کے ذریعے ہندوستان کی گورنری کشمیر کے وعدے پر حاصل کی۔ کشمیر جو خطہ جنت نظیر ہے، اپنی خوبصورتی اور دلکشی کی وجہ سے ہمیشہ سے ہی غاصب حکمرانوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے تاہم مغلوں نے کشمیر کو سیر و سیاحت کے لیے استعمال کیا اور تاریخ گواہ ہے کہ تاریخ کے طویل دور میں کشمیر زیادہ تر ایک خود مختار اکائی کی صورت میں قائم رہا۔ زاہد چوہدری تاریخ کشمیر کا مختصر جائزہ یوں پیش کرتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| اشوک | ۳۷سال |
| کنشک اور بقیہ کشان | ۱۰۰سال |
| مہر گل، ھُن | ۲۰سال (زیادہ سے زیادہ) |
| بکرماجیت، ریاست مالوہ | ۱۹۲سال |
| مغل | ۱۶۶سال |
| افغان | ۶۷سال |
| سکھ | ۲۷سال |
| کُل | ۶۰۹سال (۲۲) |

وادی کشمیر کا سیاسی و ثقافتی تعلق گندھارا تہذیب سے رہا ہے۔ اشوک کا دارالحکومت ٹیکسلا تھا جو پشاور، کابل اور گندھار کے ساتھ مل کر انتظامی اکائی رہا۔ کشمیر میں اسلامی اقتدار کسی بیرونی حملے کا نتیجہ نہیں تھا۔ یہ اقتدار مقامی نومسلموں کے ذریعے قائم ہوا جنھوں نے جبر کی بجائے مقامی صوفیا کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا۔ کشمیر کی پہلی صوفی شاعرہ للہ عارفہ کو مانا جاتا ہے جن کی صوفیانہ شاعری نے کشمیر میں فروغ اسلام میں نمایاں

کردار ادا کیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ کشمیر میں مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ غیر مسلم حکمرانوں کے دور میں بھی مسلمانوں نے اپنا تشخص برقرار رکھا۔ غلام نبی خیال "فغان کشمیر" کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> "سکھا شاہی کے دور میں سب سے پہلے سری نگر کی جامع مسجد پر تالے چڑھ گئے اور مسلمانوں کو اذان دینے یا نماز ادا کرنے سے باز رکھا گیا۔ ایک سکھ حاکم بھولا سنگھ نے حضرت شاہ ہمدانؒ کی خانقاہ کے مد مقابل دریا جہلم کے دوسرے کنارے پر توپیں نصب کیں تا کہ اس زیارت گاہ کو بارود سے اڑا دیا جائے لیکن چند مقامی معززین کی مداخلت کے بعد اس نے یہ ارادہ ترک کیا۔ اس طرح گائے کا ذبیحہ گردن زنی کے قابل جرم قرار دیا گیا۔ کئی ایسے مسلمانوں کو سر عام پھانسی پر لٹکایا گیا جنھوں نے گائے کو ذبح کرنے کا "جرم" کا ارتکاب کیا تھا۔" (۲۳)

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان ایک کمزور سیاسی ڈھانچے اور کمزور فوج کے ساتھ وجود میں آیا۔ فوج جو انگریزوں کے ماتحت رہ چکی تھی۔ انگریزوں کی طرف سے فوج کو غیر جانبدار رہنے کی ہدایات دی گئی تھیں۔ تقسیم سے قبل برصغیر میں فوج کے ۴۶ تربیتی مراکز تھے جن میں سے ۷ فوجی تربیتی مراکز پاکستان کے حصے میں آئے۔ یہ تربیتی مراکز فوج کی تربیت کے لیے ناکافی تھے۔ اس لیے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان ڈیفنس کونسل کے اجلاس میں پاکستان فوجی تربیتی ادارے کاکول کے قیام کی منظوری دی گئی۔ اس ادارے نے ۱۹۴۸ء میں فعال ہونا تھا۔ تقسیم کے بعد پاکستان کے حصے میں آنے والا ادارہ کوئٹہ اہم تھا لیکن یہ ادارہ بھی غیر مسلموں کے انخلاء کی وجہ سے غیر فعال تھا۔ تاہم ۲ فروری ۱۹۴۸ء کو فعال بنایا گیا۔ اس ادارے کے اساتذہ میں لیفٹنٹ کرنل یحیٰ خان، لیفٹنٹ کرنل اختر حسین ملک اور لیفٹنٹ کرنل گل نواز خان جو دوسری جنگ عظیم کے ملٹری کراس کے انعام یافتہ تھے، اساتذہ میں شامل تھے

پاکستان کو حربی سامان انتہائی کم ملا اور جو ملا وہ بھی غیر تسلی بخش حالت میں تھا۔ تین اہم ورکشاپیں جن میں ٹینک مرمت کے لیے جاتے تھے، وہ بھارت کے حصے میں آ گئیں۔ ۱۴۰ اسلحہ خانوں میں سے صرف ۵ جو ناکافی تھے، پاکستان کے حصے میں آئے۔ اسلحہ کے بڑے ذخیرے ممبئی، مدارس اور کلکتہ کی بندرگاہیں تمام بھارت میں واقع تھیں۔ ۱۱۲ اسلحہ ڈپو میں سے تین پاکستان کے حصے میں آئے۔ ۱۷ اسلحہ ساز فیکٹریوں میں سے صرف تین پاکستان کو مِلّیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ پاکستان کے حصے میں صرف جوش و جذبہ اور ولولہ ہی آیا۔ سامانِ حرب اور اسلحہ کی حالت تو ناقابل بیان حد تک ناگفتہ بہ تھی۔ اس تمام صورت حال کا مقصد پاکستان کو دفاعی لحاظ سے کمزور کرنا تھا تا کہ پاکستان زیادہ دیر تک آزاد مملکت کی حیثیت سے قائم نہ رہ سکے۔ دوسری طرف کشمیر اور سرحدی علاقوں میں

کشیدگی کی آڑ میں پاکستان کے حصے کے سامانِ حرب کی فراہمی بھی روک دی گئی۔ پاکستان کو صرف بے ضرر سامان فراہم گیا گیا۔ پاکستان کی نئی فوج کی نفری میں بھی کافی کمی کی گئی۔ معاہدے کے مطابق پاکستان کو ۱۴ میں سے ۶ مسلح رجمنٹس ۴۰ میں سے ۸ آرٹلری رجمنٹس اور ۱۵ میں سے ۸ انفنٹری رجمنٹس حاصل ہوئے۔ گورکھا رجمنٹ کو تقسیم نہیں کیا گیا۔ پاکستان کے حصے میں آنے والی رجمنٹس کی افرادی قوت بھی کم ہوگئی کیونکہ ان میں سے سکھ اور ہندو نکل گئے۔ پاکستان کو ایک لاکھ پچاس ہزار فوج ملّی جو کاغذوں میں تو تھی لیکن حقیقی طور پر اس کی تعدار بہت کم تھی۔

اس قلیل دفاعی سازو سامان اور فوج کی کم نفری کے ساتھ فوج کے اہم عہدے بھی انگریزوں کے پاس تھے۔ اس گھمبیر صورت حال میں پاکستان کے دفاع کا آغاز ہوا۔ پاکستان نے اپنی فوج وزیرستان کے شمالی اور جنوبی سرحدوں سے ہٹالی تاکہ قبائلی اپنے معاملات خود ہی حل کر سکیں۔ وزیر اعظم لیاقت علی خان کو وزیر دفاع کا عہدہ بھی خود ہی سنبھالنا پڑا۔ فوج میں اعلیٰ عہدیداران انگریز ہونے کی وجہ سے ان میں جوش و جذبہ کی کمی تھی۔ آزادی کے کچھ ہی عرصہ بعد بھارت نے پاکستان کی دفاعی کمزوری سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا اور ہندوستانی افواج نے جوناگڑھ کی ریاست پر قبضہ کر لیا۔ ریاست کا سربراہ مسلمان تھا لیکن عوام کی اکثریت ہندو تھی۔ تقسیم کے بنیادی قانون کے تحت ریاست کا بھارت کے ساتھ الحاق فطری تھا، یہی حال ریاست حیدرآباد کا ہوا لیکن کشمیر کے معاملہ میں صورتحال برعکس رہی۔ اس ریاست کا سربراہ سکھ تھا اور عوام کی اکثریت مسلمان تھی۔ اس ریاست کا پاکستان سے الحاق فطری تھا۔ شجاع نواز کے مطابق "تقسیم برصغیر کے وقت کشمیر کا کل رقبہ ۸۴۴۷۱ مربع میل تھا جو تقریباً برطانیہ کے برابر اور آب و ہوا میں سوئٹزرلینڈ کا ثانی تھا۔ اس خطہ کو چار قابل ذکر دریاؤں میں دریائے سندھ، راوی، جہلم، اور چناب نے گھیرا ہوا تھا۔"(۲۴) لہٰذا کشمیر کی غلامی کے پیچھے بنیادی محرک اس کا حسن و جمال، اس کی جغرافیائی اہمیت اور قدرت کے دیگر خزانوں سے مالامال ہونا ہے جو کہ بھارت کبھی نہیں چاہتا تھا کہ یہ نعمت پاکستان کے ہاتھ لگے۔

تقسیم کے بعد بھارت کے دباؤ پر سکھ راجہ نے کشمیری عوام کی مرضی کے خلاف کشمیر کا الحاق بھارت سے کر دیا۔ کشمیری مہاراجہ کی اس حرکت کی وجہ سے کشمیری عوام اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوسری طرف سے قبائلی جنگجو کشمیریوں کی مدد کے لیے کشمیر روانہ ہوگئے۔ بھارت نے اس صورت حال کا فائدہ اٹھایا اور کشمیری عوام کے جذبہ آزادی کو بغاوت کا نام دیا اور اپنی فوجیں کشمیر میں داخل کر دیں۔ دوسری طرف قبائلی جنگجو براستہ جہلم کشمیر میں داخل ہو کر سری نگر کی طرف روانہ ہوگئے۔ اس صورت حال نے کشمیر پر بھارت کے قبضے کی راہ

ہموار کر دی۔ کشمیر کے مہاراجہ کو جموں بلوا کر الحاق کے سودے پر ستخط کروائے گئے جس کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے بھارتی فوج کو کشمیر میں مداخلت کی باقاعدہ اجازت دے دی۔ تیاری پہلے سے ہی مکمل تھی۔ حربی ساز و سامان فضائی راستے سے کشمیر پہنچایا گیا۔ مخصوص سول اور فوجی ہوائی جہاز فوجیوں کو لے کر کشمیر روانہ ہوئے۔

قبائلی جنگجو آزاد کشمیر فوج سے مل گئے جن کے پاس زیادہ فوجی ساز و سامان نہیں تھا تاہم ان جنگجوؤں نے اپنی گوریلا کاروائیاں جاری رکھیں۔ دوسری طرف بھارتی فوج نے کشمیر میں اپنے قدم جمانے شروع کر دیے اور مقامی آبادی کے لیے مشکلات پیدا کرنا شروع کر دیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر قائد اعظم محمد علی جناح نے جنرل گریسی (جو قائم مقام سربراہ اعلیٰ افواج پاکستان تھے) کو حکم دیا کہ پاکستانی فوج کو کشمیر بھیجا جائے۔ جنرل گریسی کی ہچکچاہٹ پر قائد اعظم نے انھیں اس صورت حال میں پیچھے ہٹنے کے نقصانات سے آگاہ کیا۔ کشمیر میں کاروائی مربوط کرنے کے لیے کمیٹی تشکیل دینے کی منظوری دی گئی۔ اس کمیٹی نے کشمیر پہنچ کر کشمیری عوام اور مجاہدین کی کاروائیوں کا جائزہ لیا جہاں ان میں اور بھارتی افواج میں جھڑپیں جاری تھیں۔ کشمیری مجاہدین اور عوام کشمیر کا الحاق پاکستان کے چاہتے تھے جبکہ بھارتی مؤقف تھا کہ قبائلی گروہ لوٹ مار میں لگے ہوئے ہیں۔ پاکستان نے باقاعدہ جنگ سے گریز کیا لیکن کشمیری مجاہدین اور بھارتی فوج کے درمیان لڑائی ریاست کے شمال اور جنوب مغربی اطراف میں پھیل گئی۔ اس کے بعد پاکستانی افواج کے سربراہ نے مسلح جنگ میں شمولیت کا فیصلہ کیا اور جب جنگ شدت اختیار کر گئی تو بھارت نے اقوام متحدہ سے رجوع کر لیا جس کے بعد کچھ دیر کی فائر بندی ہو گئی تاکہ بھارت اپنے زخمیوں کو اٹھا سکیں۔ ساتھ ہی سردی کی شدت میں اضافے کی وجہ سے کام کی رفتار سست ہو گئی۔

فروری ۱۹۴۸ء میں انتشار سے بچنے کے لیے ایک تنظیم بنائی گئی تاکہ قبائلی جنگجوؤں کو لشکر میں شامل کیا جا سکے جس کے بعد پاکستان نے بھی باقاعدہ مسلح جنگ کا آغاز کر دیا۔ اس دوران راجوڑی، بارہ مولا اور سری نگر میں مسلح حملے کئے گئے اور اڑی، پونچھ کے پہاڑی علاقوں میں رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ آزاد کشمیر کی فوج تکنیکی لحاظ سے زیادہ تربیت یافتہ نہیں تھی۔ پونچھ میں جنگجو پسپا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ بھارت کے پاس ٹینک اور کافی حربی سامان موجود تھا۔ علاقہ ٹینکوں کی آمد و رفت کے لیے ساز گار تھا لہٰذا پاکستان نے بھی ٹینکوں کے استعمال کا فیصلہ کر لیا۔ برفباری اور بارش کے باوجود جنگ میں شدت برقرار رہی۔ پاکستان کا اس جنگ میں شامل ہونے کا بنیادی مقصد مہاراجہ کو عوام کی رائے معلوم کرنے پر مجبور کرنا تھا لیکن کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق اور بھارتی فوج کی مداخلت سے صورت حال تبدیل ہو چکی تھی۔ جنگی کاروائیاں مارچ ۱۹۴۸ء تک جاری رہیں۔ اس دوران کافی انتظامی

مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن پاکستان نے اپنے کمزور معاشی اور فوجی حالات کے باوجود بھرپور طریقے سے جنگ لڑی۔

دونوں افواج کے سربراہان جو کچھ عرصہ قبل اکٹھے کام کر چکے تھے، ایک دوسرے کی صورت حال کو با آسانی سمجھ رہے تھے۔ بھارتی سربراہ کی کوشش تھی کہ کشمیر پر ایسا بھرپور حملہ کیا جائے تاکہ پورے کشمیر پر قبضہ کر کے پاکستان پر قبضے کی راہ ہموار کی جاسکے۔ شجاع نواز لکھتے ہیں ''کشمیر کی وادی میں بھارت سری نگر- بارہ مولا- مظفر آباد سڑک کے ذریعے حملہ کرنے میں مصروف نظر آرہا تھا تاکہ وہ مظفر آباد اور کوہالا پر قابض ہو سکیں اور پاکستان کی پشت یعنی ایبٹ آباد، راولپنڈی اور پشاور میں دستک دے سکیں۔"(۲۵)اس موقعے پر اندرونی سازشیں بھی جاری رہیں۔ افغانستان کو بھی بھارت سے مالی امداد حاصل ہو رہی تھی اور افغانستان سرحدی صوبے کا دعوے دار بھی تھا۔ بالآخر یہ معاملہ اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل کے حوالے کر دیا گیا۔ سکیورٹی کونسل میں مذاکرات جاری تھے۔ پاکستانی فوج کسی بھی صورت حال کے لیے تیار تھی۔ بھارت کے تابڑ توڑ حملوں اور آزاد فوج کی کم تعداد کے پیش نظر پاکستانی فوج بھی جنگ میں باقاعدہ طور پر شامل ہو چکی تھی جس نے ہندوستانی فوج کو اڑی، پونچھ اور وشیرہ سے آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ اس دوران اقوام متحدہ کا خصوصی وفد حالات کا جائزہ لینے برصغیر آیا۔ پاکستانی افواج مزید پیش قدمی کرنا چاہتی تھی لیکن حکومت نے اقوام متحدہ کی قرارداد پر عمل در آمد کا فیصلہ کیا اور اقوام متحدہ کے وفد کی تجویز پر دونوں ممالک کی جانب سے کنٹرول لائن کو جنگ بندی کی سرحد تسلیم کیا گیا۔ ۱۹۴۸ء کی جنگ اختتام پذیر ہو گئی لیکن اپنے پیچھے مستقل کشیدگی چھوڑ گئی۔ یہ کشیدگی مسئلہ کشمیر کی شکل میں تاحال برقرار ہے۔

پاکستان نے اقوام متحدہ کی قراردادوں کو تسلیم کیا لیکن بدقسمتی سے کشمیر کا مسئلہ تاحال حل نہیں ہو سکا۔ کشمیر اب تک متنازع علاقہ ہے اور اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل درآمد ہونا باقی ہے۔ تقریباً ستر سال گزرنے کے باوجود کشمیریوں کو ان کا جائز حق نہیں مل سکا۔

### پانی...... ایک اہم تنازع:

قیام پاکستان کے وقت جو مسائل پاکستان کے حصے میں آئے ان میں ایک اہم تنازعہ پانی کا بھی تھا۔ حد بندی کمیشن نے جب بدنیتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسلم اکثریتی علاقے بھارت کے حوالے کر کے جہاں بھارت کو کشمیر تک رسائی دے کر مستقل جنگ کا سامان پیدا کر دیا، وہیں پانی کا تنازعہ بھی کھڑا کر دیا۔ پاکستان میں بہنے والے اہم دریا یا تو بھارت سے بہتے ہوئے پاکستان پہنچتے ہیں یا ان کا منبع کشمیر ہے۔ بھارت سے آنے والے دریائے

ستلج، بیاس، چناب اور راوی ہیں۔ یہ دریا بھارت کی سر زمین کو سیر اب کرتے ہوئے پاکستان میں داخل ہوتے ہیں۔ پاکستان کے میدانی علاقوں کو سیر اب کرتے ہوئے پنجند کے مقام پر دریائے سندھ سے مل جاتے ہیں۔ دریائے سندھ کا منبع کشمیر ہے۔ یہ دریا پہاڑوں پر پڑنے والی برف سے وجود میں آتا ہے۔ دریائے سندھ پاکستان کا سب سے بڑا اور طویل دریا ہے جو کشمیر سے شروع ہو کر پاکستان کے چاروں صوبوں سے ہوتا ہوا بحیرہ عرب میں جا گرتا ہے۔ اس دریا کا پانی شفافیت اور شیرینی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ دریائے کابل جو افغانستان سے بہتا ہوا "اٹک" کے مقام پر دریائے سندھ میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ دریا بھی اپنی فطرت کے لحاظ سے انوکھا ہے۔ دنیا کے باقی دریا مشرق سے مغرب کی سمت بہتے ہیں لیکن یہ دریا باقی دریاؤں کے برعکس مغرب سے مشرق کی طرف یعنی الٹا بہتا ہے۔ اس دریا کا پانی گدلا ہے اور اپنے ساتھ پتھر لے کر آتا ہے۔ ان بڑے دریاؤں کے علاوہ دریائے جہلم، دریائے نیلم، دیوسائی وغیرہ جو مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر میں سے بہتے پاکستان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ کشمیر میں بہنے والے دریا خوبصورتی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ ان دریاؤں میں چشموں کا پانی بھی شامل ہوتا رہتا ہے۔ معدنی خصوصیات شامل ہونے کی وجہ سے ان دریاؤں کا پانی شفابخش بھی ہے اور تسکین قلب کا باعث بھی۔

قیام پاکستان کے وقت جہاں دیگر ناانصافیاں پاکستان کے حصے میں آئیں وہیں دریائی پانی کی تقسیم کو بھی متنازع چھوڑ دیا گیا۔ بھارت سے آنے والے دریا پاکستان کے وسیع حصے کو سیر اب کرتے ہیں اور دنیا کے سب سے بڑے نہری نظام کو جنم دیتے ہیں۔ پاکستان کی زرعی معیشت کا انحصار اسی نہری پانی پر ہے۔ بھارت نے اپنی روایتی عادت سے مجبور ہو کر کبھی نہری پانی کو بغیر اعلان کے روک دیا تو کبھی برسات کے دنوں میں بغیر پیشگی اطلاع کے دریاؤں میں پانی چھوڑ دیا جس کی وجہ سے پاکستان میں سیلابی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے۔ کھڑی فصلوں کو نقصان پہنچا کر مال مویشی اور دیگر املاک پانی میں بہ جاتی ہیں اور ناقابلِ تلافی جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ پاکستان کی طرف سے پانی کے تنازع کو حل کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی لیکن بھارت کے منفی رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی بلکہ ہر آتے دن کے ساتھ اس رویہ میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بالآخر پاکستان صورتحال کی نزاکت کے باعث اس تنازعہ کو عالمی عدالت میں لے گیا۔ عالمی عدالت نے پاکستان کے اصولی موقف کو تسلیم کیا اور تین بڑے دریاؤں سندھ، چناب اور جہلم پر پاکستان کے حق کو تسلیم کیا اور طے یہ پایا کہ ان تین دریاؤں کا پانی پاکستان اپنی مرضی سے استعمال کرے گا اور دیگر تین دریاؤں کا پانی بھارت اپنی مرضی سے استعمال کرے گا۔ اس معاہدے کے تحت پاکستان نے اپنے حصے کے دریاؤں کا پانی استعمال کرنا شروع کیا۔ اس پر بند باندھ کر آب پاشی کے نظام کو وسعت دی اور پاکستان کی زرعی معیشت کو پروان چڑھانے کی کوشش کی۔ دوسری طرف بھارت نے راوی، بیاس اور ستلج

کے پانی کو محدود کر لیا۔ ان دریاؤں پر بند باندھے اور ان کے پانی کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا اور ساتھ ہی سیلابی پانی کو بغیر پیشگی اطلاع کے کئی بار چھوڑ کر پاکستان کی معیشت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔

کچھ عرصہ تک تو بھارت نے تین دریاؤں پر پاکستان کے حق کو تسلیم کئے رکھا لیکن جلد ہی بھارت کی حکومت نے وعدہ خلافی کی۔ پاکستان کے حصے کے دریاؤں پر بھی بند باندھ کر پاکستان کے حصے کا پانی بھی روک لیا۔ بھارت کا یہ اقدام پاکستان کو بنجر کرنے کی کوشش ہے۔ پاکستان کی سونا اگلتی زرخیز زمینیں اور پنجاب کے میدانی علاقے جو پاکستان کی زرعی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں، بھارت کی اس آبی دہشت گردی سے نقصان اٹھا رہے ہیں۔ جن تین دریاؤں پر بھارت نے پاکستان کے حق کو عالمی عدالت میں تسلیم کیا تھا اور سندھ طاس کا معاہدہ طے پایا تھا اب ان ہی تین دریاؤں کے پانی کو بھارت پاکستان کے خلاف استعمال کر رہا ہے۔ جن دنوں میں پاکستان کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے ان دنوں پانی کو روک لیا جاتا ہے اور جب بارشیں زیادہ ہوں اور پانی سے نقصان کا اندیشہ ہو تو سیلابی پانی کھول دیا جاتا ہے اور اس عمل کی کوئی پیشگی اطلاع بھی نہیں دی جاتی۔ بھارت نے ان دریاؤں پر کئی بند باندھ رکھے ہیں جو عالمی معاہدے کی سراسر خلاف ورزی ہے۔ پاکستان نے اس مسئلے کو کئی بار عالمی سطح پر اٹھایا ہے تاہم اس معاملے پر ابھی تک کوئی مثبت پیش رفت نہیں ہوئی۔ دوسری طرف پاکستان میں میٹھے پانی کو ذخیرہ کرنے کا معاملہ بھی عدم توجہ کا شکار ہے۔ منگلا اور تربیلا جیسے بڑے ڈیم جو ۱۹۶۰ء کی دہائی میں تعمیر ہوئے۔ تربیلا بند جو دنیا کا سب سے بڑا ریت اور مٹی سے بنا ہوا ڈیم ہے، وقت کے ساتھ ساتھ اس کی گنجائش میں بھی کمی آ رہی ہے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد پاکستان کی آبادی میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے لیکن پانی کے ذخائر کی تعمیر پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ ۱۹۶۰ء کے بعد پانی کا صرف ایک بڑا منصوبہ غازی بروتھا مکمل کیا گیا حالانکہ کئی بڑے ذخائر کی تعمیر ممکن ہو سکتی تھی۔

پانی کی بڑھتی ہوئی طلب اور عدم دستیابی کے مسئلے کو سنجیدگی سے سمجھنے کی ضرورت ہے ورنہ مستقبل قریب میں پاکستان کی زرخیز زمین کے بنجر ہونے کا خدشہ ہے۔ دشمن کی طرف سے چلی گئی چال کا مقابلہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ موجودہ صورتحال میں اس بات کا خدشہ ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان آئندہ جنگ پانی کے مسئلہ پر ہو۔ یہ مسئلہ روز بروز گھمبیر صورتحال اختیار کرتا جا رہا ہے۔ تاہم اب قومی سطح پر اس مسئلہ کو اجاگر کرنے اور حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس گھمبیر صورت حال میں پاکستانی شعرا اور میڈیا اپنا حصہ ڈال رہے ہیں اور عوام کے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وطن کی محبت کے اظہار کے لیے ضروری ہے

کہ ملک کو درپیش مسائل کو اجاگر کیا جائے اور ان کے حل کے لیے مخلصانہ کوششیں کی جائیں۔ ان کوششوں کے ثمر بار ہونے کے امکانات بہت روشن ہیں اور یہی کوششیں ملکی ترقی کا باعث بنیں گی۔

## سیاچین......ایک نیا تنازع:

بھارت اور پاکستان اپنی مختصر آزاد تاریخ میں چار باقاعدہ جنگیں لڑ چکے ہیں۔ یہ کہنا بے جا ہو گا کہ پاکستان ہر دہائی میں بھاتی جارحیت کا شکار ہوا ہے۔ سرحدی جھڑپیں تو اب روز کا معمول اختیار کر چکی ہیں۔ معمول کی جھڑپوں کے علاوہ سیاچین کے برف پوش بلند کوہساروں پر بھارتی جارحیت نے جنگ کے لیے ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا ہے۔ مستقبل میں بھی اس جنگی کیفیت اور دونوں ممالک کی باہمی کشمکش میں کوئی کمی ہوتی محسوس نہیں ہوتی۔ بھارت کی علاقائی بالادستی کی دیرینہ خواہش، توسیع پسندانہ پالیسیاں اور علاقے میں سپر پاور بننے کی خواہش پاکستان کے دفاع اور امن پسندی کے لیے مستقل خطرہ ہیں۔ مغربی سرحد پر پاکستان، افغان بحران سے دوچار ہے اور مشرقی سرحد پر بھارت کی جارحیت نے حالات خراب کر رکھے ہیں۔

سیاچین کا تنازع موجودہ دور میں اہم حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ سیاچن کو دنیا کا بلند ترین محاذ جنگ قرار دیا جا چکا ہے۔ سیاچن پاکستان کے شمال مشرق میں واقع بلند ترین پہاڑی سلسلوں میں وہ مقام ہے جہاں بیٹھ کر دشمن پاکستان کے وسیع علاقے کو اپنی زد میں کر سکتا ہے۔ یہ انتہائی برف پوش اور دشوار گزار علاقہ ہے۔ موجودہ دور میں پاکستان کے بلند ترین مورچے سطح سمندر سے تقریباً ۲۲۰۰۰ فٹ سے زیادہ بلندی پر واقع ہیں۔ یہاں درجہ حرارت عموماً منفی ۶۵ ڈگری سینٹی گریڈ تک رہتا ہے۔ انتہائی دشوار گزار راستے اور سطح سمندر سے اتنی بلندی انسانی زندگی کے لیے انتہائی ناساز گار ہے لیکن پاکستانی افواج ان مشکل ترین موسمی حالات میں بھی اپنی جانوں کو داؤ پر لگا کر پاکستان کے دفاع کو ناقابل تسخیر بنانے کے لیے کوشاں ہیں۔

ابتدا میں یہ علاقہ محاذ جنگ نہیں تھا۔ اس علاقے میں کسی قسم کی جنگی سرگرمیاں بہت کم تھیں۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں جب پاکستان افغان جنگ میں مصروف تھا تو بھارت نے موقع پا کر سیاچن کی بلندی پر مورچہ بندی شروع کر دی تا کہ پاکستان کے وسیع حصے کو اپنے نشانے پر رکھ کر اپنی جنگی برتری کا اظہار کر سکے لیکن پاکستانی افواج بھارت کے اس اقدام سے غافل نہیں تھیں۔ لہٰذا پاکستانی افواج نے اپنے محدود وسائل کے ساتھ بھارت سے زیادہ بلندی پر مورچہ بندی کر کے بھارت کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا اور تاحال پاکستان کی یہ دفاعی حیثیت برقرار ہے۔ اس صورت حال کے بعد پاکستان کو اس محاذ جنگ پر مسلسل اپنا دفاع قائم رکھنے کے لیے لائحہ عمل طے کرنا پڑے گا کیونکہ بھارت اگر لیہ اور لداخ کے علاقوں سے نکل کر سیاچین تک آ سکتا ہے تو وہ مزید پیش قدمی

بھی کر سکتا ہے۔ دنیا کے بلند ترین میدان جنگ میں بھارت گذشتہ کئی سال سے سب سے مہنگی لڑائی لڑ رہا ہے۔ وہ دو سو جنگی پوسٹوں پر توپیں اور توپوں کے گولے وطیارہ شکن توپیں بذریعہ ہیلی کاپٹر پہنچا رہا ہے جس میں سے ہر روز سینکڑوں کی تعداد میں گولہ بارود ضائع بھی ہو رہا ہے۔ دونوں ممالک کی طرف سے جانی اور مالی نقصان فوجی برتری کے حصول کی کاوشوں کا حصہ ہے۔

سیاچن کی جارحیت کے فوائد بھارت کے لیے تہ در تہ ہیں۔ بھارت خود کو علاقے کی مقتدر قوت بنانے کے لیے کوشاں ہے کیونکہ اس کی جنوبی ایشیاء کے لیے پالیسیاں اس بات کی غمازی کرتی ہیں۔ بھارت علاقے میں اپنی بالادستی قائم کرنا چاہتا ہے اور اس کا نشانہ خاص طور پر پاکستان ہے جو کسی صورت بھارت کی بالادستی تسلیم کرنے کو تیار نہیں اور اپنی انفرادی حیثیت قائم رکھنا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر محمد اشرف خان اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "بھارت تو پاکستان کو اپنی ذیلی اور زیرِ اثر طاقت کے طور پر دیکھنا چاہتا ہے۔ جو بحرِ ہند اور اس خطے میں بھارت کی بالادستی کی قائل ہو لہٰذا وہ پاکستان پر دباؤ ڈالنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اگر بھارت پاکستان کے ساتھ برابری کی سطح سے تعلقات استوار کرنے پر آمادہ ہو جائے اور اپنی بالادستی کی خواہش کو ترک کر دے تو یہ علاقہ امن وسکون کا گہوارہ بن سکتا ہے اور دونوں ممالک بلکہ سارا خطہ دفاعی اخراجات کم کر کے ترقی وخوشحالی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔" (۲۶)

سیاسی مقاصد کے حصول کی خاطر امن کی خواہش کو ہمیشہ سبوتاژ کیا گیا۔ بھارت کشمیر کے ساتھ ساتھ پاکستان کے شمالی علاقہ کو بھی متنازعہ بنانے کے درپے ہے۔ چین کے ساتھ سرحدی جھگڑے کو بھارت نے پاکستان کی سرحدوں تک پھیلا دیا ہے۔ سیاچن کے محاذ کو کھول کر بھارت نے پاکستان کے شمالی علاقہ جات اور شاہراہِ قراقرم کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ اس محاذ جنگ کی وجہ سے بھارت پاکستان کے محدود وسائل پر دباؤ ڈالنے کے ساتھ ساتھ اپنی سپاہ کو عملّی تربیت فراہم کر رہا ہے۔

بھارت اور پاکستان دنیا کے واحد ممالک ہیں جنھیں اس یخ بستہ ماحول میں جنگ کا تجربہ ہے۔ اس بلند ترین محاذ جنگ پر پاکستان کی افواج مسلسل برسرِ پیکار ہیں۔ اگرچہ بھارت کے مقابلے میں پاکستان کے وسائل انتہائی محدود ہیں لیکن پاکستانی افواج کا جذبہ ایمانی ان سے کہیں بڑھ کر ہے کیونکہ مسلمان ہمیشہ شوقِ شہادت سے معمور رہتا ہے۔ اس کے لیے شہادت ہی اس کی منزل مقصود ہے۔ ظہیر کاشمیری اپنی نظم "نذرِ شہیدانِ وطن" میں ایسے جذبات کا اظہار کرتے ہیں:

گرم ہے دشتِ وفا، وقت آگیا شمشیر کا
غلغلہ اٹھا فضا میں نعرہ تکبیر کا
سرفروشانِ وطن جنگ گاہ میں جانے لگے
برق بن کر دشمنوں کے سر پہ لہرانے لگے
وہ بڑھیں افواج ارض پاک وہ پرچم کھلے
اہل ایماں خوف سے تاریخ نو لکھنے لگے
گو فضا کے شہزادے دیدۂ دیدار ہیں
بحر و بر کے پاسباں فولاد کی دیوار ہیں

(نذرِ شہیدانِ وطن، جنگ ترنگ)

سیاچن کا تنازع ایک اہم تنازع ہے۔ پاکستانی افواج کی ایک بڑی تعداد اور وسائل اس محاذ جنگ پر صرف ہو رہے ہیں۔ خون کو جما دینے والی سردی میں پاکستانی افواج کے جوانان انتہائی ہمت اور حوصلہ کے ساتھ اس محاذ جنگ پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ سال کے بہت کم عرصہ میں خوراک اور سامانِ حرب کی رسد ممکن ہو سکتی ہے۔ انتہائی کم خوراک اور مال و متاع کے ساتھ پاکستانی افواج اس محاذ پر اپنی جنگی برتری برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

سیاچن کے محاذ پر کئی پاکستانی فوجی اپنی جان کا نذرانہ پیش کر چکے ہیں اور ہزاروں اپنے جسمانی اعضاء سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکے ہیں۔ کیونکہ اس یخ بستہ محاذ پر مخصوص قسم کے لباس اور ساز و سامان کے بغیر قیام ممکن نہیں۔ یہاں رہنے والے نوجوانوں کو بڑے پیمانے پر مخصوص قسم کی ادویات کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ برف کو پگھلا کر پینے کا پانی حاصل کیا جاتا ہے، جس کا ذائقہ تلخ ہوتا ہے۔ دستیاب ایندھن صرف مٹی کا تیل ہے لیکن اس محاذ پر ڈٹے ہوئے ان جوانوں کا حوصلہ قابلِ فخر ہے۔ ان کے دلوں میں وطن سے محبت کی حدت ہے جو ہر حال میں ان کے خون گرمائے رکھتی ہے۔ یہی حدت نئی زندگی کی امید بھی دلاتی ہے اور موجودہ صورتِ حال میں زندہ رہنے کا حوصلہ بھی دیتی ہے۔

سیاچن کا محاذ انتہائی اہم محاذ کی صورت اختیار کر چکا ہے کیونکہ اس محاذ پر برتری کا مطلب مخالف کے وسیع علاقے میں ہونے والی نقل و حرکت پر نظر رکھنا ہے جس کی بدولت ایک نفسیاتی برتری حاصل ہو جاتی ہے۔ فوجی ساز و سامان کی ترسیل اور رسد کے نظام کو بھی نشانہ بنایا جا سکتا ہے جس کی وجہ سے مخالف کا دفاعی نظام یکسر ناکارہ اور بے اثر ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں ممالک اپنا کثیر سرمایہ صرف کر رہے ہیں اور اپنی اپنی افواج اس محاذ سے پیچھے ہٹانے پر تیار نہیں ہیں۔

## جنگ ۱۹۴۸ء / جنگِ کشمیر کے پس منظر میں ملّی نغمہ نگاری:

وادیِ کشمیر اپنے اندر جوش و ولولہ کی تاریخ سموئے ہوئے ہے۔ اس وادی کا سحر انگیز حسن اپنے اندر جادوئی اثر رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ جس نے بھی اس جنت نظیر کو دیکھا اسے دیکھتا ہی رہ گیا اور اس کے حسنِ بے مثل میں گم ہو گیا۔ وادی کشمیر کے حسن کی جھلک کشمیر کی صوفیانہ شاعری میں بھی جابجا ملتی ہے۔ یہ بات قابل افسوس ہے کہ اس وادی کا حسن ہی اکثر و بیشتر اس پر غیروں کے تسلط کا باعث بنا۔ سیر و سیاحت کی غرض سے آنے والے حکمرانوں نے اس خطے پر حملہ آور ہو کر اسے اپنے زیر نگیں بنانے کی کوشش کی تو کبھی یہ خطہ کوڑیوں کے مول فروخت کر دیا گیا۔ کشمیری عوام پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے اور ایسے ظلم روا رکھے گئے جن کا حال پڑھ کر انسانیت کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر کشمیر کا راجہ گلاب سنگھ بغاوت کرنے والے کشمیریوں کی زندہ کھال کھنچوا لیتا اور اس کھال میں بھس بھر کر درختوں پر لٹکا دیا جاتا۔ ایسے انسانیت سوز مظالم روا رکھے گئے جن کا ذکر بھی انسانی فکر پر تازیانے بن کر ٹوٹتا ہے۔ ان حالات میں شاعری دو حدود کے درمیان نظر آتی ہے ایک طرف کشمیر کا حسن ہے اور دوسری طرف کشمیر میں ہونے والے مظالم۔ علامہ اقبال نے کشمیر میں ہونے والے ظلم و ستم کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

کہ رہا ہے داستان بے دردی ایام کی
کوہ کے دامن میں وہ غم خانہ دہقان پیر
آہ ! یہ قوم نجیب و چرب دست و تر دماغ
ہے کہاں روز مکافات اے خدائے دہر گیر ؟

(آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر، ارمغان حجاز)

دوسری طرف اقبال نے کشمیر کے حسن کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

حاجت نہیں اے خطۂ گل شرح و بیاں کی
تصویر ہمارے دل پر خوں کی ہے لالہ
تقدیر ہے اک نام مکافات عمل کا
دیتے ہیں یہ پیغام خدایان ہمالہ
سرما کی ہواؤں میں ہے عریان بدن اس کا
دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دو شالہ

(حاجت نہیں اے خطہ گل شرح و بیاں کی، ارمغانِ حجاز)

علامہ اقبال کشمیری النسل تھے۔ ان کے آباؤ اجداد کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ آئے تھے۔ اقبال نے تمام عمر اپنے کشمیری النسل ہونے پر فخر کیا۔ ان کی فطرت میں کشمیر کا حسن اور مٹی کا جذبہ حریت شامل تھے۔

قیام پاکستان کے بعد کشمیر کے معاملے میں مروجہ تقسیم کے اصولوں سے جو انحراف برتا گیا۔ اس نے کشمیر کی سرزمین کو خطے میں جلتا ہوا الاؤ بنا دیا۔ بھارت نے اپنی فوجیں کشمیر میں داخل کیں اور جب حالات قابو سے باہر ہو گئے تو یہ معاملہ اقوام متحدہ میں لے گیا۔ اقوام متحدہ نے مسئلہ کشمیر کو حل طلب مسئلہ قرار دیا اور اسے متنازع علاقہ تسلیم کرتے ہوئے اس کا حل استصواب رائے کے ذریعے تجویز کیا۔ نصف صدی گزرنے کے باوجود اقوام متحدہ میں یہ مسئلہ حل طلب ہے۔ اس سلسلے میں فتح محمد ملک رقمطراز ہیں ''کشمیر کا تنازع نصف صدی سے حل طلب ہے مگر سلامتی کونسل کی قراردادیں خود اپنے خالقوں کی بے اعتنائی اور انصاف دشمنی کی نوحہ گر ہیں۔ جہاں انصاف پسندی اور امن دوستی کے تقاضے بڑی طاقتوں کے سامراجی عزائم سے متصادم ہوں وہاں اقوام متحدہ کی جانبدارانہ بے عملی مجرمانہ حدود کو چھونے لگتی ہے۔''(۲۷) کشمیری قوم بیسیوں سالوں سے تحریک آزادی کی خاطر اپنی جانیں قربان کر رہی ہے۔ کشمیر کی آزادی کی تحریک میں ہر آنے والے دن کے ساتھ جوش و جذبہ بڑھ رہا ہے۔ اس تحریک نے شعرا و ادبا کی توجہ کو بھی اپنی جانب مبذول رکھا ہے۔ تحریک آزادی کشمیر نے اردو ادب کو نئی جہت سے روشناس کروایا۔ قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں شعرا و ادبا مسئلہ کشمیر کی طرف مائل رہے۔ برصغیر کی تحریک آزادی کی ہمہ جہت شخصیت مولانا ظفر علی خان کی شاعری میں جابجا کشمیر اور تحریک آزادی کشمیر کا ذکر ملتا ہے۔ ان کی خوبصورت نظم ''نالہ شب گیر'' سے اقتباس ہے:

ہر طرف ہنگامہ پھر برپا ہے دارو گیر کا
ہو رہا ہے پھر ہرا زخم کشمیر کا
ایک لے دے کے خدا باقی ہے جس کے عرش پر
حق ہے کچھ کشمیریوں کے نالہ شب گیر کا

(نالہ شب گیر، فغانِ کشمیر)

اردو ادب میں کشمیر کا ذکر ایک روشن باب ہے جو باقاعدہ تحریک کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ جوں جوں کشمیر کی آزادی کی تحریک میں جوش و ولولہ بڑھتا گیا۔ اردو ادب میں بھی کشمیر اور کشمیریوں سے وابستہ ادب کے ذخیرے میں روزافزوں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جوش ملّیسانی نے اپنی نظم ''نیا کشمیر'' میں جذبات کا اظہار کیا ہے:

اے تماشائی بہت کچھ تو نے کی سیر جہاں
اب ذرا کشمیر میں آ کر نیا کشمیر دیکھ

ظلمتوں میں بھی نظر آتے ہیں انوار سحر
یہ ضیا یہ روشنی یہ تابش و تنویر دیکھ
رنج و غم میں دیکھ اس کا حوصلہ اس کا جگر
آفتوں میں اس کے استقلال کی تصویر دیکھ
تو نے ہر تعمیر میں تخریب دیکھی ہے مگر
اے تماشائی! یہاں تخریب میں تعمیر دیکھ (جوش ملّیسانی، فغانِ کشمیر)

کشمیر کی وادی جس میں "للہ عارفہ" جیسی صوفی شاعرہ نے جنم لیا۔ للہ عارفہ نہ برہمن کی بیٹی تھی نہ کسی کلمہ گو کی، وہ تو صرف کشمیر کی بیٹی تھی اس لیے پھولوں کا ڈھیر بن گئی۔ آج سے سات صدیاں قبل اس بہادر عورت نے کشمیریوں کو زندہ رہنے کا سبق پڑھایا۔ ان کے نزدیک زندگی سراسر جہاد ہے۔ جعفر طاہر کی نظم "اے جنت کشمیر" سے اقتباس ہے:

اے تو کہ ہے مردانِ جگردار کی جاگیر
اے تو کہ ترے نورِ نظر صاحب توقیر
جاں باز جنوں پیشہ جری صاحب شمشیر
کہسار مگر صاحبِ اقبال جہانگیر
اے جنتِ کشمیر (اے جنتِ کشمیر، جنگ ترنگ)

کشمیر سے وابستہ شاعری میں جنگ و رزم کے نغمے بھی ملتے ہیں جبکہ کشمیر کا حسن عشق عاشقی کے لیے انتہائی ساز گار ہے۔ اس حسن میں بارود کی بو بھر چکی ہے۔ یہ بو اس شاعری کا خاصہ ہے جو تحریک آزادی کشمیر سے وابستہ ہے۔ کشمیر سے وابستہ شاعری رزمیہ شاعری کا ایک منفرد باب ہے۔ کشمیر میں جاری جنگ میں افواج آمنے سامنے نہیں ہیں۔ افواج کے سامنے نہتے عوام ہیں۔ وہ عوام جن کے سینے باطل کے مد مقابل کھڑے ہیں اور صدیوں سے ظلم کے خلاف سینہ سپر ہیں۔ عظیم سرور کا کشمیریوں کے لیے "قومی ترانہ" ان ہی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔

علم اٹھاؤ کہ کشمیر جاگ اٹھا ہے
قدم بڑھاؤ کہ کشمیر جاگ اٹھا ہے
بڑھو کہ راہ شہیدوں کے خوں سے روشن ہے
بڑھو لہو کے افق سے صدائیں آتی ہیں

بڑھو وطن کی بہاریں تمھیں بلاتی ہیں

قدم بڑھاؤ کہ کشمیر جاگ اٹھا ہے (قومی ترانہ ، جنگ ترنگ)

تحریک آزادی کشمیر اردو شعرا کا پسندیدہ موضوع ہے۔ کشمیر کا خطہ اپنے اندر حسن کا انمول خزانہ سموئے ہوئے ہے اور تحریک آزادی کشمیر کی وجہ سے اس خطے میں رزمی کیفیت بھی طویل عرصہ سے طاری ہے۔ کشمیر سے متعلقہ شاعری میں ایک طرف تو اس جنت ارضی کے حسن کی مداح سرائی ہے تو دوسری طرف تحریک آزادی کے لیے جوش وولولہ۔ کشمیریوں کی قربانیوں کو خراج تحسین پیش کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ آنے والے روشن دنوں کی روشن امید کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ یہ امید کی کرن جو روشن مستقبل کی راہ دکھاتی ہے اور کشمیریوں کے خون سے روشن ہونے والی شمعیں آزادی کے افق پر جگمگائیں گی۔ جوش ملّیح آبادی کی نظم ”اے جنت کشمیر“ میں ایسی ہی جھلک نظر آتی ہے:

ظلمات کو رنگ ایسا جمانے نہیں دیں گے

اس خاک پہ ہم رات کو چھانے نہیں دیں گے

جس خاک کا ہر ذرہ ہے خورشید کی تصویر

اے جنت کشمیر ، اے جنت کشمیر (اے جنتِ کشمیر ، فغانِ کشمیر)

کشمیر اردو ادب کا ہمیشہ تر و تازہ موضوع رہا ہے۔ زیادہ تر رزمیہ شاعری کچھ ہنگامی واقعات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ عام طور پر رزم و جنگ کچھ دنوں، کچھ مہینوں یا کچھ سالوں پر مشتمل ہوتی ہے اس لیے ان سے وابستہ شاعری بھی ہنگامی کہلاتی ہے۔ اس کے عروج کے دور میں خوب جوش و خروش سے شاعری کی جاتی ہے، لیکن جوں جوں واقعات کی شدت میں کمی آتی ہے اس جنگ یا رزم سے وابستہ شاعری بھی جوش و خروش سے محروم ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہی حال دنیا میں چلنے والی تحریکوں کا ہے۔ مقصد کے حصول کے ساتھ ہی جوش و جذبہ ماند پڑنے لگتا ہے۔ تحریکوں سے وابستہ ادب کی چاشنی بھی کم ہو جاتی ہے لیکن تحریک کشمیر اپنی نوعیت کی منفرد تحریک ہے جو کئی دہائیوں سے جاری ہے اور ہر آنے والے دن کے ساتھ اس کی شدت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ تحریک کشمیر سے وابستہ ادب تحریک آزادی کشمیر کی طرح سدا بہار ہے۔ اردو ادب کے اس الاؤ کو ایندھن کی دستیابی مسلسل جاری ہے۔ یہ الاؤ جو کشمیریوں نے اپنے خون سے روشن کر رکھا ہے، اس کی تابانی اردو ادب کو جگمگا رہی ہے۔ حفیظ تائب نے ان جذبات کو اظہار ”کشمیر“ میں یوں کیا ہے:

شعلہ ساماں ہے شبنمیں وادی

ہائے کشمیر کی حسین وادی

ہے شہیدوں کے خون سے گلناز
خلد زاروں کی ہمنشیں وادی
گرد گرد اور دھواں سی ہے
گل و ریحاں سے عنبریں وادی
اہل اسلام کب چھڑائیں گے ؟
ظلم زادوں سے نازنیں وادی (کشمیر ، تعبیر)

کشمیر کا ہر شہر اپنے اندر ایک کہانی رکھتا ہے۔ یہ کہنا پر سوز بھی ہے اور پر ساز بھی۔ کشمیر کی وادی اپنے اندر خوبصورتی بھی رکھتی ہے اور جوش و ولولہ بھی۔ یہ ولولہ اہل کشمیر کے دلوں کو گرماتا ہے۔ ان کا خون جوش مارتا ہے۔ دنیا کشمیری عوام کے جوش و جذبہ پر حیران ہے جو دہائیوں سے ظلم و ستم برداشت کر رہے ہیں۔ آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں لیکن ان کی ہمت جواں ہے اور ہر آنے والے دن کے ساتھ یہ جذبہ پروان چڑھ رہا ہے۔ یہ جذبہ، یہ آواز کشمیر سے وابستہ شاعری میں بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کشمیر سے وابستہ ادب صرف کشمیریوں کی تخلیق نہیں بلکہ دنیا کے ہر خطے میں بسنے والے مسلمانوں نے اس میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ طالب قریشی اپنی نظم "اے سری نگر" میں اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

بدن میں آگ لگ گئی ہے تیرے حال دیکھ کر
ترے تقدس حسیں کا یہ زوال دیکھ کر
چلے ہیں نصرتوں کو پانے باندھ کر یہ اب کمر
پکارتی ہے سر زمیں چلے چلو سری نگر (اے سری نگر، جنگ ترنگ)

کشمیر کی شاعری، رزمیہ شاعری کی ہر تعریف پر پورا اترتی ہے۔ کشمیر میں کئی دہائیوں سے جنگ کی کیفیت جاری ہے۔ آلاتِ جنگ مثلاً طبل جنگ، تلوار، نیزہ، بندوق، بارود وغیرہ ہر چیز ہی تحریک آزادی کشمیر میں موجود ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک طرف تو جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح بھارتی افواج ہیں اور دوسری طرف کشمیر کے نہتے مسلمان۔ ایک طرف کشمیری جوانوں کا خون بہایا جا رہا ہے تو دوسری طرف کشمیری خواتین کی عصمت تار تار ہے۔ قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری اپنی گیت نگاری میں ثانی نہیں رکھتے۔ یہ فقیر منش شاعر جنھیں اللہ تعالیٰ نے قومی ترانے کی تخلیق کی سعادت سے نوازا، ان کا یہ اعزاز رہتی دنیا ان کے پاس رہے گا۔ انھوں نے شہیدان آزادی کو اپنی نظم "خون کے چراغ" میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

قائداعظم محمد علی جناح نے کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ قرار دیا۔ جس طرح ایک جسم کی زندگی کے لیے شہ رگ کی حفاظت ضروری ہے اسی طرح ملک پاکستان کی حفاظت کے لیے کشمیر کی حفاظت بہت ضروری ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ پاکستان نے بیشتر جنگیں کشمیر کی وجہ سے لڑیں۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں ہونے والی جنگ کی وجہ تنازع کشمیر ہی تھا۔ جب ۱۹۴۸ء میں بھارت نے اپنی فوجیں کشمیر میں داخل کیں تو اس وقت پاکستانی افواج بھی بھارتی افواج کے سامنے برسرِپیکار ہو گئیں اور کشمیر کے ایک حصے کو بھارت کے غاصبانہ قبضے سے آزاد کروالیا۔ کشمیر کا یہ حصہ آج کل "آزاد کشمیر" کے نام سے پاکستانی فیڈریشن کا حصہ ہے۔ اس حصے میں اپنا خودمختار سیاسی ڈھانچہ موجود ہے لیکن آزاد کشمیر کے دفاع کی مکمل ذمہ داری پاکستان پر ہے۔ کشمیر کے دفاع کی خاطر ہی افواج پاکستان کارگل جیسے مشکل محاذ پر اپنے ازلی دشمن کے خلاف برسرِپیکار ہیں۔ دوسری طرف مقبوضہ جموں و کشمیر کی حیثیت ایک متنازعہ علاقے کی ہے۔ جسے اقوام متحدہ کی قراردادوں کے تحت ابھی حل ہونا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب برصغیر کے حکمران سیر وسیاحت کی غرض سے کشمیر آتے تھے اور اپنی امور سلطنت کی اکتاہٹ ختم کرنے کے لیے کشمیر کا رخ کرتے تھے لیکن ایک یہ وقت ہے جب کشمیری عوام اپنے گھروں میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ کرفیو، ہڑتالیں، ناکہ بندی وہ حقائق ہیں جو آج کے کشمیر کی تلخ حقیقت ہے۔ دہائیوں پر پھیلی ہوئی جنگ نے ہر چیز کو راکھ کر کے رکھ دیا ہے۔ وادی کا فطری حسن تو اسی طرح قائم و دائم ہے لیکن اس وادی میں رہنے والے عوام کی امن کی خواہش کو سنگ دلوں نے چھلنی کر دیا ہے۔ یہ چھید زدہ خواہشیں اردو ادب کے نثر نگاروں اور شعرا کے کلام میں گونجتی ہیں۔ تصور کرتپوری نظم "عزمِ مجاہد" میں کشمیری عوام کے دل کی بات کرتے ہیں:

اے وادیٔ کشمیر تجھے لے کے رہیں گے
اے حاصلِ تقدیر تجھے لے کے رہیں گے
اے منبع تنویر تجھے لے کے رہیں گے
یہ بازو شمشیر تجھے لے کے رہیں گے

محکوم فضائیں یہ تری رہ نہیں سکتیں
سیلاب میں باطل کے کبھی بہہ نہیں سکتیں (عزمِ مجاہد، نوائے پاک)

کشمیر کا موضوع پاکستانی ادیبوں کی رگوں میں خون بن کر دوڑتا ہے۔ اردو ادب کا کوئی ادیب ایسا نہیں جس نے کشمیر کے موضوع پر طبع آزمائی نہ کی ہو۔ وادی کشمیر درحقیقت پاکستانی ادبا کا پسندیدہ ترین موضوع ہے۔ ادبا و شعرا معاشرے کا حساس ترین طبقہ ہوتے ہیں۔ کشمیر کی صورت حال تو پتھر سے پتھر دل کو پگھلانے کے لیے

کافی ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ معاشرے کا یہ حساس ترین طبقہ اس موضوع کی کسک سے محروم رہے۔ پاکستانی شعرانے ہر صنفِ شاعری میں کشمیر کو موضوع سخن بنایاہے۔ مثلاً نظم، مثنوی، قطعہ، رباعی غرضیکہ تمام شعری ہئیتوں میں پاکستانی شعرانے اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔

صہبا اختر جن کا نام اردو شاعری میں کسی تعارف کا محتاج نہیں، ان کی شاعری اپنے اندر ترنم و ترنگ کی خصوصیات سموئے ہوئے ہیں۔ کشمیر کے لیے صہبا اختر کے جذبات جب الفاظ کے سانچے میں ڈھلتے ہیں تو آنے والے حسین دنوں کی امنگ پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی نظم "حسین زنداں" میں امنگ بھی موجود ہے اور ترنگ بھی شامل ہے۔ اقتباس ہے:

یہ ارض کشمیر جس کو سادہ جوانیوں کی امنگ کہیے
یہ ارض کشمیر جس کو بزم رباب و طاؤس و چنگ کہیے
یہ ارض کشمیر جس کو خلد طلسم و افسوں رنگ کہیے
نہ جانے اس دلفریب گلشن کے باغبانوں کو کیا ہوا ہے
اداس ویران اجاڑ برباد آشیانوں کو کیا ہوا ہے (حسین زندان، فغانِ کشمیر)

اردو ادب بالخصوص پاکستانی ادب کا کوئی ایسانامور شاعر موجود نہیں جس نے کشمیر کے موضوع پر قلم نہ اٹھایا ہو۔ احمد فراز بیسویں صدی کے معروف شاعر ہیں، جس کی شاعری ہمہ جہت بھی ہے اور منفرد بھی۔ احمد فراز کی شاعری ایک طرف تو رومانوی ہے تو دوسری طرف انقلابی ہے۔ احمد فراز نے ہمیشہ ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ احمد فراز کی کشمیر کے لیے شاعری بھی اردو شاعری میں نمایاں اضافہ ہے۔

فیض احمد فیض وہ شخص اور شاعر ہیں جو کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی راہ ہموار کرنے کی خاطر صرف قلمی جہاد ہی کو کافی نہ سمجھتے تھے، بلکہ اس مقصد کے حصول کی خاطر عملی جدوجہد پر بھی یقین رکھتے تھے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد وہ افتخارالدین کے ہمراہ سری نگر گئے لیکن ان کی یہ جدوجہد بارآور ثابت نہ ہو سکی۔ فیض کی سرگرمیاں انگریز گورنر تک پہنچ گئیں۔ ان پر سازش کا الزام لگایا گیا۔ تاہم عوام میں فیض کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ فیض کی انقلابی شاعری میں کشمیر کی مظلومیت کی جھلک نمایاں ہے۔

دل نا امید تو نہیں ، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام ، مگر شام ہی تو ہے
دل مدعی کی حرف ملامت پہ شاد ہے
اے جانِ جاں ، یہ حرف ترا نام ہی تو ہے (ہم پر تمہاری چاہ کا الزام ہی تو ہے، زنداں نامہ)

جمیل الدین عالی کا نام اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ بیگم رعنا اقبال جمیل الدین عالی کے بارے لکھتی ہیں کہ جمیل الدین عالی کی ادبی خدمات کے حوالے سے اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے اپنی ساری عمر ہی ادب اور زبان کی خدمت میں گزاری ہے تو غلط نہ ہو گا"(۲۸) جمیل الدین عالی ایک متنوع مزاج، جذبات اور کیفیات رکھنے والے شاعر ہیں۔ وہ انتہائی باصلاحیت شخص ہیں۔ انھوں نے نظم و نثر ہر میدان میں خوب نام کمایا ہے۔ جمیل الدین عالی نے شاعری کا آغاز ۱۹۳۹ء میں اس وقت کیا جب وہ میٹرک کے طالب علم تھے۔ اس لحاظ سے انھوں نے اپنے عہد جوانی میں ہی تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ جذبات کے اس دور میں وطن کی محبت دل میں راسخ ہو گئی۔ یہ اسی محبت کا اثر تھا کہ جمیل الدین عالی نے ملّی اور وطن سے محبت کی شاعری میں خوب نام کمایا۔ ان کے ملّی نغمات کی سادگی اور جذبات کا خلوص اپنے اندر انفرادیت کی مثال ہیں۔ جمیل الدین عالی ملّی نغمہ نگاری میں وہ نام ہے جس کی مثال اردو ادب میں ملنا محال ہے۔ عالی نے اردو ادب کی خدمت کے لیے اداروں کے قیام میں بھی نمایاں حصہ ڈالا۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ وفاقی اردو یونیورسٹی کے قیام میں بھی جمیل الدین عالی کی خدمات ایک سنہرے باب کے طور پر ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

سید ضمیر جعفری طنز و مزاح میں خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کا تعلق پاکستان کے شہر جہلم سے ہے۔ انھوں نے جس دور میں ہوش سنبھالا اس وقت برصغیر کے عوام سامراج کی چکی میں پس رہے تھے۔ اس دور میں ضمیر جعفری نے رومانوی شاعری بھی کی، وطن سے محبت کا فرض بھی نبھایا اور اپنی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی بدولت اردو ادب میں منفرد مقام حاصل کیا۔ انھوں نے طویل عمر پائی اور تمام عمر اردو ادب کے لیے وقف کیے رکھی۔ ضمیر جعفری کی ملّی شاعری بھی بے مثال ہے۔ ضمیر جعفری نے کشمیر کے لیے اپنے جذبات "جلتے چناروں کے نام" میں کچھ ان الفاظ میں پیش کیے ہیں:

وادی کشمیر کے جاں باز فرزندو سلام
جہد حق میں اے خدا کے منتخب بندو سلام
سبز دھانوں کو دعا کیسر چناروں کو سلام
زندگی کے خوبصورت شالاماروں کو سلام
شب فروشوں سے یہ صبح ایشیا کی جنگ ہے
یہ فرات عصر پر پھر کربلا کی جنگ ہے (جلتے چناروں کے نام، مَن مُندری)

کشمیر کے لیے جہاں مرد شعرانے شاعری کی وہیں خواتین شعرا بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ کیونکہ کشمیر کی آزادی کی جنگ صرف مردوں کی جنگ نہیں بلکہ یہ تو کشمیری ماؤں کی جنگ ہے، کشمیری بہنوں کی جنگ ہے۔ کشور ناہید اردو شاعری کی خوبصورت نسوانی آواز ہے۔ ان کی نظم "کشمیری ماں کی للکار" جذبات کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ اقتباس ہے:

مجھے سزا دو کہ میں نے اپنے لہو سے تعبیر خواب لکھی
جنوں بریدہ کتاب لکھی
مجھے سزا دو کہ میں نے تقدیس خواب فردا میں جاں گزاری
مجھے سزا دو کہ میں نے قاتل کو وصف تیغ والم سکھایا
سروں کو اوجِ قلم سکھایا (کشمیری ماں کی للکار، فغانِ کشمیر)

کشمیر کے موضوع نے قہقہے بکھیرنے والے ادیبوں کو بھی لہو لہو رلا دیا۔ اس صورت حال میں سنجیدہ شعرا کی آہ و بکا دل چیرتی ہے اور عالمی ضمیر کو جھنجھوڑتی ہے۔ کشمیر جو کبھی جنت نظیر تھا آج خون و بارود سے اٹا پڑا ہے۔ کشمیر سے متعلق شاعری اردو شاعری کا بہت بڑا اثاثہ ہے۔ اردو شاعری میں کشمیر ایک مستقل عنوان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس موضوع پر لگ بھگ تمام شعرائے اردو ادب نے اپنا حصہ ڈالا ہے۔ عسکری اور رزمیہ شاعری کا کوئی ایسا مجموعہ کلام نہیں جس میں کشمیر سے متعلق شاعری موجود نہ ہو۔۔اس کے علاوہ کئی عظیم شعرا نے اپنے شعری مجموعہ میں کشمیر سے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ناصر کاظمی اپنی نظم "صدائے کشمیر" میں اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

صدائے کشمیر آ رہی ہے، ہماری منزل قریب تر ہے
یہ عدل وانصاف کی گھڑی ہے، ستم کی معیاد مختصر ہے
لہو شہیدوں کا رنگ لایا
نئی سحر کی امنگ لایا
غرور کا ابر چھٹ رہا ہے
رخ حوادث پلٹ رہا ہے (صدائے کشمیر، نشاطِ خواب)

اگر اردو ادب سے کشمیر کا موضوع نکال دیا جائے تو اردو کی عسکری اور رزمیہ شاعری بے رونق اور بے رنگ ہو جائے گی۔ یہ موضوع گزشتہ کئی دہائیوں سے مجاہدین کا خون گرما رہا ہے۔ اور مسئلہ کے حل تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔

## پاک بھارت جنگ ۱۹۶۵ء اور مِلّی نغمہ گاری:

۱۹۴۸ء کی جنگ کے بعد کافی عرصہ تک بھارت کو پاکستان پر کھل کر حملے کی ہمت نہ ہوئی تاہم چھوٹی چھوٹی جھڑپیں جاری رہیں۔ دوسری طرف پاکستان کے اندرونی حالات سیاسی بحران کا شکار رہے۔ پے در پے حکومتوں کی تبدیلی اور اقتدار کی کھینچا تانی کے سیاسی منظر نامے کی وجہ سے بے چینی کی فضا پیدا ہوتی رہی۔ ۱۹۵۶ء کے آئین کی معطلی کے ساتھ ایوب خان کا مارشل لاء نافذ ہو گیا۔ اس دور میں پاکستان میں امن و امان کی صورت حال بہت بہتر ہو گئی اور ترقی کا عمل تیز ہو گیا جس سے پاکستان عالمی سطح پر اپنا مقام پیدا کرنے لگا۔ عالمی مقتدر اعلیٰ قوتوں روس اور امریکہ کو بھی پاکستان کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ یہ صورت حال بھارت کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھی کیونکہ وہ تو ابتدا سے ہی پاکستان کو دنیا کے نقشے پر چند دنوں کا مہمان سمجھتا تھا اور اب اس کو مٹا دینے جیسے ناپاک عزائم کے درپے تھا لیکن بھارتی خواہشات کے برعکس قائد اعظمؒ کی پاکستان کے روشن مستقبل کی امید اور قائم رہنے کا خواب حقیقت کا روپ دھارنے لگا تھا تو بھارت سے پاکستان کی ترقی اور خوشحالی ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ دوسری طرف تقسیم کے وقت سے ہی بھارت کو پاکستان کی نسبت کئی گنا زیادہ سامانِ حرب ملا تھا لہٰذا ان تمام حالات نے بھارتی حکومت کو طاقت کے نشے میں مبتلا کر دیا اور وہ آئے روز پاکستان میں دراندازی کرنے لگا۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی رات جب پاکستانی عوام امن اور چین کی نیند سو رہے تھے تو بھارت نے پاکستان پر رات کی تاریکی میں حملہ کر دیا۔ بھارت کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ رات کی تاریکی میں سرحد پار کر کے لاہور پر قبضہ کر لیں گے اور بآسانی پاکستان کے اندر داخل ہو کر باقی شہروں پر بھی اپنا تسلط جما لیں گے لیکن یہ سوچ بھارتی سپہ سالاروں کی بھول ثابت ہوئی اور پاکستان کی بہادر افواج نے سرحد پر ہی بھارتی افواج کو روک لیا اور اسے پاکستان کی پاک سرزمین کی طرف بڑھنے سے روک دیا۔

اس وقت ملک کے صدر فیلڈ مارشل جنرل ایوب خان تھے۔ انھوں نے فوری طور پر پاکستانی افواج اور عوام سے خطاب کیا۔ صدر پاکستان نے قوم کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا:

> ”میرے پیارے ہم وطنو! پاکستان کے دس کروڑ عوام کی آزمائش کی گھڑی آ گئی ہے۔ بھارتی فوج نے آج صبح لاہور کے قریب سرزمین پاکستان پر حملہ کر دیا ہے۔ بھارتی حکمرانوں نے اپنی روایتی بزدلی اور منافقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے باضابطہ اعلان جنگ کیے بغیر اپنی فوجوں کو پاکستان کی مقدس سرزمین میں گھسنے کا حکم دے دیا ہے۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم بھارت کو ایسا دندان شکن جواب دیں کہ بھارت کے سامراجی عزائم کا جنازہ نکل جائے۔

میرے عزیز ہم وطنو!

آزمائش کی اس گھڑی میں آپ کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ آپ میں سے ہر فرد کو اب اپنا اولین اور اہم ترین فریضہ انجام دینا ہے اور اس فریضہ کی انجام دہی کے لیے کامل یکسوئی اور توجہ کی ضرورت ہے۔ خدائے رحیم و کریم آپ کا حامی و ناصر ہو گا اور آپ کو فتح مبین عطا فرمائے گا، کیونکہ وہ حق و انصاف کے لیے لڑنے والوں کو ہمیشہ کامیابی و کامرانی عطا کرتا ہے۔ آپ جارحیت کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے تیار ہو جایئے کیونکہ آپ کی سرحدوں پر جس فتنہ نے سر اٹھایا ہے اسے کچلے بغیر اب آپ کو سکون نصیب نہیں ہو گا۔ آگے بڑھیے اور بڑھ کر دشمن کا مقابلہ کیجیے۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔ پاکستان پائندہ باد" (۲۹)

پاکستان اور بھارت کے درمیان لڑی جانے والی جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے پیچھے جہاں دیگر کئی محرکات تھے وہیں ایک بنیادی محرک کشمیر بھی تھا کیونکہ اس سے پہلے ۱۹۴۸ء میں مجاہدین اور بھارتی افوج کی جنگ سے کشمیر کا علاقہ تقسیم ہو گیا تھا اور ایک تہائی حصہ مجاہدین آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے جبکہ بقیہ دو تہائی حصہ ابھی تک بھارتی قبضے میں تھا جبکہ اقوام متحدہ کی زیرِ نگرانی استصواب رائے بھارتی ہٹ دھرمیوں کی وجہ سے عمل پذیر نہیں ہو پا رہی تھی تو اس صورت حال میں کشمیری مجاہدین و عوام دوبارہ آزادی کے لیے کوشاں تھے۔ مقبوضہ کشمیر میں آئے روز بھارتی افواج سے جھڑپوں اور احتجاج کا الزام بھارتی حکومت براہِ راست پاکستان پر لگا کر حملے کا جواز پیدا کرتی رہی اور آخر بھارت رات کی تاریکی میں پاکستان پر حملہ کر کے ایک بڑی جنگ میں کود پڑا۔ اس لحاظ سے یہ جنگ بھارت اور پاکستان کے مابین لڑی جانے والی پہلی باقاعدہ جنگ ہے۔ قاسم یعقوب اس جنگ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"۶ ستمبر کو ہونے والا بھارتی حملہ برکی کے سیکٹر پر نئی خون ریز صبح لے کر طلوع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی واہگہ سیکٹر میں دشمن نے چڑھائی کر دی۔ بہت جلد بھارتی افواج بی آر بی نہر پار کر کے لاہور میں داخل ہو گئیں۔ واہگہ کے قریب کسٹم کالونی میں گھس کر خون خرابہ شروع کر دیا گیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ اور توپوں کی گھن گرج سے مکین انتہائی خوف زدہ ہو گئے۔ سویلین پر بھارتی وحشت قابل افسوس عمل تھا۔ بیدیاں سے چار میل دور جنوب مشرق میں واقع ایک گاؤں "گدو" پر بھی بھارتی فوجوں کی وحشت ناک کاروائی اس محاذ کا افسوس ناک واقعہ ہے۔ فوجیوں کو محاذ جیتنے سے زیادہ غنڈہ گردی کا جنون تھا۔ لاہور پر حملہ اچھوگل، واہگہ اور ہڈیارہ کی جانب سے کیا گیا تھا جس کی وجہ سے اس جانب کی کثیر آبادی بھارتی یلغار کا نشانہ بن گئی۔" (۳۰)

بھارت کی طرف سے چھیڑی جانے والی ۱۹۶۵ء کی جنگ کا مقصد پاکستان کے زیادہ سے زیادہ علاقوں پر قبضہ کرنا تھا۔ اگرچہ بھارتی فوجی افسران پاکستان پر حملے کے حق میں نہیں تھے لیکن حکمرانوں نے سیاسی مقاصد کے لیے یہ جنگ خطے پر مسلط کر دی تھی۔ ہندوستانی رہنما مکمل طور پر بھی پاکستان پر قبضہ کرنا چاہتے تھے لیکن ناکامی کے بعد انھوں نے اپنے بیانات بدل دیے اور پھر یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ تو محدود مقاصد کے ساتھ میدانِ جنگ میں اترے تھے اور ان کا مقصد صرف پاکستان کی دفاعی قوت کو تباہ کرنا تھا لیکن بھارت کے مقاصد کس سے ڈھکے چھپے نہیں تھے، کیونکہ بھارت نے پاکستان کے دس مختلف علاقوں پر حملہ کیا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ علاقوں پر قبضہ کیا جا سکے۔ دوسری طرف ان کا مقصد پاکستان کی فوجی طاقت کو تقسیم کر کے اسے کمزور بنانا تھا۔

بھارت نے پہلے مغربی پاکستان اور پھر مشرقی پاکستان پر حملہ آور ہونا تھا لیکن پہلے اس نے حملہ کے لیے مغربی پاکستان کے علاقے رن کچھ کا انتخاب کیا جو کافی عرصہ سے دونوں ممالک کے درمیان وجہ تنازعہ بنا ہوا تھا۔ بھارت کے خیال میں رن کچھ کے علاقے کے ذریعے وہ بہت جلد حیدر آباد تک پہنچ کر مغربی پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے تھے لیکن یہ سوچ بھارت کی خام خیالی ثابت ہوئی۔ بھارت اپنی فوجی طاقت کے زعم میں مبتلا تھا لیکن اسے پاکستان کی فوج کی جانفشانی اور سر فروشی کا اندازہ نہیں تھا۔ رن کچھ کے علاقے میں حالات کشیدہ ہوئے تو پاکستانی قیادت پر واضح ہو گیا کہ بھارت کا مقصد پاکستانی علاقوں پر قبضہ کرنا ہے۔ پاکستان نے پہلے مذاکرات کی کوشش کی تاہم دوسری طرف پاکستانی افواج بھارت کے جارحانہ ارادوں کی صورت میں طاقت کے استعمال کے لیے تیار تھیں۔ پاکستانی فوج نے ریت کے ایسے ٹیلے کھڑے کیے جن سے پاکستانی علاقے پر قبضہ نہ کیا جا سکے۔ اس موقعے پر پاکستانی افواج نے ہمت اور شجاعت سے اگلی صفوں میں رہتے ہوئے متنازع علاقے پر قبضہ کر لیا۔

پاکستان اور بھارت کی بین الاقوامی سرحد کے آس پاس سڑکوں کا جال بچھا ہوا تھا جن کے ذریعے فوجی ساز و سامان بآسانی ایک سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا تھا لیکن پاکستانی فوج کے آفیسر افتخار جنجوعہ نے BRB نہر تعمیر کروائی جو ۵۰ فٹ چوڑی اور ۱۵ فٹ گہری تھی۔ بھارت آبی رکاوٹ کو عبور کرنے کے حق میں نہیں تھا کیونکہ اگر بھارت جی ٹی روڈ تک رسائی حاصل کر لیتا تو مغربی پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا اور پاکستان دفاعی پوزیشن میں آ جاتا۔ بھارتی منصوبہ یہ تھا کہ لاہور اور سیالکوٹ کی افواج کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا جائے اور پاکستانی فوج کی حملہ آور ہونے کی صلاحیت کو تباہ کر دیا جائے تو پاکستان کے علاقوں پر باآسانی قبضہ کیا جا سکتا ہے۔

بھارت کی جنگی تیاریوں نے پاکستان کو چوکنا کر دیا تھا لیکن پاکستان نے کوئی جنگی کاروائی نہیں کی۔ شجاع نواز کے مطابق ''۶ ستمبر کو صبح ۹ بجے تصدیق کی گئی کہ بھارت نے لاہور پر حملہ کر دیا ہے اور سیالکوٹ بھی اس کی زد میں

ہے۔"(۳۱) بھارتی حملے کے جواب میں پاکستانی افواج نے بھی پیش قدمی شروع کر دی۔ اچانک حملے کے باوجود پاکستان نے بھارت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ سیالکوٹ، چونڈہ، لاہور، نارووال سمیت ہر محاذ پر شدت اور چابک دستی سے بھارتی افواج کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ دوسرے دن بھارت کی طرف سے پھر گولہ باری کی گئی۔ فیصلہ کن معرکہ ۱۴ ستمبر کو بھارت کے شدید حملے اور پاکستانی ٹینکوں کے درمیان شروع ہوا جب پاکستانی ٹینکوں کی وجہ سے بھارتی افواج کو حملہ روکنا پڑا۔ بھارتی کمانڈوز چونڈہ پر قبضہ کر کے سیالکوٹ پر قبضہ کرنا چاہتے تھے لیکن پاکستانی توپ خانے نے ان کے ارادے خاک میں ملا دیئے۔ بھارتی کمپنیاں جو چونڈہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھیں، انھیں بھگا دیا گیا۔ پاکستانی افواج نے چونڈہ میں بھارت کو شدید نقصان پہنچایا اور بھارت کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ چونڈہ کا معرکہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ٹینکوں کی سب سے بڑی لڑائی تھی جس میں پاکستان نے کامیابی حاصل کی۔

پاکستانی افواج نے لاہور کے علاقے میں بھی خوب دفاع کیا۔ یہ علاقہ پاکستانی افواج کے لیے مانوس سمجھا جاتا تھا حالانکہ اس علاقے میں بی۔ آر۔ بی نہر کے علاوہ پاکستان کے پاس کوئی فوجی تنصیبات نہیں تھیں۔ پاکستانی افواج کو زیادہ وقت نہیں ملا۔ بھارتی فوج تیزی سے حملہ کرتے ہوئے بی۔ آر۔ بی نہر کے ڈوگرائی پل تک پہنچ گئی۔ انھوں نے فوج نہر کے پار اتار دی اور پیش قدمی شروع کر دی لیکن پاکستان کی زبردست گولہ باری نے انھیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ پاکستانی افواج کی طرف سے بی آر بی کے پل کو ۷ ستمبر ۱۹۶۵ء کو اڑا دیا گیا جس کے بعد بھارتی افواج پورا زور لگانے کے باوجود بھی نہر پار نہ کر سکیں اور اسے بہت سا نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ بھارت نے بسیار گوئی سے کام لیتے ہوئے اپنی کامیابی کے دعوے کیے لیکن درحقیقت بھارت کو اس میں ناکامی ہوئی۔

بھارت کے پاس پاکستان کے مقابلے میں چار گنا زیادہ فوج اور اسلحہ موجود تھا لیکن پاکستانی افواج نے ہمت اور جذبے سے اس جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ ملک کے صدر ایوب خان اور فوج کے سربراہ موسیٰ خان کی پیشہ ورانہ مہارت نے پاکستان کو عظیم فتح دلائی۔ سترہ روزہ جنگ میں بھارت کا بہت سا اسلحہ ناکارہ ہو گیا اور جانی نقصان بھی شدید تھا۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کو جنگ بندی ہو گئی اور بالآخر معاہدہ تاشقند کے ذریعے صلح ہو گئی۔

۱۹۶۵ء کی جنگ نے پوری پاکستانی قوم کو ایک نظریے پر متحد کر دیا اور کافی عرصہ بعد قیام پاکستان اور ہجرت پاکستان کا منظر دوبارہ دیکھنے کو ملا۔ پوری پاکستانی قوم نے متحد ہو کر بھارتی جارحیت کا مقابلہ کیا۔ جنگ ستمبر میں پاکستانی افواج کے ساتھ پاکستانی عوام نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ افواج پاکستان کے کارناموں کے ساتھ ساتھ پاکستانی عوام کی قربانیاں بھی لازوال و بے مثال ہیں۔ اس صورتحال میں شعرا کا اس واقعہ سے لاتعلق رہنا ممکن نہیں تھا۔ شعرا نے دل کھول کر افواج پاکستان اور پاکستانی عوام کو داد شجاعت دی اور اپنی شاعری کے ذریعے اس

سترہ روزہ جنگ کو امر کر دیا۔ جنگ ستمبر کی جنگ نے منظر کشی، عسکری اوزاروں اور جذبہ حب الوطنی کے اظہار کے لیے اردو کو نئی لغت سے آشنا کیا۔ شعرا نے اپنی نظموں میں بھارتی افواج کی جارحیت کی مذمت کی اور پاکستانی افواج کی بہادری اور شجاعت کی خوب داد دی۔ جمیل الدین عالی کا یہ ملّی نغمہ جب ملکہ ترنم نور جہاں نے گایا تو اس سے پاکستانی عوام اور افواج کے خون میں بجلیاں بھر گئیں۔

اے وطن کے سجیلے جوانو!
میرے نغمے تمہارے لیے ہیں
سرفروشی ہے ایماں تمھارا
جرأتوں کے پرستار ہو تم
جو حفاظت کرے سرحدوں کی
وہ فلک بوس دیوار ہو تم
اے شجاعت کے زندہ نشانو
میرے نغمے تمہارے لیے ہیں

(میرے نغمے تمہارے لیے ہیں، جیوے جیوے پاکستان)

جنگیں عموماً جغرافیائی حدود کی پاسبانی اور قومی نظریے کی حفاظت کے لیے لڑی جاتی ہیں لیکن یہ جنگ جغرافیائی حدود کی پاسبانی کے ساتھ اسلامی نظریے اور ریاست کی حفاظت کی جنگ تھی۔ دوسرے لفظوں میں اسلام اور کفر کا مقابلہ تھا اس لیے جنگ ستمبر نے پاکستانی قوم کو متحد ہو کر اپنی طاقت کا اندازہ لگانے کا موقع فراہم کیا۔ یوسف قمر نے اپنے ملّی نغمے ”سرحد پاک پہ ناپاک قدم کس کے اٹھے“ میں ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا ہے:

یہ نگاہ کس کی ہے جو سوئے حرم اٹھی ہے؟
حق پرستوں کے تقابل کی کسے سوجھی ہے؟
کس نے شیروں سے الجھنے کی جسارت کی ہے؟
کس نے خود مرگِ مفاجات کو دعوت دی ہے؟
سرحد پاک پہ ناپاک قدم کس کے اٹھے؟
اتنے گستاخ و بے باک قدم کس کے اٹھے؟

(سرحد پاک پہ ناپاک قدم کس کے اٹھے، جنگ ترنگ)

جنگ ستمبر نے پاکستانی قوم میں سیاسی و سماجی مسائل کی بنا پر پیدا ہونے والی بد نظمی کو ملّی یکجہتی میں بدل دیا اور جذبہ حب الوطنی تمام ناچاقیوں پر غالب آ گیا۔ وطن جغرافیائی حد بندی سے نکل کر نظریہ بن گیا اور پھر تاریخ اور سلامتی کی آرزو نے ہر پاکستانی کو بھارت کی جارحیت کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا کر کھڑا کر دیا۔ اس جنگ کے دوران لکھی گئی نظمیں اسی جذبہ حب الوطنی کی ترجمان ہیں۔ پوری قوم کے جذبات کی ایک ہی سمت ہے۔ حفیظ جالندھری اپنی نظم میں کچھ ایسے ہی جذبات کا اظہار کرتے ہیں:

پاکستان کی عزت ہیں جو لڑنے مرنے جاتے ہیں
ہنس کر جانیں دیتے ہیں ہم سب کی جان بچاتے ہیں
پاکستان کی عزت ہیں جو فتح کے نغمے گاتے ہیں
قوم کو جوش دلاتے ہیں، اسلام کی شان بڑھاتے ہیں
پاکستان کی عزت ہیں جو طوفان پر یلغار کریں
ملاحوں کا ہاتھ بٹائیں قوم کا بیڑا پار کریں

(پاکستان کی عزت، جنگ ترنگ)

پاکستان سے محبت ہر پاکستانی کے خون میں شامل ہے کیونکہ پاکستانی عوام کی اکثریت مسلمان ہونے کی وجہ سے وطن سے محبت کو جزو ایمان سمجھتی ہے۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے بھی اپنے وطن سے محبت کا اظہار کیا۔ ہجرت مدینہ کے وقت آپ انتہائی دکھ کی کیفیت میں سرزمین مکہ سے روانہ ہوئے تھے لیکن ہجرت کا حکم خدا کی طرف سے تھا اور اسلام میں وطن سے زیادہ خدا کے احکامات کی تعمیل کا حکم ہے لیکن اس کے باوجود انسان جس سرزمین پر آنکھ کھولتا ہے، جس مٹی میں کھیلتا ہے، جن ہواؤں میں سانس لیتا ہے اور جن فضاؤں سے سکون حاصل کرتا ہے، اس سے محبت فطری عمل ہے اور اسلام نے بھی ایسی محبت سے منع نہیں فرمایا بلکہ اسلامی مملکت کی حفاظت کرنے والے کے لیے بہت بڑے رتبہ کا اعلان کیا گیا ہے۔ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے اور اس کی محبت و حفاظت مسلمانوں کے ایمان کا حصہ ہے۔ پاکستان دنیا کی ایک اسلامی نظریاتی ریاست ہے جو ریاستِ مدینہ کی طرز پر ایک نظریہ کی بنیاد پر وجود میں آئی۔ یہ نظریہ کوئی معمولی نہیں بلکہ اس میں مکمل نظامِ حیات ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو عطا کیا گیا ہے۔ اس ملکِ اسلام پاکستان کی حفاظت میں ایک پاکستانی مجاہد کی دشمن کو للکار احمد ندیم قاسمی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

آخری بار اندھیرے کے پجاری سن لیں
میں سحر ہوں، میں اُجالا ہوں، حقیقت ہوں میں

میں محبت کا تو دیتا ہوں محبت سے جواب
لیکن اعدا کے لیے قہر و قیامت ہوں میں
میرا دشمن مجھے للکار کے جائے گا کہاں
خاک کا طیش ہوں، افلاک کی دہشت ہوں میں (٦۔ ستمبر، محیط)

احمد ندیم قاسمی جن کی تخلیقات میں وطن کی مٹی سے وابستگی انتہائی شدت کے ساتھ پائی جاتی ہے یہ تمام وابستگی اپنے وطن سے محبت میں جڑی ہوئی ہے۔۔ ان کے نزدیک محبت انسانیت کا نغمہ اول ہے۔ انسان ازل سے ہی محبت کے راز جاننے کا تمنائی ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے جنگ ستمبر سے قبل ہی جنگ کا ادراک کر لیا تھا کیونکہ تقسیم کے وقت جنگ کے لیے زمین ہموار کر دی گئی تھی۔ وہ ایک وقت میں شاعر، افسانہ نگار اور صحافی بھی تھے۔ ان کی صحافیانہ زندگی ان کی کامیاب قلم کاری اور روشن ضمیری کی علامت ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے معاشرے کے پسے ہوئے طبقات کی نمائندگی بھی کی۔ پروفیسر فتح محمد ملک ان کی حب الوطنی کے بارے میں رقم طراز ہیں "ندیم کا کوئی بھی قاری اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکے گا کہ ندیم کی خالص عشقیہ شاعری میں بھی سوز وطن ایک زیریں رو کی طرح جاری و ساری ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پاکستان کی بقاء و خوشحالی اور آزادی و خود مختاری ندیم کی ذاتی بقا اور اپنے جذباتی استحکام ہی کا دوسرا نام ہے۔" (٣٢) احمد ندیم قاسمی کی شاعری حق و باطل کی جنگ ہے جس میں انھوں نے ظالم اور مظلوم کی باہمی کشمکش کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے ملکی مسائل اور اس کے نتیجے میں پیش آنے والے حالات کو موضوعِ سخن بنا کر اپنے عہد کے واقعات کو منظوم صورت میں تاریخ کا حصہ بنانے کی کاوش کی ہے۔

احسان دانش جو شاعرِ مزدور کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی نظموں میں وطن کی مٹی سے محبت کا جذبہ اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ وہ اپنی نظموں سے وطن کے ہر پیر و جواں کو ملک کی محبت میں اپنا خون دینے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ جب دونوں فوجیں برسرِ پیکار تھیں اور فضاء میں ہر طرف بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف توپوں کے گولوں کی آوازیں گونج رہی تھیں، اس سنگین صورتِ حال میں پاک فوج کی ثابت کی قدمی نے دشمن کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا کیونکہ پاکستانی فوج بھاگنے والی نہیں تھی بلکہ اس کا ہر نوجوان ناموسِ وطن پر مٹنے کو تیار ہے۔ احسان دانش افواجِ پاکستان کے اس بلند عزم کو دیکھ کر فرماتے ہیں:

وطن کی آبرو تم ہو وطن کے پاسباں تم ہو
تمھارا ملک ہے یہ ضامن، امن و اماں تم ہو

یہ مقصد ہے کہ اس دنیا میں حق کا بول بالا ہو
خدا کہتا ہے مقصودِ زمین و آسماں تم ہو
تمہارے عزم و استقلال کے چرچے ہیں عالم میں
زمیں والوں کی جانب سے جوابِ آسماں تم ہو

(افواجِ پاکستان کے نام، جنگ ترنگ)

دشمن نے پاکستان سے جنگ کیا چھیڑی کہ ہر پاکستانی شاعر کے قلم سے خوبصورت ملّی نغمے تخلیق ہونے لگے تھے۔ اس جنگ کے دوران ملّی نغموں کی تخلیق میں اتنی بڑی تعداد میں شعرا نے حصہ لیا کہ ایسا لگنے لگا جیسے پوری قوم ذوقِ سخن رکھتی ہے۔ شعرا میں جب حب الوطنی کا جذبہ جوش سے بلندیوں کو چھو رہا تھا ایسے میں مجید امجد کی شاعری جذبہ حب الوطنی سے عام شہری کے جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ مجید امجد جو جدید نظم کے معماروں میں شامل ہیں اور ان کی شاعری اپنی مٹی اور نظریے سے وابستہ ہے۔ انھوں نے جنگ ستمبر کے دوران گہرائی اور گیرائی سے حالات کا مشاہدہ کیا اور فکر و احساس کی بھٹی میں پکا کر اسے شعری اظہار کے سانچے میں ڈھالا۔

اگر اس مقدس سرزمیں پہ میرا خوں نہ بہتا
اگر دشمنوں کے گرانڈیل ٹینکوں کے نیچے
میری کڑکڑاتی ہوئی ہڈیاں
خندقوں میں نہ ہوتیں تو دوزخ کے شعلے تمہارے معطر گھروندے کی دہلیز پر تھے
تمہارے ہر اک بیش قیمت اثاثے کی قیمت
اس سرخ مٹی سے ہے
جس میں میرا لہو رچ گیا ہے (سپاہی، امروز)

شاعر انقلاب حبیب جالب، جن کی شاعری میں حریت پسند رجحانات کا جذبہ غالب ہے۔ انھوں نے اپنی نوجوانی کے دور میں ہجرت کے مناظر دیکھے تھے۔ ہوشیار پور، مشرقی پنجاب میں پیدا ہونے والا یہ شاعر امن و سکون کی تلاش میں پاکستان آیا تھا اور پھر جب بھارت نے ان کے خوابوں کی دنیا یعنی پاکستان پر حملہ کیا تو ان کے جذبات بھڑک اٹھے۔ ہجرت کے دکھوں سے چُور اس شاعر نے اپنے نئے مسکن پاکستان سے اپنے فطری لگاؤ اور عقیدت کو انتہائی عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ حبیب جالب کا ایک ایک لفظ وطن سے محبت کا ترجمان ہے۔ وہ شاعر جس نے نئے وطن کے لیے اپنا علاقہ، اپنی سرزمین چھوڑی اور نئے وطن کی سرزمین کو اپنا مسکن بنایا تھا، اس وطن پر اپنا تن من دھن وار دیا تھا۔ جب نئے ملک میں ترقی اور امن کی خواہش لے کر آنے والے شاعر کے وطنِ

عزیز پر دشمن حملہ آور ہوا تو ان کا خون خول اٹھا کیونکہ اس صورتحال میں ان کے جذبات کا الاؤ کا بھڑکنا حب الوطنی کا ترجمان تھا۔

صہبا اختر ان شعرا میں شامل ہیں جن کی رگوں میں پاکستان اور پاک وطن کی مٹی کی مہک سمندر کے گہرے پانیوں سے زیادہ گہری اور خلا سے زیادہ وسعت سے لبریز ہے۔ "صبح آزادی" اور "میں بھی پاکستان ہوں، تو بھی پاکستان ہے" جیسے شاہکار ملّی نغمے ترنم اور آہنگ سے ملحوظ، جذبات کی کھنکار لیے ہوئے ہوئے ہیں۔ صہبا اختر کی نظم "میں بھی پاکستان ہوں، تو بھی پاکستان ہے" کے بارے قرۃ العین طاہرہ لکھتی ہیں "منصور نے عشق حقیقی میں جذب ہو کر انا الحق کا نعرہ بلند کیا اور مولویوں، مفتیوں کی نظر میں گردن زدنی ٹھہرا کہ ان کی نگاہ گہرائی و گیرائی تک رسائی نہیں رکھتی۔ صہبا حبِّ وطن میں یوں غرق ہوئے کہ میں بھی پاکستانی ہوں کے بجائے میں بھی پاکستان ہوں کا نعرہ لگایا"(۳۳) صہبا اختر نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے حوالے سے ایک شہید کی بیوہ کی اپنے بچے کو سنائی جانے والی "لوری" ان کا شاہکار ملّی نغمہ ہے۔ وہ شہید کی ایسی بیوہ کے جذبات کو بیان کرتے ہیں جس کے ہاتھوں کی مہندی کا رنگ بھی ابھی نہیں اترا۔ وہ اپنے شیر خوار بچے کو لوری سناتی ہے جس کا باپ اس کی پیدائش سے پہلے ہی شہید ہو چکا ہے۔ لوری دراصل ان مترنم اور مدھ بھرے بولوں کو کہا جاتا ہے جو ایک ماں شیر خوار بچے کو سلانے کے لیے اس کو اپنی آغوش میں لے کر طمانیت اور تشکر سے ادا کرتی ہے کہ بچہ دھیرے دھیرے نیند کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ لیکن صہبا اختر کی "لوری" نیندیں دلانے والی نہیں بلکہ نیندیں اُڑانے والی ہے۔ ایسی لوریاں ہی مستقبل کے شہیدوں کو پروان چڑھاتی ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دن جب ہر محاذ جنگ دشمن کے ٹینکوں کا مدفن بنا۔ جذبہ شوق شہادت اس قدر شدید تھا کہ پاک فوج کا ہر جوان ہی جام شہادت نوش کرنے کا تمنائی تھا۔

میری آنکھوں کی روشنی مت سو
میرے خوابوں کی زندگی مت سو
چاند تاروں کی طرح تو بھی جاگ
میرے زخموں کی طرح تو بھی جاگ
میری لوری کے رس میں نیند کہاں
میری پلکوں پر آنسوؤں کا دھواں
میرے معصوم، میرے ننھے شیر
ہے تیرے جسم میں بھی خونِ دلیر

یاد رکھنے ہیں سب ستم تجھ کو

ماں کی ناموس کی قسم تجھ کو (لوری، جاگ رہا ہے پاکستان)

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء نے پاکستان کی تاریخ کو ایک نئے جوش اور جذبے کو جنم دیا۔ اس دن ہر پاکستانی نے انفرادی طور پر اور پوری پاکستانی قوم نے بحیثیت مجموعی خود نگری، خود شناسی اور خود اعتمادی کے نئے دور کا آغاز کیا۔ یہ جنگ ہر شعبہ زندگی میں لڑی گئی۔ زہرہ نگار اور ثریا مقصود جنگ ستمبر کے حوالے سے کی گئی شاعری کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"سترہ دن کی مختصر جنگ پاکستانیوں کی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے۔ اس جنگ سے پہلے عمومی جدوجہد کے باوجود لوگوں کی طبیعتوں میں ایک قسم کا ٹھہراؤ نظر آتا تھا۔ پانی کی شفاف سطح پر یہ اطمینان اور ٹھہراؤ برف کی ہلکی سی چادر کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ گرم ہوا کا تھپیڑا لگتے ہی چٹخا، پگھلا اور پگھل کر عزم و استقلال وجہد و کامرانی کے سمندر کی بیکراں موج بن گیا۔ سمندر کی ان موجوں میں نالہ و شیون اور شور و غوغا ہی نہیں ہے، ان ڈوبتی ابھرتی موجوں کے زیر و بم میں فن کاروں کی خوبصورت آوازیں بھی ہیں۔ شاعروں کے جوش اور عقیدت مندانہ جذبوں سے امنڈتے ہوئے رسیلے گیت ہیں، رجز ہیں، ترانے ہیں۔" (۳۴)

جنگ ستمبر نے پاکستانی عوام کے جذبات کو بیدار کیا اور وہ دشمن کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے۔ دنیا نے یہ بھی دیکھا کہ ٹینکوں اور توپوں کے مقابلے میں عوام ڈنڈے لے لے کر محاذ جنگ کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ عوام الناس نے محاذوں پر جا کر اپنی خدمات پیش کیں لیکن عساکرِ پاکستان انھیں مطمئن کرتے رہے کہ ہم محاذ پر لڑنے کے لیے کافی ہیں۔ عوام الناس نے اپنا سب کچھ افواج پاکستان کی نذر کر دیا۔ خواتین نے اپنے زیورات ملک کی امن و سلامتی پر وار دیئے۔ لوگوں نے اپنی عمر بھر کی جمع پونجی وطن کی راہ میں نثار کر دی۔ عوام الناس کے اس جذبے نے عساکرِ پاکستان کو عظیم جوش و جذبے سے ہم کنار کر دیا۔ یہی جوش و جذبہ شاعروں اور ادیبوں کی تحریروں میں بھی نظر آتا ہے۔ سید وقار عظیم ستمبر ۱۹۶۵ء کی شاعری کے بارے لکھتے ہیں:

"زندگی کے اس مختصر لیکن بے حد اہم دور میں ہمارے شاعروں نے جو سینکڑوں گیت اور ترانے لکھے اور صدہا غزلیں اور نظمیں کہیں، وہ ہمارے شاعروں کی طرف سے محبت اور احسان مندی کا نذرانہ ہے۔ اس سرزمین کی خدمت میں جو اس مقدس سرزمین کی بقا کے ضامن اور اس کے نگران و پاسبان ہیں اور ان اہل وطن کی خدمت میں جنھوں

نے آزمائش کی ایک سخت اور سنگین گھڑی میں اپنی ذات کو قوم کی ذات میں جذب کر کے صرف کیا جس کی وطن کو ضرورت تھی۔"(۳۵)

ستمبر ۱۹۶۵ء کا مہینہ اس حوالے سے منفرد ہے کہ یہ دن، یہ تاریخ اور یہ مہینہ پاکستانی ادب کی پہچان بن گیا۔ اگر جنگ ستمبر کو اردو ادب کا الگ عنوان دیا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ شاعروں نے پاک و بھارت جنگ کی اہمیت اور عساکرِ پاکستان کی کارکردگی کے حوالے سے نظمیں لکھیں۔ جنگ ستمبر نے ہر پاکستانی کے لہو کو گرمایا، ہر پاکستانی پر جنگ کا جوش سوار تھا۔ عوام اپنے بہادر سپاہیوں کا ساتھ دینے کے لیے سرحدوں پر موجود تھے اور سرحدوں پر دشمن کے خلاف لڑنے کے لیے بضد رہے لیکن پاکستانی افواج اپنے عوام کی محافظ تھیں۔ افواج پاکستان نے عوام کے جوش و جذبہ کی لاج رکھ لی اور اپنا تن من دھن داؤ پر لگا کر اپنے پیارے وطن کی حفاظت کی۔ دشمن جو راتوں رات وطن کی سرحد عبور کر کے صبح کا ناشتہ لاہور میں کرنے کا تمنائی تھا، وہ سترہ دن تک سرحد پر لوہے کے چنے چباتا رہا اور آخر بھاری جانی اور مالی نقصان اٹھا کر واپس لوٹنا پڑا۔ عساکرِ پاکستان نے اپنے سے چار گنا زیادہ تعداد والی فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ یہ عوام کا دیا ہوا اعتماد تھا کہ عساکرِ پاکستان نے ہر محاذ پر دشمن کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ مظفر وارثی مجاہدین وطن کے اس جذبے کو ان الفاظ میں بیدار کرتے ہیں:

تو ہے مادرِ وطن کی آبرو
کربلا میں بہہ چکا تیرا لہو
تیرا دین احمدی ، تیرا نام غزنوی
تیری شان بت شکن
جاگ اے مجاہدِ وطن (جاگ اے مجاہدِ وطن، قومی نظمیں)

جنگ ستمبر کے موقع پر عظیم شاعر آغا شورش کاشمیری کے نغمے بھی ریڈیو پاکستان پر گونجتے رہے۔ جنھوں نے اس موضوع پر کئی نظمیں لکھیں۔ یہ نظمیں ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتی رہیں اور رسائل میں بھی چھپتی رہیں۔ شورش کاشمیری کا خلوص اور جوش ان کی رزمیہ شاعری کا خاصہ ہے۔ حکیم احمد شجاع، شورش کاشمیری کے بارے لکھتے ہیں کہ اس نازک اور مشکل دور میں جس سے پاکستان اپنے بہادر اور جنگجو دلیروں کی بے مثال قربانیوں کی بدولت فتح و نصرت کا پرچم لہراتے ہوئے گزرا ہے۔ ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے ان کا دل بڑھانے میں کچھ کم حصہ نہیں لیا۔ لیکن یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ شورش کا اشہبِ قلم اس میدان میں رات دن رواں دواں رہا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شورش نے اس عرصہ میں اپنی زندگی کے شب و روز صرف اسی بات کے لیے وقف کر دیے ہیں کہ بقول ان کے پاکستان کے ہر شہری پر یہ حقیقت عیاں ہو جائے کہ شورش کا سب کچھ اس کے

وطن کا ہے۔(۳۶) شورش کاشمیری ایک شاعر ہی نہیں مستقبل بین ادیب بھی تھے انھوں نے اپنی نظم "دوٹوک فیصلہ "(جو ۱۹ مئی ۱۹۶۵ء کو لکھی گئی) میں جنگ ستمبر کی پیش گوئی ان الفاظ میں کی:

میں کس زباں سے کہوں اس زمیں پر کیا ہو گا
مجھے یقیں ہے یہاں کوئی معرکہ ہو گا
فضا میں نعرہ تکبیر گونجتا ہو گا
سری نگر میں قیامت کا سامنا ہو گا
یہ فیصلہ ہے کہ دوٹوک فیصلہ ہو گا
ہر اک محاذ پر ڈٹ کر مقابلہ ہو گا (دوٹوک فیصلہ، الجہاد والجہاد)

پھر جب ستمبر ۱۹۶۵ء میں دشمن نے پاکستان کی سرحدوں پر حملہ کر دیا تو شورش کاشمیری ایک سالار کے روپ میں سامنے آئے جنھوں نے شعرا کی سپاہ تیار کی۔ شورش کاشمیری کے لفظ لفظ میں وطن سے محبت کا جذبہ چھلکتا ہے۔ "چھ ستمبر" کے عنوان سے شورش کاشمیری کی نظم سے اقتباس ہے:

غلامانِ آلِ نبیؐ زندہ باد
فدایانِ خیر الوریٰ کو سلام
گئے دور کے پیچ و خم الوداع
نئے دور کی ابتدا کو سلام
جلال و جمال سپاہ وطن
اساطیرِ صدق و صفا کو سلام (چھ ستمبر، الجہاد والجہاد)

شورش کاشمیری کی نظموں میں وطن پرستی کا جذبہ بھی شدت سے ابھرتا ہے۔ ان کی نظموں میں فکری جذبات نگاری کی بجائے جذبات کی شدت جھلکتی ہے۔ انھوں نے جذبات کو عوامی رنگ میں پیش کیا۔ وہ اپنی نظم "یلغار کرو یلغار کرو" میں مجاہدین وطن کو وطن کی خاطر ہتھیار اٹھانے اور دشمن پر یلغار کرنے پر ابھارتے ہیں۔ ان کے ہاں جوش و جذبہ بھی ہے اور ترنگ و نغمگی بھی۔ ان کی نظمیں اپنے اندر جنگی ترانوں کی خصوصیات سموئے ہوئے ہیں۔ ان کی نظموں میں یلغار اور للکار دونوں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ان کے خیالات قوتِ ایمانی سے لبریز ہیں اور ان کا فکری بہاؤ سپاہی کو کفن بدوش دیکھنا چاہتا ہے۔ جذبات کا یہ بہاؤ ان کی نظم "گھمسان کی جنگ" میں نمایاں ہے۔

جنگ ستمبر کو شعرا و ادبا نے حق و باطل کے معرکے سے تعبیر کیا اور اسے کفر و شرک کے لیے حدِ فاصل کے نام سے موسوم کیا۔ جنگ ستمبر کا کوئی دن ایسا نہ گزرا ہو گا جس دن شعرا نے اپنے جذبات کو الفاظ میں نہ ڈھالا ہو اور اپنے مجاہدین کی خدمت میں پیش نہ کیا ہو۔ اس جنگ نے وطن اور اہل وطن کے روابط کو ایک نئی جہت سے روشناس کروایا۔ زہرا نگار اور ثریا مقصود "جنگ ترنگ" کے دیباچے میں لکھتی ہیں "جنگ کے زمانے میں لگ بھگ دو ہزار نظمیں صرف اردو میں لکھی گئیں تھیں۔ جن میں سے اکثر نہایت مقبول ہوئی تھیں اور اب تک زبانِ زد عام ہیں۔"(۳۷) اسی کتاب کے دیباچے میں ایک اور جگہ لکھتی ہیں۔

> "یہ واقعہ ہے کہ کسی دور میں وقتی جذبے کے تحت لکھی جانے والی چیزوں میں اس قدر قیمتی اضافہ ہوا ہی نہیں جتنا کہ اس سترہ دن کی جنگ میں ہوا ہے۔ فن کاروں نے ایسی چیزیں لکھی ہیں جو فن کے اعلیٰ ترین معیار تک پہنچی ہیں، کہیں کہیں تو نظموں میں تاثر اتنا گہرا اور پائیدار ہے کہ ماہ و سال کی گردشیں اس جاذبیت اور تاثر کو کم نہ کر سکیں گی۔ یہ نگارشات بحیثیتِ فن اور معانی ہمارے اعلیٰ ادب کے سر کا تاج اور ہماری سیاست کا صرف آخر ہیں۔" (۳۸)

ناصر کاظمی جو سوز و گداز کے ساتھ ساتھ ترنم و آہنگ کے شاعر بھی ہیں اور ان کا کلام اپنے اندر درد انگیز سحر لیے ہوئے ہے، وہ شاعری میں چھوٹی بحور کے لحاظ سے مثلِ میر ہیں۔ ان کی شعر گوئی میں آہنگ اور ترنم گیتوں کے قریب ہے۔ ان کا مِلّی نغمہ "ہمارے پاک وطن کی شان" جو ۱۹۶۵ء کی جنگ کا حصہ بنا تھا اور اس کی گائیکی کا فریضہ سلیم رضا، منیر حسین اور ان کے ساتھیوں نے ادا کیا جبکہ اس کے موسیقار کالے خان تھے، خوبصورت بول اور ادائیگی سے مجاہدینِ وطن کی خوبیوں کو انتہائی خوبصورتی سے بیان کر کے ان کے جذبہ حریت میں گراں قدر اضافہ کرتا ہے:

ہمارے پاک وطن کی شان
ہمارے شیر دلیر جوان
خدا کی رحمت ان کے ساتھ
خدا کا ہاتھ ہے ان کا ہاتھ
ہے ان کے دم سے پاکستان
ہمارے شیر دلیر جوان

ستارے جرأت ہمت کے
وطن کی عظمت شوکت کے

عدو کی غارت کا سامان
ہمارے شیر دلیر جوان (ہمارے پاک وطن کی شان،نشاطِ خواب)

عساکر پاکستان نے بحیثیت مجموعی ۱۹۶۵ء کی جنگ میں دشمن پر نفسیاتی اور جذباتی فتح حاصل کی۔ اس فتح میں افواجِ پاکستان کے تینوں بنیادی لشکروں پاکستان بحریہ، پاکستان فضائیہ اور زمینی فوج نے انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنا کردار ادا کیا۔ شعرا نے جہاں عساکرِ پاکستان کو بحیثیت مجموعی خراج عقیدت پیش کیا وہیں تینوں افواج کو انفرادی سطح پر بھی خراج تحسین پیش کر کے ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اگر صوفی غلام مصطفی تبسم کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ موضوع ادھورا سمجھا جائے گا۔ دوران جنگ انھوں نے اردو اور پنجابی میں ہنگامی حالت میں ملّی نغمے لکھے تھے لیکن وہ نغمے پاکستان کی تاریخ میں ثبت ہو چکے ہیں۔ ان نغموں کو جب ملکہ ترنم نور جہاں نے اپنی خوشگوار اور فلمی آواز میں گایا تو نہ صرف فوج بلکہ پوری پاکستانی قوم عشق وطن میں جھوم اٹھی اور ہر اہل شعور چاہ رہا تھا کہ وہ آگے بڑھ کر میدان میں دشمنوں سے مقابلہ کرے اور اس ملک وملت کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کرے۔ صوفی تبسم کی پوری زندگی کی ادبی خدمات کو الگ کر کے صرف ستمبر کی جنگ کے نغموں پر ہی انحصار کیا جائے تو ان کی پہچان کے لیے کافی ہو گا کیونکہ ان کے سدا بہار نغموں نے انھیں کو حیاتِ جاوداں بخش دی ہے۔ بقول صوفی گلزار احمد ”صوفی صاحب مرحوم نے ان جنگی ترانوں کو لکھ کر ایک مجاہدانہ کردار ادا کیا ہے جو اُن کی حب الوطنی کا بیّن ثبوت ہے“(۳۹) یہ جنگی ترانے ضرب المثل کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ اقتباس ہے:

اِیہہ پُتر ہٹاں تے نئیں وِکدے
کِیہ لبھ نی ایں وِچ بزار کُڑے
ایہہ دَین ہے میرے داتا دی
نہ اینویں ٹکراں مار کُڑے
کیہ لبھ نی ایں وچ بزار کڑے

(ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے، سو بار چمن مہکا)

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو جب بھارت نے پاکستان کی سرحدوں پر حملہ کیا تو سب سے پہلے ہماری زمینی فوج کے غازیان میدان میں اترے اور بھارتی فوج کو پاکستان کی سرحد پر روک کر خود سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے۔ پاکستان

کی زمینی فوج نے دشمن کو ایسا دندان شکن جواب دیا کہ دشمن ساری حسرتیں اپنے دل میں لیے رہ گیا۔ پاکستان کی زمینی افواج کو محمود شام نے اپنے "ترانہ" میں یوں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

تمہاری جب نظر اٹھے تو فاصلے سمٹ پڑیں
تمھارا جب قدم اٹھے تو وادیاں لرز اٹھیں
تمہارے ولولوں کا ذکر اب نگر نگر میں ہے
وطن کو تم پہ فخر ہے وطن کی تم ہی شان ہو
وفن کی آبرو ہو تم وطن کی تم ہی آن ہو

(ترانہ، جنگ ترنگ)

پاکستان کی زمینی فوج جنگلوں، دریاؤں، پہاڑوں اور وادیوں میں دشمن سے نبرد آزما رہتی ہے۔ اس نے وطن کے چپے چپے کی حفاظت کرتے ہوئے سرزمینِ پاکستان کو اپنے خون سے سینچا ہے۔ جنگ کے دوران پیدل دستوں کا حوصلہ بڑھانے کا سلسلہ زمانہ قبل از اسلام سے جنگ کا اہم جزو رہا ہے۔ عرب و عجم کے لوگ جنگ کے موقع پر رجزیہ اشعار سے خون گرماتے تھے۔ خود نبی پاک ﷺ نے بھی غزوات کے موقع پر رجزیہ اشعار کی حوصلہ افزائی فرمائی اور ان کے ذریعے مجاہدین اسلام کا خون گرمایا۔ جنگ ستمبر میں بھی شعرا نے رجزیہ اشعار پیش کیے۔ نسیم امروہی نے "ملت پاک کے رجز" کے عنوان سے مسلمانوں کے شاندار ماضی کو مسلمانوں کے حال سے مربوط کر کے پیش کیا ہے۔ یہ نظم مجاہدین وطن کو غزوہ بدر اور غزوہ خیبر کی یاد دلا کر ہمت و حوصلہ عطا کرتی ہے اور اس بات کو بھی باور کرواتی ہے کہ مسلمان اپنے شاندار ماضی کے امین ہیں:

جانتے ہیں یہ ہمیشہ سے زمانے والے
ہم ہیں قلت میں بھی کثرت کو دبانے والے
سر سے میداں میں کفن باندھ کے آنے والے
پڑھ کے چولیں درِ خیبر کی ہلانے والے
ہم نے قرآن پڑھا جھوم کے بت خانوں میں
ہم نے تکبیر کہی ڈوب کے طوفانوں میں

(ملت پاک کا رجز، جنگ ترنگ)

جنگ کے دوسرے روز یعنی ۷ ستمبر ۱۹۶۵ء کو پاکستان فضائیہ بھی اس جنگ کا حصہ بن گئی۔ پاک فضائیہ کے جانبازوں نے جنگ ستمبر میں ایسے کارنامے سرانجام دیے جن کا جواب آج تک دنیا نہیں دے سکی۔ محمد محمود

عالم المعروف ایم ایم عالم نے انتہائی قلیل وقت میں دشمن کے طیارے گرانے کا جو عالمی ریکارڈ قائم کیا وہ آج تک نہیں توڑا جا سکا اور نہ مستقبل میں اس کی کوئی امید نظر آتی ہے۔ پاکستانی ہوا باز سرفراز رفیقی نے اپنے طیارے کی توپیں جام ہونے کے باوجود دشمن کا پورا ہوائی اڈہ تباہ کر دیا۔ دشمن بھی اس عظیم ہوا باز کی جرأت پر حیران رہ گیا۔ پاکستانی فضائیہ کے ہوا بازوں نے فضاؤں کی بلندی میں جس طرح دشمن کا مقابلہ کیا اور دشمن کے فضائیہ پر ایسی کاری ضربیں لگائیں کہ خود دشمن بھی دنگ رہ گیا۔ پاک فضائیہ جدید ہتھیاروں کی کمی کے باوجود اس کے ہوا بازوں کا جوش و جذبہ ہر چیز پر بھاری رہا اور انھوں نے ہمت و حوصلے سے ناقابلِ فراموش کارنامے سرانجام دیے۔
بزم انصاری "اے پاک ہوا باز" میں پاکستانی ہوا بازوں کے بارے میں کہتے ہیں:

اے پاک ہوا باز اے پیکرِ اعجاز
ہمت پہ تری اہل وطن کو ہے بڑا ناز
اے پاک ہوا باز اے پیکر اعجاز
دشمن کو کیا ڈھیر تری ضربِ گراں نے
باطل کو کیا زیر ترے عزم جواں نے
تاریخ میں زندہ ترا اقدام رہے گا
دنیائے شجاعت میں ترا نام رہے گا
اے پاک ہوا باز اے پیکرِ اعجاز

(اے پاک ہوا باز، جنگ ترنگ)

پاکستان فضائیہ کے ساتھ پاکستان کی بحری افواج نے بھی پاکستان کی سمندری سطح کا خوب ڈٹ کر دفاع کیا۔ پاکستانی بحریہ کا ولولہ سمندر کی موجوں سے زیادہ طاقتور تھا جس نے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ چونکہ پاکستان کی سمندری حدود کئی ممالک تک پھیلی ہوئی ہے اور اس کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ قیام پاکستان سے لے کر آج تک پاکستان بحریہ نے پاکستان کی سمندری حدود کی حفاظت احسن طریقے سے کر رہی ہے اور ہر محاذ پر دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔ جلیل قدوائی نے اپنی نظم "پاکستان بحریہ" میں پاکستانی بحری افواج کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

ہے پاک بحریہ کی بھی شان جلال کیا
دیکھے جو اس کی سمت عدو کی مجال کیا
سینہ سپر ہے حق کے لیے اس کا ہر جواں
لایا ہے رخ پہ جوشِ شجاعت جمال کیا

پہنچا کے زیرِ آب عدو کے جہاز کو

ملت کا اپنی نام دیا ہے اچھال کیا (پاکستانی بحریہ، جنگ ترنگ)

خطۂ پاک کے ساحلوں کے محافظ و نگہبان ہر دم تیار رہتے ہیں اور نعرہ تکبیر سے دشمن کے اوسان خطا کرنا خوب جانتے ہیں۔ سمندروں کے راہی طوفانوں سے لڑنے کی مکمل اہلیت رکھتے ہیں۔

پاکستان بری فوج کے جاں نثار سپاہی جورات دن اپنی سرحدوں پر سربکف رہتے ہیں جن کا ہر لمحہ وطن کی حفاظت کے لیے وقف ہے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ان کی لازوال قربانیاں آج تک شعرا کا موضوع سخن بنی ہوئی ہیں۔ جوش ملیؔح آبادی جو شاعر انقلاب کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ان کا بلند آہنگ اور منفرد لہجہ ان کی پہچان ہے۔ ان کا لہجہ جرأت آمیز ہے۔ جوش نے ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کو حق و باطل کا معرکہ قرار دیا۔ ان کے لہجے کی شدید کاٹ ان کی نظم "وارثانِ حیدر خیبر شکن" میں صاف سنائی دیتی ہے جو عساکرِ پاکستان سے ان کی جذباتی وابستگی کا خلاصہ ہے۔

ماہر القادری جو مذہبی مبلغ، ثنائے ربی اور نعت خوانی میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ وہ بھی جنگ ستمبر کو حق و باطل کا معرکہ قرار دیتے ہیں۔ درحقیقت پاکستان اسلام کا قلعہ ہے اور پاکستان کی سلامتی عالم اسلام کی سلامتی تصور کی جاتی ہے۔ پاکستان کے شعرا اور ادبا کو اپنے اس وطن سے گہری جذباتی وابستگی ہے۔ یہ وابستگی وطن کی مٹی سے محبت کا اظہار بھی ہے اور دین اسلام کی سربلندی کی غماز بھی۔ ماہر القادری کی نظم "شہیدوں کے لہو سے" رجزیہ نظم ہے۔ یہ نظم مجاہدوں کو ترغیب دلاتی ہے کہ وہ اپنا تن من دھن وطن کی حفاظت پر قربان کر دیں:

شہیدوں کے لہو سے جو زمیں سیراب ہوتی ہے

بڑی زرخیز ہوتی ہے بہت شاداب ہوتی ہے

جدھر سے غازیانِ ملتِ بیضا گزرتے ہیں

وہاں کی کنکری بھی گوہر خوش آب ہوتی ہے (شہیدوں کے لہو سے، جنگ ترنگ)

امن پسندی پاکستانی قوم کی کمزوری نہیں ہے کیونکہ جبر کے سامنے صبر جائز نہیں۔ شکیب جلالی اردو ادب کا توانا لہجہ اور منفرد شاعر ہیں۔ وہ انتہائی حساس شاعر ہیں، ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کا ردعمل ان کے ہاں بھی اپنی آب و تاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ "غازی کا ترانہ" شکیب جلالی کے بلند لہجے کی نظم ہے جس میں انھوں نے شب خون مارنے والے دشمن کو مخاطب کر کے جارحیت کا جواب ہمت و حوصلہ سے دینے کا عزم ظاہر کیا ہے۔

حمایت علی شاعر کی نظم "لہو" میں اسلاف کے اوصاف کی بازگشت اور حب الوطنی کے بے پایاں سمندر کے آگے دشمن کو خس وخاشاک کی طرح بہالے جانے والی موت کا پیغام ہے۔ دونوں ملکوں کی باہمی کشمکش، وطن کی حرمت پر کٹ مرنے کا حوصلہ وغیرت وطاقت کا اظہار اس نظم میں شدت سے موجود ہے۔

جہاں پہ کر دیں یہ آشکارا
ہمیں غلامی نہیں گوارا
کوئی ادھر بھول کر نہ آئے
یہ دیس ہم کو ہے سب سے پیارا
یہ خاک وردی ہے ہر جری کی
یہ خونِ پرچم ہے اب ہمارا (لہو، جاگ رہا ہے پاکستان)

۱۹۶۵ء کی جنگ میں بھارت نے دس مختلف محاذوں پر بیک وقت حملہ کر کے پاکستان کی شہری آبادیوں کو نشانہ بنایا۔ لاہور، سیالکوٹ، سرگودھا، رن کچھ، کھیم کرن وغیرہ بیک وقت جنگ کی زد میں تھے۔ پاکستان کے غیور عوام اور بہادر افواج نے اپنے ملک کے چپہ چپہ کا دفاع کیا اور ہر شہر کی عوام نے اپنی بساط کے مطابق مقابلہ کیا تو شعرا نے نہ صرف افواج پاکستان بلکہ پاکستان کے ان جنگ زدہ شہروں کی شان میں بھی شاعری کی۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ سے متعلقہ شاعری میں پاکستان کے جنگ سے متاثرہ شہروں کے حوالے سے شاعری کا ایک کثیر سرمایہ موجود ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان کے شہر لاہور جو دشمن کے نشانے پر سب سے سرفہرست تھا اور جس پر قبضہ کرنا دشمن کا سب سے بڑا خواب تھا، یہ شہر لاہور پاکستانی تاریخ کا امین اور تہذیب و تمدن کا مرکز ہے۔ سرزمینِ لاہور میں سب سے نمایاں نام علی بخش ہجویری حضرت داتا گنج بخشؒ کا ہے جن کے حسنِ اخلاق اور کردار سے خطۂ لاہور اسلام کی روشنی سے منور ہوا۔ اس لحاظ سے حضرت داتا گنج بخش کا لاہور میں دفن ہونا خود لاہور کے لیے ایک بڑا اعزاز ہے۔ قیوم نظر نے اپنی نظم "داتا کی نگری" میں لاہور کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

لاہور زندہ دلوں کا شہر تو ہے ہی لیکن جنگ ستمبر نے عساکرِ پاکستان کے ساتھ پاکستانی عوام اور خاص کر شہر لاہور والوں میں وہ جوش و جذبہ پیدا کر دیا کہ ہر شہری نے بھارتی جارحیت پر بھرپور رد عمل ظاہر کیا۔ لاہور کے شہری اپنی جانوں کا نذرانہ دینے کے لیے سرحد پر پہنچ گئے۔ پاکستانی عوام عساکرِ پاکستان کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے رہے اور بھارتی جارحیت کا بھرپور جواب دیا۔ قیوم نظر کی نظم "زندہ ہے لاہور" لاہور شہر کے عوام کے جذبات کی عکاسی ہے جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ جنگ صرف جنگ نہ تھی بلکہ معرکہ حق و باطل تھا۔

زندہ ہے لاہور ، پائندہ ہے لاہور

حق گوؤں کا آزادوں کا فرزانوں کا شہر

اپنی آن پہ مٹنے والے دیوانوں کا شہر

انسان کے غم کھانے والے انسانوں کا شہر

زندہ ہے لاہور ، پائندہ ہے لاہور (زندہ ہے لاہور، قلب و نظر کے سلسلے)

جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء میں بھارتی افواج نے لاہور پر شدید حملہ کیا تھا۔ لاہور پر حملہ صرف ایک شہر پر حملہ نہ تھا بلکہ ایک تہذیب پر حملہ تھا کیونکہ لاہور پاکستان کا تہذیبی مرکز تھا اور ہے۔ اس لیے معرکہ لاہور کے حوالے سے بہت سی نظمیں لکھی گئیں اور کچھ نظموں کو فنی لحاظ سے بھی دوام حاصل ہوا۔ اس سے ان ناقدین کی جو جنگی ادب کو صرف ہنگامی ادب تک محدود رکھتے ہیں، ان کے نظریات کی نفی ہوتی ہے کیونکہ اس جنگ میں کہی گئی بہت سی نظمیں آج بھی تازگی برقرار رکھے ہوئے ہیں اور پاکستانی قوم کے تصورات کی صحیح معنوں میں عکاسی کرتی ہیں۔ البتہ جنگ کی ہولناک تباہیوں کے پس منظر میں تخلیق ہونے والے ادب کے بارے اس نظریے کو مکمل ترک کر دینا کہ یہ صرف وقتی اُبال ہوتا ہے، درست نہیں ہے۔

ہمارے شاعروں نے عظمتِ رفتہ کو یاد دلاتے ہوئے اپنے پاسبانوں کی حمیتِ ملّی کو زندہ کیا۔ لاہور ہماری تہذیب و ثقافت کا گہوارہ ہے اور جنگ ستمبر کی فتح صرف جغرافیائی فتح نہیں تھی بلکہ تہذیب و تمدن کی فتح تھی اور عالم اسلام کی فتح تھی کیونکہ لاہور سے پاکستانی عوام کی جذباتی وابستگی مثالی ہے۔ لاہور شہر مسلمانوں کے عظیم الشان ماضی کا امین ہے اور دنیا میں اسلام کی عظمت کی علامت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ لاہور میں بھارت کی خون آشام کاروائیاں اور خوف، دھماکے، کشت و خوں اور بے تابی جنگ کے منظر نامے کا حصہ ہیں۔ انیس ناگی کی یہ نظم لاہور سے جذباتی وابستگی کا اظہار ہے۔ نظم کا عنوان "میرا شہر" ہے۔

کس طرح چھوڑ جائیں تجھے شہر لاہور

جس کی مٹی رگوں میں جمی

جس کی نکہت لہو میں چھپی

جس کے چہرے نظر میں گڑھے ہیں

انھیں چھوڑ جائیں

سلامت رہے شہر لاہور

سلامت رہیں اس کے دیوار و در

جن پہ تہذیب کا پھیلتا عکس ہے
سلامت رہیں اس کے باسی جنھیں دھول سونا ہوا پھول ہے۔

(میرا شہر، جنگ ترنگ)

اس مقدس سرزمین پر دشمن کے ناپاک قدم ناقابلِ برداشت ہیں۔ لاہور مسلمانوں کی تاریخ کی علامت ہے یہی وجہ ہے کہ شعرا کی لاہور کے ساتھ جذباتی وابستگی عروج پر تھی۔ لاہور کی طرح دوسرے شہروں میں بھی شہریوں کا بھرپور ردعمل سامنے آیا اور وہاں بھی عساکرِ پاکستان کے ساتھ پاکستانی عوام بھی شانہ بشانہ ساتھ کھڑے تھے۔ پاکستان پر بھارت کے اچانک حملے کی وجہ سے عوام میں غم و غصہ کے ساتھ جذبہ حب الوطنی تمام جذبات پر غالب آگیا کیونکہ وطن کسی قطعہ زمین کا نام نہیں بلکہ انسان کے جذبات کی علامت ہے۔ پاکستانی عوام اور پاکستانی افواج کو اسی دولت نے ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں کامیابی سے ہم کنار کیا۔

سیالکوٹ شہر جو علامہ اقبال کا آبائی شہر ہے جس میں علامہ اقبال نے جنم لیا اور پاکستان کا خواب دیکھا۔ اس شہر میں علامہ اقبال کا آبائی گھر موجود ہے۔ اس خطے کے جیالے عوام جنھوں نے پاکستان کی بنیاد رکھی، جنگ ستمبر میں باقی لوگوں سے کس طرح پیچھے رہ سکتے تھے۔ سیالکوٹ کے عوام نے بھی بھرپور طریقے سے عساکرِ پاکستان کا ساتھ دیا تو شعرا نے لاہور کی طرح سیالکوٹ کو بھی خوبصورت انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

سیالکوٹ کے عوام نے انتہائی بہادری اور دلیری سے افواج پاکستان کا ساتھ دیا۔ ان کی اس بہادری اور دلیری نے شعرا کو مجبور کیا کہ وہ ان کی ہمت اور حوصلے کی داد دیں۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں سیالکوٹ کو ہلالِ استقلال عطا کیا گیا۔ یہ ہلال استقلال سیالکوٹ کے غیور عوام کی جرأت اور بہادری کا اعتراف ہے۔ حافظ سید محمد اسحاق برق وارثی کی نظم "اہل سیالکوٹ" میں یہی اعتراف ملتا ہے۔

جاں باز و جاں نثار ہیں اہل سیالکوٹ
شہ زور و شہ سوار ہیں اہل سیالکوٹ
یہ ولولہ یہ جوش ، یہ ہمت یہ حوصلہ
قدرت کا شاہکار ہیں اہل سیالکوٹ
یہ سرزمیں پاک ہے اک باغ پر فضا
اس باغ کی بہار ہیں اہل سیالکوٹ (اہلِ سیالکوٹ، جنگ ترنگ)

سیالکوٹ کا شہر کھیلوں کے سامان اور آلات جراحی کی تیاری کے لیے مشہور ہے۔ یہاں بننے والی اشیاء بیرون ملک برآمد کر کے قیمتی زرمبادلہ کمایا جاتا ہے۔ سیالکوٹ پاکستان کی پہچان ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں

سیالکوٹ کے عوام نے بہادری کے جوہر دکھا کر تاریخ میں اپنا نام امر کر لیا۔ سید مہر علی جعفری نے اپنی نظم "سیالکوٹ کی زمیں" میں اہل سیالکوٹ کی جرأت مندی اور حوصلہ مندی کو خوب سراہا ہے۔

سیالکوٹ کی طرح سرگودھا کی سرزمین پر بھی بھارت نے حملہ کیا۔ شاہینوں کا شہر سرگودھا اپنے عوام کی بہادری کا نشان بن گیا۔ سرگودھا کے عوام نے عساکرِ پاکستان کا بھرپور ساتھ دیا۔ سرگودھا کے عوام نے بہادری کی وہ تاریخ رقم کی جو رہتی دنیا تک یاد رکھی جائے گی۔ اثر چوہان نے اپنی نظم "سرگودھا" میں سرگودھا کے جاں نثاروں کو ان الفاظ میں سراہا ہے:

جاں نثاروں کا شہر سرگودھا
دل فگاروں کا شہر سرگودھا
جہد و عزم و خیال کا مرکز
رنگ و حسن و جمال کا مرکز (سرگودھا، اثر چوہان)

سرگودھا میں موجود ہوائی فوج نے بے مثال کارنامے سرانجام دیے۔ سرگودھا کا جنگی ہوائی اڈہ جنگ کے مقاصد کے لیے استعمال ہوا۔ سرگودھا کے شاہینوں نے اپنی ہمت اور بہادری اور شجاعت سے دنیا کو حیران کر دیا۔ سکواڈرن لیڈر ایم ایچ صفدر نے اپنی نظم سرگودھا میں جنگ کے زمانے کے حالات پیش کیے ہیں۔ یہ نظم اپنے اندر اعلیٰ فنی محاسن لیے ہوئے ہے۔ اس نظم میں شاعر کی فکری بلندی اپنے عروج پر ہے۔ شاعر خود اس منظر کا حصہ رہا ہے اس لیے تمام الفاظ حقیقی معلوم ہوتے ہیں:

جہاز آتے رہے اور ہم گراتے رہے
ہر ایک شب کوئی تازہ ستم دکھاتے رہے
ہمارے شیروں سے خود کو مگر بچاتے رہے
سنا کے قصے خیالی ہمیں ہنساتے رہے (سرگودھا، جنگ ترنگ)

چونڈہ کے مقام پر دوسری جنگ عظیم کے بعد ٹینکوں کا سب سے بڑا معرکہ ہوا۔ یہ معرکہ ۱۰ ستمبر ۱۹۶۵ء کو شروع ہوا اور اس مقام پر دشمن کے سینکڑوں ٹینکوں کو نشانہ بنایا گیا جبکہ بیسیوں ٹینک ناکارہ بنا دیے گئے۔ شعرا نے چونڈہ کے محاذ جنگ پر ہونے والے معرکے کو بھی موضوع سخن بنایا۔ اسد حسین ازل نے "اے ارضِ چونڈہ" میں شہدائے چونڈہ ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

جو لوگ ہوئے ہیں ترے ناموس پہ قرباں!
تا حشر نہیں بھولیں گے ہم ان کا یہ احساں!

اے ارضِ چونڈہ

شاعر کا تخیل ہے مؤرخ کا قلم ہے

اک گونجتا نغمہ ، تیرے غازی کا قدم ہے

اے ارضِ چونڈہ (اے ارضِ چونڈہ، جنگ ترنگ)

۱۹۶۵ء کی جنگ سے متعلق شاعری میں جہاں مختلف شہروں اور محاذ جنگ کے بارے میں خراجِ عقیدت ملتا ہے وہیں مختلف شخصیات اور فوجی اعزازات کے بارے میں بھی نظمیں کہی گئی ہیں۔ اس جنگ میں بہادری کے جوہر دکھانے والے میجر راجہ عزیز بھٹی کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے والی نسوانی آواز کشور ناہید کی ہے۔ کشور ناہید نے انتہائی خلوص اور پیار سے میجر راجہ عزیز بھٹی کی خدمات کو سراہا ہے کہ انھوں نے جاں دے کر اس وطن کا دفاع کیا اور دشمن کو بھی اپنی تعریف پر مجبور کر دیا ہے۔ کشور ناہید نے "عزیز وطن" میں عزیز بھٹی کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

عزیز بھٹی ترا نام جرأتوں کا نشاں

نشانِ حیدر و جرأت تری وفا کا بیاں

تو اے عزیز نگارِ وطن سپاہ کے عزیز

رہا تو فوج کا آئینہ سکوں ساماں

میں اپنی شاعری اپنی نوا اور اپنا فن

تری وفا کی ثنا کے لیے کروں قرباں (عزیز وطن، جنگ ترنگ)

جنگ ستمبر نے شعرا کی سوچ کے نئے در وا کیے۔ شعرا کے سوچنے کا انداز تبدیل ہو گیا۔ نئے موضوعات اور فکر و نظر کو نیا انداز ملا۔ فکر اور اسلوب میں نکھار بیدار ہو گیا اور عشق و عاشقی سے نکل کر وطن سے محبت کا جذبہ ایثار شدت اختیار کر گیا۔ اس حوالے سے انتظار حسین کی کچھ سطریں تمام صورت حال کو واضح کرتی ہیں:

"۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو یہ زمیں ہم پر وارد ہوئی۔ جب زمین کے چپہ چپہ کے لیے جانیں نذر کرنی پڑیں۔ جب سرحدوں کی مٹی غازیوں کی سانس میں رچ گئی۔ جب جنگل شہیدوں کی خوشبو سے بس گئے۔ تب یہ زمین ہمارے لیے روحانی واردات بنی۔ ہمارے سینوں پہ منکشف ہوئی، ہم پر نازل ہوئی۔"(۴۰)

عسکری شاعری صرف وقتی جذباتی ابال کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ صدیوں پرانی اس وابستگی کا اظہار ہے جو انسان کو اپنے وطن سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ قدیم دور میں کچھ شعرا نے شاعری کو ذریعہ روزگار بنانے کے ساتھ ساتھ

اسے ذریعہ ابلاغ بھی بنایا ہے اور شاعری کے فنی تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے شاعری کی۔ شاعری میں ترنم، نغمگی کے ساتھ ساتھ مقصدیت کو نہیں چھوڑا کیونکہ شاعری کا بنیادی مقصد جذبات کا ابھارنا ہے جس کو شعرائے پاکستان نے جنگ ستمبر میں احسن طریقے سے نبھایا۔

جنگی ترانے اور نغمے عام طور پر ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر موسیقی کے ساتھ پیش کیے جاتے تھے۔ عوام کے جذبات عساکرِ پاکستان تک پہنچائے جاتے تھے اور ان کے جذبات کو ابھارا جاتا تھا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ریڈیو پاکستان نے بھرپور کردار ادا کیا۔ جنگی ترانے اور ملّی نغمے تواتر اور تسلسل سے نشر کئے۔ پاکستان ٹیلی ویژن ابھی نوزائیدہ تھا کیونکہ پاکستان ٹیلی ویژن کا قیام ۲۶ نومبر ۱۹۶۴ء کو عمل میں آیا تھا۔ اس کے پاس صرف لاہور میں نشریات کی سہولیات موجود تھیں۔ اس کے باوجود اس نے بھی اپنی پوری توانائی جنگ سے متعلق خبریں اور نغمات نشر کرنے میں لگا دی۔

نشریاتی اداروں پر نشر ہونے اور موسیقی کے ساتھ پیش کیے جانے کی وجہ سے شعرا نے پابند ہیئتوں پر زیادہ انحصار کیا یہی وجہ ہے کہ عسکری نغمات میں ترنم اور آہنگ زیادہ پایا جاتا ہے۔ یہی آہنگ رزمیہ اور عسکری شاعری کی پہچان ہے اور چونکہ رزمیہ اور عسکری شاعری کا مقصد عساکر کے جذبات کو ابھارنا اور گرمانا ہوتا ہے اس لیے نغمگی اور ترنم ان کا خاصہ ہے۔ عسکری شاعری میں الفاظ کا چناؤ بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ ایسے الفاظ کا استعمال جن سے جذبات کی شدت کا اظہار ہو سکے، عسکری اور رزمیہ شاعری کا لازمی حصہ ہیں اور یہ تمام خصوصیات ہمیں ۱۹۶۵ء کی جنگ سے متعلقہ شاعری میں بدرجہ اتم محسوس ہوتی ہیں۔ شاعری میں جذبات کی گہرائی اس دور کی شاعری کا امتیازی نشان ہے۔

### ۱۹۷۱ء کی جنگ اور سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں قومی و ملّی نغمہ نگاری:

جنگ ستمبر میں پاکستانی افواج کا جوش و جذبہ اور پاکستانی عوام کا اتحاد کسی طرح بھی دشمن کو ہضم نہ ہوا لہٰذا اب کی بار دشمن نے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے جنگ سے پہلے سازشوں کا جال بچھایا اور اس جنگ کے لیے دشمن نے ہمارے اپنے لوگوں کو استعمال کیا۔ پاکستان کی پے در پے سیاسی کمزوریوں نے دشمن کی سازشوں کو کامیاب ہونے کا موقع فراہم کیا۔ یہ جنگ صرف جنگ نہ تھی بلکہ ماضی و حال اور مستقبل کے آئینے میں فکری خدوخال کا نظارہ تھی۔

بنگال ایک بڑا صوبہ تھا جسے ۱۹۰۵ء میں انگریز حکومت نے تقسیم کر کے مشرقی بنگال اور مغربی بنگال میں تقسیم کر دیا تھا جہاں بالترتیب مسلمانوں اور ہندوؤں کو اکثریت حاصل ہو گئی تھی۔ مسلمان اس تقسیم سے خوش

تھے جبکہ ہندو اس تقسیم کے سخت خلاف تھے کیونکہ اس تقسیم سے ان کی عددی برتری بھی اکارت گئی تھی۔ بالآخر ۱۹۱۱ء میں ہندوؤں کے دباؤ پر انگریزوں نے یہ تقسیم ختم کر دی اور بنگال پھر سے متحد ہو گیا۔

تقسیم برصغیر کے قاعدے کے مطابق پنجاب کی طرح بنگال بھی تقسیم ہوا اور مسلم اکثریتی بنگال کو مشرقی پاکستان کا نام ملا جبکہ پنجاب، سندھ، بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کو ملا کر مغربی پاکستان کا نام دیا گیا۔ پاکستان کے ان دونوں حصوں میں سینکڑوں میل کا فاصلہ ہونے کے ساتھ دونوں حصوں کے درمیان کوئی زمینی رابطہ نہیں تھا جبکہ فضائی رابطہ کے لیے بھی بھارتی علاقے سے گزرنا پڑتا تھا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے دونوں حصوں کی آبادی تقریباً یکساں تھی۔ ابتدا میں مشرقی پاکستان کے عوام کو یہ کہ کر ان میں منافرت پیدا کی گئی کہ آبادی میں کم ہونے کے باوجود مغربی پاکستان کو زیادہ سیاسی حقوق حاصل ہیں۔ اس تخصیص کو ختم کرنے کے لیے مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو "ون یونٹ" کا نام دیا گیا اور مشرقی اور مغربی پاکستان کو مساوی سیاسی حقوق دیئے گئے لیکن پاکستان کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں نے پاکستانی عوام کو امن اور چین کا سانس نہ لینے دیا اور مشرقی پاکستان میں مختلف طریقوں سے منافرت کے بیج بونا شروع کیے اور ساتھ ان بیجوں کی خوب آبیاری بھی جاری رکھی۔ آخر چند سالوں میں منافرت اور نفاق کی فصل تیار ہو گئی۔ نتیجہ کے طور پر مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور قیام بنگلہ دیش کی صورت میں دشمنانِ پاکستان کو فتح ہوئی اور پاکستان دولخت ہو گیا۔ صدیق سالک اس بارے رقم طراز ہیں کہ اگر ۱۹۷۰ء کی ابتدا میں سیاست دان، تاجر اور دانشور مغربی پاکستان سے ذہنی روابط توڑ چکے تھے تو کیا بنگالی سپاہی اس وبا سے محفوظ تھے؟ کیا کسی اندرونی شورش کو فرو کرنے کے لیے ان پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا؟ (۴۱) یقیناً جواب نہیں میں ہو گا کیونکہ اس وقت نفرتوں کی فصل پک کر تیار ہو چکی تھی۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ایوب خان کی زیر قیادت پاکستان میں ترقیاتی منصوبوں کا آغاز کیا گیا جو کافی کامیاب رہے تھے۔ ان منصوبوں میں ہیڈ ورکس اور نہریں بنائی گئیں، صنعتیں اور کارخانے لگائے گئے لیکن ان تمام منصوبوں کے باوجود منافرت اور منافقت کی سیاست پروان چڑھتی رہی جس نے پاکستان کو نظریاتی اور سیاسی طور پر بہت نقصان پہنچایا۔ مارشل لاء کے دور میں کئی سیاسی شخصیات پروان چڑھیں جنھوں نے بعد میں پاکستان کی سیاست میں اہم کردار ادا کیا۔ ان سیاسی شخصیات میں مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو اور مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمان زیادہ اہم ہیں۔ مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی پارٹی پاکستان پیپلز پارٹی اور مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمان کی عوامی لیگ مقبول جماعتیں بن کر ابھریں۔

۱۹۷۰ء میں جنرل یحیٰ خان نے پاکستان میں انتخابات کروا کر اپنی ذمہ داری پوری کی۔ ان انتخابات میں مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی اور مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کو عددی اکثریت حاصل ہوئی لیکن مغربی پاکستان کی مقتدر قوتیں عوامی لیگ کو اقتدار منتقل کرنے کے حق میں نہیں تھیں جس کے ردعمل کے طور پر شیخ مجیب الرحمان کو بنگال کے عوام کے دلوں میں منافرت کے جذبات ابھارنے میں مدد ملّی جبکہ بھارت پہلے سے ہی منافرت کی خوب پشت پناہی کر رہا تھا اور جب یہ منافرت منظر عام پر آئی تو ملک دولخت ہو گیا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد اقتدار کی جنگ نے پاکستان کو شدید نقصان پہنچایااور بھارت مشرقی پاکستان کی عوام کو یہ باور کروانے میں کامیاب ہو گیا کہ مغربی پاکستان ان کے حقوق پر ڈاکہ ڈال رہا ہے۔ ہندو اساتذہ کے ذریعے مشرقی پاکستان کی نوجوان نسل کے ذہنوں میں یہ بات ڈال دی گئی تھی کہ اگر وہ مغربی پاکستان کے ساتھ رہیں گے تو ان کے حقوق سلب کر لیے جائیں گے۔ صدیق سالک اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ”وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بنگالی قومیت کی وبا تیز ہوتی جا رہی تھی اور شہری اور فوجی طبقے اس کی لپیٹ میں آ رہے تھے۔ اس کو مزید ہوا دینے کے لیے عوامی لیگ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔ وہ ہر اس تقریب میں سرد مہری اور بیگانگی برتتی جس سے قومی یکجہتی کو تقویت ملتی تھی اور ہر اس موقع کو اہمیت دیتی جس سے صوبائی عصبیت کو فروغ حاصل ہوتا۔ مثلاً جب بھی یوم پاکستان (۲۳مارچ) یوم آزادی (۱۴اگست) یوم دفاع (۶ستمبر) اور قائد اعظم کا یوم ولادت (۲۵دسمبر اور وفات ۱۱ستمبر) آیا، عوامی لیگ نے کوئی دلچسپی نہ لی، لیکن اس کے برعکس سارجنٹ ظہور الحق کی برسی، لسانی فسادات کے شہیدوں کی یاد اور رابندر ناتھ ٹیگور کی جنم اشٹمی کو ہمیشہ دھوم دھڑکے سے منایا۔“ (۴۲)

دوسری طرف مغربی پاکستان کی قیادت صرف حصول اقتدار کی جنگ میں مصروف رہی جس سے مشرقی پاکستان کے عوام کے تحفظات کی تشفی نہ ہوئی اور عوام الناس میں بھی شدید نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ اس نفرت کو ایسی ہوا دی گئی کہ تقسیم ملک کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ اس سلسلے میں آغا اشرف کی تحریر قابلِ غور ہے کہ ”مولانا بھاشانی نے تو پاکستانی فوج کے ایک بریگیڈ یئر سے گفتگو کرتے ہوئے یہاں تک کہ دیا کہ مشرقی پاکستان کا مریض شدید مرض میں مبتلا ہے۔ جس کا علاج طویل اور صبر آزما ہے اور شیخ مجیب الرحمان اس کے معالج کی حیثیت سے شوگر کوٹڈ زہر کی گولیاں دے رہے ہیں“(۴۳) مغربی پاکستان کے دانشوروں کی ایک کثیر تعداد ارباب اختیار تک اپنی آواز پہنچانے کی کوشش کرتے رہی لیکن حکومت کی طرف سے کوئی مثبت رویہ سامنے نہ آیا۔ اگر تمام صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو بنگلہ دیش کی علیحدگی کے پانچ واضح اسباب نظر آتے ہیں:

۱۔ پاکستان کی کمزور قومی قیادت

۲۔ مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی کی تخریب کاریاں

۳۔ ہندوستانی حکمرانوں کی سازشیں

۴۔ بھارتی فوجی مہم جوئی

۵۔ اقتدار کی منتقلی میں تاخیر

ان تمام اسباب نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں اہم کردار ادا کیا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان زمینی راستے سے دونوں ممالک کے درمیان سینکڑوں کلومیٹر دوری اور پھر دونوں ممالک کے درمیان ایک ایسی سلطنت حائل تھی جس نے قیام سے اب تک پاکستان کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس صورتحال نے عمومی امور کی انجام دہی اور انتظامی امور کی ادائیگی میں رکاوٹیں کھڑی کیں۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان دونوں الگ اپنی تہذیب اور ثقافت کو لے کر پروان چڑھنے لگے جس سے باہمی اشتراک کے مواقع کم ہوتے گئے جبکہ زبان کا مسئلہ ابتدا ہی سے چلا آرہا تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ مزید نزاعی شکل اختیار کر گیا تھا۔ بنگال کی زبان بنگالی تھی جبکہ قائداعظم نے اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیا تھا اور جب بنگال میں بھی اردو زبان کو سرکاری زبان قرار دیا گیا تو وہاں بغاوت نے جنم لیا، بنگالیوں نے اسے ثقافت پر حملہ تصور کیا اور دفاع کے لیے میدانوں میں نکل آئے۔ سیاسی غلطیوں کے نتیجے میں بغاوت شدید تر ہوتی چلی گئی جبکہ اس ساری صورت حال میں مغربی پاکستان الگ اور غالب حیثیت میں رہا۔

مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان کی نسبت زیادہ پسماندہ علاقہ تھا اور وہاں ترقیاتی کاموں کی ضرورت بھی زیادہ تھی لیکن حکومت کی عدم توجہی نے نہ صرف بنگالی عوام کے دلوں میں نفرت کو جنم دیا بلکہ مشرقی پاکستان کے عوام میں صوبائی خود مختاری کا احساس شدت اختیار کرتا چلا گیا اور عوام کی محرومی کو سیاسی منافرت میں تبدیل کر دیا گیا جسے مخالفین نے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ اس صورت حال میں عوامی لیگ مشرقی پاکستان کی نمائندہ جماعت بن کر ابھری جس نے سیاسی بساط پر مشرقی پاکستان کے حقوق کا نعرہ بلند کیا۔ عوامی لیگ کے رہنما شیخ مجیب الرحمان نے عوامی محرومیوں کو سیاسی مقاصد کے لیے ہوا دی اور منافرت کی آگ پورے مشرقی پاکستان میں پھیلا دی۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات سے پہلے بنگال میں شدید سمندری طوفان نے تباہی مچا دی جس سے نظام زندگی تہ و بالا ہو گیا تھا۔ معاشی اور جانی نقصان سے بنگال کا مجموعی نظام زندگی سخت متاثر ہوا، اس صورت حال میں مغربی

پاکستان کی سیاسی قیادت کی طرف سے کوئی مثبت رد عمل سامنے نہ آیا جس کی وجہ سے عوام میں مایوسی بڑھ گئی۔ دوسری طرف شیخ مجیب الرحمان کی قیادت میں علیحدگی پسند قوتیں جمع ہونا شروع ہو گئیں اور مغربی پاکستان کی سیاسی غفلت نے اس صورت حال کو مزید منفی رخ دیا۔ عوام کے اندر مایوسی کے جذبات نے صورتحال کو علیحدگی پسند سیاست دانوں کے لیے مزید سازگار بنا دیا جنھوں نے عوامی جذبات سے فائدہ اٹھایا اور کچھ ہی عرصہ میں علیحدگی پسند فکر مشرقی پاکستان کے عوام کا نظریہ حیات بن گئی۔ شیخ مجیب الرحمان کا چھ نکاتی کلیہ سیاسی میدان میں ان کے لیے بہت معاون ثابت ہوا۔ قدرت اللہ شہاب شیخ مجیب الرحمان کی سیاسی چالوں کے بارے لکھتے ہیں کہ شیخ مجیب نے اپنے بریف کیس سے کاغذوں کا ایک پلندہ نکال کر ایک طویل اور کسی قدر بے ربط تقریر پڑھی جس میں ذکر تو ان کے چھ نکات کا تھا لیکن انجام علیحدگی اور تخریب پر مبنی تھا۔ اپنی تقریر ختم کرتے وقت شیخ صاحب نے زور دے کر کہا تھا کہ ان کی پیش کردہ تجاویز پر عمل کرنے ہی سے ملک سلامت رہ سکتا ہے۔ اس پر صدرِ ایوان نے برجستہ پوچھا تھا کونسا ملک؟ اس رنگ اور سر پر یہ کانفرنس ناکام ہو گئی۔"(۴۴) یعنی ان کا بنیادی مقصد علیحدگی تھا اور وہ عوام کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ملک بچانے کا برائے نام واویلا مچاتا رہا۔

جب عوامی منافرت اپنے عروج پر پہنچ گئی تو مغربی پاکستان کی سیاسی قیادت نے صورتحال کا ادراک کیا لیکن صورتحال کو سلجھانے کی بجائے ان کی سرکوبی کی کوششیں شروع کر دیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیخ مجیب الرحمان کے چھ نکات کو مشرقی پاکستان کی عوام کی اکثریت نے قبول کر لیا اور اس کی حمایت شروع کر دی۔ یہ صورتحال آہستہ آہستہ سازشی رنگ اختیار کر گئی۔ ۱۹۶۸ء میں اس طرح کی سازش کی بنیاد پر "تلہ سازش کیس" میں ۲۸ افراد کے خلاف غداری کا مقدمہ قائم کیا گیا۔ اس مقدمہ کا مقصد سازش اور منافرت کے بیج کو اکھیڑنا تھا لیکن بھارتی شہ پر بنگال کے علیحدگی پسندوں نے اسے اپنے خلاف جارحیت تصور کیا۔ صدیق سالک اپنی کتاب میں لکھتے ہیں "اگرچہ ابتدا میں شیخ مجیب الرحمان کو اس سازش کے حوالے سے مشرقی پاکستان میں نفرت کا سامنا کرنا پڑا مگر جلد ہی وہ اس مقدمے کے طفیل مقبولیت کے آسمان پر جا پہنچا۔"(۴۵) ان تمام تحفظات کی بنیاد پر مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان مد مقابل آ گئے۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں سمندری طوفانوں نے مشرقی بنگال کو شدید جانی اور مالی نقصان سے دوچار کر دیا اور تباہ کاریوں کے باعث عام انتخابات بھی ملتوی ہو گئے جو بالآخر ۷ دسمبر ۱۹۷۰ء کو ہوئے۔ انتہائی نامساعد حالات میں ہونے والے انتخابات میں مغربی پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی نے ۱۴۶ میں سے ۸۴ اور مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے ۱۶۷ میں سے ۱۶۴ نشستیں حاصل کر کے سیاسی دھارے کا رخ موڑ دیا۔ عوامی لیگ کی اس کامیابی کے بارے میں صدیق سالک لکھتے ہیں:

> ”عوامی لیگ در حقیقت پولنگ سے پہلے ہی انتخابات جیت چکی تھی، ۷ دسمبر اس کی رسمی توثیق کا دن تھا۔ اس کا احساس تقریباً سبھی لوگوں کو ہو چکا تھا اور انھوں نے انتخابات سے پہلے ہی چڑھتے سورج کی پرستش شروع کر دی تھی۔ ڈھاکہ ٹیلی ویژن کے بنگالی جنرل منیجر نے یکم دسمبر کو مجھ سے کہا: ”مجھے شیخ صاحب کے پاس جا کر ان سے معذرت کر لینی چاہیے کہ ہم دور افتادہ علاقوں میں ان کے جلسوں کی تشہیر نہ کر سکے کیونکہ ہیڈ کوارٹر (راولپنڈی) سے حکم آیا تھا کہ صرف بڑے بڑے شہروں میں اپنی کیمرہ ٹیمیں بھیجیں، شیخ صاحب یقیناً اس پر خفا ہوں گے۔ وہ بر سرِ اقتدار آ کر ممکن ہے آپ (باوردی) لوگوں کو کچھ نہ کہیں لیکن مجھے ہرگز نہیں بخشیں گے۔“ (۴۶)

اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجیب الرحمان کی عوامی گرفت نے انتخابات سے پہلے ہی ان کی کامیابی کے روشن امکانات عیاں کر دیے تھے اور سرکردہ لوگ عوامی لیگ کو مشرقی پاکستان میں بر سرِ اقتدار دیکھ رہے تھے۔ مزید بر آں عوامی لیگ کی سیاسی قیادت کے منافرت کے جذبات سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے۔ اس نازک مرحلے پر ایوب خان نے اقتدار کی باگ ڈور یحیٰ خان کے سپرد کر دی تھی اور خود سیاسی بساط سے رخصت ہو گئے تھے۔ ملک کے دونوں حصوں میں دو مختلف سیاسی جماعتوں کی مقبولیت اور کامیابی نے ملک کو عجیب و غریب صورتحال سے دوچار کر دیا۔ ملک فکری دھاروں میں دو لخت ہو گیا۔ اس صورتحال میں ازلی دشمن بھارت بھی اپنی سازشوں کے جال کے ساتھ میدان میں آ گیا۔ دوسری طرف اقتدار کی منتقلی میں تاخیر نے بھی بحرانوں کو جنم دیا۔

اس دوران ہونے والے تمام واقعات ہی بحرانوں میں اضافے کا باعث بنتے گئے۔ ۳۰ جنوری ۱۹۷۱ء کو کشمیری نوجوانوں نے بھارتی ہوائی جہاز اغوا کر لیا۔ دہلی سے اغوا کیا جانے والا یہ طیارہ لاہور کے ہوائی اڈے پر اتارا گیا۔ طیارے میں موجود مسافر اور عملے کے افراد تو محفوظ رہے لیکن طیارہ بموں سے اڑا دیا گیا۔ ہندوستان نے اس صورتحال سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان کے خلاف منفی پروپیگنڈوں میں تیزی کر دی حالانکہ طیارے کا اغوا بھی بھارت کی اپنی سازش کا حصہ تھا جس کا مقصد عالمی سطح پر پاکستان کو بدنام کرنا تھا جس کے بعد بھارت نے حالات کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اسی سازش کا ایک حصہ ۲۰ اگست ۱۹۷۱ء کو پاکستانی تربیتی ہواباز راشد منہاس کے تربیتی طیارے کا اغوا بھی تھا جو ہوابازوں کو تربیت دینے والا تربیت کار (انسٹرکٹر) مطیع الرحمان پاکستانی ہواباز اور طیارے کو اغوا کر کے بھارت لے جانا چاہتا تھا تاکہ پاکستانی فضائیہ کے متعلق اہم راز حاصل کر سکے لیکن پاکستان کے اس بہادر ہواباز نے تربیت کار کی سازش ناکام بنا دی اور اپنا طیارہ بھارتی سرحد کے قریب زمین سے ٹکرا کر شہادت کے مرتبے سے سرفراز ہو گئے اور ملک کا اعلیٰ ترین فوجی اعزاز نشان حیدر حاصل

کیا۔ اقتدار کی منتقلی میں تاخیر نے عوامی لیگ کو عوام میں منافرت کے جذبات بھڑکانے کا موقع فراہم کیا اور شیخ مجیب الرحمان نے بنگال کی مکمل آزادی کے اعلانیہ بیانات دینے شروع کر دیے۔ مزید سول نافرمانی کی تحریک کے ذریعے بغاوت کی راہ ہموار ہو گئی۔

سقوطِ ڈھاکہ کے پس منظر میں بھارتی سازشیں کارگزار تھیں اور اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے بنگالی عوام کی مکتی باہنی کے نام سے نجی فوج بنالی تھی۔ بنگال رجمنٹ ، ایسٹ پاکستان رائفلز، مقامی پولیس اور ہزاروں رضاکاروں نے مغربی پاکستان کے خلاف سول نافرمانی شروع کر دی جن کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ اس سول نافرمانی کی آڑ میں خفیہ ایجنسیوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

ایک اور افسوس ناک واقعہ اقبال و جگن ناتھ ہال ڈھاکہ میں پاکستانی طلباء و طالبات کا بڑے پیمانے پر قتل عام تھا۔ عوامی تائید نہ ہونے کے باعث ملک کی سیاسی اور فوجی قیادت بے بس دکھائی دیتی رہی جبکہ دوسری طرف ۲۷ مارچ ۱۹۷۱ء کو میجر ضیاء الرحمن نے پنجابی کمانڈر آفیسر رشید جنجوعہ کو قتل کر کے بنگال فوج کی قیادت سنبھال لی۔ بعد میں یہ میجر ضیاء بنگلہ دیش کے صدر بھی بنے اور پھر قتل کر دیے گئے۔

اس صورتحال میں جب اندرونی خلفشار اپنے عروج پر تھا اور ملکی حالات سیاسی قیادت اور فوجیوں کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے تو پاکستان کے ازلی دشمن بھارت نے موقع پا کر مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر جنگ مسلط کر دی۔ ۲۲ نومبر ۱۹۷۱ء کو بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کیا اور اس کے بعد ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مغربی محاذ پر بھی حملہ آور ہو گیا۔ بھارت کے اس حملے کا مقصد پاکستانی افواج کو کئی محاذوں پر مصروف کرنا تھا تاکہ مشرقی پاکستان میں صورتحال سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ ۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد سے بھارت نے کھل کر مشرقی پاکستان میں جارحیت شروع کر دی اور مشرقی پاکستان پر قبضے کے درپے ہو گیا۔ دوسری طرف افواج پاکستان بے جگری سے لڑ رہی تھیں مرتضیٰ انجم پاکستانی افواج کی بہادری کی صفات گنواتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہماری بری افواج نے بھارت کی سرحد کے ساتھ ساتھ بہت ہی مضبوط مورچہ سر کر کے ایک دفعہ اور اپنی روایتی بہادری اور صلاحیت کی دھاک بٹھا دی۔ ہماری چھوٹی سی فضائیہ نے بھی تاریخی کارنامے انجام دیے ۔ اسی طرح بحریہ بھی کسی سے پیچھے ہرگز نہ رہی۔"(۴۷) لیکن آخر میں پاک فوج کو شکست تسلیم کرنا پڑی اور پاکستانی فوج کا ایک جمِ غفیر بھارت کے ہاتھوں قید ہو گیا۔

۱۹۷۱ء کی جنگ میں ناکامی سازشوں اور مخلص قیادت کے فقدان کی وجہ سے تھی۔ یہ فقدان سیاسی اور عسکری دونوں سطحوں پر دیکھنے میں آیا۔ کمزور سیاسی قیادت نے مشرقی پاکستان کو نظر انداز کر کے وہاں کے عوام

کے دلوں میں منافرت کو فروغ دیا۔ اس دوران پاکستان کی عسکری قیادت نے بھی زیادہ دانش مندی کا ثبوت نہ دیا جس کا بھارت نے پاکستان کے اندرونی حالات خراب کر کے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنوں کو اپنوں سے دست و گریباں کر کے ناپاک مقاصد حاصل کیے۔ ایک طرف تو ہندو اساتذہ کے ذریعے نوجوان طلبا کے ذہنوں میں اشتعال پیدا کیا گیا اور دوسری طرف انھیں جنگی ہتھیار اور ساز و سامان بھی مہیا کیا گیا۔ بنگالی عوام اور فوج کی طرف سے بھارتی ساخت کے اسلحے کا استعمال اس بات کا ثبوت ہے کہ بنگالیوں نے یہ جنگ بھارت کی شہ پر لڑی۔ پاک فوج سے لڑنے کے لیے رضاکاروں کو باقاعدہ تربیت دی گئی اور اس تربیت کے لیے ڈھاکہ یونیورسٹی کے میدان استعمال کیے گئے جبکہ مقامی پولیس اور خفیہ ادارے سب اس میں شریک تھے۔ مکتی باہنی روز بروز مضبوط تر ہوتی گئی تھی اور عسکری اداروں کی باغی نفری بھارت میں تربیت پا رہی تھی۔ جب صورت حال مکمل طور پر پاکستان اور پاکستانی قیادت کے خلاف ہو گئی تھی تو بھارت نے باقاعدہ حملہ کر دیا۔ دوسری طرف جنرل یحی کا انتقال اقتدار کے مرحلے کو طول دینے سے بنگالی عوام نے بدنیتی سے تعبیر کیا۔ آغا اشرف لکھتے ہیں "۱۹۷۱ء میں جب قومی اسمبلی کے انعقاد میں یحیٰ خان تاخیر کر رہے تھے، بھارت نے عوامی لیگ کے مؤقف کی پرزور حمایت کی تھی۔ بھارت خفیہ اور اعلانیہ طور پر عوامی لیگ کو متشدد سیاسی رویہ اختیار کرنے پر آمادہ کر چکا تھا۔"(۴۸) ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کو جنگ کے خاتمہ کے بعد مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کے روپ میں دنیا کے نقشے پر ابھر چکا تھا اور پاکستانی افواج کے بھارتی عساکر کے آگے ہتھیار ڈال دینے سے فوجیوں کی ایک کثیر تعداد کو جنگی قیدی بنا لیا گیا۔ ان جنگی قیدیوں سے بھارت نے انسانیت سوز سلوک کیا۔

۱۹۷۱ء کی جنگ سے پاکستان کا ایک بازو کٹ کر علیحدہ ہو گیا اور جانی و مالی نقصان الگ سے اٹھانا پڑا۔ وطن کے کئی بہادر سپوتوں نے جام شہادت نوش کیا۔ پاکستانی فوج کے غیور اور بہادر سپاہیوں نے بے مثال کارنامے سر انجام دیے جس کی بدولت وطنِ عزیز کی خاطر غیر معمولی کارکردگی دکھانے اور جان کا نذرانہ پیش کرنے پر میجر اکرم شہید، میجر شبیر شریف شہید، سوار محمد حسین شہید اور راشد منہاس شہید کو پاکستان کے سب سے بڑا عسکری ایوارڈ نشان حیدر سے نوازا گیا۔ دیگر مجاہدین جنھوں نے دشمن کے سامنے سینہ سپر کیے رکھا انھیں ستارہ جرأت اور دیگر تمغات سے نوازا گیا۔ قوم جو اپنا حوصلہ کھو بیٹھی تھی ایک بار پھر میدان حیات میں نکل آئی اور نئے حوصلے، ہمت اور عزم نو سے زندگی کا آغاز کیا۔

۱۹۷۱ء کی جنگ پاکستان کے لیے جنگ سے زیادہ ایک سانحہ تھی جس کے اثرات تا دیر اردو شاعری پر چھائے رہے۔ سازشوں اور باہمی کشمکش نے پہلے ہی عوام میں مایوسی کی کیفیت کو جنم دیا تھا اس لیے شعرا میں وہ

جوش وجذبہ دکھائی نہ دیا جو ۱۹۶۵ء کی جنگ میں دیکھنے کو ملا تھا۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ عساکرِ پاکستان دشمن کے ساتھ ساتھ اپنے ہی بنگالی بھائیوں سے برسرِ پیکار تھیں اور قاتل اور مقتول ایک ہی گھر سے تعلق رکھتے تھے اس لیے یہ جنگ سے زیادہ کٹھن مرحلہ تھا۔ محاذ آرائی کے ساتھ اپنوں کی بے وفائیاں، سیاسی اور معاشرتی زبوں حالی بچھڑ جانے اور کھو دینے کے احساس نے عوام الناس کے دلوں میں دکھ اور کرب کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس سانحے نے عوام کو شکست وریخت کے احساس سے دوچار کر دیا اور عوام غم وافسوس کی کیفیت میں ڈوب گئے جس سے ملک کی فضا بحیثیت مجموعی رنج و الم کا مظہر بن گئی۔ حسن طاہر اپنی نظم "پاک آشوب" میں اس سانحے کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

کیا پوچھتے ہو جہاں والو — آزادی و عزو شان والو
بیتا ہم پر پڑی ہے کس کی — ہم مر گئے آج موت اپنی
ہم جھوٹ کو سچ سے تولتے تھے — ہم ظلم پہ نہ لب کھولتے تھے
ہم عزت نفس کے پجاری — دھوکا عادت بنا ہماری
جھوٹے وعدوں کا قصہ بالا — کب تک رہتا مگر سنبھالا

(پاک آشوب، فنون)

۱۹۷۱ء کی جنگ کے نتیجے میں کی جانے والی شاعری عسکری سے زیادہ فکری ہے اور یہ سوال وجواب کے مرکز کے گرد گھومتی ہے اس میں قوم اپنے آپ سے سوال کر کے جواب کھوجتی ہے کہ آخر وہ کونسے عوامل تھے جس نے جذبات و احساسات کے دھاگوں سے بندھی اس قوم کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔ تلخیاں، بے وفائیاں، طعنے، اعترافِ شکست، اپنوں کا غم، غیروں کا غصہ، کھو جانے کا افسوس اور عزم نو ۱۹۷۱ء کی جنگ سے وابستہ شاعری کے اہم موضوعات ہیں اور یہی موضوعات کم و بیش تمام شعرا کے ہاں ملتے ہیں۔ عسکری مہمات سے متعلق نظموں کی تعداد بہت کم ہے کیونکہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں عسکری مہم جوئی عجیب انداز سے ہوئی تھی۔ بھارتی جارحیت سے پہلے اندرونی خلفشار سے عوام کے ذہنوں پر مایوسی کی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ اپنی طوالت اور ہولناکی کے اعتبار سے ۱۹۶۵ء کی جنگ سے کسی طرح کم نہ تھی۔ ہنستے شہریوں پر گولہ باری و املاک کو نقصان اور بھارت کی کھلی جارحیت ۱۹۶۵ء کی جنگ کے حالات کی تصویر تھی لیکن شعرا کی توجہ زیادہ تر سانحہ پر مرکوز رہی۔ مجید امجد کی نظم "اے قوم" ایسے ہی دکھ کی غماز نظر آتی ہے:

پھولوں میں سانس لے، کہ برستے بموں میں جی
اب اپنی زندگی کے مقدس غموں میں جی

وہ مائیں، جن کے لال لہو میں نہا گئے
صدیوں اَب ان کے آنسوؤں اکھڑے دموں میں جی
بندوق کو بیان غم دل کا اذن دے
اک آگ بن کے پوربوں اور پچھموں میں جی (اے قوم، فردا)

سانحۂ مشرقی پاکستان کے بعد ایک احساس جب سب سے مضبوط علامت بن کر ابھرا وہ تھی، جدائی کی علامت۔ جدائی نے اجنبیت کو جنم دیا اور مذہب اور وطن کی لڑی میں پروئے ہوئے اپنے ہی بھائی اجنبی اور غیر بن گئے۔ انسان کے لیے سب کچھ قابلِ برداشت ہوتا ہے لیکن اپنوں کا غیر بن جانا ایسا دکھ ہے جو انسان کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیتا ہے۔ فیض احمد فیض نے اپنی نظم ''ڈھاکہ سے واپسی پر'' میں سقوط ڈھاکہ کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے:

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا، کتنی مدارتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد (ڈھاکہ سے واپسی پر، شامِ شہر یاراں)

جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے بعد سقوط ڈھاکہ اہم سانحہ تھا جس نے اردو ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے جس کے متعلق کئی سیاسی اور تاریخی تالیفات منظر عام پر آئیں۔ شعرا اور ادبا نے اس سانحے کو اپنا موضوع سخن بنایا۔ ان کتابوں میں تاریخی واقعات کے ساتھ ذاتی اور اجتماعی تاثرات کو بھی قلم بند کیا گیا۔ وطن کا دولخت ہونا کسی بڑے صدمے سے کم نہ تھا تمام محب وطنوں کا دل خون کے آنسو رویا۔ اس سانحے کا ذکر روحی کنجاہی کی اس غزل میں ان الفاظ میں ملتا ہے:

زخم جدائی کیسا رہا مجھ سے پوچھیے
یہ سانحہ ہے کتنا بڑا مجھ سے پوچھیے
میرا وجود مجھ سے الگ ہو کے رہ گیا
کیوں رو رہا ہے کون مرا مجھ سے پوچھیے
کاٹی جڑیں مری، مرے سائے میں بیٹھ کر
لوگوں نے کیا سلوک کیا مجھ سے پوچھیے

(زخم جدائی کیسا رہا مجھ سے پوچھیے، فنون)

احمد ندیم قاسمی کی وطن سے محبت نے انھیں اس سانحے پر بہت رنجیدہ کیا۔ ان کی نظم "ایک ہی رنگ ہے" جنگ کی تباہ کاریوں کا نوحہ ہے۔ ملک کے دونوں حصوں بالخصوص مشرقی پاکستان میں خون کی جو ہولی کھیلی گئی وہ تاریخ کا سیاہ باب ہے۔ پاکستان کی سرحدوں پر بمباری سے سینکڑوں افراد جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ پاکستانی عوام نے کئی دن تک یہ خوں آشام نظارہ دیکھا۔ بارود نے آنکھیں چندھیا دیں اور معصوم لوگوں کا خون سڑکوں پر بہتا رہا۔ نظم سے اقتباس ہے:

مگر خون کا تو فقط ایک ہی رنگ ہے
چاہے ڈھاکے کا ہو
چاہے لاہور کا
آج کے دن کا
یا آنے والے دنوں کا
ہزاروں کا ہو یا کروڑوں کا ہو
رنگ تو خون کا ایک ہے
اور یہی رنگ ہے آج کی زندگی کا (ایک ہی رنگ ہے، محیط)

یہ خدائے بزرگ و برتر کا نظام ہے کہ دنیا میں بسنے والے تمام انسانوں کا خون ایک رنگ کا یعنی سرخ ہے لیکن جب جسم بھی ایک ہو تو پھر یہ فرق کیسے ہو سکتا ہے۔ مراد ڈھاکہ اور لاہور ایک ہی ملک کے دو شہر ہیں اور جب ڈھاکہ میں آپریشن کے دوران اپنے ساتھیوں کا خون بہا گیا تو احمد ندیم قاسمی کے نازک احساسات نے ڈھاکہ اور لاہور کو استعارہ کے طور پر استعمال کر کے مشرقی پاکستان میں بہائے جانے والے خون اور انسانی جانوں کے ضیاع پر گہرے دکھ والم کا اظہار کیا ہے۔ یعنی اس خون کا رنگ ایک تھا پھر یہ خون کس طرح سفید ہو گیا۔ یہ خون لالچ اور حرص نے سفید کر دیا۔ تخت و تاج کی حرص نے اپنوں کو اپنوں سے جدا کر دیا۔ احمد ندیم قاسمی نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے ایک ہی قافیہ میں "دوہے" لکھے ہیں جن میں وہ سینکڑوں میل دور جنگی قیدیوں اور وطن میں ان کے اہلِ خانہ سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے مقتدر قوتوں کو سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہیں:

لالچ تاج و تخت کا ، کڑی کمان کا تیر
کھینچتا ہے ہر دور پر ، لہو کی ایک لکیر
دیکھے کل چوپال پر کئی امیر کبیر
قد اونچے ، طرّے بڑے ، ذرا ذرا سے ضمیر

دنیا کی تاریخ میں ڈھونڈیں کوئی نظیر
دور دیس میں قید ہیں ، جن بہنوں کے ویر
کون بڑھائے حوصلے ، کون بندھائے دِھیر
سب ہاتھوں پر خون ہے ، سب آنکھوں میں نیر

(دوہے، محیط)

اسی دور کے ایک بڑے شاعر ناصر کاظمی نے بھی اس دکھ کو شدت سے بیان کیا۔ ناصر کاظمی جنھوں نے پاکستان کی خاطر اپنا آبائی علاقہ چھوڑا تھااور ہجرت کا دکھ بھی جھیلا تھااور قیام پاکستان کے وقت قتل وغارت گری دیکھی تھی۔ جنھوں نے بستیوں کو اجڑتے دیکھا تھا۔ پھر انھیں سقوط ڈھاکہ کا دکھ جھیلنا پڑا۔ ان پر آشوب حالات نے ہجرت کے زخم کو پھر سے تازہ کر دیا۔ سقوط ڈھاکہ نے ان کے دل پر اتنا گہرا اثر کیا کہ وہ اس سانحہ کے بعد بمشکل چند سال تک زندہ رہ سکے اور باقی عمر اسی دکھ میں مبتلا رہے یہی وجہ ہے کہ ناصر کاظمی کے آخری دنوں کے کلام میں جابجا استعاروں اور علامتوں کی صورت میں مشرقی پاکستان اور اس کی عوام سے یکجہتی کا اظہار ملتا ہے۔ ان کی غزلوں ”کہیں اجڑی اجڑی سی منزلیں کہیں ٹوٹے پھوٹے سے بام ودر“، ”وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے“ اور دیگر میں مشرقی پاکستان کی سرزمین کے دریاؤں اور ملاحوں سے اظہار ہمدردی ہے۔ چونکہ مشرقی پاکستان میں دریاؤں کی فراوانی ہے اس لیے اسی نسبت سے اسے دریاؤں کی سرزمین بھی کہا جاتا ہے۔ کشتیاں اور ساحل اس سرزمین کے لیے عام استعارے ہیں۔ ناصر کاظمی نے اپنے اشعار میں ان ساحلوں اور کشتیوں کو جابجا یاد کیا ہے۔ ان کی شاعری میں ناؤ ، دریا، رات ، لوگ کی علامت استعمال ہوئی ہیں۔ یہ علامات اس دور کے پر آشوب ہونے کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان کی شاعری اس عہد گم گشتہ کا نوحہ ہے جو کھو گیا لیکن اپنے پیچھے گہرے گھاؤ چھوڑ گیا۔

رات ڈھل رہی ہے　　ناؤ چل رہی ہے
برف کے نگر میں　　آگ جل رہی ہے
لوگ سو رہے ہیں　　رت بدل رہی ہے
آج تو یہ دھرتی　　خون اگل رہی ہے
خواہشوں کی ڈالی　　ہاتھ مل رہی ہے

(رات ڈھل رہی ہے، دیوان)

ناصر کاظمی کی شاعری میں استعاروں کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ انھوں نے اس عظیم سانحہ کو استعاروں میں یوں بیان کیا:

دھواں سا ہے جو یہ آکاش کے کنارے پر
لگی ہے آگ کہیں رات سے کنارے پر
صدائیں آتی ہیں اجڑے ہوئے جزیروں سے
کہ آج رات نہ کوئی رہے کنارے پر
یہاں تک آئے ہیں چھینٹے لہو کی بارش کے
وہ رن پڑا ہے کہیں دوسرے کنارے پر

(دھواں سا ہے جو یہ آکاش کے کنارے پر، دیوان)

مجید امجد نے سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے جو نظمیں لکھیں ان میں احساس زیاں بھی ہے اور احساس جدائی کی کسک بھی۔ وطن کے دولخت ہو جانے کا دکھ ہر دل میں پنہاں ہے لیکن مجید امجد کی نظموں میں یہ منفرد انداز میں ابھرتا ہے۔ مجید امجد کی نظمیں، ہم تو سدا، اے قوم، ۲۱ دسمبر ۱۹۷۱ء اور ریڈیو پر اک قیدی، میں احساسِ زیاں نمایاں ہے۔

بنگلہ دیش کی دھرتی کو دریا، سمندر اور ریت سے خاص نسبت ہے۔ مجید امجد نے اسی نسبت کو بہت خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ مجید امجد کی نظم "سب کچھ ریت" اسی نسبت کا اظہار ہے اور ریت کی علامت میں سقوط ڈھاکہ کا منظر پیش کرتے ہیں:

کیسی ہے یہ بھوری اور بھسمنت اور بھربھری ریت
جس کے ذرا ذرا سے ہر ذرّے میں پہاڑوں کا دل ہے
ابھی ابھی ان ذروں میں اک دھڑکن تڑپی تھی
ابھی ابھی اک سلطنت ڈوبی ہے
ابھی ابھی ریت کی سلوٹوں کا اک کنگرہ ٹوٹا ہے
سب کچھ ریت...... سرکتی ریت......!

(سب کچھ ریت، فردا)

مجید امجد کے ہر لفظ میں بنگال کی جدائی کا دکھ محسوس ہوتا ہے کیونکہ بنگال شعرا کے سینے میں دھڑکتا تھا۔ اس کی جدائی کئی سالوں تک دل کی پھانس بنی رہی۔ مجید امجد کی نظم "۸ جنوری ۱۹۷۲ء" میں بنگال کی جدائی اور وہاں کے ظلم و ستم کا دکھ نمایاں ہے:

ان سالوں میں،

سیہ قتالوں میں

چلی ہیں جتنی تلواریں بنگالوں میں

اُن کے زخم اتنے گہرے ہیں روحوں کے پاتالوں میں

صدیوں تک روئیں گی قسمتیں جکڑی ہوئی جنجالوں میں

ظالم آنکھوں والے خداؤں کی ان چالوں میں

دکھوں، وبالوں میں،

قحطوں، وکالوں میں،

کالی تہذیب کی رت آئی ہے اجالوں میں، (۸ جنوری ۱۹۷۲ء، فردا)

قیوم نظر جو قومی و ملّی نغموں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں، وطن پرستی ان کے فن کا لازمہ ہے۔ ان کی شاعری کے ہر لفظ میں وطن سے محبت چھلکتی ہے گویا وطن ہی ان کی زندگی کا مقصد ہے اور جب وطن پر ایسا کڑا وقت آپڑے کہ اس کا ایک لازمی حصہ اس سے جدا ہو جائے تو قیوم نظر جیسا حساس شاعر کیسے خاموش رہ سکتا ہے؟ وطن کی کہانی جو کئی سالوں کی جہد مسلسل کا ثمر ہے اگر اس میں ایسا موڑ آجائے کہ صدیوں کے چاہنے والے ایک دوسرے سے دور ہو جائیں تو طبیعت میں بھونچال آجانا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ "سقوط ڈھاکہ" ایسی ہی نظم ہے:

کیا کہیں دیکھا ہے دن — کس طرح ڈوبا ہوا

اک سمندر آگ کا — تا افق پھیلا ہوا

اک دریا خون کا — موج موج اٹھتا ہوا

اک دوزخ ظلم کا — ہر طرف کھلتا ہوا

اک شعلہ جبر کا — سر بسر جلتا ہوا

ہر گھڑی دیوار سے — اک جواں لٹکا ہوا

ہر گلی کے موڑ پر — ایک سر چٹخا ہوا

ہر جگہ ہے نیزہ بلند — جس پہ دل ٹانکا ہوا

عضو عضو انسان کا — جابجا بکھرا ہوا

کیا کہیں دیکھا ہے دن — کس طرح ڈوبا ہوا

(سقوط ڈھاکہ، قلب و نظر کے سلسلے)

قیوم نظر نے اپنی نظموں میں جنگوں کے بارے جذباتیت کا اظہار کیا ہے کیونکہ وہ جنگوں کا جائزہ ایک حساس شاعر کی آنکھ سے لیتے ہیں۔اسی لیے ان کے اندر کا انسان، وطن اور اہلِ وطن سے محبت کیوجہ سے انھیں قلم اٹھانے پر تیار کرتا ہے۔ کمال پور وہ علاقہ تھا جہاں پاکستانی فوج کو ہتھیار ڈالنا پڑے اور ملک دولخت ہو گیا لیکن اس سے پہلے کمال پور میں افواج پاکستان بے جگری سے لڑیں پھر یہی مجاہدین دشمن کی قید میں قیدی بن کر گئے۔ قیوم نظر کی نظم "کمال پور میں جو لڑے" اس واقعہ کی کہانی ہے۔

کمال پور میں جو لڑے
مجاہدوں نے کفر کیا
کیا جو چاک پیرہن
انھیں مِلّی وہ زندگی
عجب ہے جس کا نام ہے
بہشت آفریں وطن
جہاں کو درس دے گئے
کمال پور میں جو لڑے

(کمال پور میں جو لڑے، قلب و نظر کے سلسلے)

کمال پور اس حوالے سے امر ہو گیا کہ شکست کے باوجود عساکرِ پاکستان نے اپنا روایتی جوش و جذبہ ترک نہ کیا۔ یہاں سے جنگی قیدی بنائے جانے والے مجاہدین نے دشمن کی قید میں اذیتوں کا مقابلہ کیا لیکن وطن کے خلاف ایک حرف تک نہ کہا۔ سازشوں نے ملک کو دولخت کر دیا لیکن افواجِ پاکستان کے جذبات میں عشقِ وطن کی شدت میں کوئی کمی نہ لا سکیں۔

سید ضمیر جعفری جو خود بھی ایک فوجی آفیسر کی حیثیت سے فرائض سرانجام دے چکے تھے، ۱۹۷۱ء کی جنگ میں افواجِ پاکستان کی پسپائی کے باوجود انھوں نے افواجِ پاکستان کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ کمال پور کی لڑائی کو بہت سے شعرا نے اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔ سید ضمیر جعفری اپنی نظم "کمال پور کا دستہ" میں افواجِ پاکستان کی ہمت و حوصلہ کو بھرپور داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

کمال پور کا دلیر دستہ
وہ شیر لشکر کا شیر دستہ
زمیں کی شمعو! گواہ رہنا! فلک کے تارو گواہ رہنا

اداس کھیتو! جلی منڈیرو! لٹی بہارو گواہ رہنا
وفا کے بیدار منزلوں میں!
غنیم کے سرد مقتلوں میں!
ہماری تاریخ کی شفق رنگ یادگار! گواہ رہنا
ہمیشہ روشن و ہمیشہ زندہ
کمال پور کا دلیر دستہ
وہ شیر لشکر کا شیر دستہ (کمال پور کا دستہ، ہفت روزہ ہلال)

ضمیر جعفری نے ۱۹۷۱ء کی جنگ میں جہاں پاکستان کی بہادر افواج کو بہادری کی مثال قرار دیا ہے اور ان بہادروں کی عظمت کی داد رسی کی اور یہ یقین دلایا کہ پسپائی اور شکست کے باوجود ان کی ہمت اور حوصلے میں کمی نہیں آئی اور دنیا میں ان کی دھاک تاحال برقرار ہے، وہیں انھوں نے شکست کے ذمہ داروں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ شکست کی صورتِ حال کو اپنی طویل نظم "گنر شیر خان" میں لکھتے ہیں:

الٰہی یہ کیا ماجرا ہو گیا
"نیازی" نے "اروڑا" کو با چشمِ تر
کیا پیش جب اپنا ریوالور
تو اک پل میں صدیوں کا خوں ہو گیا (گنر شیر خان)

مسلمان مجاہدین کی یہ شان ہے کہ وہ آخری دم تک لڑتے ہیں اور شہادت یا غازی میں سے کوئی ایک رتبہ پاتے ہیں۔ جنگ میں بھاگ جانا یا دشمن کے آگے ہتھیار پھینک کر شکست تسلیم کر لینا ایک مسلمان مجاہد کا شیوہ نہیں ہے اس لیے جب پاکستانی جنرل امیر عبداللہ نیازی نے بھارتی جنرل جگجیت سنگھ اروڑا کے آگے ہزاروں کے لشکر کے ساتھ ہتھیار ڈال دیے تو غیور مسلمانوں کے لیے یہ لمحہ بہت درد انگیز تھا اور پوری قوم اس غم میں مبتلا تھی کہ پاکستان کی اتنی بہادر فوج کیسے شکست کھا گئی؟ ضمیر جعفری اس شکست کی وجہ بھی اسی نظم میں پیش کرتے ہیں:

یہ جانباز لشکر نہ کھاتا شکست
مگر تھا قیادت کا کردار پست
عزائم تو بیدار سینوں میں تھے
مگر سانپ بھی آستینوں میں تھے (گنر شیر خان)

گنر شیر خان مشرقی پاکستان کے تناظر میں لکھی گئی سید ضمیر جعفری کی ایک طویل نظم ہے جو پاک فوج کے ایک جوان شیر خان کی زندگی کے گرد گھومتی ہے۔ شیر خان ایک باہمت اور محب وطن نوجوان ہے جو پاک فوج میں ملکی حفاظت اور سلامتی کا مشن لے کر بھرتی ہوتا ہے اور جنگ میں بہادری سے لڑتا ہوا دشمن کو بھاگنے پر مجبور کر دیتا ہے لیکن جب قیادت کی طرف سے شکست تسلیم کرنے کا اعلان ہوتا ہے تو اس کا دل غم سے نڈھال ہو جاتا ہے۔ نظم "گنر شیر خان" کے بارے سید ضمیر جعفری لکھتے ہیں کہ یہ نظم مشرقی پاکستان کے المیے کے پس منظر میں لکھی گئی ہے جس کا مرکزی کردار ہماری جری اور جیالی فوج کا ایک نمائندہ جوان ہے جس کو میں نے گنر شیر خان کے نام سے پکارا ہے۔ "گنر" (GUNNER) کا لفظ نظم کے صوتی در وبست کی مناسبت سے منتخب کیا گیا" (۴۹) یہ نظم ۱۹۷۱ء کی جنگ میں شکست پر پاک فوج کے جذبات کی صحیح معنوں میں عکاسی کرتی ہے۔

جب قائد اعظم اور اقبال کا پاکستان دولخت ہو گیا اور شکست کے بعد ہزاروں کی تعداد میں پاک فوج دشمن کے ہاتھوں قید ہو گئی اور کئی ماؤں کے لال وطن کی نذر ہو گئے تو دشمن کو سبق سکھانے اور اپنے ساتھی آزاد کرانے کے لئے پاکستانی قوم اور خاص کر فوج میں بے چینی کی کیفیت پیدا ہو چلی تھی۔ ایسے میں عسکری مجاہدین و شعرا نے قوم کے جذبات کو سہارا دیتے ہوئے اس شکست کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور یہ مؤقف اپنایا کہ ایک پاکستان کی بجائے دو پاکستان اور ایک مسلم ریاست کی بجائے دو مسلم ریاستوں کا ظہور ہوا ہے۔ صوبیدار افضل تحسین ان مجاہد پاکستانی شعرا میں شامل ہیں جو شکست کو کفار کی اُڑائی ہوئی خبر سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ وہ ساتھی مجاہدین کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اپنی نظم "شکست کس نے کھائی ہے؟" میں کہتے ہیں:

شکست ہی کا تذکرہ، جگہ جگہ دہائی ہے!
گھٹا فسردگی کی آسمان و دل پہ چھائی ہے!
عجیب جگ ہنسائی ہے!
شکست کا غلغلہ ہے، یہ اتہام ناروا
بغیر اذن جنگ ہی؟
محاذ پر چلی ہے کوئی توپ یا تفنگ ہی؟
مجاہدوں کے سینوں میں دبی رہی امنگ ہی؟
شکست اک ہوائی ہے جو غیر نے اُڑائی ہے
کیسی کج ادائی ہے!
شکست کس نے کھائی ہے؟ (شکست کس نے کھائی ہے؟، ہفت روزہ ہلال)

حقیقت یہ ہے کہ شہید ہو جانے والا مفتوح نہیں ہوتا اس لئے صوبیدار افضل تحسین نے شہید ہو جانے والے مجاہدین کے رفقائے کار کو افسوس کرنے کی بجائے خوش ہونے کا کہا ہے اور اس نظم میں یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ شہید ہارتا نہیں بلکہ مسلمان کی اصل جیت تو شہادت پالینا ہے۔ دشمن خوش ہو کر خود کو دھوکہ دے رہا ہے۔ صوبیدار افضل تحسین اس امید پر یقین رکھتے ہیں کہ مجاہدین کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی اور ان شاء اللہ ایک دن پاکستان اور بنگلہ دیش پھر سے ایک ہو جائیں گے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستان اور بنگلہ دیش جدا ہو کر بھی ایک ہیں کیونکہ دونوں اسلامی ملک ہیں اور وقتی اختلاف ہونے کے باوجود دونوں میں مذہبی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

اردو ادب کے مشہور شاعر صہبا اختر جنھیں مشرقی پاکستان کی سرزمین سے دلی لگاؤ تھا اور اس کی محبت میں ان کی نظم "سنہرا دیس" صہبا کے قوتِ متخیلہ کی پیداوار ہے کیونکہ جب یہ نظم تخلیق کی گئی تھی اس وقت تک انھوں نے مشرقی پاکستان نہیں دیکھا تھا۔ اس نظم میں وہاں کے مناظر کی تفصیل، جزئیات نگاری، خوبصورت فضائیں اور محنتی لوگوں سمیت سبھی کا ذکر ملتا ہے۔ اس سنہرے دیس سے صہبا کا جذباتی تعلق تھا لہٰذا جب سقوط ڈھاکہ کا سانحہ پیش آیا تو اس سانحے نے ان کے وجود کو ریزہ ریزہ کر ڈالا لیکن وہ اپنے وجود کے ساتھ وطن کی ماؤں اور بہنوں کے منتشر وجود کو بھی سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سنو میری بہنو ، سنو میری ماؤ
نہ گریہ کرو اور نہ آنسو بہاؤ
تماشائے گلشن، بہار و خزاں ہے
کہ ہر ابتلائے وطن ، امتحاں ہے
جو مختار ٹھہرے ، وہ مجبور بھی ہے
یہی زندہ قوموں کا دستور بھی ہے

(سقوطِ ڈھاکہ، مشعل)

جنگ کی تباہ کاریاں انسانی زندگیوں کو الم ناک صورت حال سے دوچار کر دیتی ہیں۔ یہ الم ناک صورت حال ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد شدت کے ساتھ سامنے آئی۔ سقوط ڈھاکہ نے قوم کو اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا اور دوسری طرف ساتھیوں کی جدائی کا زخم رستا تھا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں عساکر پاکستان کے سپاہیوں کی کثیر تعداد جنگی قیدی بن گئی ان قیدیوں کی تعداد تقریباً نوے (۹۰) ہزار تھی۔ یہ قیدی ہندوستان کی جیلوں میں بند سالوں تک ظلم و ستم سہتے رہے۔ بھارتی جیلوں میں پاکستانی جنگی قیدیوں کے ساتھ انسانیت سوز مظالم روا رکھے گئے۔ جنگی قیدی جو

اس قوم کے اعضاء تھے۔ اپنوں سے دور دشمن کی حراست میں ملکی ہتک کے ساتھ دکھ کا باعث بھی تھے۔ لیکن اس صورت حال میں بھی جینا تھا اور ایک قوم بن کر ابھرنا تھا۔ اپنے زخموں کا علاج بھی خود ہی کرنا تھا اور دکھوں کا مداوا بھی اپنے آپ پر ہی منحصر تھا۔ ان حالات کے پیش منظر اردو شاعری نے رجائیت کا دامن نہ چھوڑا اور شعرا نے ملّی نغموں سے قوم کے زخموں پر مرہم رکھا۔

مجید امجد نے اپنی شاعری میں ان اسیر ان جنگ سے اظہار عقیدت کیا۔ ان کے جذبات و احساسات کی خوب ترجمانی کی اور قید میں بھی ان کے ساتھ ہونے کا احساس دلایا۔ یہ قیدی بھارتی جیلوں سے کبھی بذریعہ ریڈیو اپنے ہم وطنوں سے مخاطب ہوتے تو سقوط ڈھاکہ کے زخم رسنے لگتے۔ مجید امجد کی نظم "ریڈیو پر ایک قیدی" اس قسم کے حالات کا ردعمل لگتی ہے جس میں ایک قیدی ریڈیو پیغام کے ذریعے اپنی قوم کو دلاسہ دیتا ہے اور اپنی خیریت کا یقین دلاتا ہے لیکن قوم ایک لاعلاج مرض میں مبتلا ہو چکی تھی جس کے زخم کہ بھرنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ مجید امجد اپنی نظم "جنگی قیدیوں کے نام" میں ان الفاظ میں قیدیوں سے اظہارِ عقیدت کرتے ہیں:

وہاں جہاں مشکلوں سے آزاد گلشنوں کی ہوائیں پہنچیں
وہیں کہیں دور ادھر تمہاری دکھوں بھری کال کوٹھری تک
ہمارے ٹوٹے ہوئے دلوں کی صدائیں پہنچیں
دعائیں پہنچیں
وفائیں پہنچیں (جنگی قیدی کے نام، فردا)

اس وقت پاکستان کے تقریباً تمام ہی اردو شعرا نے جنگی قیدیوں کے ساتھ اظہار یکجہتی کیا اور وطن واپس آنے والے قیدیوں کو خوش آمدید کہا، انھیں وطن کی سرزمین پر آمد پر مبارک باد دی تھی۔ اہلیان وطن کی طرف سے تہنیت کے پیغامات پہنچائے۔ قیوم نظر نے جنگی قیدیوں کی آمد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے انھیں اہلیانِ وطن کے جذبات پہنچاتے ہیں۔ ان کی نظم "اسیر انِ جنگ کی واپسی پر" میں ان الفاظ میں خوشی کا اظہار ملتا ہے:

قدم قدم خوشبو لہرائی
نگر نگر گونجی شہنائی
خوشیاں تان پر تان اڑائیں
پربت وادی مل کر گائیں
تم آئے دل شاد ہوا ہے
سونا گھر آباد ہوا ہے (اسیر انِ جنگ کی واپسی پر، قلب و نظر کے سلسلے)

جنگی قیدی دوران قید نفسیاتی اذیت سے دوچار رہے۔ پسپائی کا دکھ ویسے ہی ناقابل برداشت تھا پھر دشمن کی قید نے اس اذیت کو دوچند کر دیا۔ اس صورت حال میں وطن اور اہل وطن کی طرف سے خوش آمدید کہے جانے کا احساس خوشگوار احساس تھا جس نے کسی حد تک قیدیوں کو زندگی کی طرف لوٹنے کے مواقع فراہم کئے۔

ماجد صدیقی بھی ان شعرا میں شامل تھے جن کا دل اس سانحہ پر شدت غم سے لبریز تھا۔ جب پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈالے تو انھوں نے اپنی نظموں "اے مرے افسردہ وطن " اور "میں ایک ماں ہوں" میں افسوس کا اظہار کرتے ہوئے پسِ پردہ ملوث عناصر پر کڑی تنقید کی اور اس واقعے کی مذمت کی۔ لیکن جب جنگی قیدی واپس آرہے تھے تو ان قیدیوں کا شاندار الفاظ میں استقبال کرتے ہیں۔ ان کی نظم "یوسفاں وطن کے نام" سے اقتباس:

تمہارے ایثار و عزم ہمت کو
اس وطن کا ہر ایک ذرہ
عقیدتوں کا محبتوں کا
خراج دینے کو مضطرب ہے
تمھارا آنا ، اداس راہوں ، حزیں نگاہوں
لپکتی باہوں کے واسطے وجہ سکوں ہے

(یوسفاں وطن کے نام، شاد باد منزل مراد)

قیدیوں کی وطن واپسی افواج پاکستان کی عظمت کی واپسی سے تعبیر کی گئی۔ قیدیوں کی صحیح سلامت واپسی نے حکومت کی کامیاب سفارت کاری کا اظہار بھی کیا۔ اپنے جسم کا ایک حصہ کھو کر باقی ملک اور عوام کو بچا کر قوم نے جینا تھا اور ایسا اسی صوت میں ممکن تھا جب عوام کے جذبات تر و تازہ ہوتے۔ شعرا نے یہ فریضہ بخوبی سرانجام دیا۔ جمیل الدین عالی جو قومی و ملّی نغمہ میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں اور انھوں نے ملّی نغموں میں خاصی شہرت پائی۔ جنگی قیدیوں کے حالات کے بارے میں وہ بھی بے بس دکھائی دیتے ہیں۔

اے دیس کی ہواؤ !
سرحد کے پار جاؤ
اور ان کو چھو کے آؤ
جن کے بدن کی گرمی
سانسوں میں بس رہی ہے

جن کے سخن کی نرمی

کانوں میں رس گئی ہے

(اے دیس کی ہواؤ سرحد کے پار جاؤ، جیوے جیوے پاکستان)

سقوط ڈھاکہ سے شعرا کے ہاں المیہ کا تاثر ظاہر ہوا۔ ملک کے دولخت ہونے کہ وجہ سے غم اور درد کی کیفیت کا تاثر نمایاں تھا۔ احمد ندیم قاسمی جن کی آواز باقی شعرا میں منفرد محسوس ہوتی ہے۔ ان کی نظم "میں روتا ہوں" اسی المیے کا دکھ لیئے ہوئے ہے جبکہ احمد فراز جو مزاحمتی شاعری میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں اور جنھوں نے ہر دور میں آمریت کے خلاف آواز بلند کی ہے، ۱۹۷۱ء کے سانحے کے بعد جنگی قیدیوں کے حوالے سے ان کی نظم "میرے اپنے لوگو" میں ان جذبات کا اظہار ملتا ہے:

بس آ بھی جاؤ

کہ کبھی دن تو پھریں بے سروسامانوں کے

کہ کبھی زخم سلیں چاک گریبانوں کے

"ندیاں سوکھ گئیں

شوق میں طوفانوں کے"

اور اب ساعتِ دیدار

جب آئی ہے تو کیا دیکھتا ہوں

آنے والے سفر درد سے لوٹے ہیں

تو ان کے پیکر

اتنے بے رنگ ہیں بے جان ہیں

جیسے کبھی زندہ ہی نہ تھے (میرے اپنے لوگو!، شبِ خون)

احمد فراز سقوط ڈھاکہ کو اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں ان کے نزدیک وطن کا دولخت ہو جانا، شناخت کے چھن جانے کی طرح ہے۔ یہ احساس انھیں خون کے آنسو رلاتا ہے۔

عزیز جہاں ادا جعفری جو اردو ادب میں توانا نسوانی لہجہ ہے اور اردو شاعری میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہیں، ان کے ہاں بھی سانحہ مشرقی پاکستان کے رد عمل کے طور پر غم انگیز لہجہ ملتا ہے۔ ایک عورت جو رشتوں کو اپنا سب کچھ سمجھتی ہے اس کے لیے رشتوں کی پامالی سے بڑھ کر کوئی سانحہ اور دکھ نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی نظم "کوئی پیاں نہیں" میں ایسے ہی دکھ کا اظہار کرتی ہیں:

رشتہ درد فرسودہ زنجیر تھی

آج زنجیر توڑ دی گئی

پیار کے گیت ہونٹوں پہ ہیں منجمد

آج احساس کی رسم دیرینہ چھوڑی گئی

آج کھیتوں میں نفرت کی فصلیں اگیں

میرے اپنے درختوں کی شاخیں صلیبیں بنیں

میرے بچوں کو کیسی امانت مِلّی

خون میں لتھڑا ہوا ہے سپہ پیرہن

میری نسلوں کو میری وراثت مِلّی (کوئی پیمان نہیں، غزالاں تم تو واقف ہو)

اسی طرح پروین شاکر کی نظم "مفاہمت" میں پوری قوم کی شکست و بے وفائی کی کاٹ نظر آتی ہے کیونکہ میدانِ جنگ میں پسپائی اختیار کرنے والوں سے میدان عشق میں بھی وفا کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ وہ اپنے محبوب کو مثلِ شکست خوردہ قوم قرار دیتے ہوئے قومی غیرت کو جگانے کی بھرپور کوشش کرتی ہیں۔

سو تم نے بھی اب

ایک ہاری ہوئی قوم کے رہنما کی طرح

اپنے ہتھیار دشمن کے قدموں میں رکھ کر

نئی دوستی کا لرزتا ہوا ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا ہے

اور — میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے

کہ ہتھیار دینے کی اس رسم میں

کیا کروں

تمہاری چمکدار، متروکہ تلوار کو

بڑھ کے چوموں

کہ اپنے گلے پہ رکھوں؟ (مفاہمت، خوشبو)

۱۹۷۱ء کے گھاؤ اب تک عوام کے دلوں میں زندہ ہیں۔ یہ سانحہ سازشوں کی کامیابی تھی اور جذبوں کی شکست۔ عوام کے دلوں میں پلنے والی منافرت کا بروقت سدباب نہ کیا گیا۔ یہ نفرت پھل پھول کر تناور درخت بن گئی جس نے پاکستان سے اس کا ایک بازو جدا کر دیا۔ اس جنگ کے رد عمل میں ابھرنے والی شاعری میں المیہ کا تاثر

نمایاں ہے۔ محسن احسان، امجد اسلام امجد، شہزاد احمد، ماجد صدیقی، علی عباس زیدی، رفعت سلطان، ایوب خاور، ریاض احمد، نعیم صدیقی، جون ایلیا، ریاض مجید، اور صہبا اختر کے ہاں اس المیے کے گہرے اثرات ملتے ہیں۔

پاکستانی عوام فوج کے ساتھ ہیں۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں، ۱۹۶۵ء کی جنگ کی طرح مغربی پاکستان کی عوام نے اپنی فوج کا بھرپور ساتھ دیا۔ سانحہ کے بعد بھی عوام نے فوج پر بھرپور اعتماد کیا۔ یہی وجہ تھی کہ دولخت ہونے کے بعد ملک پھر سے سنبھل گیا۔ پاکستانی افواج نے باقی ماندہ وطن کی حفاظت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔

### تنازع سیاچین اور مِلّی نغمہ نگاری:

پاکستان کے شمال مشرق میں بلند ترین پہاڑی سلسلے ہیں اور سکردو سے آگے انتہائی شمال مشرق کی طرف سیاچن کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ اسی کی دہائی میں بھارتی افواج نے ان بلند پہاڑی سلسلوں پر قبضہ کر کے پاکستانی علاقوں پر تسلط جمانا شروع کر دیا۔ بھارت کے اس فوجی اقدام کے مقاصد کے بارے میں محمد خان اشرف لکھتے ہیں کہ سیاچن کی جارحیت کے فوائد بھارت کے لیے تہہ در تہہ ہیں۔ بھارت خود کو اب علاقائی طور پر ایک حاوی قوت تصور کرتا ہے اور ایک مِنی سپر پاور بننے کا خواہشمند ہے۔ اس کی جنوبی ایشیا کے ممالک کے متعلق تمام پالیسیاں اس مقصد کی غماز ہیں"(۵۰) بھارت کے ان خطرناک عزائم کی وجہ سے پورے جنوبی ایشیا کا امن و سکون خطرے میں پڑا ہوا ہے۔

سیاچن کے علاقہ میں بلندی کی وجہ سے دشمن کی حرکات و سکنات پر نظر رکھنا آسان نہ تھا اور دفاعی صورتحال بھی نازک تھی۔ اس مشکل صورتحال میں پاکستانی افواج نے ہیلی کاپٹر کے ذریعے سیاچن کے علاقے میں افواج اور جنگی ساز و سامان پہنچایا۔ برف باری اور انتہائی بلندی کی وجہ سے یہ انتہائی دشوار اور کٹھن کام تھا، لیکن پاکستانی افواج نے اپنے تمام وسائل بروئے کار لاتے ہوئے انتہائی بلندی پر مورچہ بندی کی۔ بلند علاقے میں مورچہ بندی کی بدولت پاکستان کو کسی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن پاکستانی افواج نے انتہائی دلیری اور حکمت عملی سے جارحانہ انداز میں دشمن کو کسی حد تک پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ اب بھی پاکستانی افواج کئی سالوں سے انتہائی بلند اور سرد علاقوں میں مورچہ بندی کیے ہوئے ہیں اور نامساعد حالات کی وجہ سے اشیائے ضروریہ اور جنگی ساز و سامان کی رسد انتہائی دشوار کام ہے۔ بعض حالات میں تو یہ ناممکن ہو جاتا ہے لیکن عساکرِ پاکستان اپنی ہمت اور حوصلہ سے اس بلند ترین محاذ جنگ پر اپنی سبقت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

پاک فوج کے حوصلوں کو بلند رکھنے کے لیے فوجی اور غیر فوجی شعرا کے ہاں عساکرِ پاکستان کو خراج عقیدت پیش کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ میجر غضنفر عباس قیصر فاروقی اپنی نظم "اللہ کے سپاہی" میں مردانِ سیاچن کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

چلو سیاچن کی سرحد پر، علیؑ حیدر، علیؑ حیدر
بڑھو آگے مٹا دو شر، علیؑ حیدر علیؑ حیدر
جھلکیں باطل کے نہ دَر پر ، رہِ حق میں کٹیں یہ سر
زباں پہ اللہ اکبر ہو دل میں اک خدا کا ڈر
اٹھو جاگو میرے شیرو چلو سیاچن کی سرحد پر علیؑ حیدر علیؑ حیدر
بڑھو آگے اے شیر نر علیؑ حیدر علیؑ حیدر

(اللہ کے سپاہی، ہفت روزہ ہلال)

سیاچن جو کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں کے لیے دفاعی اہمیت کا حامل ہے اور دنیا کا بلند ترین میدانِ جنگ ہے ، کے پس منظر میں لکھی گئی نظموں میں کہسار ، پہاڑ ، برف ، سردی اس علاقے کے استعارے ہیں۔ یہ استعارے مشکل ترین حالات میں پاکستانی افواج کے حوصلوں کے ترجمان ہیں اور ان مشکل ترین حالات کی علامت بھی ہیں جو عساکرِ پاکستان سیاچن میں برداشت کر رہے ہیں۔ سیاچن کے پس منظر کی شاعری میں پاکستان کی فضائی افواج اور بحری افواج کا ذکر بھی نمایاں ہے۔ فلائیٹ لیفٹیننٹ نوید شبلی کی نظم "میرے شاہین اور ملاح میرے غازی جوان" ایسے ہی جذبات کا اظہار ہے:

میرے شاہین اور ملاح میرے غازی شیر جواں
ان سب کا ہاتھ خدا، ان سب کا دل قرآں
یہ جم کر لڑتے ہیں
یہ تھم کر لڑتے ہیں
بس رب سے ڈرتے ہیں
بس آگے بڑھتے ہیں
ان کا والی وارث میرا سوہنا رب رحماں
میرے شاہین اور ملاح میرے غازی شیر جواں

(میرے شاہیں اور ملاح میرے غازی شیر جواں، ہفت روزہ لہلال)

اکرم باجوہ جو قومی و ملّی نغموں کے عہدِ حاضر کے شاعر ہیں اور ان ملّی نغموں میں موضوعات کی کئی جہتیں سمیٹے ہیں، انھوں نے بھی سیاچن کے موضوع کو اپنے نغموں کا حصہ بنایا ہے۔ وہ اپنی نظم "فخر وطن، فخر جہاں" میں سیاچن کے مجاہدوں کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

پربت کی برفیلی چوٹی، سیاچن ہے مشہور
تند و تیز ہے موسم جس کا قاتل اور مغرور
یخ بستہ اور تیز ہوائیں، خنجر بن کر کاٹیں
برفانی طوفان کے ریلے خون بدن کا چاٹیں
سبز ہلالی پرچم چوم کے سیاچن پر لہرایا
کالی رات کا جادو توڑا ، عدو کا کیا صفایا

(فخر وطن، فخر جہاں، تکبیر کا رنگ للکار ہوا)

سیاچن دنیا کا بلند ترین محاذ تسلیم کیا جاتا ہے جہاں سالہا سال برف جمی رہتی ہے لیکن ہماری پاک فوج نے بھی گلشن کے تحفظ کی قسم کھائی ہوئی ہے لہٰذا سیاچن کے برف پوش پہاڑ ہوں یا کشمیر کی حسین وادی، ہمارے مجاہد ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ سیاچین کے مجاہدین کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے لیفٹیننٹ کرنل سید نواب عالم بارہوی ملّی نغمہ "سیاچن کے مجاہدوں کی للکار" میں سیاچن کے مجاہدوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

اٹھو اٹھو کہ جہاں نے ہمیں پکارا ہے
ہمارا جوش جنوں قوم کا سہارا ہے
جو ہم میں دم ہے تو سارا جہاں ہمارا ہے
کوئی ہمارا مقابل ہو کس کو یارا ہے
یہ برف پوش سیاچن کی سختیاں کیا ہیں
دفاعِ ملک میں ہر امتحاں گوارا ہے

(سیاچن کے مجاہدوں کی للکار، ہفت روزہ ہلال)

یخ بستہ ہواؤں اور بلند چوٹیوں پر وطن کی حفاظت کرنے والے پاک فوج کے جوان داد کے مستحق ہیں اور یہ ضروری ہے کہ ان کی جفاکشی کو سراہا جائے۔ سیاچن کی بلندیاں جہاں کا درجہ حرارت منفی ۴۰ درجے تک گر جاتا ہے جہاں پینے کے لیے پانی میسر نہیں ہوتا، جہاں کھانے کے لیے خوراک میسر نہیں ہوتی اور جہاں پر فرائض سرانجام دینے والے جوان طویل عرصے تک اپنے خاندان اور اپنے اہل عیال سے بے خبر زندگی گزارتے ہیں۔

ان کا حوصلہ ان کہساروں سے زیادہ بلند ہے اور ان کی ہمت سیاچن کے موسم سے زیادہ شدت رکھتی ہے۔ سیاچن کی یخ بستہ ہوائیں عساکرِ پاکستان کے جذبہ حب الوطنی کو سرد نہیں کر سکتیں نہ ہی ان کے شوق شہادت کو ٹھنڈا کر سکتی ہیں۔

## معرکۂ کارگل اور ملّی نغمہ نگاری:

کارگل کشمیر کی جنگ بندی کی سرحد کے ساتھ ایک سیکٹر ہے چونکہ کشمیر کے علاقے میں ہمیشہ ہی سے بھارتی اور پاکستانی افواج برسرِپیکار رہی ہیں اور وقتاً فوقتاً دونوں اطراف کی گولہ باری سے یہ محاذ اکثر ہی گرم رہتا ہے۔ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۵ء کی جنگ کی سب سے بڑی وجہ بھی کشمیر کا تنازع ہی تھا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد دونوں ممالک کے درمیان سرحدی جھڑپوں کا سلسلہ جاری رہا، معرکہ سیاچن کے موقع پر کئی بڑی جھڑپیں ہوئیں، لیکن شدید جنگ کی صورتحال پیدا نہ ہوئی تھی۔ ۱۹۹۹ء میں بھارت کی طرف سے کارگل اور اس سے ملحقہ علاقوں میں جارحانہ کاروائیاں زور پکڑنے لگیں جس سے مئی ۱۹۹۹ء میں باقاعدہ جنگی صورتحال پیدا ہو گئی۔ ونگ کمانڈر محمد نواز عاصم کے مطابق" کارگل آپریشن کا آغاز ۱۹۹۹ء کے موسم گرما میں کیا گیا، جس کے دوران پاکستانی فوجیوں نے بھارتی لائن آف کنٹرول کی دوسری جانب پوزیشنز سنبھال لیں جس سے بھارتی سپلائی لائن کٹ گئی، جس نے دلی سرکار کو حیرت زدہ کرکے رکھ دیا۔" (۵۱) پاکستانی افواج نے بھارتی فوجی رسد کی سپلائی مکمل کاٹ دی تھی لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چل سکا کیونکہ یہ آپریشن اس وقت کے آرمی چیف جنرل پرویز مشرف کا ذاتی فیصلہ تھا جس سے نہ صرف اس وقت کے وزیرِاعظم ناواقف تھے بلکہ بہت سے جرنیلوں سمیت جنرل ملٹری آپریشن جنرل توقیر ضیاء بھی اس سے لاعلم تھے۔ ونگ کمانڈر محمد نواز عاصم جنرل شاہد عزیز کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ان کا کہنا تھا کہ ابتدائی طور پر کارگل آپریشن کا علم صرف جنرل مشرف، چیف آف اسٹاف جنرل عزیز، فورس کمانڈ ناردرن ایریاز کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل جاوید حسن اور دسویں کور کے کمانڈر محمد احمد کو ہی تھا۔ کور کمانڈرز کی اکثریت کو بشمول چیف آف ائیر اسٹاف چیف مارشل پرویز مہدی قریشی اور پرنسپل اسٹاف آفیسرز کو اس آپریشن پر یکسر نظرانداز رکھا گیا تھا۔ جنرل عزیز کے مطابق یہاں تک کہ اس وقت کے ڈائریکٹر جنرل ملٹری آپریشنز DGMO لیفٹیننٹ جنرل توقیر ضیاء کو بھی بعد میں اس آپریشن کا علم ہوا۔" (۵۲)

سیاچن کے محاذ پر کھانے پینے کی اشیاء اور جنگی ساز و سامان گرما کے موسم میں پہنچایا جاتا ہے۔ سرما کے موسم میں شدید برفباری کے باعث رسد ممکن نہیں ہوتی۔ مجاہدین اور پاکستانی افواج نے بھارتی افواج کو سیاچن میں

محصور کر دیا اور کشمیر کے علاقے میں پیش قدمی کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس صورتحال میں بھارت نے عالمی طاقتوں سے مدد طلب کی۔ بیرونی طاقتوں کی مداخلت پر دونوں ممالک کی حکومتیں جنگ بندی پر رضامند ہو گئیں۔ جنگ بندی کے بعد بھارتی مقبوضہ علاقے بھارت کو واپس کر دیے گئے جس کے بعد افواج پاکستان اور بھارتی افواج کو جنگ سے پہلے والی جگہ پر واپس آنا پڑا۔ اس طرح کشمیر کی آزادی کا ایک اور موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

کارگل کی جنگ میں اگر پاکستانی فوج کی بہادری کی بات کی جائے تو وہ بے مثالی تھی۔ پاک فوج کا ہر جوان سپاہی سے آفیسر تک جس بہادری اور دلیری سے لڑا وہ قابلِ تحسین ہے۔ برف سے ڈھکے پہاڑ جہاں انسان اور جانور تو کیا گھاس کا تنکا تک نہیں اگتا، وہاں اپنی جانیں تک قربان کر کے پاکستان کی عزت و سربلندی کی لاج رکھی۔ کرنل عبدالرحمان بلال ملّی نغمہ میں پاک فوج کے مجاہدین کی اس شجاعت کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

سوز جاں داغ دل دکھایا ہے
پردہ کشمیر سے اٹھایا ہے
کارگل کے ہر اک شہید نے آج
آئینہ وقت کو دکھایا ہے
لڑ کے شیروں کی طرح دشمن سے
رسمِ شبیر کو نبھایا ہے
خالد و طارق و غوری بن کر
کفر کو خاک میں ملایا ہے

(قصہ کارگل، شجاعت کے تارے وطن کے سپاہی)

کارگل کی جنگ میں پاک فوج کے سینکڑوں نوجوانوں نے جام شہادت نوش کیا جن میں سے دو کو نشان حیدر سے نوازا گیا۔ ان میں پہلا نام کیپٹن کرنل شیر خان ہے۔ کرنل شیر خان نے کارگل کے میدان میں شجاعت و بہادری کے جوہر دکھائے اور دشمن کو شدید جانی اور مالی نقصان پہنچایا۔ ایم آر شاہد "شہیدانِ وطن" میں لکھتے ہیں کہ کرنل شیر جذبۂ شہادت سے اس قدر سرشار تھے کہ وہ پوسٹ پر دشمن کے حملے کے وقت پوسٹ سے باہر نکل کر دشمن کو للکارتے اور بھاگتے ہوئے دشمن کا کافی دور تک تعاقب کر کے انھیں بھاری نقصان پہنچاتے تھے۔(۵۳) کیپٹن کرنل شیر خان نے اپنے نام اور ملک کی عظمت کی لاج رکھتے ہوئے شہادت پائی اور ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید ہو گئے۔ لیفٹیننٹ محمد شہزاد نیّر کارگل کے شہیدوں کی عظمت ملّی نغمہ میں بیان کرتے ہیں:

مثالِ مطلعِ تاباں ہیں کارگل کے شہید
پیامِ صبح درخشاں ہیں کارگل کے شہید
حریمِ ظلم کے اندر بجھے اندھیر میں
چراغ بن کے فروزاں ہیں کارگل کے شہید
فصیلِ حق و یقیں پر جو خوب لہرایا
وہی تو پرچمِ فشاں ہیں کارگل کے شہید

(وقار و عظمتِ ایماں ہیں کارگل کے شہید، شجاعت کے تارے وطن کے سپاہی)

کارگل کے محاذ پر دوسرے نوجوان جنھوں نے نشانِ حیدر حاصل کیا وہ حوالدار لالک جان تھے، حوالدار لالک جان نے میدان جنگ میں بہادری کا عملی مظاہرہ کیا اور دشمن کے علاقے میں گھس کر دشمن کو بھاری جانی اور مالی نقصان پہنچایا۔ اسی کارگل کے معرکے کے ایک مجاہد کیپٹن سردار اظہار حیدر شہید جنھیں ان کی شجاعت پر ستارۂ جرأت سے نوازا گیا، کیپٹن اظہار کی شہادت کے بعد ان کی جیب سے ایک پرچی نکلی جس پر تحریر تھا:

"شعورِ سجدہ نہیں ہے مجھ کو تو میرے سجدے کی لاج رکھنا
یہ سر تیرے آستاں سے پہلے کسی کے آگے جھکا نہیں تھا
میں وہ جنس ہوں یہاں پیار کی جو ملے کسی کو کبھی کبھی
مجھے خرچ کر ذرا سوچ کر میں بہت ہی کم ہوں بچا ہوا" (۵۴)

معرکۂ کارگل ہو یا کوئی بھی جنگ کا میدان، پاکستانی افواج کے غیور مجاہدین نے جانوں کے نذرانے وطنِ عزیز پہ نچھاور کر دیے لیکن ہمیشہ میدانوں میں فتح حاصل کی ہے اور ملک کی عزت و ناموس پر کبھی حرف نہیں آنے دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس ملک کی قیادت نے جیتی ہوئی جنگ اکثر مذاکرات کی میز پہ آ کر ہار دی اور فوج کی قربانیوں کا خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا جس کا پوری قوم کو ملال ہے۔

## (ج) بیرونی جنگوں اور اندرونی خلفشار کے تناظر میں ملّی نغمہ نگاری

بیسویں صدی عیسوی کا دور جنگوں کے عروج کا عہد کہلاتا ہے جس میں دو بڑی جنگوں کے ساتھ جنگ بلقان، روس جاپان جنگ، جنگ کوریا، بھارت چین جنگ، جنگ ویتنام، پاک بھارت جنگ، عرب و اسرائیل جنگ، روس افغان جنگ، عراق امریکہ جنگ، امریکہ افغان جنگ نمایاں ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں اقوام متحدہ کے قیام کے باوجود جنگوں کی تعداد اور شدت میں کمی نہیں آئی البتہ اس کے بعد عالمی جنگوں جیسی کسی بڑی جنگ کی نوبت نہیں آئی۔

جدید حربی ہتھیاروں کی ایجاد کے ساتھ ہی جنگیں بھی زیادہ تباہ کن ہوتی گئیں اور ان کے اثرات بھی وسیع تر ہوتے گئے۔ جنگوں کے اثرات کی وسعت کے ساتھ اردو شاعری کا لب و لہجہ بھی آفاقی ہو گیا اور ادب میں انسان دوست رجحانات کو فروغ حاصل ہونے لگا۔ عالمی ادبی منظر نامے میں دنیا کی جن زبانوں نے ظلم و استبداد کے خلاف آواز بلند کی ہے ان میں اردو بھی شامل ہے اور اردو شاعری نے اس عمل میں متحرک کردار ادا کیا ہے۔

عالمی جنگوں اور خاص کر اسلامی ممالک میں غیر اسلامی قوتوں کے حملوں اور ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں نے اردو شاعری کو خاص کر متاثر کیا ہے۔ فلسطین، کشمیر، عراق اور افغانسان سمیت تمام متاثرہ اسلامی ممالک اردو ملّی نغموں کا اہم موضوع ہیں۔ افغانستان روس جنگ، امریکہ افغان جنگ اور امریکہ عراق جنگ کے دوران تخلیق ہونے والے ادب میں انسان دوستی کا تصور نظر آتا ہے اور جنگ و بربریت کو ظلم سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔

## افغان روس جنگ اور ملّی نغمہ نگاری:

افغانستان کا علاقہ ہمیشہ سے جنگ و جدل کا مرکز رہا ہے کیونکہ عالمی حملہ آور اس علاقے پر قبضہ کرنے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ خود افغان حکمرانوں نے بھی ارد گرد کے علاقوں پر حملہ آور ہو کر اپنا تسلط قائم کیا۔ محمود غزنوی، احمد شاہ ابدالی اور مغل سلاطین افغانستان ہی کے راستے برصغیر پر حملہ آور ہوئے اور اپنی حکومت قائم کی۔ ۱۹۷۹ء تک امریکہ اور روس دو عالمی طاقتیں تسلیم کی جاتی تھیں اور دونوں عالمی طاقتیں ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لیے سرد جنگ میں مبتلا رہتی تھیں۔ اس دوران روس نے افغانستان پر حملہ کر دیا تو امریکہ نے موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے افغانستان کے ساتھ مذہبی رشتہ داری ہونے کی وجہ سے پاکستان کو بالواسطہ اس جنگ میں ملوث کر دیا اور روس کے خلاف پاکستان کی بھرپور پشت پناہی شروع کر دی۔ دوسری طرف مذہبی حلقوں سے اس جنگ کی حمایت حاصل کی گئی اور جہاد کا نعرہ بلند ہوا۔ یہ نعرہ پاکستان سے نکل کر بہت سے اسلامی ممالک میں پھیل گیا۔ یوں امریکہ افغان روس جنگ میں اسلام کا مذہبی کارڈ استعمال کرتے ہوئے امریکہ کو سبقت حاصل ہوئی اور روس کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔

افغان روس جنگ کے دوران اردو ادب میں دو رویے سامنے آئے اور یہ دونوں رویے اپنی اپنی انتہا پر تھے۔ ایک رویہ مکمل طور پر جنگ کے خلاف تھا جبکہ دوسرا رویہ اس جنگ کو اسلام کی بقا سمجھ کر جہاد قرار دے رہا تھا۔ دوسرے رویے کے زیر اثر ایسی شاعری تخلیق ہوئی جس نے افغان جنگ کو تحریک بخشی۔ ۱۹۸۱ء میں افغان جنگ کے موضوع پر شاعری کی ایک کتاب "کربلا سے کابل تک" تحسین فراقی اور غافل کرنالی نے مرتب کی۔

جس میں جنگ افغانستان کے موضوع پر ۴۸ نظمیں شامل ہیں۔اس کے معروف نظم نگاروں میں نعیم صدیقی، حفیظ تائب، طفیل ہوشیار پوری، مظفر وارثی، عطاالحق قاسمی، جلیل عالی، غافل کرنالی، انور مسعود اور تحسین فراقی شامل ہیں۔ کتاب کا دیباچہ جو خواجہ محمد زکریا نے ”حرف چند“ کے عنوان سے لکھا، جس میں افغان جنگ سے مسلمانوں کے رشتے کے حق میں دلائل دیئے گئے۔

افغانستان جنگ کو تمام دنیا کے مسلمانوں کی جنگ اور مشترکہ درد تصور کیا گیا جس کی بنا پر نہ صرف پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام کے مسلمانوں نے جذبہ جہاد اور طلبِ شہادت کی نیت سے شرکت کی جبکہ ادبا اور شعرا نے اس جنگ کے تناظر میں ادب تخلیق کیا۔سید ضمیر جعفری نے ”درد مشترک“ کے عنوان سے ایک فلپائنی مجاہد آزادی الاگی فضل کے ایک انگریزی خط کا ترجمہ نظم کی صورت میں کیاہے۔اقتباس ہے:

شرق میں
غرب میں
دشمن اپنے مشترک
استعمار زادگانِ استمار
اپنا نصب العین ایک
ایک جلیل تاب وتب
روز وشب
درد ایک دین ایک
عہد اک، یقین ایک
اک کتاب
(زندگی کی آب وتاب)
چاہ ایک
راہ ایک
نقطہ نگاہ ایک
اک رسول ﷺ
اک خدا
لا الہٰ الا اللہ! (درِد مشترک، قریۂ جاں)

افغان روس جنگ میں پاکستان کے تمام علاقوں سے بھی مجاہدین نے افغان مجاہدین کا بھرپور ساتھ دیا اور اس جنگ میں برابر شریک رہے۔ افغانستان ایک اسلامی ملک ہونے کی حیثیت سے پاکستانی عوام نے افغان عوام کے درد کو اپنا درد سمجھ کر محسوس کیا۔ یہ واحد موقع تھا جب امتِ مسلمہ صحیح معنوں میں اپنے اسلامی بھائیوں کی مدد کے لیے یکتا ہو گئی تھی۔ دوسرے لفظوں میں اس جنگ کو اسلام اور کفر کی جنگ قرار دے کر افغان مجاہدین سے مِلّی جذبے کا اظہار کیا گیا ہے۔

جمشید خان دکھی کی نظم "افغان مجاہدین کے نام" سے اقتباس ہے:

صدقے میں ترے ، جرأت و عظمت پہ میں قرباں
مولا تمھیں دے حوصلہ ارفع مرے افغاں
نکلا ہے ترے دم سے ہی رشیا کا جنازہ
دنیا تری ہمت پہ ہے انگشت بدنداں
تازہ ہوئیں پھر سے مرے اسلاف کی یادیں
باقی ہے زمانے میں ابھی خالدؓ و سلماںؓ
ایکا جو تمہاری یونہی ہر دم رہے قائم
چھا جائیں جہاں بھر میں ہر اک سمت مسلماں

(افغان مجاہدین کے نام، شمالی علاقے کا اردو ادب)

### افغانستان امریکہ جنگ:

سوویت یونین کی تحلیل کے بعد امریکہ دنیا کی واحد سپر پاور کی شکل میں سامنے آیا۔ دنیا میں اجارہ داری کی خواہش ہمیشہ سے مقتدر قوتوں کا خاصہ رہا ہے۔ بالخصوص سیاسی اور فوجی طور پر کمزور علاقے ان قوتوں کا نشانہ بنتے آئے ہیں۔ افغانستان کا علاقہ جو پہلے ہی جنگ سے تباہ حال تھا اور گزشتہ طویل عرصے سے مضبوط سیاسی طاقت سے محروم بھی۔ مزید بر آں افغان روس جنگ نے علاقے کی زبوں حالی میں اہم کردار ادا کیا تھا جس میں امریکہ بالواسطہ ملوث رہا تھا۔ امریکی خاصیت ہے کہ اپنا مفاد ختم ہونے کے بعد یہ اپنے دوستوں کے لیے بھی خطرہ بن جاتا ہے یعنی اس کی دوستی اور دشمنی دونوں خطرناک ہیں لہٰذا جب اسلام پسند عناصر سے اس کا کوئی مفاد نہ رہا تو اس نے اپنی روایت بر قرار رکھتے ہوئے ان کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا جس کی ابتدا ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعہ سے ہوئی۔ یہ مشہور واقعہ جس کو ۱۱/۹ کہا گیا ہے، اپنے ساتھ تمام دنیا بالخصوص اسلامی ممالک کے لیے دہشت گردی کی بھرپور

لہر لے کر آیا جس سے لاکھوں افراد لقمۂ اجل بن گئے اور دہشت گردی سے متاثرہ علاقے سیاسی اور معاشی بدحالی کا شکار ہو گئے۔

نائن الیون کا واقعہ چار طیاروں کا اغوا تھا۔ ان جہازوں میں دو جہاز ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی عمارت سے ٹکرائے جبکہ تیسرا جہاز امریکی وزارت دفاع کی عمارت پینٹاگون کے قریب گرا اور چوتھا جہاز کسی بھی جگہ کو ہدف بنائے بغیر پنسلوانیا میں گر کر تباہ ہو گیا۔ ان جہازوں کے گرنے سے جہازوں میں سوار مسافر اور متاثرہ علاقے بھی شدید تباہی اور بربادی کا شکار ہو گئے۔ ان جہازوں کا اغوا ہونا اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے ٹکرانا خود اپنی جگہ پر ایک معمہ ہے اور عجیب کہانی کو جنم دیتا ہے۔ اس صورتحال کے تکنیکی تجزیے اور تمام حقائق کا بغور مشاہدہ پاک فضائیہ کے ہوا باز ونگ کمانڈر محمد نواز عاصم اپنی کتاب "قومی سانحات اور اصل حقائق"، میں ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> "پہلی ناممکن بات یہ ہے کہ ایلومینیم سے تیار شدہ مسافر بردار طیارہ اس قدر مضبوط نہیں ہوتا کہ وہ اسٹیل سے تیار کردہ دیواروں اور ۱۴۷ اسٹیل سپورٹ ستونوں سے تیار کردہ عمارت سے گزر سکے، لہٰذا جہاز کے پر سخت چھری کی طرح اس انتہائی طاقت ور عمارت کی دیواریں نہیں کاٹ سکتے تھے۔ دوسری ناممکن بات یہ ہے کہ ویڈیو میں ظاہر کردہ جہاز کے رخ میں نمایاں ہونے والی عمارتیں واضح طور پر ورلڈ ٹریڈ سینٹر ٹاور کے عقب میں ہیں۔ فلائیٹ ۱۷۵ کے پر بلڈنگ کے سامنے ظاہر ہونے چاہیے تھے نہ کہ عقب میں۔ ۹/۱۱ ویڈیوز کو ڈیلی بلاگ کے مارکس ایلن نے legibly sharp کیا جو لاس اینجلس سے تعلق رکھنے والا امریکی شہری ہے۔ تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ CGI کی ری پریزنٹیشن تھی، الیکٹرونک میڈیا پر اس جعلی ویڈیو کو چلانے کا مقصد مسلم ممالک پر امریکی حملوں کا جواز پیدا کرنا تھا۔" (۵۵)

۹/۱۱ کے بعد ایک نام جو نمایاں طور پر ابھرا وہ اسامہ بن لادن کا ہے۔ اسامہ بن لادن ایک سعودی نژاد باشندہ تھا جو ۱۹۹۶ء میں سوڈان سے ہوتا ہوا افغانستان آ گیا اور طالبان سے اتحاد کر لیا۔ طالبان افغانستان، روس جنگ کا سب سے طاقت ور کردار ہیں جنھوں نے روس کو افغانستان سے نکلنے پر مجبور کیا تھا اور پھر افغانستان میں حکومت حاصل کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ افغان روس جنگ کے دوران طالبان کو روس مخالف حمایت حاصل رہی تھی اور بعد میں یہی حمایت مخالفت کا روپ دھار گئی تھی۔ مرتضیٰ انجم کے مطابق اسامہ بن لادن ہمیشہ میڈیا پر بات چیت کے خواہش مند رہے تاکہ وہ اپنا سیاسی ایجنڈا پیش کر سکیں کیونکہ ان پر ساری دنیا میں دہشت گردی کی کاروائیوں میں ملوث ہونے کے الزامات لگائے جاتے تھے۔ انھوں نے افغانستان سے اپنا پہلا انٹرویو لندن کے "دی انڈیپنڈنٹ" (The Independent) کے رابرٹ فسک کو دیا جس میں انھوں نے مطالبہ کیا کہ امریکی،

برطانوی اور فرانسیسی فوجیں سعودی عرب سے نکل جائیں۔ اس کے بعد انھوں نے پاکستانی صحافیوں کی پریس کانفرنس میں امریکہ اور اسرائیل کے خلاف "بین الاقوامی اسلامی محاذ برائے جہاد" قائم کرنے کا اعلان کیا۔"(۵٦)اس پس منظر کی وجہ سے ۹/۱۱ کے واقعے کی تمام ذمہ داری اسامہ بن لادن اور طالبان پر ڈال دی گئی لیکن یہ بات ابھی تک تحقیق طلب ہے کہ ۹/۱۱ کے واقعہ کے پیچھے اسامہ بن لادن کی سوچ کارفرما تھی یا یہ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے اور اسلامی ممالک پر چڑھائی کی ایک سازش تھی۔ بیشتر حقائق اسے امریکی سازش ثابت کرتے ہیں۔ مرتضیٰ انجم کا یہ اقتباس اس واقعے کے بارے میں امریکی سازش ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

"ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں چار ہزار سے زائد یہودی کام کرتے تھے لیکن اس مرکز کی تباہی سے ایک بھی یہودی ہلاک نہیں ہوا۔ دراصل گیارہ ستمبر کو یہودی ملازمین میں سے کوئی بھی ڈیوٹی پر حاضر نہیں تھا، کیونکہ یہودیوں کو اسرائیل انٹیلی جنس ایجنسی "شبک" کے ذریعے دہشت گردی کا قبل ازوقت علم ہو گیا تھا۔" (۵۷)

یہ بات انتہائی حیران کن ہے کہ دہشت گردی کی اطلاع صرف یہودی ملازمین کو تھی اور دیگر کسی ملازم کو نہ تھی۔ ۱۵ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکی صدر نے اپنے خطاب میں امریکی افواج کو جنگ کی تیاری کا حکم دیا، دوسری طرف افغانستان میں طالبان حکومت بھی جنگ کی پیشگی اطلاع پا چکی تھی۔ طالبان حکومت کسی طور پر امریکی مطالبات ماننے کے حق میں نہیں تھی۔ امریکی سینٹ سے اجازت کے بعد صدر بش نے امریکی افواج کو افغانستان جنگ میں استعمال کیا۔ پاکستانی صدر پرویز مشرف نے بھی پاکستانی عوام کی مرضی کے خلاف امریکہ کی ہاں میں ہاں ملادی اور پاکستان ایک دفعہ پھر سے قیادت کے فیصلوں کا مجرم ٹھہرا اور امریکی جنگ میں ملوث ہو گیا۔

امریکہ نے جواز پیدا کرنے کے بعد طالبان کو مٹانے کے لیے ۱۷اکتوبر ۲۰۰۱ء کو افغانستان پر حملہ کر دیا اس حملے کے بارے قاسم یعقوب لکھتے ہیں کہ ۳۰۰ ایف ۱٦ اور ایف ۱۵ لڑاکا طیارے ۳۵۰۰۰ ہزار ریزرو فوجی سعودی عرب، بحرین، خلیج فارس اور دوسری جگہوں سے بحری بیڑوں کی طرف روانہ کر دیے گئے۔ گائیڈڈ میزائل سے لیس یہ طیارے افغانستان کے شہروں پر بم برسانے لگے۔ امریکی جدید طیارہ ۵۸ ٹوبی نے کیمیائی مواد اور بارود کی بارش سے جلال آباد ، قندوز ، کابل ، ہرات، قندھار وغیرہ کے شہروں کے در و دیوار ہلا کر رکھ دیے۔"(۵۸)اس جنگ میں طالبان مخالف گروپ جو شمالی اتحاد کے نام سے مشہور تھا، امریکہ کا مکمل ساتھ دیا اور بعد میں اسی گروپ کے حامد کرزئی کو امریکہ نے عبوری حکومت کا برائے نام انچارج دے دیا۔

ہمسایہ اور اسلامی ملک ہونے کی وجہ سے افغانستان کی صورتحال نے ہمیشہ ہی پاکستان کو متاثر کیا ہے۔ تاریخی، لسانی، ثقافتی روابط اور طویل بین الاقوامی سرحد کی وجہ سے دونوں ممالک ایک دوسرے کے سماجی اور سیاسی حالات سے متاثر ہوئے ہیں۔ روس افغانستان جنگ کے دوران پاکستانی عوام اور حکومت نے لاکھوں افغان مہاجرین کو نہ صرف پاکستان میں پناہ دی بلکہ ہر طرح سے ان کی مالی امداد اور معاشی امداد کی اور جذباتی و خونی رشتوں کی بنیاد پر ردعمل کا اظہار کیا۔ افغانستان امریکہ جنگ کے دوران بھی حکومتی سطح پر امریکہ سے تعاون کے باوجود عوامی سطح پر بھرپور ردعمل سامنے آیا۔ اس ردعمل نے اردو ادب اور اردو شاعری کو بھی متاثر کیا۔

جب انسان انسانیت کے درجے سے گر کر اپنے جیسے انسانوں کا خون کرتا ہے تو رشتے مر جاتے ہیں حالانکہ یہ رشتے ہی در حقیقت انسان کے مختلف روپ ہیں۔ بچہ، ماں، بہن، بھائی، باپ در حقیقت رشتوں ہی کی مختلف اشکال ہیں۔ آفتاب اقبال شمیم اپنی نظم "زمانہ بازار بن گیا ہے" میں اسی طرح کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ جب انسانوں نے حرص و طمع کو اپنا مقصدِ زندگی بنا دیا ہے تو ان رشتوں کی پہچان ختم ہو چکی ہے:

یہ شہر سوداگراں ہے جس میں
معاش کے لنگروں پہ پلتی ہوئی رعایا
انا کی قلت سے اپنے باطن میں مر چکی ہے

(زمانہ بازار بن گیا ہے، پاکستانی ادب ۲۰۰۲ء۔ شاعری)

جنگ نے بچوں اور بڑوں سب کو متاثر کیا۔ بچے جو اپنی فطرت میں معصوم ہوتے ہیں، ان کی سوچ اور سوال سچائی کے مظہر ہوتے ہیں۔ ایوب خاور کی نظم "ایک افغان بچے کا سوال" ایسی ہی معصومیت کا اظہار ہے۔

اے امریکہ
مرے حصے کے بسکٹ بم دھماکوں کی وجہ سے
ریزہ ریزہ ہو گئے ہیں
بھوک آتش گیر مادے کی طرح
سینے میں معدے تک بھڑکتی پھر رہی ہے
حلق میں گریہ کی ڈلیاں ہیں
جو نگلی جا رہی ہیں اور نہ اُگلی جا رہی ہیں
اے امریکہ
مرے دامن میں میری بانجھ دھرتی کی سیہ مٹی ہے

اور ہاتھوں میں میزائل کے ٹکڑے

تم اس مٹی اور ان کے بدلے میں

مجھے کھانے کو کیا دو گے!

(ایک افغان بچے کا سوال، پاکستانی ادب ۲۰۰۲ء۔ شاعری)

مقتدر قوتوں کے مظالم کا نشانہ صرف افغانستان ہی نہیں دنیا کے بہت سے خطے ہیں۔ جہاں ظلم و بربریت اپنے عروج پر ہے۔ وہ خطہ افغانستان ہو، کشمیر ہو چیچنیا ہو، فلسطین ہو کہ بوسنیا، ہر خطے میں طاغوتی قوتیں اپنے پنجے گاڑھے ہوئے ہیں۔ عرش صدیقی کی نظم " ہم اندھیروں میں لڑ رہے ہیں" بھی ایسے ہی علاقوں کا نوحہ ہے جہاں جہاں طاغوتی قوتیں قبضہ جمائی نظر آتی ہیں:

عجیب سا ذائقہ تھا جو میری سر داندھی سیہ زباں سے چمٹ گیا تھا!

نہ جانے کس کا لہو تھا جو میرے خشک ہونٹوں پہ آ گرا تھا،

لہو کہ جس میں سیہ سلگتی ہوئی نمی تھی!

میں اس کو بازو سے صاف کرتا

مگر میں اک عمر کا پیاسا

نمی سے کیسے گریز کرتا تھا

(ہم اندھیروں میں لڑ رہے ہیں، پاکستانی ادب ۱۹۴۷ء۔۲۰۰۸ء، شاعری)

افغانستان جنگ کے زیر اثر اردو ادب میں عمدہ شعری ادب تخلیق ہوا ہے۔ یہ ادب اپنی جگہ پر ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ یہ نظمیں مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔ یہ شاعری وقت کے تقاضوں کے مطابق تخلیق ہوئی اور اس نے اردو ادب میں اہم مقام پایا۔

## عراق امریکہ جنگ اور ملّی نغمہ نگاری:

امریکہ نے جن ممالک کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا پھر اِنھیں ممالک کو اپنا نشانہ بنایا۔ استعمال ہونے اور نشانہ بننے والے مملک کی فہرست میں عراق بھی شامل ہے۔ عراق کو ایران اور کویت کے خلاف استعمال کیا گیا اور مقاصد حاصل ہونے کے بعد عراق پر جوہری ہتھیاروں کی سرپرستی کا الزام لگا دیا گیا۔ جوہری ہتھیاروں کی آڑ میں عراق کے چپے چپے کو چھان مارا اور جب اس بات کا یقین کر لیا کہ عراق میں امریکہ کے مقابلے کی سکت نہیں تو عراق پر حملہ آور ہوا۔ یہ حملہ دہشت گردی کے اس منصوبے کی کڑی تھی جو ۱۱/۹ کی آڑ میں شروع کیا گیا تھا۔ اس حملے میں امریکہ، برطانیہ، جمہوریہ چیک، ہنگری، پولینڈ، ڈنمارک، اسپین اور پرتگال اتحادی تھے۔ ان

ممالک کا نشانہ عراقی حکمرانوں کے ساتھ ساتھ وہاں کی عوام بھی تھی۔ صدر صدام کو گرفتار کر کے ۲۰۰۷ء میں پھانسی دے دی گئی اور عراقی عوام کو ظلم و بربریت کا نشانہ بنایا گیا جس کے بعد خانہ جنگی اور بدامنی عراقی عوام کا مقدر بن گئی۔

عراق کے ساتھ پاکستانی عوام کے اسلامی رشتوں کی بدولت، عراق کی تباہی کا رد عمل پاکستان میں بھی نظر آیا۔ انسانی اور اسلامی بنیادوں پر یہ جذباتی رد عمل فطری تھا۔ اردو شعرا کی بڑی تعداد نے عراقی عوام سے اظہار ہمدردی کیا اور ہر سطح کے شاعر نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ جاوید انور کا شعری مجموعہ "بھیڑیے سوئے نہیں" ان سامراجی قوتوں کے ظلم و ستم اور سفاکیت کو موضوع بنایا گیا ہے جبکہ ان قوتوں کو جاوید انور نے بھیڑیوں سے تشبیہ دی ہے۔ اس مجموعے میں شامل نظم "انتباہ" میں شاعر ان طاغوتی طاقتوں سے مخاطب ہیں:

ابابیلیں ابھی زندہ ہیں ظالم ہاتھیوں والو
کہ نفرت وہ توانائی ہے جو جو ذرے کو ایٹم بم بنا دیتی ہے
ادھر دیکھو
پہاڑوں پر
بیابانوں میں، صحراؤں میں، جو بھی ہے
(محبت بھی)
سبھی نفرت سے تم پر تھوکتے ہیں
(لڑ نہیں سکتے)
بظاہر لڑ نہیں سکتے
مگر دیکھو
وہ کعبے جو دلوں میں ہیں ہتھوڑوں سے نہیں ڈھیتے

(انتباہ، بھیڑیے سوئے نہیں)

بغداد تہذیبِ انسانی کا قدیم ترین شہر بھی ہے اور تہذیب اسلامی کے عروج کی یادگار بھی۔ لہٰذا اس شہر سے رغبت اور لگاؤ فطری امر ہے۔ جنگیں صرف عمارتیں ہی تباہ نہیں کرتیں بلکہ معاشرتی اقدار ہلا کر رکھ دیتی ہیں۔ وہ اخلاقی اقدار جو صدیوں میں وجود پاتی ہیں، جنگیں انھیں لمحوں میں تباہ کر دیتی ہیں۔

خالد علیم کی کتاب "بغداد آشوب" عراق جنگ کے حوالے سے ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اس کا مرکزی موضوع جنگِ عراق ہے۔ یہ مجموعہ ۲۰۰۳ء میں منظر عام پر آیا۔ مجموعہ کلام کا انتساب عراقی بچوں و عراقی

حریت پسندوں، عراقی بزرگوں، عراقی ماؤں، بہنوں کے نام ہے۔ کتاب میں جابجا تلمیحات کا استعمال ہے۔ کتاب کی ایک نظم "امن اور جنگ" میں اٹھائے گئے سوالات عالمی ضمیر کو جھنجھوڑتے ہیں:

کس کی دہشت نے کسے لرزہ بد اندام کیا

اور پھر الزام بھی کس پر آیا

امن کے نام پر جنگوں کا یہ دستور نکالا کس نے

ہاتھ کس کا ہے، گریبان کس کا

دھجیاں کس کی اڑیں، کس کا بدن چاک ہوا

اور لہو کس کا اچھالا کس نے (امن اور جنگ، بغدادِ آشوب)

عراق اور افغانستان جنگ در حقیقت ایک ہی تناظر میں لڑی جانے والی جنگیں ہیں۔ ان جنگوں کا مقصد دنیا میں امریکہ کی بالادستی قائم کرنا ہے اور اسلامی ممالک کو سیاسی، سماجی اور معاشی طور پر تباہ کرنا ہے۔ ان مقاصد کے لیے جال پھیلانے والے اس میں کامیاب رہے ہیں۔ عالمی بالادستی کے خواب نے ہمیشہ ہی سے کمزور اقوام کو تہس نہس کیا ہے۔ ڈاکٹر منصور احمد کی کتاب "کوئی خود کو ڈھونڈتا ہے" میں شامل "افغان و عراق جنگ کے تناظر میں ایک نغمہ" ایسے ظلم و ستم کے خلاف اٹھائی جانے والی آواز ہے۔

جو نظر سے چھلکے غبار ہے

وہ جو دل کہے بس فشار ہے

وہ جو لفظ تم نے سنا نہیں

کہ لہو میں شعلہ بار ہے

یہ خوں کی کس کو طلب ہوئی

ہوس یہ کس کی غضب ہوئی

کسے پھر قضا درکار ہوئی

جو نظر سے چھلکے غبار ہے

وہ جو دل کہے بس فشار ہے

(افغان و عراق کے تناظر میں ایک نغمہ، کوئی خود کو ڈھونڈتا ہے)

افغانستان اور عراق کی جنگ نے خطے میں تباہی و بربادی کے مناظر پیدا کر دیے۔ دونوں ممالک کے سیاسی و سماجی اور معاشی ڈھانچہ مکمل طور پر تباہ و برباد ہو گیا۔ دوسری طرف قابض افواج بھی نفسیاتی کشمکش کا شکار ہو گئیں

کیونکہ قابض اقوام کا کثیر سرمایہ اور قوت ان علاقوں میں اپنا تسلط برقرار رکھنے میں صرف ہو رہا ہے۔ دونوں ممالک اسلامی ملک ہونے کے ناطے تمام دنیا کے مسلمانوں کی ہمدردی کے حقدار ٹھہرے۔ عراق افغانستان کے علاوہ دیگر مسلم ممالک جن میں فلسطین، بوسنیا، چیچنیا، برما اور شام شامل ہیں، میں ہونے والی جنگی کاروائیوں کے نتیجے میں پھیلی تباہی کو بھی شعرا نے ملّی نغموں کا موضوع بنایا ہے۔

## (د) پاکستان میں دہشت گردی کی لہر اور ملّی نغمہ نگاری:

افغان امریکہ جنگ میں پاکستان نے نیٹو ممالک سے تعاون کیا۔ افغانستان روس جنگ میں پاکستان کی سرزمین روس کے خلاف استعمال ہو چکی تھی۔ افغانستان میں خراب حالات سے افغانیوں کی کثرت نے پاکستان میں پناہ حاصل کی۔ خاص کر روسی جنگ کے دوران طالبان کو اسلحہ سمیت جنگی سامان پاکستان کے ذریعے فراہم کیا جاتا رہا۔ پاکستان کے مختلف علاقوں میں بارود کی فیکٹریاں لگ گئیں۔ جن میں مقامی سطح پر گوریلا کاروائیوں کے لیے ساز و سامان تیار کیا جاتا رہا۔ جس سے مقامی لوگوں کے پاس اسلحہ، بارود تیار کرنے کی صلاحیت اور تربیت آ گئی۔ افغانستان کے ساتھ طویل حد بندی کی وجہ سے پاکستان کے لیے افغانستان کے حالات سے محفوظ رہنا ممکن نہ تھا۔ جس سے افغان امریکہ جنگ کے ساتھ پاکستان میں بھی دہشت گردی کی شدید لہر پھوٹ پڑی۔ قبائلی علاقے جو شمال کی سمت پاکستان کو مضبوط دفاع فراہم کر رہے تھے، دہشت گردوں کی مضبوط اور محفوظ پناہ گاہیں بن گئیں جس سے عوام میں چھپے دشمن کو پہچاننا مشکل ہو گیا۔ پاکستانی قوم جس نے ہر محاذ پر بیرونی دشمن کا سامنا کیا تھا اس کے لیے اندرونی محاذ پر اپنے درمیان چھپے ہوئے دشمن کا مقابلہ کرنا انتہائی کٹھن ہو گیا۔

پاکستان میں دہشت گردی کی لہر درحقیقت عالمی طاقتوں کے ایجنڈے کا حصہ تھی۔ جس طرح روس کا افغانستان کے راستے پاکستان کے گرم پانی کی بندرگاہ تک پہنچنا مقصد تھا اسی طرح امریکہ بھارت گٹھ جوڑ کا مقصد بھی افغانستان کے راستے پاکستان کی سرزمین کا استعمال تھا۔ پاکستان کی سرزمین امریکہ افغان جنگ میں استعمال ہوتی رہی لیکن دوسری طرف پاکستان کی سرزمین پر قبضہ بھی عالمی قوتوں کے ایجنڈے میں شامل رہا۔ تاہم حالات و واقعات، پاکستانی افواج اور عوام کے جذبہ حب الوطنی کی وجہ سے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے ناپاک عزئم سے محفوظ رہا۔ پاکستان نے افغان جنگ میں امریکہ کا ساتھ کیوں دیا تھا۔ اس بارے میں محمد عرفان طارق لکھتے ہیں۔ "پاکستان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا کہ ان آپریشنز پر کنٹرول قائم کیا جائے اور اس وار آن ٹیرر War on Terror) (میں امریکہ کی حمایت کا اعلان کیا جائے اور ان کو مجبور کیا جائے کہ وہ ہمیں ساتھ

ملائیں یہ بلا تو ٹلنے والی نہیں تھی پھر اس میں نقصان یہ ہوتا تھا کہ پاکستان کے پاس کوئی کنٹرول نہ رہتا" (۵۹) کیونکہ کنٹرول کی صورت میں پاکستان کسی بھی وقت نیٹو کی سپلائی بند کر سکتا تھا لیکن اس کنٹرول کے چکر اور امریکہ کی حمایت میں پاکستان نے ان طالبان سے دشمنی کرلی جن کے ساتھ مل کر دہائیوں سے افغان روس جنگ لڑتا آرہا تھا اور آنے والے دور میں اس کا سنگین خمیازہ بھگتنا پڑا۔

اس تمام صورتحال میں پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑا۔ پاکستان کے قبائلی علاقے جو پاکستان کے لیے دفاعی حد کی حیثیت رکھتے تھے، دہشت گردی کا گڑھ بن گئے۔ یہاں تک کہ قبائلیوں کے جذبہ حب الوطنی پر بھی سوال اٹھنے لگے۔ محمد عرفان طارق مزید لکھتے ہیں " پاکستان کے قبائلیوں کی پاکستان سے ہمدردیاں ایک سوالیہ نشان بن گئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسرے لوگوں کی طرح قبائلیوں نے بھی قائداعظم کے شانہ بشانہ تحریک پاکستان میں سب سے زیادہ بڑھ کر حصہ لیا تھا اسی طرح قبائلیوں نے پاک فوج کے شانہ بشانہ قبائلی علاقوں کو دہشت گردی سے پاک کرنے کے لیے بھی ساتھ دیا۔" (۶۰) قبائلیوں کے تعاون کے بغیر اس جنگ پر قابو پانا بھی ناممکن تھا۔

یہاں یہ سوال بھی جنم لیتا ہے کہ دہشت گردی کیوں کی جاتی ہے۔ وہ کون سے عوامل ہیں جو دہشت گردی کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب "گمشدہ تاریخ" میں دہشت گردی کے تناظر میں لکھتے ہیں کہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تاریخ میں دہشت گردی کو طاقتوروں نے اپنے مقاصد کے لیے بطور ہتھیار استعمال کیا ہے تاکہ ان لوگوں کو اس سے دہشت زدہ رکھا جائے کہ جو ان کی مخالفت کرتے ہیں اور جو ناانصافی اور استحصال کے خلاف تحریکیں چلا کر نظام کو بدلنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔" (۶۱) دہشت گردی کی شکلیں وقت اور حالات کے ساتھ بدلتی رہیں۔ کبھی یہ حکومتوں کی طرف سے عوام کے استحصال کی صورت میں سامنے آئیں اور کبھی عوام کی طرف سے حکومتی اقدامات کے ردعمل کے طور پر کی جانے والی انتہاپسندانہ کاروائیاں دہشت گردی کہلائیں۔ فرقہ وارانہ جماعتوں کے باہمی اختلافات دہشت گردی کی وجہ بن گئے لیکن دورِ جدید میں مختلف ممالک اور حکومتیں اپنے دشمن ممالک اور حکومتوں کو کمزور کرنے کے لیے اسلحہ اور مدد فراہم کرتی ہیں اور مقامی لوگوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات مقامی لوگوں کے عقائد و نظریات اور جذباتی لگاؤ کو استعمال کیا جاتا ہے اور بعض صورتوں میں پیسوں کے عوض دہشت گردی کے لیے عوامی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ فی زمانہ پاکستان میں مؤخر الذکر دہشت گردی کی قسم متحرک نظر آتی ہے۔

دہشت گردی کی وجہ سے پاکستان کے تمام علاقے متاثر ہوئے۔ خیبر سے کراچی تک کوئی گاؤں، کوئی شہر ایسا نہ تھا جسے دہشتگردی نے اپنی لپیٹ میں نہ لیا ہو۔ مساجد، چرچ، گوردوارے، مندر، تعلیمی ادارے غرض کوئی سماجی اور معاشرتی مرکز دہشت گردی سے متاثر ہوئے۔ افواج پاکستان کے مراکز کو نشانہ بنانے کی کوششیں کی جاتی رہیں، پولیس اور سکیورٹی اہلکار شہید ہوتے رہے یہاں تک کہ سکولوں کے معصوم بچے بھی ان ظالمانہ کاروائیوں سے محفوظ نہ رہے۔ خوف و دہشت کی فضا نے ہر پاکستانی کو اپنی لپیٹ میں لیے رکھا لیکن حیران کن طور پر پاکستانی عوام انتہائی بہادری اور دلیری سے اس خوف سے بر سرپیکار رہی۔ تاریخ نے دیکھا کہ جن جگہوں سے ایک دن لاشیں اٹھائی جاتیں، لہو دھویا جاتا دوسرے روز اسی جگہ پر پاکستانی عوام اپنی معمولات زندگی میں مشغول نظر آتے۔ پاکستانی قوم کا حوصلہ حیران کن حد تک بلند رہا۔

۲۸ نومبر ۲۰۰۸ء کو پرویز مشرف کے چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ چھوڑنے کے بعد جنرل پرویز کیانی چیف آف آرمی سٹاف مقرر ہوئے۔ پاکستانی افواج کا مورال بلند کرنے کے لیے ۲۰۰۸ء کو "سولجر کا سال" قرار دیا گیا۔ اس دور میں افواج پاکستان نے مشرقی اور مغربی دونوں سرحدوں پر خطرات سے نمٹنے کے لیے حکمت عملّی تیار کی اور اہم ترین کامیابی سوات آپریشن تھا۔

دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے آپریشن سوات بڑا اہم تھا۔ اس آپریشن کے لیے پہلے سوات کی عوام کو محفوظ مقامات پر منتقل کیا گیا۔ اگر چہ اس صورتحال سے شہریوں کو کافی تکلیف سے دوچار ہونا پڑا لیکن عوام نے اپنے وطن کی خاطر یہ تکلیف برداشت کی اور پاکستانی افواج کا بھرپور ساتھ دیا۔ اس آپریشن میں اپنا گھر بار چھوڑنے والے IDPs کہلائے۔ میجر ریٹائرڈ خورشید زماں سوات کے IDPs کو اپنی نظم "IDPs کے نام" میں ان الفاظ میں دلاسہ دیتے ہیں:

ہے یقیں مجھ کو ملے گی سب کو مشکل سے نجات
اپنے گھر کو چھوڑ کر نکلے ہو تم اہل سوات
ہے مقابل ایک دشمن دوستوں کے بھیس میں
جس نے بے گھر کر دیا ہے تم کو اپنے دیس میں
حوصلے سے چھوڑ کر نکلے ہو تم گھر بار کو
مرحبا کہتے ہیں ہم سب آپ کے ایثار کو
آپ کی قربانیاں اہل وطن پہ ایک قرض
تم ہمارے ہو، مدد کرنا تمہاری، ہم پہ فرض

کیمپ میں گرمی بھی ہے اور آزمائش ہے کڑی
گھر کی راحت یاد آتی ہو گی تم کو ہر گھڑی

(IDPs کے نام، ماہنامہ ہلال)

۲۰۰۹ء میں سوات اور قرب وجوار کے علاقوں میں کامیاب آپریشن کے بارے ماہنامہ "ہلال" کے مدیر لیفٹیننٹ کرنل عارف محمود جون کے شمارے میں "ملکی سالمیت کی جنگ" کے عنوان سے اس کے اداریے میں لکھتے ہیں کہ افواجِ پاکستان کا شورش زدہ علاقوں لوئر دیر، بونیر، سوات، اپر دیر، اور شانگلہ میں شر پسندوں اور جنگجوؤں کے خلاف آپریشن جاری ہے اور کئی علاقوں کا کنٹرول حاصل کرتے ہوئے وہاں سے عسکریت پسندوں کا صفایا کر دیا گیا ہے۔ حکومت اور فوج پورے عزم کے ساتھ بر سرپیکار ہے اور اسے قوم کی بھرپور تائید بھی حاصل ہے۔" (۶۲) سوات آپریشن کی کامیابی کے بعد پاکستانی افواج نے وزیرستان آپریشن کا فیصلہ کیا۔ یہ مرحلہ انتہائی مشکل تھا کیونکہ اس علاقے میں دہشت گردوں نے اپنا جال بچھا رکھا تھا اور یہاں دشمن بہت منظم تھا۔ کچھ مقامی لوگ بھی ان کے سہولت کار بنے ہوئے تھے۔ اس صورتحال میں دہشت گردوں کے ٹھکانوں کو تباہ کرنا انتہائی کٹھن تھا۔ پاکستانی افواج نے ہمت اور حوصلے سے اس علاقے میں بھرپور کاروائیاں کیں۔ سرور انبالوی پاکستانی افواج کے نوجوانوں کو ان کی شجاعت کی داد ان الفاظ میں دیتے ہیں:

سپاہی مری قوم کے نوجواں
زمانہ ہے جرأت کی ان کا گواہ
بلند ان کی رہتی ہے ہر دم نگاہ
حقیقت میں اسلام کی ہیں سپاہ
یہ ہر معرکہ میں رہیں کامراں

(سپاہی مری قوم کے نوجواں، ماہنامہ ہلال)

ان سخت حالات میں ہزاروں فوجیوں اور عوام الناس نے شہادت پائی لیکن پاکستانی عوام نے اپنی سیاسی اور سماجی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ جنرل کیانی کے بعد جنرل راحیل شریف نے چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ سنبھالا۔ جنرل راحیل شریف بہادر شہیدوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ آرمی چیف کا عہدہ سنبھالنے سے قبل دہشت گردی کی جنگ میں کافی مہارت حاصل کر چکے تھے۔ محمد عرفان طارق کے مطابق "جنرل راحیل شریف کو کمان سنبھالنے کے ساتھ ہی کئی بڑے بڑے چیلنجز کا سامنا تھا جن میں دہشت گردی کے خلاف جنگ اولین چیلنج ہے۔ دہشت گردی کا خاتمہ کر کے ہی پاکستان میں پائیدار امن یقینی ہے۔" (۶۳) طالبان سے امن

مذاکرات کے خاطر خواہ نتائج بر آمد نہ ہونے کے بعد پشاور میں آرمی پبلک سکول پر دہشت گردوں کی کاروائی نے پوری قوم کا ہلا کر رکھ دیا۔

## سانحۂ آرمی پبلک سکول پشاور اور ملّی نغمہ نگاری:

۱۶ دسمبر کا دن پاکستان کی تاریخ میں کوئی نیک شگون لے کر نہیں آیا بلکہ اس تاریخ نے پاکستانی قوم کو دو بڑے سانحات سے دوچار کیا۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مشرقی پاکستان الگ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا اور پھر اس سانحے کے ۴۳ سال بعد ۱۶ دسمبر ۲۰۱۴ء کی صبح اسلام اور پاکستان کے دشمنوں نے معصوم بچوں کا خون بہا دیا۔ ۱۶ دسمبر ۲۰۱۴ء کی صبح پاکستان کی حفاظتی افواج کے لباس میں ملبوس دہشت گردوں نے وارسک روڈ پر واقع آرمی پبلک سکول میں داخل ہو کر معصوم بچوں پر گولیوں کی بارش کر دی۔ ۱۴۴ معصوم بچوں، اساتذہ اور کالج پرنسپل سمیت ۱۵۰ سے زائد افراد دہشت گردوں کی بربریت کا شکار ہو گئے۔ چھ سے سات گھنٹے تک دہشت گردوں اور حفاظتی اہلکاروں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہا اور سکیورٹی اداروں کی طرف سے گھیرا تنگ ہونے پر دہشت گردوں نے خود کو خودکش بارود سے اڑا لیا۔ اس واقعے کی ذمہ داری طالبان نے قبول کی جبکہ حملے کی تمام تر منصوبہ بندی افغانستان میں ہوئی۔ آرمی پبلک سکول میں معصوم بچوں کے قتل عام کا مقصد افواج پاکستان کو طالبان کے خلاف کاروائیوں سے روکنا تھا۔ دہشت گردوں نے مذہب اور انسانیت کی تمام حدود کو عبور کرتے ہوئے ظلم کی ایسی مثال قائم کی جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ اسلام تو دوران جنگ بچوں و عورتوں یہاں تک کہ درختوں اور فصلوں کو بھی نقصان پہنچانے سے منع کرتا ہے لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹ تھا۔ اسلام کے نام پر دہشت گردی کرنے والوں نے پر امن بچوں پر گولیاں چلائیں۔ ایک معصوم بچی جو پہلی بار اسکول میں داخلے کی غرض سے آئی تھی اپنے والد کی گود میں شہید کر دی گئی۔ ظلم و بربریت کی ایسی داستان رقم کی گئی جو رہتی دنیا تک سیاہ لفظوں میں لکھی جاتی رہے گی۔ محمد عرفان طارق کے مطابق "آرمی پبلک سکول میں دہشت گردی کے واقعہ کی ایف آئی آر میں گڈ اور بیڈ طالبان کی تمیز ختم کرتے ہوئے طالبان اور دیگر جہادیوں کے تمام سرکردہ لیڈروں کے خلاف مقدمات درج کئے گئے۔"(۶۴) سانحۂ پشاور میں ملوث دہشت گردوں کا تعلق افغانستان سے جڑ گیا۔ جنرل راحیل شریف نے ڈی جی آئی ایس آئی کے ہمراہ کابل کا دورہ کیا اور ان سے دہشت گردوں کی سرکوبی کے لیے بات چیت کی۔ افغان صدر اور دوسرے حکام کی طرف سے مطلوب دہشت گردوں کی حوالگی کی یقین دہانی کروائی گئی لیکن عملی طور پر ایسا نہ ہو سکا۔

۲۰۰۹ءسے لے کر ۲۰۱۴ءتک پاکستان پر ایسا کڑا وقت گزرا ہے جس میں پشاور اور اسلام آباد سمیت پاکستان کے کئی شہر دہشت گردوں کے نشانے پر تھے۔ کوئی صبح شام ایسی نہ تھی جب کسی گھر سے جنازہ نہ اٹھا ہو لیکن سانحۂ پشاور اپنی شدت کے لحاظ سے تمام واقعات پر بھاری پڑا، ملک کا ہر فرد سوگوار تھااور ہر آنکھ اشک بار تھی۔ اس صورتِ حال میں معروف شعرا کے ساتھ ساتھ غیر معروف شعرا کی طرف سے بھی اپنے جذبات کا بھرپور اظہار کیا۔

سانحۂ پشاور کے حوالے سے پاکستان بھر کے اخبار رور سائل میں ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والوں کی جانب سے اظہارِ مذمت کے ساتھ ساتھ متاثرین سے مکمل دِلی وابستگی ظاہر کی گئی لیکن مسلح افواج کے "ماہنامہ ہلال" کی ادبی تخلیقات سانحۂ پشاور کی عملی تفسیر ثابت ہوئیں۔ عطیہ خالد کی نظم "بیٹے کی یاد میں" سانحۂ پشاور میں شہید ہونے والے بچے کی ماں کے جذبات ہیں۔ عطیہ خالد کے شوہر میجر خالد بھی شہادت کے رتبے سے سرفراز ہو چکے تھے۔

دیکھ کے خالی بچپن کا وہ جھولا تیرا
چھو کے ہر ایک کھلونا تیرا
گرنا وہ اٹھا کے پہلے قدم کا تیرا
ماں کہ کر پکارنا وہ ہر دم تیرا
انجینئر بن کے خدمت کرنے کا عزم تیرا
مگر چھوڑ کے یوں چلے جانا بزم تیرا
لمحہ لمحہ وہ دن یاد کرتی ہے
تو کہیں سے آجائے فریاد کرتی ہے
ماں تجھے یاد کرتی ہے
ماں تجھے یاد کرتی ہے

(بیٹے کی یاد میں، ماہنامہ ہلال)

سانحۂ پشاور میں شہید ہونے والے بچوں کی ساری مائیں شعرا نہیں ہیں اس لیے ان کی تخلیقات فنی لحاظ سے اعلیٰ مرتبہ کی نہ بھی ہوں لیکن فکری لحاظ سے بلند پایہ ضرور ہیں۔ جس طرح ۱۹۶۵ء کی جنگ نے ہر پاکستانی کو شاعر بنا دیا تھا، اسی طرح سانحۂ پشاور نے ہر ماں، ہر بہن کو شاعری کا فن عطا کر دیا۔

خوشی کا موقع ہو یا غم کی کوئی صورت، قومی وملّی نغمہ اردو ادب کی ایک ایسی صنف ہے جو قوم، ملک وملت سے اظہار یکجہتی کے لیے سب سے کارآمد ہے لہٰذا اس صنفِ ادب میں سانحۂ پشاور کے موضوع پر شعرا نے قطار در قطار ملّی نغمے تخلیق کیے کہ ملّی نغموں کی تخلیق میں ستمبر ۱۹۶۵ء کی روایت کا دہرایا جانا نظر آتا ہے۔ ''رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو'' کے عنوان سے شعری مجموعہ جو بشریٰ سعید نے مرتب کیا۔ سانحۂ پشاور کے موضوع سے وابستہ ہے اور اس میں ساٹھ ۶۰ کے قریب شعرا کے ملّی نغمے شامل ہیں جو اس سانحہ کی رقت انگیزی کا پتہ دیتے ہیں۔ انجم سلیمی ملّی نغمہ '' ۱۶ دسمبر کا پشاور'' میں اس سانحۂ کی منظر کشی اس طرح کرتے ہیں:

شہر محصور ہے
سب کے سب داخلی
خارجی راستے بند ہیں
زندگی اپنے ہی خون میں لت پت ہے
ان گنت زخموں سے چور
زندگی کے محافظ
مددگار ہاتھوں میں
شمعیں اٹھائے ہوئے
تیرگی کے مقابل نکل آئے ہیں

(۱۶ دسمبر کا پشاور، رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو)

آرمی پبلک سکول کے سانحہ کا دکھ نہ صرف پاکستان بلکہ عالمی دنیا میں بھی شدت سے محسوس کیا گیا کہ ہر باشعور ذی روح کی آنکھ اشکبار تھی۔ احمد رضا راجا اس سانحے پر لوگوں کے جذبات کی حقیقت ان الفاظ میں عیاں کرتے ہیں:

کوئی ظاہر کوئی نہاں رویا
ایسا غم تھا کہ اک جہاں رویا
اتنا گریہ ہوا زمیں کانپی
ہچکیاں لے کے آسماں رویا
جا تو پہنچا تھا وہ خلاؤں میں
بن کے بادل مگر دھواں رویا

اس کی فریاد میں ہے کتنا اثر
دیکھو آج اک بے زباں رویا

پھول مسلے گئے جہاں احمد
جا کے موسم ہر اک وہاں رویا

(کوئی ظاہر کوئی نہاں رویا، رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو)

واحد غالبی نے اپنی نظم "سانحۂ پشاور" میں اس واقعہ کو واقعہ کربلا سے تشبیہ دی ہے۔ جس طرح کربلا میں معصوم بچوں کا خون بہایا گیا اسی طرح سانحۂ پشاور میں معصوم بچوں کی زندگی سے کھیلا گیا لیکن اب کی بار شہدا کی تعداد واقعہ کربلا سے بھی دگنی تھی:

وہ ننھا اصغر
وہ پہلا معصوم شہید بچہ
اسی تسلسل میں آج پھر
ان یزیدوں نے
وہ قیمتی خون بہادیا ہے
شہید بچوں کا خونِ ناحق
زبانِ حق سے پکارتا ہے
یہ کون ظالم ہیں؟ (سانحۂ پشاور، رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو)

اس عظیم سانحے پر معروف و غیر معروف تمام شعرا نے قلم اُٹھایا اور دل کی غمگین وادی سے لہو سے بھرے شعر تخلیق کیے۔ ان شعرا کی تحریروں میں جوش وولولہ بھی ہے اور عزم استقلال بھی۔

معروف شاعر امجد اسلام امجد پاکستانی قوم کا جذبہ بڑھاتے ہوئے اپنی نظم "اب اور نہیں ڈرنا" ایسے ہی جذبات کا اظہار کرتے ہیں:

اے اہل نظر، اے اہل وفا
اک بات ہمیشہ یاد رہے
یہ جتنے شقی ہیں، قاتل ہیں
اندر سارے بزدل ہیں
اب ان سے اور نہیں ڈرنا

دہشت کی موت نہیں مرنا
اب ان سے اور نہیں ڈرنا

(اب اور نہیں ڈرنا، ماہنامہ ہلال)

سانحۂ پشاور کے بعد پورے ملک میں دہشت اور خوف کی لہر پھوٹ پڑی۔ ایک طرف تو پورا ملک اس سانحے سے اشکبار تھا تو دوسری جانب دہشت گردی کی لہر نے دلوں میں ایسی بے چینی پیدا کر کے رکھی تھی کہ کربلا کا منظر معلوم ہوتا تھا۔ اس صورتحال میں قوم کا یکجان رہنا بہت ضروری تھا اور دشمن کو پہچان کر اسے کیفرِ کردار تک پہنچانا لازم تھا۔ سید الطاف حسین بخاری اپنی نظم "میں اس لہو کا خراج لوں گا" میں دشمن کے خلاف جنگ کا اعلان کرتے ہیں:

مجھے قسم ہے شہید پھولوں کے ایک اِک قطرہ لہو کی
جو اپنے لختِ جگر کو بے جان پا کے روئی
مجھے قسم ہے اس ماں کے آنسوؤں کی
کہ اب میں دھرتی کا سرخ آنچل
علم بناؤں گا لشکروں کا
جو گھر کو میرے جلایا تم نے
سو اب یہ آتش نہ بجھنے پائے
سارے قاتل جلیں گے اس میں
یزید، حرمل، شمر کے ساتھی
بنامِ دیں خون بہانے والے
اور ان کی ہمت بڑھانے والے

(میں اس لہو کا خراج لوں گا، رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو)

سانحۂ پشاور نے عوام الناس کے دلوں میں ڈر اور خوف کی ایسی کیفیت پیدا کر دی تھی کہ ہر ماں اپنے بچے کو سکول بھیجتے ہوئے غیر محفوظ سمجھنے لگی۔ ناہید قمر کی نظم "شہید بچوں کے لیے" ان خیالات کی ترجمان ہے۔

مگر تم اب بھی
پتھروں میں پھول کھلانے کی امید رکھتے ہو
نہیں دیکھ پاتے

کہ تمہارے بعد
ہماری نظموں کی آنکھیں
آنسوؤں سے بھر گئی ہیں
اور خواب، زندگی کی طرح
ہماری انگلیوں کے بیچ سے بہہ چکے ہیں (شہید بچوں کے لیے، زندگی کے حاشیے پر)

سانحۂ پشاور پر جتنی نظمیں لکھی گئیں ان سب میں جہاں ان بچوں کے مرنے کا نوحہ ہے وہیں آنے والے دور کی امید کی کرن بھی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اتنی تباہی اور بربادی کے بعد بھی پاکستانی قوم مایوس نہیں ہوئی کیونکہ آنے والے اچھے دنوں کی امید ہی درحقیقت روشن مستقبل کی ضامن ہے۔ آرمی پبلک سکول کے سانحہ کے بعد وہی ہال ایک بار پھر بچوں کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ وہی بچے، وہی استاد، اور وہی عمارت آج بھی تدریس میں مشغول ہیں۔ احسان الٰہی نے "سانحۂ پشاور کے شہیدوں کے نام" میں شہداء کو سلام پیش کیا ہے:

نڈھال غم سے یہ مائیں سلام کہتی ہیں
یہ اشک اشک ہوائیں سلام کہتی ہیں
سمیٹ کر سبھی خوشبوئیں زمانے کی
چمن چمن کی فضائیں سلام کہتی ہیں
ہر اک دل کی دھڑکن تمہاری خاطر ہے
ہر اک نفس کی دعائیں سلام کہتی ہیں
تمہارے جیسی ہی خلقت ہے جس کی الفت کو
عظیم رب کی عطائیں سلام کہتی ہیں

(سانحۂ پشاور کے شہیدوں کے نام، رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو)

سانحۂ پشاور سے ویسے تو پورا عالم، خاص کر پاکستانی قوم متاثر ہوئی اور شعرا و ادبا نے اس سانحہ کے بارے میں اپنے اور قوم کے دکھ کا اظہار درد بھرے لہجے میں کیا لیکن ماہنامہ "ہلال" کے قلم کاروں نے اس کیفیت کو خاص انداز سے بیان کیا۔ ان دنوں "ہلال" جن شعرا کا کلام چھپتا تھا ان شعرا نے اس سانحۂ کے حوالے سے کئی ایسے رقت آمیز مِلّی نغمے تحریر کیے کہ جن کو پڑھنے یا سننے سے آج بھی اہل درد کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ ان نغمات میں سب سے مقبول نغمہ "بڑا دشمن بنا پھرتا ہے جو بچوں سے ڈرتا ہے"۔ اس سانحہ کے بعد کئی ہفتوں تک پاکستانی ٹی وی چینلز پر پیش کیا جاتا رہا اور اس نغمے کو اپنے جذباتی جملوں اور جذباتی پس منظر کی وجہ سے فوج اور عوام

میں زبردست پذیرائی ملّی کہ اس نغمے کے الفاظ میں پوری قوم کے احساسات کا نچوڑ موجود تھا۔ یہ نغمہ ایک بچے کی زبانی ان بزدل دشمنوں کو پیغام پہنچاتا ہے کہ وہ ان سے اخلاقی لحاظ سے بہت بڑا ہے۔ اسی طرح کا ایک اور مقبول ملّی نغمہ "مجھے دشمن کے بچوں کو پڑھانا ہے" یہ نغمات میجر عمران رضا کی تخلیقی کاوش ہیں جو پہلی مرتبہ ماہنامہ "ہلال" میں شائع ہوئے۔ ان نغموں کی موسیقی معروف گلوکار و موسیقار ساحر علی بگا نے ترتیب دی اور ان کے بیٹے اذن نے اپنی درد بھری آواز میں گا کر اس نغموں کا حق ادا کر دیا:

پتہ کیا پوچھتا ہے وہ کتابوں میں ملوں گا میں
کئے ماں سے ہیں جو میں نے کہ وعدوں میں ملوں گا میں
میں آنے والا کل ہوں وہ مجھے کیوں آج مارے گا
یہ اس کا وہم ہو گا کہ وہ ایسے خواب مارے گا
تمھارا خون ہوں نا ، اس لیے اچھا لڑا ہوں میں
بتا آیا ہوں دشمن کو کہ اس سے تو بڑا ہوں میں
میں ایسی قوم سے ہوں جس کے وہ بچوں سے ڈرتا ہے
بڑا دشمن بنا پھرتا ہے جو بچوں سے لڑتا ہے

(بڑا دشمن بنا پھرتا ہے جو بچوں سے ڈرتا ہے، ماہنامہ ہلال)

ملک و قوم کے محافظین کا جانیں قربان کرنے کی روایت تو قدیم ہو چکی تھی لیکن اب کی بار آرمی پبلک سکول کے بچوں نے اک نئی روایت ڈالی یعنی ملک و قوم کی حفاظت کا کفارہ مجاہدین وطن کے ساتھ ان کے بچوں کے لہو نے بھی چکا دیا ہے۔ سید ایاز مفتی المعروف ابنِ مفتی لکھتے ہیں:

"پاکستان کے سرحدوں کے محافظین کے بچوں نے بھی اس دن اپنی جانیں قربان کر کے گویا ایک درس دیا ہے کہ ہم کسی سے کم نہیں اور یہ کہ "اقراء" جیسے مقدس مشن جو حضور ﷺ کو سونپا گیا تھا اور جس کے ہم امین ہیں ہم اس کی حفاظت اپنی جان سے بھی زیادہ کریں گے اور ان بچوں نے دین ابراہیمی کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے جہاں ہر بچے نے حضرت اسماعیلؑ کے دورِ طفلی کی قربانی کو عملّی شکل میں اپنے خون سے پیش کر کے اُمتِ مسلمہ کو یہ پیغام دیا کہ ہم فرزندانِ توحید اپنے وطن، اپنی سرزمین کے لیے، اپنے دین کے لیے، اقراء (علم) اور علمی درسگاہوں کے تحفظ کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرنے میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ کسی شاعر نے ارضِ وطن کو دین کی ہجرتِ ثانی کا مدینہ قرار دیا تھا اس موقع پر اگر میں یہ کہوں پشاور کا المناک واقعہ بھی کربلائے ثانی کا برپا ہونا تھا۔" (۶۵)

سانحۂ پشاور کے پس منظر میں طویل عرصہ تک عسکری اور غیر عسکری قلم کاروں کی طرف سے طبع آزمائی کی جاری ہے اور یہ تحریریں مختلف رسائل و جرائد میں چھپتی رہتی ہیں۔ سانحۂ پشاور کے حوالے سے تخلیق ہونے والے ملّی نغمات جہاں رنج و الم کی داستاں لیے ہوئے ہیں، وہیں ملّی نغموں کی روایت میں ایک گراں قدر اضافہ بھی ہیں جو ستمبر ۱۹۶۵ء سے ایک طویل عرصے بعد دیکھنے کو ملا ہے۔

**معرکۂ بڈھ بیر اور ملّی نغمہ نگاری:**

سانحۂ پشاور سے پہلے اور بعد میں دہشت گردوں کا نشانہ عام عوام اور عساکر پاکستان بنے۔ سانحۂ پشاور ایک بڑا سانحہ تھا جس میں عساکر پاکستان کے بچوں کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس سانحہ کے بعد بھی جابجا سکیورٹی اہلکاروں اور عسکری اڈوں پر حملے جاری رہے جس کا افواج پاکستان نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور تاحال کر رہے ہیں۔ سانحۂ پشاور کی پہلی برسی بھی نہ ہوئی تھی کہ معرکہ بڈھ بیر پیش آیا۔ بڈھ بیر پشاور کا نواحی قصبہ ہے جو ۱۹۵۹ء میں امریکہ کو دس سال لیز پر دے دیا گیا تھا اور امریکہ یہاں اپنا ایک ہوائی اڈہ قائم کر کے جاسوسی جہاز یوٹو (U2) اڑاتا تھا جس کے ذریعے سوویت یونین کی نگرانی کی جاتی۔ جنوری ۱۹۷۰ء میں امریکہ سے یہ ایئر بیس واپس لے کر پاکستان ایئر فورس کا بیس کیمپ بنا دیا گیا۔

۱۹۷۰ء سے لے کر اب تک بڈھ بیر میں پاکستان فضائیہ کا ایئر بیس کیمپ موجود ہے۔ ۱۸ ستمبر ۲۰۱۵ء کو دہشت گردوں نے بڈھ بیر ایئر بیس پر حملہ کر دیا۔ دہشت گردوں کا مقصد ایئر بیس کو نقصان پہنچانا اور وسیع پیمانے پر عساکر پاکستان کو تباہی سے دوچار کرنا تھا۔ اس سانحۂ میں سب سے نمایاں مقام کیپٹن اسفند یار بخاری کو حاصل رہا۔ اسفند یار بخاری اس معرکے میں شہید ہوئے لیکن شہادت سے پہلے انھوں نے بہادری کے وہ جوہر دکھائے جن کی نظیر تاریخ عالم میں بہت کم ملتی ہے اور ایسے بلند ہمت جواں بھی بہت کم سامنے آتے ہیں۔

اسفند یار بخاری خیبر پختونخواہ کے ساتھ صوبہ پنجاب کے آخری ضلع اٹک سے ایک تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد سرجن ڈاکٹر اور والدہ محترمہ قرآن پاک کی معلمہ ہیں۔ اسفند یار بچپن سے غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انھوں نے فضائیہ ڈگری کالج ایم آر ایف (کامرہ کینٹ) سے جماعت ہفتم تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد کیڈٹ کالج حسن ابدال میں تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور اپنی محنت و لگن سے فوج میں کمیشن حاصل کر کے ملٹری اکیڈمی کاکول چلے گئے۔ تربیت مکمل کرنے کے بعد کاکول اکیڈمی سے "شمشیر اعزازی" حاصل کیا اور فوج کے ایک فعال مجاہد بن گئے۔

۱۸ستمبر ۲۰۱۵ء کی صبح جب دہشت گردوں نے بڈھ بیر ایئر بیس پر حملہ کیا تو اسفند یار بخاری کی یونٹ کو اس حملے کا جواب دینے کے لیے بلایا گیا جبکہ ان سے پہلے دہشت گردوں کے خلاف برسرِ پیکار میجر حسیب زخمی ہو چکے تھے۔ اس نازک صورتحال میں اسفند یار بخاری نے اپنے اعلیٰ افسران سے دہشت گردوں سے مقابلے کے لیے کمانڈ کی التجا کی۔ کمانڈ کی اجازت ملنے کے بعد حکمت عملی طے کی، اپنے جوانوں کو منظم کیا اور اپنا سب کچھ بھلا کر دہشت گردوں کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئے۔ انھوں نے دہشت گردوں کو ایک مخصوص علاقے تک مسدود کر دیا اور اقامتی کالونی کو محفوظ بنالیا۔ ایک بہادر فوجی جوان کیپٹن اسفند یار بخاری نے لڑائی کا پانسا ہی پلٹ دیا تھا۔ وہ دہشت گردوں کو للکار للکار کر جہنم رسید کرتا رہا اور بالآخر جواں مردی اور بہادری سے لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کر گئے۔ محمد ظہیر قندیل، اسفند یار بخاری کے ساتھ اس معرکے میں شامل جوانوں سے لی گئی معلومات کے حوالے سے ان کی اس وقت کی کیفیت بارے لکھتے ہیں کہ وہ(اسفند یار) اونچی اونچی آواز میں کہتے تھے ”یہ بزدل اور ڈرپوک ہیں، یہ نہتے اور کمزوروں پر ہی اپنا رعب جما سکتے ہیں۔ معصوم بچوں اور بے بس خواتین کو قتل کر کے اپنی دہشت جماتے ہیں، تم جیسے مردوں کا سامنا کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ گیدڑ آج شیروں سے پنجہ لڑا بیٹھے ہیں۔ ان سے خائف مت ہونا، ڈرنا نہیں، وہ چوہے ہیں انھیں دیکھتے ہوئے ان پر جھپٹ پڑو، اسفند یار صاحب ان پر ایسے جھپٹتے تھے جیسے شیر شکار کو دبوچنے جا رہا ہو۔“(٦٦) اسفند یار بخاری نے جام شہادت نوش کیا لیکن پوری ایئر بیس اور اس سے منسلک اقامتی کالونی کو تباہی سے بچالیا۔ ان کی بہادری اور سرفروشی کی وجہ سے ان کا خاندان اور خطۂ اٹک کی تاریخ میں امر ہو گیا۔

اسفند یار کی شخصیت اور شہادت کے موضوع پر لکھی گئی کتاب ”معرکہ بڈھ بیر کے ہیرو“ کے مصنف محمد ظہیر قندیل ایک شاعر بھی ہیں۔ انھوں نے ملّی نغمہ میں خوبصورت انداز میں اسفند یار بخاری کو خراج تحسین پیش کیا ہے:

زمیں بھی تم آسماں بھی اسفند یار تم ہو
کہیں نہیں ہم جہاں بھی اسفند یار تم ہو
فرشتے مستی میں چور ہو کر بہک رہے ہیں
شہید بھی شادماں بھی اسفند یار تم ہو
وطن کی تم شان ہو چمن کی بہار تم ہو
خدا کا اک ارمغاں بھی اسفند یار تم ہو

(جہاں بھی اسفند یار تم ہو، معرکہ بڈھ بیر کا ہیرو)

کراچی کے ایک کہنہ مشق اور معروف بزرگ شاعر سید انور جاوید ہاشمی، جو کہ اردو لغت بورڈ کے سابق رکن بھی رہے ہیں، نے اسفند یار بخاری کو خراج عقیدت بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے اشعار فکری اور فنی ہر لحاظ سے بلند پایہ ہیں:

اے شہید ملک و ملت ، نوجواں عالی وقار
اے مکینِ خلد اے مقبولِ حق، اسفند یار
سرفروشی کی تمنا تھی شہادت مل گئی
ساتھیوں میں کیڈٹوں سے تجھ کو رفعت مل گئی
فضلِ ربی ہی کہا جائے گا جرأت کو تری
فوقیت فطرت سے تیرے عزم کو بخشی گئی
دے کے نذرانہ لہو کا سرخ رو اسفند ہے
دیکھو فرزندِ وطن کیسا سعادت مند ہے

(اسفند یار بخاری، معرکہ بڈھ بیر کا ہیرو)

ڈاکٹر احسان بخاری، جو اسفند یار بخاری کے بھائی ہیں۔ ان کی نظم "اسفند یار میرا بھائی میرا یار" ایک بھائی کے جذبات بھی ہیں اور قوم کے ایک فرد کی حیثیت سے ایک شہید کے لیے خراج عقیدت ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر فہمیدہ تبسم جو وفاقی اردو یونیورسٹی کی معلمہ ہیں اور اٹک سے تعلق رکھتی ہیں، نے بھی خوبصورت انداز میں کیپٹن اسفند یار بخاری کے لیے عقیدت کا اظہار کیا ہے:

شہادتوں کے اجر ملے ہیں، جو نور و خوشبو کے سلسلے ہیں
بلندیوں کے یہ فیصلے ہیں، یہ آسماں کے معاملے ہیں
بدر سے بڈھ بیر تک وفا کے ، جہاں میں جتنے علم کھلے ہیں
یہ سب مدینے کے جاں نثاروں کے فوج در فوج قافلے ہیں
وہ ان کے لشکر کا اک سپاہی، وہ ان کے زیر کماں مجاہد
نشانِ حیدر تو اک نشاں ہے، جناب حیدرؓ اسے ملے ہیں

(کیپٹن اسفند یار بخاری شہید، معرکہ بڈھ بیر کا ہیرو)

معرکہ بڈھ بیر کے موضوع پر تخلیق ہونے والا ادب زیادہ تر اسفند یار بخاری کے بارے میں لکھا گیا کیونکہ اس معرکے کے اصل ہیرو وہی ہیں لیکن ان کے ساتھ دوسرے بہادروں کی قربانیاں بھی یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

ان بہادروں کے لیے تخلیق کردہ ادب فنی لحاظ سے تو شاید اتنا بلند پایہ نہ ہو لیکن فکری لحاظ سے بہت ارفع ہے۔ شہداء سے جذباتی لگاؤ ایک فطری جذبہ ہے اور یہ جذبہ پاکستانی قوم میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

جنگی معرکوں میں ہر شخص کی نگاہیں میدان جنگ میں لڑنے والے مجاہدین پر ہوتی ہیں۔ قوم کے ہاتھ دعاؤں کے لیے اٹھ رہے ہوتے ہیں لیکن اس دوران شعرا بھی اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنے فن سے ملک و قوم کی خدمت کا حق بخوبی نبھا رہے ہوتے ہیں۔ مجاہدین نے سرحدوں پر جہاد بالسیف کے فرائض انجام دیے اور شعرا نے جہاد بالقلم کا فریضہ نبھایا۔ انھوں نے جہاد کو اجتماعی اور قومی چیلنج کی حیثیت سے قبول کیا اور دشمن کے خلاف قلم کو بطور ہتھیار استعمال کیا اس لیے جہاں مجاہدین کی خدمات کو سراہا جاتا ہے وہیں شعرا بھی قابلِ تحسین اور ملکی و قومی اثاثہ ہیں جنھوں نے ملکی بقاء کی خاطر اپنے خون کی سیاہی سے ایسے مِلّی نغمے تخلیق کیے ہیں جن سے ملکی دفاع مظبوط ہوا ہے۔ بے شک اس ملک کا تحفظ شعرا کی حب الوطنی اور احسان مندی کا بھی مظہر ہے۔

## حواشی و حوالہ جات


۱۔ قاسم یعقوب۔اردو شاعری پر جنگوں کے اثرات۔کراچی: سٹی بک پوائنٹ،۲۰۱۵ء۔ص۹

۲۔ www.Wikipidia.com. 1st August, 2016

۳۔احمد دہلوی،سید۔فرہنگِ آصفیہ، جلد دوم۔لاہور: مطبع رفاہ عام پریس،۱۹۰۸ء۔ص۵۱

۴۔ قاسم یعقوب۔اردو شاعری پر جنگوں کے اثرات۔ص۱۴

۵۔ایضاً۔ص۱۵

۶۔القرآن۔۲:۲

۷۔ حفیظ صدیقی،ابوالاعجاز ۔کشاف تنقیدی اصطلاحا ت۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۱۹۷۵ء۔ ص۶۶

۸۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر۔تاریخ ادب اردو (جلد دوم)۔لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۹۴ء۔ص۶۷

۹۔ فرمان فتح پوری،ڈاکٹر۔اردو کی منظوم داستانیں۔کراچی:انجمن ترقی ادب،۱۹۷۱ء۔ص۲۲

۱۰۔وارث سرہندی۔علمی اردو لغت۔لاہور:علمی کتاب خانہ،س ن۔ص۸۰۶

۱۱۔حفیظ صدیقی،ابوالاعجاز۔کشاف تنقیدی اصطلاحا ت۔ص۸۶

۱۲۔حالی،مولانا الطاف حسین۔مقدمہ شعر و شاعری۔لاہور:پاپولر پبلشنگ ہاؤس،۱۹۸۴ء۔ص۳۹

۱۳۔حفیظ صدیقی،ابوالاعجاز۔کشاف تنقیدی اصطلاحا ت۔ص۹۷

۱۴۔شان الحق حقی۔نشیدِ حریت۔کراچی:ادارہ مطبوعات پاکستان،۱۹۶۴۔ص۵۔۶

۱۵۔عبدالحق،ڈاکٹر مولوی۔نصرتی۔کراچی:انجمن ترقی اردو،۱۹۶۱ء۔ص۸۲

۱۶۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر،اردو ادب کی تاریخ۔لاہور:سنگ میل پبلشرز،۲۰۰۹ء،ص۱۳۶

۱۷۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر۔ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری۔لاہور:سنگ میل پبلشرز،۲۰۰۵ء۔ص۳۰۷

۱۸۔ قاسم یعقوب۔اردو شاعری پر جنگوں کے اثرات۔ص۱۱۱

۱۹۔ شجاع نواز۔بے نیام تلواریں۔کراچی:ویلکم بک پورٹ،۲۰۱۰ء۔ص۵۶

۲۰۔ متین الرحمان مرتضیٰ ۔”میں نے پاکستان بنتے دیکھا“۔ مشمولہ ،تکبیر؛ کراچی: جلد ۲۰، شمارہ ۳۷۔ ۵ تا ۱۱ ستمبر ۱۹۹۷ء۔ص۴۷

۲۱۔ زاہد چوھدری۔ "پاک بھارت تنازعہ اور مسئلہ کشمیر کاآغاز"۔ مشمولہ پاکستان کی سیاسی تاریخ،لاہور: ادارہ مطالعہ تاریخ،۱۹۹۹ء۔ ص۹۷

۲۲۔ ایضاً۔ ص۱۱۴۔۱۱۵

۲۳۔ غلام نبی خیال۔فغانِ کشمیر۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات،۱۹۹۹ء۔ ص۱۴

۲۴۔ شجاع نواز۔بے نیام تلواریں۔ ص۶۸

۲۵۔ ایضاً۔ ص۹۷

۲۶۔ اشرف، ڈاکٹر محمد خان۔پاکستان: قومی سلامتی کے مسائل۔لاہور: گنج شکر پریس، ۲۰۰۹ء۔ ص۹۷

۲۷۔ فتح محمد ملک۔ تحریکِ آزادی کشمیر اردو ادب کے آئینے میں۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۱ء۔ ص۲۵

۲۸۔ رعنا اقبال۔ جمیل الدین عالی شخصیت اور فن۔اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء۔ ص۲۵

۲۹۔بحوالہ عشرت رحمانی۔ چھ ستمبر ایک تحقیقی و نفسیاتی جائزہ۔ لاہور: اشرف پریس، ۱۹۶۶ء۔ ص۲۴۰۔۲۴۴

۳۰۔ قاسم یعقوب۔اردو شاعری پر جنگوں کے اثرات۔ص۱۳۲

۳۱۔ شجاع نواز۔بے نیام تلواریں۔ ص۱۷۷

۳۲۔فتح محمد ملک ۔احمد ندیم قاسمی : شاعر اور افسانہ نگار۔ لاہور :سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء۔ ص۱۰۹

۳۳۔طاہرہ ،ڈاکٹر قرۃ العین ۔صہبا اختر شخصیت اور فن۔ اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۰ء۔ ص۱۱۲۔۱۱۳

۳۴۔ زہرا نگاہ، ثریا مقصود۔ مرتبین؛جنگ ترنگ۔ کراچی: ادارہ مطبوعات پاکستان،۱۹۶۷ء۔ ص۱

۳۵۔ وقار عظیم،سید۔ "ستمبر ۱۹۶۵ء کی شاعری"۔ مشمولہ،فنون،لاہور: اکتوبر ۱۹۶۵ء۔ ص۴۹

۳۶۔ احمد شجاع، حکیم۔ "حرفِ چند"، مشمولہ،الجہاد و الجہاد۔لاہور: چٹان پبلشرز،۱۹۹۴ء۔ ص۱۹

۳۷۔زہرا نگاہ،ثریا مقصود۔جنگ ترنگ۔ص۵
۳۸۔ایضاً۔ص۴
۳۹۔گلزار احمد،صوفی۔مرتب؛کلیات صوفی تبسم۔لاہور:الحمد پبلی کیشنز،۲۰۱۳ء۔ص۲۱
۴۰۔انتظار حسین۔"ادب جنگ کے بعد"۔مشمولہ،فنون،لاہور:فروری،مارچ،۱۹۶۶ء۔ص۹۲
۴۱۔صدیق سالک۔میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا۔لاہور:الفیصل ناشران،۲۰۰۹ء۔ص۲۱
۴۲۔ایضاً۔ص۲۵
۴۳۔آغا اشرف۔جہادِ پاکستان۔لاہور:مکتبہ القریش،۱۹۸۶ء۔ص۳۰۲
۴۴۔قدرت اللہ شہاب۔شہاب نامہ۔لاہور:سنگ میل پبلشرز،۱۹۹۸ء۔ص۱۰۴۶
۴۵۔صدیق سالک۔میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا۔ص۱۳
۴۶۔ایضاً۔ص۳۵
۴۷۔مرتضیٰ انجم۔جنگی معرکے۔لاہور:خزینہ علم وادب،۲۰۰۴ء۔ص۲۱۲
۴۸۔آغا اشرف۔جہادِ پاکستان۔ص۳۴۵
۴۹۔ضمیر جعفری،سید۔گنر شیر خان۔اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،۱۹۹۷ء۔ص۱۳
۵۰۔اشرف،ڈاکٹر محمد خان۔پاکستان :قومی سلامتی کے مسائل۔ص۹۷
۵۱۔عاصم ،محمد نواز ۔قومی سانحات اور اصل حقائق۔(مترجمہ محمد ارشد ملک)۔کراچی :روزنامہ سائبان اسپیشل،اگست ۲۰۱۷ء۔ص۱۶۹
۵۲۔ایضاً۔ص۱۷۰
۵۳۔ایم۔آر شاہد۔شہیدانِ وطن۔لاہور:الفیصل ناشران،۲۰۱۶ء۔ص۶۵
۵۴۔ایضاً۔ص۲۵۹
۵۵۔عاصم،محمد نواز۔قومی سانحات اور اصل حقائق۔ص۱۷۵
۵۶۔مرتضیٰ انجم۔جنگی معرکے۔لاہور:خزینہ علم وادب،۲۰۰۴ء۔ص۲۸۵
۵۷۔ایضاً۔ص۲۹۵
۵۸۔قاسم یعقوب۔اردو شاعری پر جنگوں کے اثرات۔ص۲۲۴۔۲۲۵

۵۹۔ محمد عرفان طارق۔ امن کی تلاش .....ضرب عضب تک۔ اسلام آباد:ایم ٹی ایم پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء۔ ص۶۶

۶۰۔ ایضاً۔ ص۶۴

۶۱۔ مبارک علی، ڈاکٹر۔گمشدہ تاریخ۔لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء۔ ص۳۹

۶۲۔عارف محمود۔ "ملکی سالمیت کی جنگ"۔مشمولہ، ہلال (ماہنامہ )۔راولپنڈی: شمارہ ۱۲، جلد۴۵، جون۲۰۰۹ء۔ ص۳

۶۳۔ محمد عرفان طارق۔امن کی تلاش .....ضرب عضب تک۔ ص۱۲۵

۶۴۔ ایضاً۔ ص۱۳۲۔۱۳۳

۶۵۔ ایاز مفتی، سید۔ "سانحۂ پشاور پر بشریٰ سعید کی کتاب"۔ مشمولہ، رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو۔ (مرتبہ بشریٰ سعید)۔فیصل آباد: شمع بکس، ۲۰۱۶ء۔ ص۱۸

۶۶۔ محمد ظہیر قندیل۔معرکہ بڈھ بیر کا ہیرو۔ حسن ابدال: کیڈٹ کالج حسن ابدال، ۲۰۱۷ء۔ ص۲۰۳

باب پنجم | صفحہ نمبر

## فن کا تعارف:

فن سے مراد ایسی انسانی صلاحیت جو غیر فطری ہو اور انسان اپنی محنت اور تجربے کی بنیاد پر حاصل کرے۔ فن کی تکمیل میں نہ صرف انسانی محنت اور تجربہ کار فرما ہوتا ہے بلکہ اس میں انسانی ذہانت کی چاشنی بھی درکار ہوتی ہے۔ فنی مہارت سے منزلوں کو عروج حاصل ہوتا ہے، جب کوئی فنکار اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے خون جگر کی نمود سے کچھ تخلیق کر لیتا ہے تو وہ فن کی معراج کو پہنچ جاتا ہے۔ کسی شخص یا قوم کی تہذیب اس وقت تک ترقی یافتہ نہیں کہلا سکتی جب تک وہ قوم فنی لحاظ سے بھی بام عروج کو نہ پہنچ جائے۔ دوسرے لفظوں میں انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقا کا علوم و فنون کے ساتھ گہرا رشتہ ہے۔ کوئی بھی تخلیق کار اس وقت تک اپنا مقام پیدا نہیں کر سکتا جب تک وہ فکر کے ساتھ فنی لحاظ سے بھی مستحکم نہ ہو۔ فن کار لوگ عام انسانوں سے زیادہ ذہین اور حساس ہوتے ہیں اور وہ زندگی کی قدروں کو بھی احسن طریقے سے لفظوں میں ڈھال کر فنی چاشنی سے ایسا شہ پارہ تخلیق کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو انسانی جذبات و احساسات میں تغیّر پیدا کر سکے۔ فن آفرینی دنیا کے تمام علوم کی طرح شعر و ادب پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔

شاعری ایک ایسا پیچیدہ عمل ہے، جس کی تخلیق میں کئی عناصر شامل ہو کر ایک تخلیقی وحدت کی تشکیل و تعمیر میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔ یہ عناصر اپنا ظاہری وجود کھو جانے کے بعد اپنا ذاتی تشخص مٹا دیتے ہیں جیسے کئی ندیاں، نالے اور دریا سمندر کی تشکیل میں اپنا ذاتی وجود وحدت کی تخلیق میں سمندر کی نذر کر دیتے ہیں لیکن اس سے پہلے ہر اکائی اپنا تشخص قائم رکھتی ہے حتیٰ کہ بارش کا ایک قطرہ بھی سمندر میں حصہ ڈالنے سے پہلے اپنا تشخص رکھتا ہے لیکن سمندر میں شامل ہونے کے بعد ان عناصر ترکیبی کے وجود کی نفی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح شاعری میں بھی شامل عناصر تخلیقی وحدت کی تعمیر کا حصہ بن کر اپنا ظاہری یا ذاتی وجود قربان کر دیتے ہیں، لیکن بعض اوقات ان تعمیری عناصر میں وہ اجزا بھی شامل ہو جاتے ہیں جو تخلیقی وحدت کی تعمیر و تشکیل میں سود مند ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوتے ہیں اور اس کو ایک بہترین تخلیقی شہ پارہ بننے کی رہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں یا دوسرے عناصر ترکیبی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو سکتے اس لیے ان تمام عناصر ترکیبی کا مطالعہ از حد ضروری ہو جاتا ہے۔

شاعری کی تخلیق میں عام طور پر دو پہلو نمایاں ہیں، ایک فکری اور دوسرا فنی۔ کسی فن کار کا تخلیقی شاہکار اس وقت تک وجود میں نہیں آ سکتا جب تک وہ اسے تخیل کی بلندی کے ساتھ اعلیٰ فنی محاسن کا جامہ نہ پہنائے یعنی روحانیت اور جذبات کے ساتھ کاری گر کی ذاتی چابک دستی کا ہونا بھی از حد ضروری ہے۔

## ہیئت کا تعارف:

شعری تخلیق میں عام طور پر دو فکری پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ جن میں اول کا خیال ہے کہ تخیل اور جذبات سے کوئی بھی فن پارہ وجود میں لایا جاسکتا ہے اس فکری پہلو سے وابستہ فن کو اتنی اہمیت نہیں دیتے۔ ادب برائے معاشرہ والے عام عام طور پر اس پہلو سے وابستہ ہیں جبکہ دوسرا تخلیقی پہلو فکر اور تخیل کے بجائے تخلیق کی آرائش وزیبائش پر ساری توجہ صرف کرتا ہے اس کی مثال اگر لکھنؤ کے ادب سے دی جائے تو مناسب ہوگا کیونکہ ناسخ وانشا نے شعر کی ظاہری زیبائش پر توجہ صرف کی لیکن اس کے باوجود دبستانِ لکھنؤ کو اردو ادب میں وہ چاشنی نہیں مل سکی جو دبستان دلی کو تھی کیونکہ دبستان دِلّی والے خارجی پہلو کے ساتھ داخلی پہلو کو بھی لازمی سمجھتے تھے۔ شعری فن پارہ کی تخلیق کے لیے ان دونوں پہلوؤں یا عناصر کا یکسر ایک ساتھ چلنا ضروری ہے کیونکہ خیالات و جذبات کو فنکار کی ہنر مندی سے تخلیقی پرچار کر کے ایک شہ پارہ تخلیق کیا جاسکتا ہے جبکہ صرف ماورائی علم سے کوئی شہ پارہ تخلیق کرنا انسانی ممکنات میں نہیں ہے۔

جب کسی فنکار (شاعر و ادیب) کے ذہن میں کوئی خیال و فکر جنم لیتا ہے تو اس کے مؤثر اظہار کے لیے کسی خارجی پیکر یا ہیئت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اپنے خیال یا جذبہ کو مجسم صورت میں ڈھال کر ہی وہ اپنے مقصد کی تکمیل کر پاتا ہے۔ اس کے لیے پہلے وہ ایک سانچہ تیار کرتا ہے یا پہلے سے تیار شدہ سانچوں کی پرکھ کرتا ہے تاکہ وہ اپنے تخیل کو کسی سانچے میں ڈال کر سب سے بہتر انداز میں کوئی شکل دے سکے۔ اس سانچہ کو عام معنوں میں ہیئت یا Form کہا جاتا ہے۔

ہیئت کا لفظ عربی سے اردو میں وارد ہوا ہے جس کے معنی ساخت اور شکل وصورت کے ہیں۔ مشہور لغت فیروز اللّغات کے مطابق: "بناوٹ، صورت، شکل، حالت، کیفیت اور طور طریق "(۱) اور فرہنگ آصفیہ کے مطابق: "حالت، کیفیت ڈھنگ اور طور طریق وغیرہ "(۲) کے ہیں۔ مراد یہ ایک ایسا مجسم ڈھانچہ یا ساخت ہے جس میں ایک فنکار اپنے خیالات و افکار کو مادی شکل دیتا ہے کیونکہ اس صورت یا شکل کے بغیر خیالات و افکار بے معنی ہیں۔ جس طرح ایک روح کو اپنی ظاہری وجودگی کے اظہار کے لیے ایک جسم یا مادے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی طرح خیال، فکر و جذبے کو بیان کرنے کے لیے بھی ایک ساخت کی ضرورت ہوتی ہے جس کے بغیر اس کا وجود ناممکن ہے۔ بقول مولوی عبد الرحمن: "یہ سنتے، مانتے آئے ہیں کہ عالم ملکوت ارواح مجردہ کا مسکن ہے مگر یہ دوسرے عالم کی باتیں ہیں۔ اس عالم میں ہم نے روح مجرد نہیں دیکھی، جب بھی کوئی ذی روح دیکھا ہے، مجسم

دیکھا ہے اور روح کو ہمیشہ اس کے تصرف سے پہچانا ہے یہاں تک کہ روح کا تصور بھی کرتے ہیں تو کسی نہ کسی قالب میں۔"(۳)

جب روح اور جسم کی آویزش ہوتی ہے تو اس کو زندگی کہا جاتا ہے یہی روح جب اس جسم سے خارج ہو جائے تو فقط ایک بے معنی جسم رہ جاتا ہے۔ اسی طرح فکر و ہیئت کی آویزش کو فن کا نام دیا گیا ہے، یعنی جس طرح زندگی میں جسم اور روح دونوں کی آویزش ہے اور جسم ظاہری نمائش جبکہ روح کا تعلق باطن کے ساتھ ہوتا ہے یہی تعلق تخلیقی فن پارہ میں بھی پایا جاتا ہے اور کسی ایک پہلو کے کمزور ہونے کی صورت میں تخلیق کی اہمیت اور مقام و مرتبہ متاثر ہوتا ہے۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ فکر اور ہیئت میں سے کسی ایک سے فن پارہ تخلیق کیا جا سکتا ہے تو یہ ناممکن ہے، لہٰذا جہاں فکر کی اہمیت ہے وہیں ہیئت کے بغیر کچھ بھی ناممکن ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں، ان دونوں کی بہترین آویزش سے ایک ایسا فن پارہ تخلیق ہو سکتا ہے جو قلب و نظر کی جاذبیت کے باعث صدیوں زندہ رہ سکتا ہے

اب دیکھنا یہ ہے کہ خیال و فکر کو مجسم کرنے کے لیے وہ کیا لوازمات یا بنیادی عناصر ترکیبی ہیں جس سے ایک فکر کو پیکر میں تراشا جا سکتا ہے تو بقول عبد الرحمن "معانی کلام کی روح ہیں اور جب ارواح کا تصور بھی بغیر جسم و جسمانیات کے نہیں ہو سکتا اور معانی ہیں کلام کی روح۔ تو ان کا بھی کوئی جسم ہونا چاہیے۔ وہ جسم کیا ہے؟ یہی الفاظ، جو ہم تم بولتے ہیں۔ جنھیں زبان، کام و دہان، لب و دندان، کی مدد سے پیدا کرتی ہے۔ اور ہوا کانوں تک پہنچاتی ہے۔"(۴) ان الفاظ کو شاعر گھونسلے کے تنکوں کی طرح بنتا ہے اور ایک پائیدار صورت تشکیل دیتا ہے جس کو ہیئت کہا جاتا ہے۔ ہیئت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے ابو الاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں: "لغوی اعتبار سے ہیئت ایک ایسی خارجی شکل کا نام ہے جو کسی چیز کی انفرادیت کی حدود کو متعین کرتی ہے چنانچہ فنی اعتبار سے ہیئت اظہار کی خارجی صورت کا نام ہے۔ نظم کا یہ خارجی پیکر وزن کی نوعیت، ردیف و قافیہ کے نظام، مصرعوں کی تعداد اور مصرعوں کے طول کی یکسانیت یا عدم یکسانیت جیسے امور سے معیّن ہوتا ہے۔"(۵) دوسرے لفظوں میں جذبات، فکر اور خیالات وغیرہ کو لفظوں کی مدد سے کسی خاص سانچہ میں مجسم شکل دینے اور زبان و بیان کی آرائش و زیبائش سے شاعر اور سامع کے درمیان رابطہ اور رشتہ سے ہم آہنگی پیدا کرنے کا نام ہیئت ہے۔

## (الف) ملّی نغموں میں ہیئتی تنوع

انگریزی زبان و ادب میں ہیئت کے لیے Form کا لفظ استعمال ہوتا ہے جبکہ اصناف ادب کے لیے Genre کا لفظ مستعمل ہے۔ ہیئت اور صنف اصطلاحی اور معنوی اعتبار سے مختلف ہیں کیونکہ صنف کا تعلق

موضوع اور مواد سے ہے جبکہ ہیئت اس مواد کی ظاہری تشکیل کو کہا جاتا ہے لیکن اردو زبان و ادب میں بعض اوقات ہیئت اور صنف کی اس قدر ملاوٹ ہو جاتی ہے کہ ان کی الگ شناخت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر غزل کی مثال لے لی جائے تو غزل دور قدیم میں حسن و عشق کے بیان کی وجہ سے صنف شمار کی جاتی رہی ہے لیکن اگر موجودہ دور میں دیکھا جائے تو غزل کا ذیلی ڈھانچہ سامنے آنے کے بعد ہیئت سے زیادہ مناسبت معلوم ہوتی ہے کیونکہ غزل اب صرف حسن و عشق کے مضامین کے لیے مختص نہیں رہی بلکہ زندگی کے تمام موضوعات کی ترجمان بن چکی ہے البتہ کچھ اصناف ایسی ہیں جو صرف موضوع کی پابند ہیں اور کسی بھی ہیئت میں اظہار کی جا سکتی ہیں جیسے نعت، حمد، اور ملّی نغمہ وغیرہ۔ شمیم احمد ہیئت اور صنف کی اس آمیزش کے بارے اپنی کتاب ''اصنافِ سخن اور شعری ہیئتیں'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''شعری ہیئتوں کی شناخت کوئی بڑا مسئلہ نہیں، اس لیے کہ ان کی شناخت بہت حد تک ظاہری صورت سے متعلق ہوتی ہے لیکن صنف و سخن کی شناخت میں تھوڑی بہت پیچید گی ضرور ہے کیونکہ بعض اوقات اصناف کی شناخت ہیئتی اصولوں پر منحصر ہوتی ہے، بعض موضوع سے پہچانی جاتی ہیں، بعض دونوں ہی پر اپنی شناخت کا دورومدار رکھتی ہیں، بعض موضوع، ہیئت دونوں میں سے کسی پر اپنی شناخت کا انحصار نہیں کرتیں، بعض ایسی اصناف ہیں جو محض کسی وزن (یا اوزان) ہی کی وجہ سے اپنی صنفی شناخت قائم کرتی ہیں۔''(۶)

اس لحاظ سے اردو ادب میں اصناف سخن کی شناخت کا کوئی ایک پیمانہ نہیں ہے لیکن وہ اصناف سخن جن کی پہچان صرف ان کا موضوع ہے اور وہ کئی ہیئتوں میں مستعمل ہیں، ان کی شناخت باقی اصناف سخن کی نسبت قدرے آسان اور بہتر ہے جبکہ ہیئتوں میں پایا جانے والے تنوع کے بارے شمیم احمد لکھتے ہیں: ''ہر شعری ہیئت ایک قابل شناخت ظاہری شکل ضرور رکھتی ہے، جسے دیکھتے ہی فوراً پہچان لیں کہ یہ فلاں ہیئت ہے۔''(۷) کیونکہ تمام ہیئتوں کی ساخت اور بناوٹ مختلف ہے۔

جہاں تک ملّی نغمہ کا سوال ہے تو یہ ان اصناف سخن میں شامل ہے جن کی شناخت کا پیمانہ خالص مواد اور موضوع ہے اور ہیئت کے لحاظ سے اس میں کئی تجربات پائے جاتے ہیں۔ ملّی نغمہ چونکہ خالص موضوعاتی صنف سخن ہے تو اس میں پائے جانے والے ہیئتی تنوع میں، روایتی اور غیر روایتی ہیئتوں کے استعمال کے ساتھ ساتھ جدید ہیئتوں کو بھی وضع کیا گیا ہے اس کے علاوہ ملّی نغموں میں بعض شعرا کے ہاں کئی ہیئتی تجربات بھی نظر آتے ہیں۔ ملّی نغمہ کا ہیئتی تنوع کے ساتھ مطالعہ لازم تھا لہٰذا اس میں پایا جانے والا ہیئتی تنوع کو حسب ذیل حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

## روایتی ہیئتیں غزل، مثنوی، قطعہ وغیرہ:

غزل اردو ادب کی مقبول صنف سخن اور بعض شعرا کا پسندیدہ طرز اظہار ہے۔ غزل اپنی مخصوص ہیئت کی بدولت شعرا و سامعین میں یکسر مقبولیت رکھتی ہے۔ قدیم دور میں غزل کو حسن و عشق کے مضامین ادا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے اس لیے بعض نقاد و محققین اس کو اب بھی موضوعاتی اصناف سخن میں شمار کرتے ہیں لیکن دورِ جدید میں غزل نے اپنے اندر زندگی کے تمام مسائل جذب کر لیے ہیں تو اب اس کو موضوعاتی صنف کہنا درست نہیں ہے لیکن چونکہ اس کی ہیئتی ساخت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اس لیے اب اس کو صرف ہیئتی صنف سخن میں شمار کرنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ اب اس میں تمام موضوعاتی اصناف سخن جیسے حمد، نعت، منقبت، واسوخت اور ملّی نغمہ وغیرہ کے مضامین کو ادا کیا جاتا ہے۔ ملّی نغمہ نگاروں نے قومی و ملّی موضوعات کو پیش کرنے کے لیے اس صنف کو خاص کر برتا ہے۔ ان ملّی نغمہ نگاروں میں صوفی تبسم، قیوم نظر، ناصر کاظمی، فیض احمد فیض اور احمد فراز سمیت تمام اہم ملّی نغمہ نگار شعرا شامل ہیں۔ حفیظ تائب کے ایک دعائیہ ملّی نغمہ سے اقتباس ہے:

وطنِ پاک کہ ہے مملکتِ عشقِ رسول
اس میں یا رب ہو محبت کے اجالوں کا نزول
مستقل اس میں رہے حبِ نبی کا موسم
شاخ در شاخ کھِلیں نزہتِ کردار کے پھول
عدل و احساں سے مرتب ہو نظام ہستی
پیروی ختمِ رسلِ کی ہو ہمارا معمول
سارے افراد ہوں تزئینِ چمن میں شامل
سب پہ روشن ہوں مساوات و اخوت کے اصول
اب اس دیس میں آ جائے بہارِ اسلام
اے خدا اب تو ہوں تائب کی دعائیں قبول

(وطنِ پاک کہ ہے مملکتِ عشقِ رسول، تعبیر)

اسی طرح احمد ندیم قاسمی کا شاہکار دعائیہ ملّی نغمہ جو بہت مقبول ہوا، غزل کی ہیئت میں پیش کیا گیا ہے۔ اقتباس ہے:

خدا کرے میری ارض پاک پر اترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو

یہاں جو پھول کھلے وہ کھلا رہے برسوں
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو
یہاں جو سبزہ اگے وہ ہمیشہ سبز رہے
اور ایسا سبز کہ جس کی کوئی مثال نہ ہو

(خدا کرے میری ارض پاک پر اترے، لوح خاک)

غزل کی طرح مثنوی بھی اردو شعر و ادب کی قدیم صنف سخن ہے جس میں دور قدیم میں دکنی ادب میں رزم نامے لکھے گئے ہیں جبکہ شمالی ہند میں اس صنف میں حسن و عشق کی کئی داستانیں رقم ہوئیں۔ مثنوی کی روایت میں میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" اور پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی "گلزار نسیم" کو جو شہرت حاصل ہوئی وہ بے مثل ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے بھی اصناف سخن میں مثنوی کو سب سے مفید اور کارآمد صنف سخن کہا ہے(۸) جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہیں۔

جہاں تک ملّی نغموں کا تعلق ہے تو شعرائے اردو نے اس ہیئتی صنفِ ادب سے خوب استفادہ کیا ہے۔ نقش ہاشمی، حکیم الامت علامہ محمد اقبال کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے "اقبال کے حضور" مثنوی کی ہیئت میں ملّی نغمہ پیش کرتے ہیں:

حضرت اقبالؒ اقلیم خودی کے تاجدار
دانش و حکمت شعور و آگہی کے شہر یار!
شاعرِ ملت حکیم الامت اے اقبال مند
تیری پروازِ تخیل آسمانوں سے بلند!
تو کہ تھا سقراطِ دوراں اے فلاطونِ زماں
عصرِ حاضر کے ارسطو راز دارِ کن فکاں

(اقبال کے حضور، جاوداں اقبال)

مثنوی کی ہیئت میں ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم "میرے وطن کا سپاہی" کے عنوان سے ملّی نغمہ میں پاک فوج کے جوانوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں:

یہ وہ سپاہی ہیں جن کا ڈنکا تمام دنیا میں بج رہا ہے
یہ پھول وہ ہیں کہ جن کے دم سے وطن کا گلزار سج رہا ہے
یہ کعبۃاللہ کے محافظ! یہ کلمۃاللہ پڑھنے والے
دلوں میں قرآں کا نور ہاتھوں میں لے کے شمشیر بڑھنے والے

یہ ہاتھ کٹ بھی گئے تو تب بھی ترے علم کو نہ گرنے دوں گا
اے پاک دھرتی میں تیرا بیٹا میں تیری حرمت پہ کٹ مروں گا

(میرے وطن کا سپاہی، ارمغانِ وطن)

غزل اور مثنوی کے بعد روایتی ہیئتوں میں "قطعہ" سب سے مقبول اردو ہیئت ہے جس کی مقبولیت ہر دور میں رہی ہے۔ مِلّی نغمہ نگاروں نے قومی و مِلّی موضوعات کو قطعہ میں بھی روانی سے پیش کیا ہے۔ جون ایلیا سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد ایک قطعہ میں ان الفاظ میں نغمہ پرداز ہیں:

یہ پوچھتی ہیں وقت سے خود دار بستیاں
جس نے ہمیں فریب دیا ہے ، وہ کون ہے؟
کس نے کیا ہے قوم کے زخموں کو بے وقار
جس نے ہمیں ذلیل کیا ہے ، وہ کون ہے ؟ (قطعہ جون ایلیا، گویا)

جون ایلیا ایک دوسرے قطعہ میں اسی موقعے پر قوم کو دلاسہ بھی دیتے ہیں:

ناقابل شکست ہیں اس قوم کے عوام
اس قوم کے عوام کی تعظیم کیجیے
یہ قوم آج بھی ہے سرفراز و سرخرو
اس قوم کے جلال کو تسلیم کیجیے (قطعہ جون ایلیا، گویا)

## متفرق ہیئتیں:

مِلّی نغمہ اردو ادب کی ایسی وسیع القلب صنف سخن ہے جو قدیم روایتی ہیئتوں کے ساتھ دیگر متفرق ہیئتوں میں بھی اظہار کے لیے پیش کی جاتی رہی ہے، کیونکہ مِلّی نغمہ کسی ایک شعری ہیئت کے قالب کا پابند نہیں ہے اس لیے ان کا اظہار متفرق شعری ہیئتوں یعنی مسمط کی تمام شکلوں مثلاً مثلث ، مربع ، مخمس ، مسدس ، مسبع، مثمن، متسع، معشر اور دیگر شعری ہیئتوں میں بھی کیا گیا ہے۔

چونکہ مِلّی نغموں کا تعلق گائے جانے سے بھی ہے اس لیے زیادہ تر پابند ہیئتوں میں مِلّی نغمہ نگاروں نے مِلّی نغمہ کو موضوع سخن بنایا ہے۔ پابند ہیئتوں کی موسیقی کے ساتھ ہم آہنگی نسبتاً آسان ہے جس سے موسیقار و گلوکار کی رغبت میں اضافہ ہوتا ہے اس لیے پابند ہیئتوں کا رجحان قدرے زیادہ ہے۔ مسمط شعری ہیئت کے لحاظ سے مِلّی نغمہ کی چند صورتیں پیش کی جا رہی ہیں۔

مُسَمّط:

مُسمط عربی کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ”پروئی ہوئی یا موتیوں سے جڑی ہوئی کوئی چیز کے ہیں لیکن اصطلاحی لحاظ سے مسمط سے مراد وہ نظم جس کا ہر بند مقررہ تعداد کے مصرعوں پر مشتمل ہو۔“(۹) مسمط کے بندوں کے مصرعوں کی تعداد میں تنوع پایا جاتا ہے لیکن بند کے مصرعوں کی تعداد کا جو تعین پہلے بند میں کیا جائے گا، آخری بند تک وہی تسلسل قائم رہنا چاہیے۔ لہٰذا مصرعوں کی تعداد کے لحاظ سے مسمط کی کئی مزید شکلیں قائم ہیں جن میں مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مسبع، مثمن، متسع اور معشر وغیرہ ہیں۔

مسمط نظم کی وہ شکل جس کا ہر بند تین تین مصرعوں پر مشتمل ہو اس کو مثلث کہا جاتا ہے۔ مثلث کی مزید شکلوں میں ہر بند کے اولین دو مصرعے کسی اور قافیہ اور تیسرا مصرعہ پہلے بند کا ہم قافیہ ہو سکتا ہے اس اصول کے تحت اس ہیئت کی صورت اس طرح واضح ہوتی ہے۔

الف الف الف ب ب الف ج ج الف دد الف

مسعود حسن ”مدینہ آدم“ کے عنوان سے مِلّی نغمہ میں قوم کے جوانوں کو قدم بڑھانے کی ترغیب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

وہ دور....! ساحل دریا پہ جگمگاتا دیار
وہاں ملے گی تجھے زندگی کی تازہ بہار
ابھی سے اتنا ہے بے دم ، ذرا قدم تو بڑھا
نیا جنوں ہے وہاں اور نئی دلوں میں ترنگ
خیال کے بھی شبستاں میں جاگ اٹھی ہے امنگ
عمل سے فکر ہے مدغم ذرا قدم تو بڑھا (مدینہ آدم، نوائے پاک)

مثلث نظم میں اگر آخری مصرعہ ٹیپ کا ہو یعنی ایک ہی مصرعہ بند کے آخر میں دہرایا جارہا ہو تو وہ بھی مثلث مسمط کہلائے گا، مثال واضع ہو۔

شورش کاشمیری کی نظم ” غازی یا شہید “ سے اقتباس ہے:

ہم تو ہٹنے کے نہیں ، جنگ ہی کا دَور چلے
اب جو تلوار چلی ہے تو بہر طور چلے
جنگ کا دور چلے

ان مہاشاؤں سے ڈرنا نہیں سیکھا ہم نے
چھیڑ بھارت کے سپوتوں سے ذرا اور چلے
جنگ کا دور چلے (غازی یا شہید، الجہاد والجہاد)

مثلث کی ایک تیسری صورت یہ بھی ہے کہ ہر بند کے تینوں مصرعے ہم قافیہ ہوں جبکہ یہ ضروری نہیں کہ پہلے بند کا قافیہ کسی اور بند کے بھی ہم قافیہ ہو۔ مثال دیکھنے سے اس کی ہیئتی شکل اس طرح واضح ہو گی۔

الف الف الف ب ب ب ج ج ج د د د

منصور ملتانی کی کشمیر پر نظم "نشاطِ کرب" سے اقتباس ہے:

کل شب یہ کہہ رہا تھا ستاروں کا کارواں
اب توڑ دوں میں طوق و سلاسل کو بے گماں
ایک بار پھر حدیث محبت کروں بیاں
میرے بدن میں دوڑتا پھرتا لہو ہے وہ
لہجہ ہے میرا اور میری گفتگو ہے وہ
صحرائے تشنگی میں میری آب جو ہے وہ (نشاطِ کرب، فغانِ کشمیر)

مسمط نظم میں اگر ہر بند چار مصرعوں پر مشتمل ہو تو وہ مربع نظم کہلاتی ہے۔ مثلث کی طرح مربع بند کی بھی کئی صورتیں ہیں۔ جن میں ایک صورت یہ ہے کہ مربع بند نظم کے پہلے بند کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوں جبکہ بعد کے تمام بندوں سے پہلے دو مصرعوں کا قافیہ الگ ہو لیکن آخری دو مصرعوں کا قافیہ پہلے بند کے ہم قافیہ ہو۔ اس میں ہر بند کا آخری مصرعہ ٹیپ کا بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی ہیئتی صورت اس طرح واضح ہو گی۔

الف الف الف الف ب ب الف الف ج ج الف الف

مثال کے طور پر سید ضمیر جعفری کا یہ ملّی نغمہ جو انھوں نے ۱۹۷۱ء کی جنگ کے پس منظر میں لکھا، سے اقتباس ہے:

پھر اک الجھن شعلہ بن کر لپکی شہر جلانے کو
پھر اک صر صر غم لے آئی بستی میں ویرانے کو
کھول دیئے خود اپنے جڑے اپنا گوشت چبانے کو
کیا ہم کو یہ ہاتھ ملے تھے اپنی لاش اٹھانے کو
درد کی پھیلی آگ میں، قائد اعظم کے مہتاب جلیں
کرب کی بھڑکی بھٹی میں اقبال کے اجلے خواب جلیں

قبر کی شب میں پھینک دیا اپنا سورج گہنانے کو

کیا ہم کو یہ ہاتھ ملے تھے اپنی لاش اٹھانے کو (لہو کا نرخ، قریۂ جاں)

مربع بند نظم کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ہر بند کے پہلے تین مصرعے الگ ہوں جبکہ چوتھا مصرعہ پہلے بند کے چوتھے مصرعہ کا ہم قافیہ ہو۔ یہ مصرعہ ٹیپ کا مصرعہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی ہیئتی شکل اس طرح واضح ہو گی۔

الف الف الف ب ج ج ج ب د د د ب

صوفی تبسم کے کلام سے اقتباس ہے:

میدانوں پہ لہرائے ہوئے دامن کہسار

وادی کی فضاؤں میں مہکتے ہوئے گلزار

چاروں طرف اٹھکیلیاں کرتے ہوئے اشجار

حوریں ہوں کھڑی جس طرح کوثر کے کنارے

دیہات کے ہیں شام و سحر رنگ سہانے

پوشیدہ فضاؤں کے سکوں میں ہیں ترانے

خاموش حکایات ہیں خاموش فسانے

لفظوں سے کہیں بڑھ کے دلآویز اشارے (قومی ترانہ، سو بار چمن مہکا)

مربع بند نظم کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ہر بند میں مصرع دوم اور چہارم ہم قافیہ ہو جبکہ ہر بند کا مصرعہ اول اور سوم کے قافیے الگ الگ ہوں۔ اس کی ہیئتی صورت کچھ اس طرح واضح ہو گی۔

الف ب ج ب د ہ ز ہ ح ط ی ط

اس کی مثال احمد فراز کی نظم "یہ پرچم جاں" سے اقتباس ہے:

نغموں کا جہاں تھا ریزہ ریزہ

اک وحشت درد کُو بکُو تھی

ہر دل تھا بجھا چراغ گویا

ہر چشمِ طلب لہو لہو تھی

اک رقص جنوں ہوا ہے جاری

یہ رقص جنوں نہ رک سکے گا

یہ شمع نوا نہ بجھ سکے گی

یہ پرچمِ جاں نہ جھک سکے گا (یہ پرچمِ جاں، شبِ خون)

مثلث اور مربع کے بعد مخمس بند کی صورت آتی ہے جس میں ہر بند میں مصرعوں کی تعداد پانچ ہوتی ہے۔ مثلث اور مربع کی طرح اس کی بھی ایک سے زیادہ صورتیں موجود ہیں۔ جن میں ایک صورت یہ ہے کہ پہلے بند سمیت ہر بند کے تین تین مصرعے الگ الگ قافیوں میں ہم قافیہ ہوتے ہیں جبکہ آخری دو مصرعے پہلے بند کے چوتھے اور پانچویں مصرعے کے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اس کی ہیئتی صورت اس طرح واضح ہو گی۔

الف الف الف ب ب ج ج ج ب ب د د د ب ب

بعض اوقات ہر بند کا پانچواں مصرعہ ٹیپ کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

سیماب اکبر آبادی کا مِلّی نغموں کا مجموعہ "قائد کی خوشبو" کی نظم "میر کارواں" سے اقتباس:

منزل سے تجھ کو عشق ہے اے پائے مرد عشق

آئیں گے ترے بعد کئی رہ نوردِ عشق

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو دردِ عشق

رکھی ہے آج لذت زخمِ جگر کہاں؟

اے میر کارواں (میر کارواں، قائد کی خوشبو)

مخمس کی ایک دوسری ترتیب کے مطابق ہر بند کی شکل میں مصرع دوم، چہارم اور پنجم تو ہم قافیہ ہوتے ہیں لیکن مصرعہ اول اور سوم کے قافیے ان سے مختلف ہوں۔ اس کی ہیئتی صورت اس طرح واضح ہو گی:

الف ب ج ب ب

مثلاً احمد فراز کی نظم "نیا کشمیر" سے اقتباس ہے:

تیرے سینے پہ محلات کے ناسوروں نے

تیری شریانوں میں اک زہر سا بھر رکھا ہے

تیرا ماحول تو جنت سے حسیں تر ہے مگر

تجھ کو دوزخ سے سوا وقت نے کر رکھا ہے

تجھ کو غیروں نے سدا دستِ نگر رکھا ہے (نیا کشمیر، شبِ خون)

مخمس کے تیسری صورت یہ بھی ہے کہ ہر بند کے پہلے چار مصرعے ہم قافیہ ہوں جبکہ پانچواں مصرعہ الگ قافیہ رکھتا ہو جو ٹیپ کا مصرعہ بھی ہو سکتا ہے اور تمام بندوں کے آخری مصرعوں کا ہم قافیہ بھی۔ اس کی ہیئتی صورت اس طرح واضح ہو گی:

الف الف الف الف ب ج ج ج ج ب د د د د ب

مثلاً سانحۂ پشاور کے پس منظر میں لکھا گیا سیدہ نسیم آرا کا ملّی نغمہ سے اقتباس:

فرشتے ہم کو لینے کے لیے جنت سے آئے تھے
سلامی دے کے ہم کو خلد کا مژدہ سناتے تھے
درود پاک پڑھ کر اپنی باہوں میں بلاتے تھے
ہمیں پھولوں کی طرح اپنی گودوں میں اٹھاتے تھے
میری ماں اب نہیں رونا، میری ماں اب نہیں رونا

(ننھے شہیدوں کی التجا، رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو)

مخمس کی چوتھی صورت یہ بھی ہے کہ ہر بند کے پہلے دو مصرعے آپس میں ہم قافیہ ہوں جبکہ باقی ہر بند کے تیسرے، چوتھے اور پانچویں مصرعوں کا قافیہ ایک ہو، اس کی ہیئتی صورت یہ ہو گی:

الف الف ب ب ب ج ج ب ب ب د د ب ب ب

قمر عباس امروہوی کی نظم " وطن کی آواز " سے مثال ملاحظہ ہو:

مٹا دے کفر کی دنیا جلا دے ظلم کی بستی
فنا کر سامراجی قوتوں کا زور اور ہستی
جوان پاک قاسم صف شکن آواز دیتا ہے
مجاہد صف شکن تجھ کو وطن آواز دیتا ہے
زمین پاک کا رنگیں چمن آواز دیتا ہے (وطن کی آواز ، جنگ ترنگ)

مخمس کے بعد مسمط کی ہیئت ترکیب میں مسدس کی ہیئت ہے جس میں ہر بند میں چھ مصرعے شامل ہیں مسمط کی یہ ہیئت سب سے زیادہ مقبول ہے اور شعرائے اردو نے اس کو سب سے زیادہ وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ دیگر شعری ہیئتوں کی طرح اس کے بند میں مصرعوں کی تعداد چھ کے ساتھ قافیہ اور ردیف کے لحاظ سے مزید کئی شکلیں ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

مسدس کی ایک صورت یہ ہے کہ ہر بند میں پہلے چار مصرعے آپس میں اور پانچواں اور چھٹا مصرعہ آپس میں ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اس ہیئتی ترکیب میں آخری مصرعہ بعض اوقات ٹیپ کا مصرعہ ہوتا ہے۔ اس کی ہیئتی صورت حسب ذیل ہوگی:

الف الف الف الف ب ب ج ج ج ج ب ب دد دد ب ب

مثال کے طور پر فدا علی سلمان کا مِلّی نغمہ "جنت کشمیر" سے اقتباس ہے:

تو وطن کی لاج ہے اور آبرو
ہے وطن تیرے ہی دم سے سرخرو
دھوم تیری قریہ قریہ کو بہ کو
نام کے تیرے ہیں چرچے چار سو
اب نہ رک یہ وقت ننگ نام ہے
جنت کشمیر اک دو گام ہے

(جنتِ کشمیر، شمالی علاقے کا اردو ادب)

مسدس ہیئت کی ایک دوسری صورت میں دوسرا، چوتھا، چھٹا مصرعہ ہم قافیہ ہوتے ہیں، جبکہ پہلا، تیسرا اور پانچواں مصرع قافیے کی قید سے آزاد ہوتے ہیں، اس کی ہیئتی صورت ملاحظہ ہو:

الف ب ج ب د ب

مثال کے طور پر احمد فراز کی نظم "دیکھنا یہ ہے" سے اقتباس ہے:

دیکھنا یہ ہے کہ اس باطل و حق کے رن میں
رات مرتی ہے کہ زنجیرِ سحر ہوتی ہے
آخری فتح مری ہے مرا ایمان ہے یہ
جس طرح ڈوبتے سورج کو خبر ہوتی ہے
میں تو سو بار اسے اپنا مقدر کر لوں
جس شہادت سے مری ذات امر ہوتی ہے

(دیکھنا یہ ہے، شبِ خون)

اسی طرح ایسی نظم جس کا ہر بند سات سات مصرعوں پر مشتمل ہو وہ مسبع کہلاتی ہے اور آٹھ آٹھ مصرعوں پر مشتمل بند والی نظم کو مثمن جبکہ نو نو مصرعوں پر مشتمل بند والی نظم کو متسع اور دس دس مصرعوں پر مشتمل بند والی نظم کو معشر کہا جاتا ہے۔ عام طور پر شعرائے اردو اور مِلّی نغمہ نگاروں نے مخمس اور مسدس ہیئت کو

زیادہ برتا ہے لیکن کہیں طویل مصرعوں پر مشتمل بندوں والی نظمیں بھی شامل ہیں اس لیے اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ طویل مصرعوں والے بندوں کی نظم سے مثال واضح ہو جو مسبع ہیئت میں ہے۔ فلائٹ لیفٹیننٹ نوید شبلی کی نظم "مجاہد کی دعا" سے اقتباس:

مرے خدا تو مجھے اپنے سائبان میں رکھ
مثال بن کے جیوں اس طرح جہان میں رکھ
میں تیری راہ میں دیوانہ وار لڑتا رہوں
میں ظلمتوں میں اجالے تمہارے بھرتا رہوں
میں اس طرح سے اطاعت تمہاری کرتا رہوں
مثال وقت تیرے دَور سے گزرتا رہوں
جو سیلِ کفر کو روکے اُسی چٹان میں رکھ

(مجاہد کی دعا، شجاعت کے تارے وطن کے سپاہی)

مسمط شعری ہیئت کے ساتھ ترکیب بند اور ترجیع بند کی شعری ہیئتوں میں بھی ملّی نغمے موجود ہیں۔ ترکیب بند اور مسمط میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مسمط میں نظم کے تمام بندوں میں شعروں اور مصرعوں کی تعداد برابر ہونی چاہیے جبکہ ترکیب بند اور ترجیع بند میں یہ پابندی لازمی نہیں ہے بلکہ ہر بند میں شعروں کی تعداد مختلف ہو سکتی ہے۔ جیسے اقبال کی نظم "شمع اور شاعر" میں یہ تعداد یکساں نہیں ہے تو اس کو ترکیب بند کہا جائے گا۔ جبکہ ترکیب بند اور ترجیع بند میں صرف اتنا ہی فرق ہے کہ ترکیب بند میں ہر بند کا آخری شعر نیا اور مختلف ہوتا ہے مگر ترجیع بند میں تمام بندوں کا آخری شعر ایک ہی ہو گا جس کو ٹیپ کا شعر کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات پورے شعر کی بجائے صرف آخری شعری کا آخری مصرعہ بار بار دہرایا جاتا ہے اس صورت میں شعر کی بجائے مصرع کو ٹیپ کا مصرع یا ترجیع بند ہیئتی مصرع کہا جائے گا۔

اردو شعری ہیئتوں میں ایک ہیئت مستزاد کی بھی استعمال ہوتی ہے۔ مستزاد ایک مکمل مصرعے پر مزید نصف مصرعے یا ایک ٹکڑے کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ مکمل مصرع اور نصف مصرع آپس میں ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ ملّی نغموں میں بھی یہ ہیئت ترکیب استعمال ہوئی ہے جس کی مثال حسب ذیل ہے:

خلیفہ عبد الحکیم کی نظم "اے خطۂ کشمیر" سے اقتباس ہے:

صدیوں سے یہاں حالت انساں رہی خستہ     پر بال شکستہ
آزادی و توقیر کا مسدود ہے رستہ     ہر باب ہے بستہ

حیواں یہاں مہنگا ہے تو انسان ہے سستہ      یہ    نوع    خجستہ
ہے خون رلاتی مجھے آدم کی یہ تحقیر      اے    خطۂ    کشمیر

(اے خطۂ کشمیر، فغانِ کشمیر)

مستزاد ہیئت میں کبھی ایک شعر کے مصرعے کے دونوں حصے یعنی مکمل مصرع اور نصف مصرعہ یا بڑھا ہوا مصرعہ آپس میں ہم قافیہ ہوتے ہیں اور کبھی ایک شعر کے مکمل مصرعے آپس میں اور نصف مصرعے آپس میں ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ ثاقب حزیں کی نظم "بانی پاکستان کے حضور" سے مثال ملاحظہ ہو:

تنظیم کا جو درس کبھی تم نے دیا تھا      سب یاد ہے ہم کو
مسلم کو اخوت پہ عمل تم نے کہا تھا      سب یاد ہے ہم کو
پھر عزم و یقیں رکھ کے ہمیں کس نے بڑھایا      سب یاد ہے ہم کو

(بانی پاکستان کے حضور، ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح)

## آزاد نظم اور ملّی نغمہ نگاری:

اردو ادب کے قدیم دور میں شعرا کے ہاں قافیہ شاعری کا لازمی حصہ سمجھا جاتا تھا لیکن اس سے مکمل خیالات ادا کرنے میں کسی قدر دشواری رہتی تھی۔ دوسرا یہ ہوا کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں بدیشی حکمرانوں کے ساتھ ان کے ادب کے اثرات بھی ہماری زبان پر پڑے جس سے وہاں کی چند شعری اور نثری اصناف اردو میں رائج ہو گئیں۔ آزاد نظم بھی انگریزی ادب سے اردو میں وارد ہوئی لیکن اس میں ہیئتی پابندیوں سے آزادی اور قافیہ ردیف اور وزن بحر کی کوئی پابندی نہ ہونے کی وجہ سے شعرائے اردو کو اپنے خیالات و فکر ادا کرنے میں کسی قدر آسانی نظر آئی تو انھوں نے اس صنف کو اپنا کر شعری ہیئتوں میں کسی قدر اضافہ کر دیا۔ اردو ادب میں ن م راشد اور تصدق حسین خالد کو آزاد نظم کا بانی تصور کیا جاتا ہے لیکن دوسرے جدید شعرا کے ہاں بھی اس کی مقبولیت میں کمی نہیں ہوئی۔ بیسویں صدی کے اردو کے زیادہ تر شعرا نے زبان کا ذائقہ بدلنے کی خاطر ہی سہی آزاد نظم میں اظہار کیا ہے۔

ملّی نغمہ میں خیالات اور موضوع کی وسعت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے اور ملک و ملت سے محبت بھی شعرائے اردو کے خون میں شامل ہے لہٰذا بعض شعرا نے پابند ہیئتوں کی بجائے آزاد نظم کو اپنا پیرایہ اظہار بنایا ہے۔ آزاد نظم کے ساتھ نظم معریٰ اور پابند نظم میں بھی ملّی نغمے تخلیق ہوئے ہیں۔

آزاد نظم میں ملّی نغموں کی تخلیق کے حوالے سے کسی ایک شاعر یا ادارے کو نامزد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ بیسویں صدی میں یہ ایک مقبول ہیئت اختیار کر چکی ہے اور تمام شعرا جہاں پابند ہیئتوں کو اپناتے ہیں وہیں آزاد نظم

میں ادب تخلیق کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے بلکہ بعض شعرا تو اس کی قافیہ ردیف اور بحر و وزن کی پابندیوں سے آزادی کی وجہ سے صرف آزاد نظم کو ہی تخلیقی اظہار کی بہترین ہیئت خیال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر صائمہ خیری کی نظم "وطن عزیز کے نام" سے اقتباس ہے:

مرے وطن اے زمیں میری

یہ گیت میرے

ترے ہی کھیتوں میں جھومتے ہیں

ترے ہی جنگل ترے ہی دریا

ترے ہی شہروں کو چومتے ہیں

ترے سپاہی عظیم تر ہیں

ترے کسانوں میں روشنی ہے

ترے مصور بہت بڑے ہیں

یہ تیرے شاعر

تمام خطوں کے شاعروں سے عظیم تر ہیں (وطن عزیز کے نام، میری نظمیں میرے گیت)

ملّی نغمے جس طرح موضوعات کی وسعت لیے ہوئے ہیں تو قومی و ملّی رہنماؤں پر بھی کئی ملّی نغمے لکھے گئے جن میں اقبال اور قائداعظم کی شخصیات سرفہرست ہیں۔ ان قومی رہنماؤں پر لکھے گئے ملّی نغمے جہاں پابند ہیئتوں میں وضع ہوئے ہیں وہیں آزاد نظم کو بھی شعرا نے پیرایہ اظہار بنایا ہے۔ کشور ناہید کی نظم "اے قائداعظمؒ تیرے زمانے میں" سے اقتباس ہے:

ہوا نے پانی پہ جو بھی لکھا

وہ معتبر تھا

کہ وقت ایسا تھا

رات بھی دن کی روشنی سے حسین تر تھی

کہ وقت ایسا تھا

مسکراہٹ، اداس ہونٹوں سے جھانکتی تھی

(اے قائداعظمؒ ترے زمانے میں، ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح)

اسی طرح معرّیٰ نظم جس میں مصرعے تو برابر ہوتے ہیں مگر قافیے کی پابندی نہیں ہوتی، اس ہیئت میں بھی ملّی نغمہ نگاروں نے ملّی نغمے تخلیق کر کے ملّی نغموں کی قدر و اہمیت اور مقام و مرتبہ میں اضافہ کیا ہے۔ قیوم نظر کی نظم "وادیِ کشمیر" سے اقتباس ہے:

آج بھی وادیِ کشمیر تیرے کوہ و دمن
ان گنت شعلوں کی قسمت کو ہم آغوش کیے
دیکھتے ہیں تیری لٹتی ہوئی شادابی کو
جانے کیا تیرے پرستاروں پر گزری ہے جو یوں
نیل گوں آنکھیں ہیں پتھرائی ہوئی اور وہ لب
جن پہ جھرنوں سے رواں نغمے رہا کرتے تھے
گنگ ہیں، اور فنکاروں کے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ
سوکھی لکڑی کی طرح ٹوٹ چکے ہیں شاید

(وادیِ کشمیر، قلب و نظر کے سلسلے)

آزاد نظم کی طرح مغرب سے درآمد شدہ دیگر ہیئتی اصناف سخن میں بھی ملّی نغمے تخلیق کیے گئے ہیں۔ ان اصناف سخن میں سانیٹ، ہائیکو اور کینٹو وغیرہ شامل ہیں۔ ریاض احمد ریاض ہائیکو شعری ہیئت میں بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

تیری چھاؤں میں سارے بیٹھے ہیں
تو ہے برگد مرے زمانے کا
تیری عظمت جناحؒ سب مانیں

(ہائیکو، ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح)

سید جعفر طاہر اردو کینٹو میں اپنی مثال آپ ہیں۔ انھوں نے اس مغربی صنف ادب کو اردو میں نہ صرف متعارف کروایا بلکہ "ہفت کشور" کے عنوان سے پورا مجموعہ کینٹوز میں تخلیق کیا۔ انھوں نے قومی و ملّی مضامین کو بھی اس صنف میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے جن میں ان کا کینٹو "داستان حریت" کافی مقبول ہوا ہے جس میں جعفر طاہر نے انگریزوں کی آمد سے لے کر یہاں پر حکومت قائم کرنے کی داستان بیان کی ہے کہ کس طرح انگریز تجارت کی غرض سے آئے اور پورے ہندوستان کے مالک بن گئے اور جب ہندوستان کے باشندوں نے اپنا حق لینے کے لیے ہاتھ اور ہتھیار اٹھائے تو انھوں نے اس کو بغاوت کا نام دیا۔

مذکورہ بالا شعری ہیئتوں کے علاوہ اردو ادب کی دیگر تمام ہیئتی اصناف میں مِلّی نغمے لکھنے کی روایت موجود ہے۔مِلّی نغمہ کا تعلق بھی گیت کی طرح گائے جانے سے ہے اس لیے اس میں گیت کی ہیئت کا اثر بھی پایا جاتا ہے۔ یعنی گیت کی طرز پر اس ہیئت میں مِلّی نغمے ادا کیے جاتے ہیں کہ جس سے موسیقی کا رنگ دینا آسان ہو اور موسیقار و گلوکار اپنے فنی کمال سے نغمگی کا رنگ دے سکیں تاکہ فوج و عوام کے جذبہ حب الوطنی اور جذبہ قوم و ملت میں اضافہ ہو سکے۔صوفی تبسم کا گیت کی ہیئت میں مِلّی نغمہ جس کا عنوان "ترانہ مِلّی" ہے، سے اقتباس ہے:

بڑھے چلو بڑھے چلو بڑھے چلو
بلند ہمتیں لیے
سپاہیو! بڑھے چلو
بہادرو! بڑھے چلو
بڑھے چلو بڑھے چلو
بڑھے چلو بڑھے چلو
یہی تمہاری شان ہے
اس میں ساری آن ہے
یہی عمل کی جان ہے
بڑھے چلو بڑھے چلو بڑھے چلو (ترانہ مِلّی، سو بار چمن مہکا)

## تمام ہیئتوں کے حوالے سے اردو میں مِلّی نغمہ نگاری کا مطالعہ:

دنیا کی کسی بھی زبان و ادب کے بغور مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جہاں معاشرہ کا اس کے ادب پر اثر پڑتا ہے وہیں تہذیب و تمدن کی تبدیلی سے ان اصناف کی ہیئتی صورت بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔یوں ہیئتیں خیال و فکر کے اظہار کے ساتھ عصری تشخیص کا ذریعہ بھی بن جاتی ہیں یعنی جب کوئی شاعر یا ادیب معاشرے کے عروج و زوال، بلندی و پستی اور ظلم و زیادتی کو قلم سے تحریر کرنا چاہتا ہے تو عصری تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ادب تخلیق کرتا ہے۔عصری میلانات کو سمجھے بغیر ادب کی تخلیق میں کوئی ہیئتی صورت اختیار کرنا فن کی بے قدری کرنے کے مترادف ہوتا ہے کیونکہ عصری ارتقا کے ساتھ ادب اور ہیئت کے تقاضے بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔اردو ادب میں قصیدہ کی مثال لے لیں تو کسی دور میں قصیدہ شعرا کی مقبول صنف ادب تھا اور بادشاہ و امرا کی طرف سے قصیدہ نگار کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔اگر ہیئتی صنف کے حوالے سے بات کریں تو قدیم

دور میں غزل کی ہیئت پسندیدہ تھی جس میں حسن و عشق اور ہجر و وصال کے مضامین قافیہ اور ردیف اور مطلع و مقطع کے ادا کیے جاتے تاکہ قارئین زیادہ سے زیادہ لطف اٹھا سکیں۔

بادشاہی نظام کے خاتمہ کے بعد جہاں فکر و خیال میں تبدیلی پیدا ہوئی وہیں یہ تبدیلی ہیئت کی تبدیلی کا بھی باعث بن گئی۔ کیونکہ تہذیب و تمدن کی تبدیلی سے فکر و خیال اور ضروریات زندگی کے تقاضے بھی بدل گئے اور چونکہ ہیئت کوئی جامد یا معیّن چیز تو ہے نہیں لہٰذا تہذیب و معاشرت کی تبدیلی سے ہیئت میں بھی تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ نئی سوچ نئی ہیئت کا تقاضا کرتی ہے اور قدیم ہیئت میں فنکار اپنا پیرایہ اظہار اس طرح نہیں کر پاتا جس طرح وہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ بعض اوقات قدیم ہیئت میں جزوی تبدیلی کر کے یا پھر کسی نئی ہیئت کی ایجاد کر کے عصری میلانات کو ادا کرتا ہے کیونکہ ایسی ہیئت اس کی ضرورت بن جاتی ہے جس میں وہ نئے تہذیبی افکار کو احسن انداز سے پیش کر سکے۔

جب کوئی فن کار کوئی نئی ہیئت ایجاد کرتا ہے تو ابتدا میں اس کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوتی جیسی کہ قدیم ہیئتوں کو حاصل ہوتی ہے لیکن اگر اس نئی ہیئت میں کوئی دم خم ہو تو اور خیال کو بہتر طور پر پیش کرنے کی صلاحیت ہو تو رفتہ رفتہ یہ اپنی اہمیت منوا لیتی ہے اور تخلیق کاروں اور قارئیں میں مقبول ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر معاشرے کی تبدیلیوں کے ساتھ ہیئتی ایجادات و تجربات کا سلسلہ رک جائے تو تخلیقی جمود طاری ہو جاتا ہے اور اس معاشرے کا ادب زوال کا شکار ہو جاتا ہے۔

اردو ادب میں جنگ آزادی کے بعد جب زندگی گزارنے کے تمام تقاضے تبدیل ہو گئے اور برصغیر پاک و ہند کی تہذیبی معاشرت پر مغرب کے اثرات پڑنا شروع ہوئے تو ان مغربی اثرات نے ادب کو بھی متاثر کیا اور نئے فکر و خیال کے ساتھ نیا ہیئتی تنوع بھی دیکھنے میں آیا۔ آزاد نظم، سانیٹ اور ہائیکو جیسی ہیئتی اصناف مغرب سے ہمارے تہذیب و ثقافت پر تبدیلی کے ساتھ وارد ہوئیں۔ ان میں مرور ایام کے ساتھ کچھ ہیئتوں کو قبول عام حاصل ہوا جن میں آزاد نظم شامل ہے اور یہ صنف مشرقی تہذیب و معاشرت میں بھی مانوس ہو گئی جبکہ کچھ ہیئتی اصناف مشرقی تہذیب کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے میں ناکام رہیں اور ان کو کوئی خاص مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جیسا کہ کینٹوز، ہائیکو اور سانیٹ وغیرہ ہیں۔

موجودہ دور کو گلوبل ویلیج کا عہد کہا جاتا ہے جس میں پوری دنیا سکڑ کر مختصر ہو گئی ہے تو ایسے دور میں کسی ایک زبان کی شعری ہیئت کا دوسری زبان و ادب میں رائج ہونا عام بات ہے لیکن غلبہ ان شعری ہیئتوں کو حاصل ہے جو ترقی یافتہ یا تہذیب یافتہ ممالک سے تعلق رکھتی ہیں۔

جہاں تک مِلّی نغمہ کا تعلق ہے تو یہ بھی وقت کے میلانات کے ساتھ ہیئتی تنوع رکھتا ہے۔ جب ابتدا میں جنگ نامے، رزم نامے یا فتح نامے شعرا کی مقبول اصناف تھیں تو حالات کی تبدیلی سے ان رزم ناموں کا دور زوال شروع ہو گیا اور ان کی جگہ جدید ہیئتوں کے ساتھ مِلّی نغموں یا قومی نغموں نے لے لی اور آج کے عہد میں مِلّی نغمہ ایک مقبول عام صنفِ ادب کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

## (ب) اسالیب کا تنوع

مِلّی نغموں میں جہاں ہیئتی تنوع پایا جاتا ہے وہیں اس صنفِ ادب کو اپنی مقبولیت کی بنا پر کئی طرح کے اسالیب میں بھی پیرایہ اظہار بنایا گیا ہے۔ اسالیب کا تنوع کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔

۱۔ شعرا کا انفرادی اسلوب

۲۔ بوقت ضرورت اور مواقع کے لحاظ سے اپنایا گیا اسلوب

مِلّی نغموں میں اسالیب کے تنوع پر بحث کرنے سے پہلے اسلوب کی وضاحت ضروری ہے۔ اسلوب کیا ہے؟ سید عابد علی عابد کے خیال میں اسلوب سے مراد کسی لکھنے والے کی وہ انفرادی طرز نگارش ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والوں سے ممیز ہو جاتا ہے۔"(۱۰) اسلوب کوئی مافوق الفطرت شے نہیں ہے جو کسی انسان میں داخل ہو کر اس کا طرز نگارش دوسرے سے منفرد کر دیتا ہے بلکہ اسلوب تو ہر فن کار کی ذاتی شخصیت کا عکس ہے۔ کیونکہ اسلوب میں تخلیق کی باطنی صفات ظاہر ہوتی ہیں۔ بقول سید عبد اللہ "اسلوب تحریر کی کسی ایک صفت کا نام نہیں بلکہ در حقیقت مصنف کی پوری ذاتی زندگی کا عکس اور اس کا مطالعہ ہے جو الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔"(۱۱) اسلوب کوئی عام شے نہیں ہے بلکہ تخلیق کار کی داخلی اور خارجی صفات اس میں ظاہر ہوتی ہیں یعنی اسلوب در حقیقت تخلیق کار کی لفظی تحریر ہے اور بقول سلام سندیلوی "ہم اسلوب کے ذریعے پتا چلا سکتے ہیں کہ یہ عبارت کس کی ہے، لفظوں کا انتخاب، فقروں کی چستی، جملوں کی ساخت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ گل کاری کس مصنف کی ہے۔"(۱۲) یہی وجہ ہے کہ آج میر و غالب ہوں یا ذوق و نصیر۔ ان کے تخلیقی سرمائے سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے خالق کون ہیں۔

کسی تخلیقی سرمائے میں جہاں خیال و فکر کی اہمیت و قدر ہے وہیں اس کا اسلوب بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ خیالات جتنے بھی بلند ہوں اگر تخلیق کار کا طرز نگارش قارئین کو متاثر نہیں کر سکتا تو وہ تحریر اپنا ادبی مقام

نہیں بنا سکتی۔ اس لیے اسلوب کو مواد کے برابر اہمیت حاصل ہے۔ اسلوب جس قدر محنت، وضاحت اور انتخاب الفاظ سے تعمیر و تشکیل کیا گیا ہو گا اس قدر اس کی اہمیت اور فن کار کی شخصیت پر مثبت اثرات مرتب ہوں گے۔

اسلوب یا طرز نگارش میں دیگر زبانوں کے الفاظ و مرکبات اثر انداز ہوتے ہیں جو فن کار کے فن میں جدت پیدا کرنے اور اپنی ذہنی وابستگی کے عکاس ہوتے ہیں۔ اگر اردو ادب میں ملّی نغموں کے حوالے سے بحث کی جائے تو اس میں عام طور پر عربی، فارسی، انگریزی اور ہندی زبان کے اثرات غالب ہیں لہٰذا ملّی نغموں کے اسالیب کا تنوع معرب اسلوب، مفرس اسلوب، ہندی آمیز اسلوب، انگریزی اسلوب، رواں دواں اسلوب اور سلیس اردو زبان کے اسلوب پر مشتمل ہے لیکن اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو زبان کے علاوہ خطیبانہ، ظرافت یا طنز، بیانیہ اور تنقیدی سمیت اسلوب کی بہت سی دیگر اقسام بھی ہیں۔

معرب اسلوب پر بات کی جائے تو ملّی نغموں میں عربی زبان و ادب کا اثر ابتدا سے غالب ہے اس کی وجہ ہمارا مذہب اسلام سے تعلق ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں اسلام عربوں سے ہوتا ہوا فارس کے راستے پہنچا تھا البتہ کچھ عرب تاجر بھی اسلام کی اشاعت کا باعث بنے۔ ملّی نغمہ چونکہ خالص پاکستانی صنف سخن ہونے کے ساتھ باقی اسلامی ممالک سے مذہبی ہم آہنگی کی بنا پر پورے عالم اسلام کی نمائندہ صنف کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اسلام کی بنیادی تعلیمات عربی میں ہیں (قرآن پاک اور حدیث شریف) اس لیے عربی زبان کا ملّی نغموں پر اثر کوئی اچنبھے کی بات نہیں بات ہے۔ ملّی نغمہ نگاروں نے عربی الفاظ و جملوں کو ملّی نغموں میں خاص کر استعمال کیا ہے۔ معرب اسلوب کے حوالے سے ملّی نغموں کی چند مثالیں ذیل ہیں۔

بشر فاروق کی نظم "اتحاد ملک و ملت زندہ باد" سے اقتباس:

صدق صدیقی رضائے لا اِلٰہ
عشقِ فاروقی ثنائے لا اِلٰہ
خوئے عثمانی صدائے لا اِلٰہ
سوز شبیری بنائے لا اِلٰہ
جذبہ مہر و محبت زندہ باد
اتحاد و ملک و ملت زندہ باد

(اتحاد ملک و ملت زندہ باد، تیرا پاکستان ہے یہ میرا پاکستان ہے)

اسی طرح قمر یزدانی مجاہدین وطن کو جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب دیتے ہوئے مجاہدین سے یوں مخاطب ہیں:

انتم الاعلون تیرا وصف ہے
خدمت قوم و وطن تیرا شعار
مظہرِ نصر من اللہ تیرا عزم
اور عمل تائیدِ حق کا شاہکار

(نغمہ جہاد، زندہ و پائندہ باد)

عربی کے علاوہ ملّی نغموں پر فارسی زبان و ادب کا بھی غلبہ ہے اس کی وجہ یہ کہ فارسی صدیوں تک برصغیر کے مسلمان بادشاہوں کے عہد میں سرکاری زبان کے طور پر رائج رہی جبکہ برصغیر پر زیادہ حملہ آوروں کا تعلق بھی فارس سے تھا۔ دوسری اہم بات یہ کہ اردو زبان کا بنیادی اسلوب بھی فارسی اور عربی سے مستعار شدہ ہے اس لیے عربی کے ساتھ فارسی الفاظ و مرکبات کا ملّی نغموں میں استعمال عام ہے۔ سیماب اکبر آبادی کی نظم "خضرِ راہ" سے اقتباس ہے:

وہ خضرِ راہ ، میر کارواں، وہ قائد منزل
ستم کی آندھیوں میں کارواں چلتا رہا جس کا
چلا ہر کاروان جس کی نظروں کے اشارے پر
ز راہِ صدق حکمِ ضوفشاں چلتا رہا جس کا

(خضرِ راہ، قائد کی خوشبو)

عربی اور فارسی کے علاوہ ملّی نغموں میں ہندی زبان کے الفاظ و محاورات بھی شامل ہیں۔ اس کی وجہ صدیوں تک اردو اور ہندی کا یک زبان کے طور پر قائم رہنا ہے۔ اب بھی اختلاف یہ ہے کہ ہندی زبان کا رسم الخط سنسکرت کا ہے اور اس میں سنسکرت الفاظ کا غلبہ ہے جبکہ اردو زبان فارسی اور عربی رسم الخط میں ہے اور اس میں فارسی و عربی الفاظ کثرت سے موجود ہیں۔ اردو اور ہندی میں اس قدر اشتراک ہونے کی وجہ سے ملّی نغموں کے اسلوب میں بھی ہندی الفاظ و محاورات اور ہندی اصناف کا استعمال قدرے عام ہے۔ ملّی نغمے، گیت کی ہیئت میں کثرت سے لکھے گئے ہیں اور گیت ہندی صنف سخن ہے۔ ہندی آمیز اسلوب کی مثالیں ذیل ہیں۔ ادا جعفری کی نظم "پکارے اپنا پاکستان" سے اقتباس ہے:

پیلے مکھڑوں لالی چاہے
سوکھے ہونٹوں گیت
من نگری میں پریت

پیار کا رشتہ ان مٹ ہووے
اس دوری کو تھامو
جھولی جھولی اس کی چمپا
اس خوشبو کو جانو
دکھ کا بندھن سکھ کا ناتا
انسان کی پہچان
پکارے اپنا پاکستان (پکارے اپنا پاکستان، ساز سخن بہانہ ہے)

انگریز برصغیر پاک وہند میں سو سال قبضہ رکھنے کے بعد انگریزی زبان کے ایسے اثرات چھوڑ گئے کہ ستر سال گزرنے کے باوجود اس کا اثر کم نہیں ہوا بلکہ گلوبل ویلیج کی وجہ سے اس کا اثر تمام دنیا میں بڑھتا جارہا ہے اور اس زبان کے الفاظ کو عام بول چال میں برتا جاتا ہے لہٰذا ملّی نغمے بھی ان اثرات سے آزاد نہیں ہیں۔ سانحۂ پشاور کے تناظر میں جبار واصف انگریزی الفاظ کو عام الفاظ کے طور پر استعمال کرتے ہوئے "سانحۂ پشاور" کے عنوان سے ملّی نغمہ میں فرماتے ہیں:

قلم کتابیں، بستے خون میں لت پت ہیں
ننھے منے بچے خون میں لت پت ہیں
ماؤں نے جو لنچ میں دے کر بھیجے تھے
انڈے اور پراٹھے خون میں لت پت ہیں

(سانحۂ پشاور، رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو)

زبانوں کے اثرات کے علاوہ ملّی نغموں کو رواں دواں اسلوب میں بھی شعرائے اردو ادب نے پیرایہ اظہار کیا ہے۔ رواں دواں اسلوب کے حوالے سے ملّی نغموں کی مثال میں اکرم باجوہ کی نظم "کھنڈر" جو ایک سپاہی کے جذبات ہیں، سے اقتباس ہے:

ہم سفر روک لے، راہوارِ حسیں روک بھی لے
آ کہ اس قریہ محبوب کے آثاروں پر
آج آئے ہیں تو پھر بیٹھ کے دم بھر رو لیں
آ کہ اس خاک معطر کے حسین رانو پر
طفلِ معصوم کی مانند گھڑی بھر سو لیں (کھنڈر، تکبیر کا رنگ للکار ہوا)

رواں دواں اسلوب میں ملّی نغموں کی تخلیق نامور شعرا کا پسندیدہ اسلوب ہے لیکن اس کے ساتھ سلیس اردو زبان میں بھی ملّی نغمے تخلیق کیے گئے ہیں۔ سلیس زبان کا اسلوب موجودہ دور میں زیادہ مقبول ہے۔ مثال کے طور پر حسن رضوی کی نظم "میرے دیس کی کیا ہی باتاں" سے اقتباس ہے:

دیس میرے کی ٹھنڈی چھاواں
گیت میں اس کے ہر دم گاواں
اس کے موسم پیار کے موسم
پیاریاں ہیں برساتاں
میرے دیس کی کیا ہی باتاں

(میرے دیس کی کیا ہی باتاں، کبھی کتابوں میں پھول رکھنا)

ان اسالیب کے تنوع سے یہ اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہیں کہ ملّی نغمہ اردو ادب کی ایک مکمل اور مقبول صنف سخن ہے جس کا موضوع، ہیئت اور اسالیب کا تنوع اس کی قدر و قیمت اہمیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اسالیب کا تنوع جہاں شعر کی خارجی صورت کی کئی اقسام رکھتا ہے وہیں شعر کی داخلی سطح میں تغیر و تبدل پیدا کرتا ہے۔ ملّی نغموں کے داخلی اسالیب کے تنوع کو علم بلاغت کی رو سے بھی دیکھنا ضروری ہے۔

## علم بیان:

علم بیان ایسے علم کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعے ایک مفہوم کی کئی طریقوں سے وضاحت کی جائے۔ علمائے بلاغت نے علم بیاں کی الگ الگ تعریفیں کی ہیں جن میں مولوی نجم الغنی کے مطابق " علم بیاں ایسے قاعدوں کا نام ہے کہ اگر کوئی ان کو جانے اور یاد رکھے تو ایک معنی کو کئی طریق سے عبارتِ مختلفہ میں ادا کر سکتا ہے جن میں سے بعض طریق کی دلالت معنی پر بعض طریق سے زیادہ واضح ہوتی ہے۔"(۱۳) جبکہ سید عابد علی عابد کے الفاظ میں "علم بیان وہ علم ہے جو مجاز (۱۔ تشبیہ، ۲۔ استعارہ، ۳۔ مجاز مرسل، ۴۔ کنایہ) سے اس طرح بحث کرتا ہے کہ اس پر حاوی ہونے کے بعد فنکار، انشا پرداز یا خطیب اپنے مفہوم کے ابلاغِ تام میں کامیاب ہو سکے۔"(۱۴) عابد علی عابد کے مطابق بیان اصلاً مجاز ہے جو حقیقت کی زد ہے جبکہ تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل اور کنایہ مجاز کے ارکان ہیں"(۱۵) اور مولوی عبد الرحمن کے مطابق "شعر شاید سخن ہے اور مجاز اس کا پر تکلف لباس و زیور"(۱۶) علم بیان کی تعریف وضع ہو جانے کے بعد اس کے ارکان تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل اور کنایہ کی وضاحت اور ملّی نغموں میں اس کے استعمال پر بحث ضروری ہے۔

ا۔ تشبیہ:

تشبیہ کا لفظ شبہ سے نکلا ہے جس کے معنی مساوی یا مماثل کے ہیں۔ مولوی نجم الغنی کے بقول" علم بیان کی اصطلاح میں تشبیہ سے مراد دلالت ہے دو چیزوں کی۔ جو آپس میں جدا جدا ہوں، ایک معنی میں شریک ہونے پر، اس طرح کہ بطور استعارے کے نہ ہو اور نہ بطور تجرید کے ہو۔ تجرید کا بیان علم بدیع میں آتا ہے۔"(۱۷) دلالت کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ اخلاق دہلوی "روح بلاغت" میں فرماتے ہیں کہ کسی جانی پہچانی چیز کی راہ نمائی سے کسی انجان چیز سے واقف ہونا دلالت ہے مثلاً دھواں دیکھنے سے آگ کو سمجھ لینا، شیر سے خاص قسم کے درندے کا تصور ذہن میں آنا۔"(۱۸) جبکہ تجرید سے مراد "کسی چیز کا وصف میں اتنا کامل ہونا کہ اس سے اس جیسی کوئی دوسری چیز حاصل کی جاسکے تا کہ یہ سمجھا جائے کہ پہلی چیز اپنی خوبی میں کامل ہے" (۱۹) سید عابد علی عابد کے بقول "تشبیہ وہ فن ہے جس کے ذریعے فنکار، انشا پرداز یا خطیب مختلف چیزوں میں مشابہتیں دریافت کرتا ہے۔ گویا ایک چیز کو دوسری چیز کے مشابہ کر دیتا ہے۔"(۲۰) اگر تمام تعریفوں کو مختصر اور سادہ الفاظ میں بیان کیا جائے تو علم بیان کی رو سے تشبیہ سے مراد کسی ایک شے کی ظاہری و باطنی خوبی و خامی کو دوسری چیز کی ظاہری و باطنی خوبی و خامی کے مانند قرار دینا ہے۔ ملّی نغموں میں تشبیہات کا ذخیرہ موجود ہے۔ چند مثالیں ذیل ہیں:

دیار دشت میں چمکا تھا جو قمر کی طرح
وہ تیز دھوپ میں تھا سایہ شجر کی طرح

(اعجاز رحمانی۔ غزل، ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح)

حصول علم و ہنر میں ایسے مگن تھے وہ تو
کہ سطح آب رواں پہ جیسے حباب چہرے

(ریاض ندیم نیازی۔ غزل، رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو)

خوشبو جیسی بیٹیاں لہو لہان ہیں اور
پھولوں جیسے بیٹے خون میں لت پت ہیں

(جبار واصف۔ سانحۂ پشاور، رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو)

چاند اس رات بھی نکلا تھا ، مگر اس کا وجود
اتنا خوں رنگ تھا ، جیسے کسی معصوم کی لاش

(احمد ندیم قاسمی۔ چھ ستمبر، محیط)

۲۔ استعارہ:

علم بیان میں تشبیہ کے ساتھ استعارہ کا استعمال کافی وسیع ہے۔ شعر و ادب میں زور پیدا کرنے کے لیے استعارہ عام استعمال ہوتا ہے اور اس کو تشبیہ سے زیادہ موثر اور کارگر سمجھا جاتا ہے۔ مولوی عبد الرحمن کے مطابق " استعارہ کے معنی ہیں عاریت لینا(ادھار لینا) اس لیے اصطلاح میں استعارہ یہ ہے کہ کوئی چیز کسی کی عاریت لے کر، کسی محروم کو دے دیں اور صورت بدل کر سامنے لائیں۔ " (۲۱) جبکہ مولوی نجم الغنی کے مطابق "مجاز میں معنی حقیقی اور معنی مجازی کے درمیان علاقے کا ہونا ضروری ہے۔ پس اگر دونوں میں تشبیہ کا علاقہ ہے تو ایسے مجاز کو استعارہ کہتے ہیں۔ اگر تشبیہ کے سوا کوئی دوسرا علاقہ ہے تو اسے مجاز مرسل بولتے ہیں"(۲۲) تشبیہ اور استعارہ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ تشبیہ میں ایک چیز کو دوسری چیز کے مماثل یا مانند قرار دیا جاتا ہے جبکہ استعارہ میں ایک چیز کو مماثل یا مانند کہنے کی بجائے ہو بہو وہ چیز قرار دے دی جاتی ہے۔ یعنی تشبیہ میں جس چیز سے تشبیہ دی جاتی تھی استعارہ میں اس چیز کی تمام صفات مستعار لے کر دوسری کو دے دی جاتی ہیں جس سے اس کے معنی و مفہوم بدل جاتے ہیں جو حقیقی کی بجائے مجازی کہلاتے ہیں لیکن تعلق تشبیہ کا ہوتا ہے۔ ملّی نغموں میں تشبیہ کی نسبت استعارہ زیادہ وسعت سے استعمال ہوا ہے جس کی مثالیں درج ذیل ہیں۔

سانحۂ پشاور کے حوالے سے سبیلہ انعام صدیقی کی غزل "معصوم کا کفن ہے جو خوں میں بھرا ہوا" سے اقتباس ہے:

معصوم کا کفن ہے جو خوں میں بھرا ہوا
اے میرے گھر کے چاند تیرے ساتھ کیا ہوا
کوئی بتا دے لال کا میرے تھا کیا قصور
اسکول اس کا جانا ہی کیسے خطا ہوا

(معصوم کا کفن ہے جو خوں میں بھرا ہوا، رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو)

اخگر سرحدی ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں "سرزمین سرگودھا" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

نازش گلستاں ہے　　رونق بہاراں ہے
جنت درخشاں ہے　　سرزمین سرگودھا
سرزمین سرگودھا　　(سرزمین سرگودھا، جنگ ترنگ)

۳۔ مجاز مرسل:

علم بیان کی تیسری صورت مجاز مرسل ہے مجاز حقیقت کے برعکس ہوتا ہے جبکہ مجاز مرسل کی تعریف کرتے ہوئے علامہ اخلاق دہلوی لکھتے ہیں کہ لفظ کو اس خوبی سے مجازی معنی میں استعمال کرنا کہ اصلی اور مجازی معنی میں تشبیہ کے علاوہ کوئی اور تعلق ہو اسے مجاز مرسل کہتے ہیں۔"(۲۳) استعارہ اور مجاز مرسل میں بنیادی فرق یہ ہے کہ استعارہ میں مجازی معنی اور حقیقی معنی میں تشبیہ کا تعلق ہوتا ہے جبکہ مجاز مرسل میں تشبیہ کے علاوہ کوئی اور تعلق ہوتا ہے۔ مجاز مرسل کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

یہ یزیدوں کی کاروائی ہے
پھر سے اصغر نے چوٹ کھائی ہے
ننھے بچوں کا خون ہوتا ہے
کربلا پھر سے لوٹ آئی ہے

(غضنفر علی کا قطعہ، رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو سے)

جبکہ سرور کمال "جاوداں اقبال" میں نظم "اقبال" میں علامہ اقبالؒ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

تیرے افکار نے بخشا ہے ہمیں عزم بلند
ڈال دی تیرے جوانوں نے ستاروں پہ کمند

(اقبال، جاوداں اقبال)

۴۔ کنایہ:

علم بیان کی چوتھی صورت کنایہ ہے۔ نجم الغنی نے کنایہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے کہ "کنایہ" لغت میں پوشیدہ بات کو کہتے ہیں۔ علم بیان کی اصطلاح میں "کنایہ" اس لفظ کو کہتے ہیں جو اپنے موضوع میں مستعمل ہو لیکن مقصود وہ معنی نہ ہوں بلکہ ایک دوسرے معنی ہوں جو اُن پہلے معنی کے ملزوم ہوں"(۲۴) دوسرے لفظوں میں کنایہ سے حقیقی معنی بھی مراد لیے جائیں اور مجازی بھی، جبکہ شاعر کی مراد مجازی معنی ہو اس کو کنایہ کہیں گے۔ ملّی نغموں میں علم البیان کی دیگر صورتوں کی طرح کنایوں کا استعمال بھی ہوا ہے۔ سیماب اکبر آبادی کی نظم "آہ قائد اعظم" سے مثال ملاحظہ ہو:

نہ ہونے سے تمہارے کیا کہیں کیا حال ہے دل کا
نہیں ہو تم تو پھیکا پڑ گیا ہے رنگ محفل کا

ابھی کیوں کر موحّد راہ چل سکتا ہے بے کھٹکے
ابھی تو ہر قدم پر اک صنم خانہ ہے باطل کا

(آہ قائداعظم، قائد کی خوشبو)

## علم بدیع:

علم بدیع ایسے علم کو کہتے ہیں جس میں کلام کی خوبیوں اور خامیوں کا امتیاز کیا جاتا ہے۔ علمائے بلاغت نے علم بدیع کی مختلف تعریفیں کی ہیں مولوی نجم الغنی کے مطابق "بدیع ایک علم یعنی ملکہ ہے جس سے چند امور ایسے معلوم ہو جاتے ہیں جو خوبی کلام کا باعث ہوتے ہیں"(۲۵) جبکہ شمیم بلاغت کے مصنف علامہ اخلاق دہلوی نے اس کی آسان اور مختصر تعریف کی ہے جس کے مطابق "علم بدیع وہ علم ہے جس سے کلام کی لفظی اور معنوی خوبیاں معلوم ہوں"(۲۶) نجم الغنی کے بیان کے مطابق "اول جس نے ان قوائد کا نام علم بدیع مقرر کیا، عبداللہ بن معتز عباسی تھا جس نے ۲۷۴ہجری میں علم بدیع کے قواعد اختراع کر کے ایک مستقل علم مقرر کیا۔ اس نے ایک کتاب میں سترہ قسم کی صنائع لکھی تھیں پھر پیچھے آنے والے اس میں اضافہ کرتے گئے"(۲۷)

علم بدیع کو صنائع بدائع بھی کہا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بدیع کی جمع بدائع ہے اور صنعت کی جمع صنائع ہے اس لیے اسے صنائع بدائع کا علم کہا جاتا ہے اور اس میں کلام کی لفظی و معنوی خوبیوں پر بحث ہوتی ہے اس لیے اسے لفظی اور معنوی دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

### ا۔ صنائع لفظی:

اگر مذکورہ کلام کا تعلق الفاظ، املا یا صوت سے ہو تو اس کو صنائع لفظی کہا جاتا ہے۔ صنائع لفظی میں الفاظ اور صورت کی کاریگری سے کلام میں حسن و نکھار پیدا کیا جاتا ہے۔ ملّی نغموں میں صنائع لفظی کی مختلف صورتیں قائم ہیں۔ مرورِ ایام کے ساتھ صنائع لفظی میں اضافہ ہوتا چلا گیا لہٰذا ان تمام صنعتوں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں البتہ چند صنعتوں کے استعمال سے مثالیں درج ہیں:

### صنعتِ تکرار:

صنعتِ تکرار وہ صنعت ہے جس میں ایک ہی لفظ کو تسلسل کے ساتھ استعمال کیا جائے یعنی جس صنعت میں مخصوص لفظ کی تکرار پائی جائے۔ یہ صنعت اس وقت استعمال ہوتی ہے جب کسی لفظ یا معانی پر زور دینا مقصود ہو۔ صنعت تکرار کی مثال ملاحظہ ہو:

دہقانوں کی محنت رنگ لائی قدم قدم خوشحالی
غنچہ غنچہ لہک رہا ہے مہکی مہکی ڈالی
گلشن گلشن پھول کھلے ہیں چمن چمن ہریالی
اپنا پانی امرت جیسا مٹی خوشبو والی

(اپنا پانی امرت جیسا مٹی خوشبو والی، تیرا پاکستان ہے یہ میرا پاکستان ہے)

مندرجہ بالا دونوں شعر بشیر فاروق کی ملّی نظم سے لیے گئے ہیں اس ملّی نغمہ میں بشر فاروق نے صنعتِ تکرار مطلق کو استعمال کیا ہے۔ ملّی نغموں میں یہ صنعت کثرت سے مستعمل ہے۔

صنعتِ ترافق:

اس صنعت میں چار مصرعے ہوتے ہیں اور جس کو چاہیں مصرع اول، دوم، سوم یا چہارم پر رکھیں اور مطلب و مفہوم میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو۔ اس میں شرط یہ ہے کہ چاروں مصرعے ہم قافیہ ہونے چاہیں۔ شان الحق حقّی کا ملّی نغمہ "کوچ کا ترانہ" سے اقتباس ہے:

ہان تیز کہ جاتا ہے ترقی کا نشاں تیز
ہاں تیز کہ ہوتی ہے حریفوں کی زباں تیز
ہاں تیز کہ کرتے ہیں عدو تیر و سناں تیز
ہاں تیز کہ گرتی ہے بہت قیمت جاں تیز

(کوچ کا ترانہ، نوائے پاک)

صنعت نظم والنثر یا سہل ممتنع:

اس صنعت کو نثر کی صورت میں بھی پڑھا جا سکتا ہے اس لیے اسے نظم و نثر بھی کہتے ہیں۔ ملّی نغمے بعض اوقات ہنگامی صورت میں لکھے جاتے ہیں تو اس دوران یہ صنعت زیادہ استعمال ہوتی ہے۔ اس صنعت کی شرط یہ ہے کہ لفظوں میں تاکید نہ ہو۔ مثلاً:

امتحان آن پڑا ہے تو کوئی بات نہیں
ہم نے سو بار زمانے کے بھرم توڑے ہیں

(ساغر صدیقی۔ ضرب محمود، کلیات ساغر صدیقی)

جگمگاتا ہوا ہرا پرچم
آشتی کا پیام دیتا ہے

اپنے سائے میں رہنے والوں کو
مئے تسکیں کا جام دیتا ہے
جانتے ہیں یہ اپنے بیگانے

(طفیل ہوشیار پوری۔ شمع ملت کے، میرے محبوب وطن)

**۲۔صنائع معنوی:**

صنائع معنوی وہ صنائع ہیں جن سے کلام میں ظاہری حسن کے ساتھ بلاغت میں بھی اضافہ ہوتا ہے اس لیے علمائے بلاغت نے صنائع معنوی کو صنائع لفظی پر ترجیح دی ہے۔صنائع معنوی میں کلام کی معنوی خوبیوں سے بحث ہوتی ہے اور لفظی وجود بھی اس وقت تک کوئی اہمیت نہیں رکھتا جب تک اس میں معنوی صفت نہ ہو اس لیے لفظی صنائع کی نسبت صنائع معنوی کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ علمائے بلاغت نے صنائع لفظی کی طرح صنائع معنوی کی بھی کئی اقسام بیان کی ہیں جن میں ملّی نغموں کے حوالے سے چند کا ذکر ذیل میں کیا جارہا ہے۔

**صنعت تضاد:**

صنعت تضاد میں دو الفاظ ایسے استعمال ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد یا مقابل ہوں اس صنعت کو صنعتِ طباق یا مطابقت بھی کہا جاتا ہے۔شعرا نے اپنے کلام میں اس صنعت کا استعمال بڑی عمدگی سے کیا ہے۔شورش کاشمیری کی نظم "یومِ انقلاب" سے اقتباس ہے:

ہو کفر ادھر اور ادھر حق کا پھیرا
اس سمت ہزاروں ہوں ادھر تین سو تیرہ
ظلمات کا دل چیر دے اس پر بھی سویرا
ایسا بھی زمانے میں ہوا ہے کہ نہیں ہے
اب سوچ میرے دوست ! خدا ہے کہ نہیں ہے؟

(یومِ انقلاب، الجہاد والجہاد)

**صنعت مراعات النظیر:**

صنعت مراعات النظیر میں ایسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جن کی نسبت سے ایسے دوسرے الفاظ لائے جاتے ہیں جو تضاد اور تقابل کے بجائے کسی اور وجہ سے نسبت رکھتے ہوں۔ملّی نغموں میں ایسے الفاظ کثرت سے مستعمل ہیں۔

مثال کے طور پر:

پاک شاہینوں کے دیکھے معجزے پرواز کے
یہ فضائی معرکے تھے اک نئے انداز کے

(ظفر اقبال۔ ہائی مارک، شجاعت کے تارے وطن کے سپاہی)

عیاں ہونے کو ہیں اقبال کے خوابوں کی تعبیریں
بلند اک ساتھ ہوں گی پھر مسلمانوں کی تکبیریں

(بشیر فاروق۔ بلند اک ساتھ ہوں گی پھر مسلمانوں کی تکبیریں، تیرا پاکستان ہے یہ میرا پاکستان ہے)

بنیاد ہلا دینے کو ہے قصر جفا کی
وہ شور جو زنداں میں ہے زنجیر سے پیدا

(ظفر علی خان۔ شورِ زنجیر، فغانِ کشمیر)

صنعت لف و نشر:

صنعت لف و نشر میں لف کے معنی لپیٹنا کے ہیں اور نشر کے معنی پھیلانا ہیں۔ علم بدیع کی اصطلاح میں دو یا اس سے زیادہ چیزوں کا ذکر کیا جائے اور دوسرے مصرعے میں ان چیزوں کے مناسبات کو بغیر تعیّن کے وضاحت کی جائے۔ ملّی نغموں میں اس صنعت کے استعمال کی مثالیں ذیل ہیں:

کتنے عظیم تھے وہ انساں ، کتنا عظیم تھا نذرانہ
ان کی عظمت کے ہمیشہ ، گن گائے گا زمانہ
آ، تجھ کو میں بتاؤں ، تاریخ وطن کیا ہے
اپنے دیس کی خاطر ، خوں سے غسل کیا ہے

(اے عزیز۔ تاریخ وطن کیا ہے، مسلم خوابیدہ اٹھ، بیدار ہو، تیار ہو)

میں قرآن پڑھ چکا تو اپنی صورت ہی نہ پہچانی
میرے ایمان کی زد ہے مرا طرز مسلمانی
عجب کیا ہے ، میرے مقاصد ہی سے اکتا دے
مرا ذوقِ خود آرائی ، مرا شوق تن آسانی

(احمد ندیم قاسمی۔ مرا طرزِ مسلمانی، دوام)

## صنعت تلمیح:

علم بدیع میں تلمیح کی اصطلاح سے مراد کسی تاریخی واقعہ، مشہور قصہ، ضرب المثل وغیرہ کی طرف اشارہ کرنا کے ہیں جس میں پوری بات کیے بغیر صرف ایک یا دو لفظوں سے مفہوم واضح کرنا ہوتے ہیں لیکن جب تک پورا واقعہ معلوم نہ ہو، کلام کی اچھی طرح سمجھ نہ آئے۔

مِلّی نغمہ اردو زبان و ادب میں پوری مسلم امہ کا ترجمان ہے جس میں کئی جنگی، تاریخی، مذہبی، سیاسی اور سماجی کارناموں کو شعرائے مِلّی نغمہ نے تلمیحات کی صورت میں مختلف انداز میں پیش کیا ہے اور مسلمان مفکرین و جرنیل کی علمی و شجاعتی پہلوؤں کا حوالہ دے کر حال اور مستقبل کی فکر کی ترغیب دی ہے۔مِلّی نغموں سے اس کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

ابابیلوں کے لشکر بن کے چھا جاؤ ہوا بازو
عدو پر سنگریزے پھر سے برسانے کا وقت آیا

(عبداللہ کامل۔وقت کی آواز، جنگ ترنگ)

راہ و رسم کہن کی بات چلی
قیس اور کوہکن کی بات چلی
اک تبسم کناں کلی چٹکی
پھر کسی گل بدن کی بات چلی

(سیدہ نسیم آرا۔ننھے شہیدوں کی التجا پیاری، رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو)

## امیجری، تصویر کاری اور تمثالیت:

امیجری انگریزی کا لفظ ہے جس کو اردو میں پیکر تراشی کہا جاتا ہے۔امیجری کے لفظی معنی شکل یا مورت کے ہیں جبکہ اصطلاحی معنی بقول ارشاد علی خان "جب تخیل پر تشکیل و تجسیم کا اضافہ ہوتا ہے تو وہ امیج یا شبیہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔اس پیکر تراشی کو مجاوزات سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔"(۲۸) یعنی جب لفظوں کی مدد سے تصورات کی تصویر کاری کی جاتی ہے تو قلب و ذہن پر ایک امیج یا ذہنی پیکر واضح ہوتا ہے جس کو امیجری کہا جاتا ہے۔جبکہ شاعری خود تصورات کی تصویر کاری کا عمل ہے جس میں شاعر الفاظ و تراکیب کے ذریعے ایسی تصویر کاری کرتا ہے جو تصورات میں ارتعاش پیدا کر کے حواس کو متحرک کر دے۔طارق سعید امیجری کی پانچ خصوصیات وضع کرتے ہیں:

۱۔ تصویر کاری، پیکر آفرینی یا محاکات آفرینی:

۲۔ لفظی صورت گری: لفظوں کے ذریعہ ذہنوں میں بنے امیج کو صفحہ قرطاس پر لانا لفظی صورت گری ہے اس لفظ سے یہ مراد نہیں ہے کہ لفظوں کی صورت سے امیج تیار کرنا بلکہ امیج پہلے دماغ میں ہوتا ہے، لفظ اس کی صورت گری کر دیتا ہے۔ خطوط اور رنگ سے تو امیج کی تشکیل میں آسانی ممکن ہے مگر محض لفظ سے امیج کا خیال بھی ناممکن ہے۔

۳۔ حسیاتی یا حسی یعنی حواس خمسہ کو بیدار کرنا

۴۔ تاثر آمیزی، یعنی خیالات و جذبات و تاثر سے آراستگی

۵۔ امیجری تزئین بیان کی طرح بنیادی موضوع پر باہر سے تھوپی گئی چیز نہیں ہوتی بلکہ اس کے اندر کی چیز ہوتی ہے ورنہ تزئین اور امیجری میں کوئی فرق ہی نہ رہ جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں امیجری بنیادی موضوع پر بیرونی شے (جو غیر حاضر ہوتی ہے یا غیر موجود ہوتی ہے) کی شکل میں تھوپی نہیں جاتی بلکہ وہ بنیاد کی ہی غیر منقسم حصہ ہوتی ہے۔(۲۹)

امیجری صرف الفاظ کی کاریگری نہیں بلکہ ذہن میں موجود تصورات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر جذبات و احساسات کو تصویر کاری کے ذریعے متاثر کیا جاتا ہے۔ جبکہ علامت اور امیجری بھی مختلف چیزیں ہیں کیونکہ علامت کے معنی نشان یا خصوصیت کے ہیں اور اس میں ایک نشان کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

اس طرح تمثیل کی بات کی جائے تو تمثیل عربی لفظ ہے جس کے معنی شکل دکھانا یا مثال دینا کے ہیں یعنی مجرد کو بھی مجسم شکل میں پیش کرنا کے ہیں اور بقول طارق سعید "جب کسی قصے کے واقعات ظاہرہ طور پر لگاتار کسی دوسرے مماثل تصور یا ڈھانچہ کی طرف مسلسل نمایاں طور پر اشارہ کریں تو ہم اسے تمثیل کہتے ہیں۔ چاہے وہ واقعات تاریخی ہوں، اخلاقی ہوں یا فلسفیانہ ہوں یا مظہر قدرت کی صورت میں ہوں۔ فرضی کہانیاں اور فرضی قصے ایسی قسمیں ہیں جو تمثیل سے نزدیکی اشتراک رکھتی ہیں اور اس کے لیے استعمال میں لائی جاتی ہیں"(۳۰) تمثیل نگاری کے حوالے سے مولانا محمد حسین آزاد کی Allegory اردو میں اہم حیثیت رکھتی ہے۔

ملّی نغموں میں امیجری، تصویر کاری اور تمثیل کاری بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے بلکہ ملّی نغموں میں ان کو بہت اہمیت حاصل ہے کیونکہ شاعر الفاظ کی تصویر کاری سے ملّی نغموں کا قاری کے ذہن میں ایسا نقشہ یا شبیہ تیار کرتے ہیں جو جذبات و احساسات پر اثر انداز ہو کر ان کو متحرک کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ ملّی نغموں میں امیجری و تمثالیت کی ابتدا نغموں کی روایت سے وابستہ رہی ہے یہی وجہ ہے کہ ہماری قدیم شاعری ان فنی محاسن سے بھری پڑی ہے جبکہ

جدید دور میں یہ نئے نئے انداز میں سامنے آ رہی ہے۔ ملّی نغموں میں اس کی لاتعداد مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ اکرم باجوہ کی نظم "چھ ستمبر" سے اقتباس:

میں نے شیروں کو جھپٹتے ہوئے دیکھا رن میں
کیسے لڑتے تھے وہ کہسار میں ، صحرا ، بَن میں
میں نے یلغار کے عالم میں یہ عالم دیکھا
آنکھ دشمن پہ رہی خون نہیں تھا تن میں

(چھ ستمبر، تکبیر کا رنگ للکارہوا)

ذاکر رحمان کی سانحۂ پشاور کے پس منظر میں امیجری کی خوبصورت نظم ملاحظہ ہے:

جب پھولوں کا قتل ہوا
میں زندہ تھا
اب رفتہ رفتہ
میرے اندر
کانٹے اگتے
جاتے ہیں

(ایک مختصر نظم، رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو)

اس طرح دیکھا گیا ہے کہ ملّی نغموں میں شعرا نے مختلف واقعات کو اس طرح شاعری کا حصہ بنایا ہے کہ پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے اور انسان ان واقعات و لمحات کے سحر میں کھو جاتا ہے۔

## نغمگی، خوش آہنگی، غنائیت:

نغمگی، خوش آہنگی اور غنائیت شاعری کی بنیادیں ہیں کیونکہ کلام موزوں کا مقصد نغمگی اور خوش آہنگی پیدا کرنا ہے لیکن باقی اصناف سخن کی نسبت گیت اور ملّی نغموں میں موسیقیت کا عمل دخل زیادہ ہے۔ ملّی نغمہ جو آج تک گیت ہی کا حصہ سمجھا جاتا رہا ہے، اس کی وجہ بھی گیت کی طرح نغمگی اور موسیقیت کا دخل عام اصناف سے زیادہ ہے۔ گیت گائے جانے کے لیے لکھے جاتے ہیں تو ملّی نغمہ بھی گایا جانے کے لیے لکھا جاتا ہے لیکن اگر تصور کیا جائے تو پوری شاعری کا تعلق گائے جانے سے ہے۔ ملّی نغمہ اور گیت اردو کی چند ان اصناف سخن میں شامل ہیں جن کی پہچان غنائی اظہار تصور سے کی جاتی ہے۔ ترنم اور سریلا پن ان کا لازمی حصہ ہے۔

مِلّی نغمہ پوری قوم کے سوئے جذبات کو جگانے کا کام کرتا ہے اور نغمگی و خوش آہنگی اور غنائیت کے بغیر مِلّی نغموں میں وہ لطف پیدا نہیں ہو سکتا جس کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے مِلّی نغمہ نگاروں نے مِلّی نغموں میں نغمگی، خوش آہنگی، غنائیت اور موسیقیت کو خصوصی اہمیت دی ہے۔

مِلّی نغموں میں ترنم اور نغمگی ویسے تو ہر مِلّی نغمہ نگار نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن چند مِلّی نغمہ نگار اس میں خاص طور پر کامیاب رہے ہیں جن میں حفیظ جالندھری، صوفی تبسم اور جمیل الدین عالی سرفہرست ہیں۔ جمیل یوسف حفیظ کی موسیقیت کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "حفیظ اپنے فطری آہنگ اور موسیقی کی لہروں کے زور پر ہی شعر کہتے تھے۔ انھیں عروض سے واقفیت نہ تھی۔ شعر کہتے وقت وہ اپنے حال میں مست گنگنایا کرتے اور اشعار اسی گنگناہٹ کی لہروں پر تیرتے ہوئے آٹپکتے۔"(۳۱) حفیظ جالندھری کی نظم "زندہ باد پاکستان" سے اقتباس ہے:

اے میرے آباد وطن آزاد پاکستان

زندہ باد پاکستان

تیرے سمندر، تیرے دریا، کہسار و میدان

سلطنت و سامان خدائے پاک کا ہے احسان

تو ہے پاک امانت جس پر زندگیاں قربان

تجھ پر نچھاور مال جان۔ اولاد پاکستان

زندہ باد پاکستان

(زندہ باد پاکستان، چراغ سحر)

اسی طرح صوفی تبسم بھی مِلّی نغموں میں ترنم اور موسیقیت پیدا کرنے میں ماہر ہیں۔ ان کی نظم "ارضِ پاک" سے اقتباس ہے:

ارض پاک تیرا نام

تجھ سے ہم سب کا مان

سب جگ میں ہے تیری شان

ارض پاک تیرا نام (ارضِ پاک، سو بار چمن مہکا)

اسی طرح جمیل الدین عالی کا مشہور و مقبول مِلّی نغمہ "مرا انعام پاکستان مرا پیغام پاکستان" میں نغمگی، موسیقیت، غنائیت اور خوش آہنگی کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ان شعرا کے علاوہ دیگر تمام مِلّی نغمہ نگاروں کے ہاں بھی مِلّی نغموں میں یہ خصوصیات بدرجہ اتم ہیں۔

### جوش وولولہ سے معمور الفاظ وتراکیب کا استعمال:

ملّی نغمہ کا مقصد قوم میں جوش و جذبہ کو پیدا کر کے ان کو نیند سے بیدار کرنا اور دنیا کی دوسری اقوام کے مقابلے میں خود کو بہتر طور پر تیار کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا ملّی نغمہ کی نہایت اہم خصوصیت جوش و جذبہ ہے۔ جوش و جذبہ کی خصوصیت کے بغیر ملّی نغموں سے مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے۔ شعرائے ملّی نغمہ نے بھی اس خصوصیت کا خصوصی خیال رکھا ہے اور ان نغموں میں ایسے الفاظ وتراکیب کو برتنے کی کوشش کی ہے جو جوش و ولولہ سے معمور ہوں۔ بشیر فاروق کا ملّی نغمہ "دل بھی تیرا جان بھی تیری میرے پاکستان" سے انتخاب ہے:

ہم ہیں جیالے ارضِ حسیں کے غیرت کے متوالے
ہم ہیں سپاہی چاند زمیں کے جان لٹانے والے
تجھ پر آنچ نہ آنے دیں گے پیارے پاکستان
دل بھی تیرا جان بھی تیری میرے پاکستان

(دل بھی تیرا جان بھی تیری میرے پاکستان، تیرا پاکستان ہے یہ میرا پاکستان ہے)

ملّی نغمے جوش و جذبات سے لیس الفاظ وتراکیب سے بھرپور ہیں کیونکہ یہی جذبات مجاہدین وطن کو بھی دشمن کے خلاف جنگ کے لیے تیار کرتے ہیں جبکہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ جیتنے میں جوش و جذبے سے بھرپور ملّی نغموں کا کلیدی کردار رہا ہے۔

### متنوع بحروں کا استعمال:

اوزان و بحور شاعری کے وہ پیمانے ہیں جو علمائے متقدمین نے نغمہ و آہنگ کو برقرار رکھنے کے لیے وضع کیے۔ ملّی نغموں میں بھی اوزان و بحور کا خاص خیال رکھا جاتا ہے تاکہ ان کی نغمگی، ترنم، موسیقیت، روانی اور گنگناہٹ برقرار رہے۔ ملّی نغموں میں چونکہ ہیئتی تنوع پایا جاتا ہے لہٰذا بحروں میں تنوع بھی لازمی امر ہے۔ ملّی نغمہ نگاروں نے ملّی نغموں میں متنوع بحریں استعمال کی ہیں جن میں عام طور پر رواں بحروں کو زیادہ برتا گیا ہے۔ بحر متدارک، بحر متقارب، بحر رمل، بحر کامل، بحر ہزج وغیرہ میں ملّی نغموں کی کثرت ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

احمد ندیم قاسمی کی نظم "کل اور آج" سے اقتباس ہے:

کل تو ہر گام پہ منزل کا گماں ہوتا تھا
آج ہر منزل دشوار ہے پیغامِ رحیل

(کل اور آج، جلال و جمال)

اور ش۔ ضحیٰ کی نظم ''پندرہ اگست سے اقتباس ہے:

بنامِ محمد بنامِ علیؑ!!
مجھے اپنے قائدؒ کی یاد آگئی!
وہ قائدؒ وہ اسلام کا راز دار
وہ مِلّت کے میدان کا شہسوار

(پندرہ اگست، نوائے پاک)

مِلّی نغموں کی مجموعی فنی واسلوبی صورت حال کا جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ صنفِ سخن کے معیار پر ہر لحاظ سے پورا اترتا ہے۔ کسی بھی موضوعاتی صنفِ سخن کی طرح اس کی روایت مضبوط اور اس کے فنی محاسن پختگی کے دائرے میں آتے ہیں لہٰذا اس کو کسی اور موضوعی صنف کے ذیلی عنوان میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ اردو شاعری میں مِلّی نغمہ کا مقام الگ ہے جس کو دیگر بہت سی موضوعاتی اصنافِ سخن سے بڑھ کر شمار کیا جاسکتا ہے۔

## حوالہ جات وحواشی


۱۔ فیروز الدین، مولوی۔ فیروز اللغات اردو۔ لاہور: فیروز سنز، ۲۰۱۲ء، ص ۱۴۶۲

۲۔ احمد دہلوی، سید۔ فرہنگ آصفیہ، جلد چہارم۔ لاہور: رفاہ عام پریس، س ن۔ ص ۶۳۷

۳۔ عبد الرحمٰن، مولوی۔ مرآۃ الشعر۔ (مرتبہ ڈاکٹر ظہور احمد اظہر)، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۵ء۔ ص ۹۴

۴۔ ایضاً

۵۔ حفیظ، ابوالاعجاز صدیقی۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء۔ ص ۲۱۶۔۲۱۷

۶۔ شمیم احمد۔ اصناف سخن اور شعری ہیئتیں۔ بھوپال: انڈیا بک امپوریم، ۱۹۸۱ء۔ ص ۸

۷۔ ایضاً۔ ص ۱۴

۸۔ حالی، مولانا الطاف حسین۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ لاہور: پاپولر پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۲ء۔ ص ۱۹۱

۹۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر۔ اصناف ادب۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء۔ ص ۸۷

۱۰۔ عابد علی عابد، سید۔ اسلوب۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱ء۔ ص ۴۱

۱۱۔ عبد اللہ، سید ڈاکٹر۔ اشارات تنقید۔ لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص۔ ۲۵۷

۱۲۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر۔ ادب کا تنقیدی مطالعہ۔ لاہور: میری لائبریری، ۱۹۶۴ء۔ ص ۲۴

۱۳۔ نجم الغنی، مولوی۔ بحر الفصاحت، حصہ پنجم (علم بیان)۔ (مرتبہ سید قدرت نقوی)۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۷ء۔ ص ۱۳

۱۴۔ عابد علی عابد، سید۔ البیان۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۹ء۔ ص ۸۳

۱۵۔ ایضاً۔ ص ۸۳۔ ۸۴

۱۶۔ عبد الرحمٰن، مولوی۔ مرآۃ الشعر۔ (مرتبہ ڈاکٹر ظہور احمد اظہر)۔ ص ۱۲۶

۱۷۔ نجم الغنی، مولوی۔ بحر الفصاحت، حصہ پنجم (علم بیان)۔ (مرتبہ سید قدرت نقوی)۔ ص ۲۶

۱۸۔ اخلاق دہلوی، علامہ۔ روح بلاغت۔ دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۳ء۔ ص ۱۳

۱۹۔ ایضاً۔ ص ۲۲

۲۰۔ عابد علی عابد، سید۔ البیان۔ ص ۱۳۰

۲۱۔ عبد الرحمٰن، مولوی۔ مرآۃالشعر۔(تدوین و تحقیق ڈاکٹر ظہور احمد اظہر)۔ ص۱۲۹
۲۲۔ نجم الغنی، مولوی۔ بحر الفصاحت، حصہ پنجم(علم بیان)۔(مرتبہ سید قدرت نقوی)۔ ص۲۲
۲۳۔ اخلاق دہلوی، علامہ۔ روح بلاغت۔۷۳
۲۴۔ نجم الغنی، مولوی۔ بحر الفصاحت، حصہ پنجم(علم بیان)۔(مرتبہ سید قدرت نقوی)۔ ص۲۱۳
۲۵۔ نجم الغنی، مولوی۔ بحر الفصاحت، حصہ ششم و ہفتم(علم بدیع)۔(مرتبہ سید قدرت نقوی)۔ ص۱۳
۲۶۔ اخلاق دہلوی، علامہ۔ شمیم بلاغت۔ دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۸ء۔ ص۹
۲۷۔ نجم الغنی، مولوی۔ بحر الفصاحت، حصہ ششم و ہفتم(علم بدیع)۔(مرتبہ سید قدرت نقوی)۔ ص۱۴
۲۸۔ ارشاد علی خان۔ جدید اصولِ تنقید۔ اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء۔ ص۵۳
۲۹۔ طارق سعید۔ اسلوب اور اسلوبیات۔ لاہور: نگارشات پبلشرز، ۱۹۹۸ء۔ ص۲۳۳۔۲۳۵
۳۰۔ ایضاً۔ ص۲۴۶
۳۱۔ جمیل یوسف۔ حفیظ جالندھری۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۱ء۔ ص۲۹

## ماحصل

اردو شعر و ادب کے ابتدائی دور پر نظر دوڑائی جائے تو امیر خسرو کی ہندی اردو شاعری میں اردو کی واحد صنف گیت میسر آتی ہے لیکن مرور ایام اور زبان کے ارتقا کے ساتھ دیگر اصناف سخن بھی اس قافلے میں سوار ہوتی گئیں جن میں مرثیہ، قصیدہ، حمد و نعت اور دیگر شامل ہیں۔ جب اردو شاعری کا یہ کارواں ولی دکنی کے عہد کو پہنچا تو اردو غزل بھی پوری شان و شوکت سے اردو ادب کی شعری روایت کا حصہ بن چکی تھی اور اردو شعرا میں غزل کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ آنے والے دور کی شعری اصناف میں سب سے بلند مرتبے پر فائز ہو گئی لیکن پھر برصغیر میں عہد مغلیہ کے خاتمے کے ساتھ اس پر زوال آ گیا اور شعرا کا رخ مقصدی شاعری کی طرف مڑ گیا تو اردو غزل نے ایک نیا روپ دھارا یعنی یہ موضوعی صف سخن سے شعری ہیئتوں میں اپنا مقام و مرتبہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی اور حسرت موہانی اور دیگر شعرا نے غزل کو زوال پذیر ہونے سے بچا لیا اور اس کو ایک نیا ادبی مقام عطا کیا۔ مزید آنے والے ادوار میں ناصر کاظمی اور دیگر شعرا نے اس صنف کو دوام بخشا اور یہ پھر سے اردو ادب کی پسندیدہ صنف سخن کی حیثیت اختیار کر گئی۔

اردو غزل کے برعکس دیگر شعری اصناف جن میں مرثیہ، قصیدہ، شہر آشوب، رزم نامے اور کئی دیگر اصناف شامل ہیں جو خاص تہذیبی اور ثقافتی عہد کے خاتمہ کے ساتھ زوال کا شکار ہو گئیں اور ان اصناف کو شعرائے اردو غزل کی طرح نئی زندگی عطا نہ کر سکے یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اصناف مخصوص عہد اور تہذیب و ثقافت کا نتیجہ تھیں جو موجودہ دور میں اپنا وجود نہیں رکھ سکیں اور پستی کا شکار ہو کر ارتقائے اردو کے کاروان سے پیچھے رہ گئیں اور ان کی جگہ کئی نئی اصناف اس قافلے میں شامل ہو کر ارتقائے اردو کی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئیں۔ ان نئی اصناف میں ملّی نغمہ، آزاد نظم، سانیٹ، ہائیکو، نظمانہ اور دیگر مقامی و بدیسی اصناف شامل ہیں۔ یعنی ان قدیم اصناف کی جگہ کئی نئی اور مختصر اصناف سخن نے لے لی ہے۔

اردو شعر و ادب میں جب ملّی نغمہ کی بات کی جائے تو اردو شاعری کی ابتدا سے ہی یہ شاعری کا حصہ رہا ہے لیکن اس کی صورتیں مختلف تھیں۔ شاعر کا قلم قوم کی امانت ہوتا ہے اور حسن و عشق کے جذبات کا اظہار ثانوی حیثیت رکھتے ہیں جبکہ شاعر کے لیے سب سے اہم اس کی قوم، وطن یا قبیلہ ہوتا ہے۔ شاعر اپنی قوم کو کسی صورت تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ قوم جس قسم کے حالات سے بھی گزر رہی ہو، شاعر کا قلم ان حالات کا ترجمان بن جاتا ہے جبکہ شاعری کے موضوع اور ہیئت کا انتخاب وہ وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق کرتا ہے اور یہی قوم اور شاعر کی کامیابی بھی ہے۔ جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صورت حال بارے مرزا ادیب لکھتے ہیں:

> ”دیکھنے والے حیران ہیں کہ کیا یہ وہی قلم ہیں جو چاند کی کرنوں، قوس و قزح کی رنگینیوں اور موسم بہار کے پھولوں پر سو جاں نثار تھے۔ آج ان میں توپوں کی گھن گرج اور ہوائی جہازوں کی گڑ گڑاہٹ کہاں سے آگئی۔ یہ تو پیار کے گیت الاپتے تھے۔ یک بیک یہ رجز خوانی کیوں کرنے لگے، مگر دیکھنے والے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ادیبوں کا قلم قوم کی امانت ہوتا ہے۔“ (۱)

یہ صورت حال صرف ۱۹۶۵ء کی جنگ میں دیکھنے کو نہیں آئی بلکہ ایام اول سے ہی یہ جذبہ اور حمیت شعرا کی زندگی کا خاصہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعر بھی قوم کا حصہ ہوتا ہے اور کسی بھی قوم کے لیے اس کی ذات کا شعور اور تشخص کا احساس ضروری ہوتا ہے۔ ایک فرد ہو یا پوری قوم، جب تک وہ اپنے مقام سے صحیح معنوں میں آگاہ نہ ہو اس کے لیے اپنا وجود برقرار رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ دنیا کے نقشے پر ایک ملک یا قوم اس وقت تک اپنا وجود قائم رکھ سکتے ہیں جب تک اس کے افراد اس ملک و قوم کے وجود سے وابستگی کے جذبے سے سرشار ہوں اور اپنے ملک و قوم کی بقا اور اپنی ذات کی بقا کو لازم و ملزوم سمجھیں۔

خود شناسی ایک اہم جذبہ ہے۔ یہ جذبہ بطور فرد اور بطور قوم ہر دو صورتوں میں ترقی کا ضامن ہے۔ قوم جب تک باشعور ہو کر اپنے اندر قومی غیرت و حمیت اور خود شناسی کا جذبہ پیدا نہیں کر لیتی اس وقت تک نہ صرف دیگر اقوام کے سامنے وہ ذلیل و خوار ہوتی ہے بلکہ وہ جلد ہی صفحہ ہستی سے بھی مٹ جاتی ہے۔ قوم کے شعرا غیرت و حمیت کے شعور کو بیدار کرنے کے لیے اہم کردار ادا کرتے آئے ہیں۔ قومی شعور کی بیداری اور زبوں حالی کے لیے کی جانے والی شاعری کو کئی ناموں سے پکارا جاتا رہا ہے جس میں جنگ نامے، رزم نامے، شہر آشوب، قومی مرثیہ، قومی گیت، مثنویاں اور کئی دیگر نام شامل ہیں لیکن پاکستان کے ایک خالص اسلامی نظریے پر وجود میں آنے کے بعد ان گیتوں، مرثیوں، شہر آشوب اور جنگ و رزم ناموں کو ملت اسلامیہ سے منسوب کرتے ہوئے مِلّی نغمہ کا نام دیا گیا ہے۔ گویا مِلّی نغمہ ارتقائے اردو کے کارواں میں شامل ایک باقاعدہ صنف سخن ہے جس نے قوم و ملت کے جذبے سے منسوب سابقہ تمام اصناف سخن کی جگہ لے لی ہے یعنی جب سے پاکستان کا قیام ہوا اس کے ساتھ ہی پاکستانی صنف سخن مِلّی نغمہ بھی وجود میں آگئی اور جس طرح پاکستان کا نقش ہندوستان کی صورت میں صدیوں سے قائم ہے اسی طرح مِلّی نغمہ بھی دیگر اصناف کی صورت میں موجود تھا لیکن اس کو مخصوص نام ”مِلّی نغمہ“ پاکستان کے قیام کے ساتھ ملا۔

مِلّی نغمہ کو خالص پاکستانی صنف سخن اس لیے بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ اردو میں پاکستان اور ملت اسلامیہ کی ترجمان واحد صنف سخن ہے۔ پاکستان کا قیام خالص اسلامی نظریے پر قائم ہے یعنی ملت اسلامیہ ایک جسم ہے تو

پاکستان اس کی آنکھ، کان، دل یا بازو ہے اور ملّی نغمہ اردو میں اس حصے اور اس کے دیگر اعضا (یعنی عوام اور ملک) کی کیفیت بیان کرنے کے ساتھ پورے جسم کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ لیکن چونکہ اردو اسلامی ممالک میں صرف پاکستان کی ہی قومی زبان ہے اور دیگر اسلامی ممالک میں الگ زبانیں بولی و سمجھی جاتی ہیں اس لیے اس صنف سخن کو پاکستان کے ساتھ خصوصی تعلق حاصل ہے۔

اردو میں مروج بیشتر شعری اصناف برصغیر کے حکمرانوں کی طرح بدیسی ہیں یعنی غزل فارسی سے آئی ہے تو قصیدہ، مرثیہ، سانیٹ اورآزاد نظم سمیت دیگر کئی شعری اصناف بھی ان بدیسی حکمرانوں کے ساتھ دوسری زبانوں سے اردو میں آئیں۔ اسی طرح امتدادِ زمانہ کے ساتھ ہائیکو جاپان سے اور دوہا اور گیت ہندی ادب سے اردو میں داخل ہوئیں جبکہ ملّی نغمہ واحد صنف سخن ہے جو خالص پاکستان اور اردو کی پیداوار ہے اس لیے ملّی نغمہ کو تمام اصناف سخن میں یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ ملک پاکستان اور پوری ملت اسلامیہ کی ترجمان صنف کی حیثیت رکھتی ہے۔

ایسی شاعری جس میں قومی موضوعات پر بحث کی گئی ہو وہ قومی شاعری کہلاتی ہے لیکن جب قوم کسی خاص مذہب و ملت سے منسوب ہو تو اس کی شاعری کو ملّی شاعری کہا جاتا ہے۔ پاکستان کی ملت اسلامیہ کے ساتھ ہم آہنگی کی بدولت اس کی قومی شاعری ملّی شاعری کے زمرے میں آتی ہے۔ اور جب اس شاعری کو آلات موسیقی کے ساتھ مخصوص دھنوں سے نغمگی پیدا کر کے گایا جائے تو وہ ملّی نغمہ کہلاتا ہے لیکن چونکہ شاعری محسوسات کا غنائی اظہار ہے لہٰذا تمام قومی و ملّی شاعری کو قومی و ملّی نغمہ کہا جا سکتا ہے۔

ایک حقیقی شاعر صرف آپ بیتی کو ہی موضوع شعر نہیں بناتا بلکہ وہ جگ بیتی کو آپ بیتی پر ترجیح دیتا ہے اور وہ آپ بیتی کا ذکر بھی جگ بیتی کے پیرائے میں کرتا ہے۔ یوں اس کی تخلیقات کا دائرہ اپنی ذات، قوم، قبیلے اور ملک سے بڑھ کر پوری انسانی برادری تک پھیل جاتا ہے اور اس کی تخلیقات کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ وہ جہاں اور جس صورت میں بھی جبر و استبداد دیکھے، اس سے نفرت کرتا ہے اور اس کا اظہار وہ اپنی تخلیقات میں کرتا ہے۔ قومی و ملّی نغمہ شعرا کے ان تمام جذبات کے لیے سب سے بہترین پیرایہ اظہار ہے جس میں شاعر حقائق اور انصاف پر قائم رہتے ہوئے حق گوئی کو بیباکی سے بیان کر کے قوم کا سر فخر سے بلند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

قومی و ملّی نغمہ اردو ادب کی ایک ایسی صنف ہے جو ملک و ملت سے اظہار یکجہتی کے لیے سب سے کار آمد ہے کیونکہ اس میں خوشی و غم، جوش و جذبات، ناصحانہ و خطابانہ حتٰی کہ قوم کے تمام مسائل و وسائل کو کئی طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس کے موضوعات کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ حب الوطنی، تہذیبی روایات، اخلاقی

روایات، قومی وملّی رہنما، مذہبی اصولوں کی پاسداری اور عسکری حوالے سمیت دیگر قومی وملّی مسائل سے متعلقہ تمام امور شامل ہیں۔ مظفر عباس پاکستانی قومی وملّی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ پاکستانی جدید تر نسل کے شاعروں کے کلام کو بجا طور پر روح عصر کا نقیب کہا جا سکتا ہے۔ معاصر صورتحال کا ادراک اور تفہیم ان کی شاعری میں بہت نمایاں ہے۔ اکیسویں صدی کی دنیا چونکہ گلوبل ولیج کی حیثیت اختیار کر چکی ہے لہٰذا اب ان کی اڑان صرف اپنے خطے تک محدود نہیں ہے۔ دنیا کے کسی بھی مقام پر رونما ہونے والا واقعہ اب ان کی شاعری کا موضوع بن سکتا ہے۔"(۲) اس لیے فلسطین میں اسرائیلی جبر وجارحیت، نائن الیون کے بعد افغانیوں پر امریکی یورش، کشمیر میں ہندوستانی مظالم اور عراق میں امریکی یلغار اور عالمی دہشتگردی، پاکستان میں ہونے والی ملّی نغمہ نگاری کے موضوعات میں شامل ہیں۔ دور قدیم کی قومی شاعری کی اصناف جن میں رزم نامے، مرثیے اور شہر آشوب وغیرہ شامل تھے، ان کے موضوعات کا دائرہ محدود تھا اور وہ قوم، قبیلے، گروہ یا ملک کی حدود سے باہر نہیں نکلتی تھیں جبکہ ملّی نغمہ کا دائرہ کار اس قدر وسیع ہے کہ یہ ملکی، قومی، ملّی اور بین الاقوامی مسائل عامہ کو اپنے موضوعات میں جگہ دیئے ہوئے ہے۔ ساغر صدیقی کی نظم "شامی شہید" جس میں وہ ملک شام کے شہدا کی عظمت اور بہادری کے ساتھ ان سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ اقتباس ہے:

زندہ و پائندہ ہیں شامی شہید
خاکِ مرقد باب جنت کی کلید
ایک پیکر جرأت بیدار کے
مثل تھے فولاد کی دیوار کے
روبرو کانٹوں کے سینہ کر دیا
نذر ناموس مدینہ کر دیا

(شامی شہید، کلیات ساغر)

دنیا اب سکڑ چکی ہے لیکن شعرا کے اظہار بیان کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے اور اب وہ قوم وقبیلے کی نمائندگی کرنے کے ساتھ پوری دنیا میں ہونے والی ناانصافیوں اور جبر واستبداد کے خلاف آواز اٹھانا لازمی سمجھتے ہیں جس کے لیے قدیم اصناف شاعری ان کے پیرایہ اظہار کے لے ناکافی ہیں جبکہ قومی وملّی نغمہ ایک ایسی صنف ہے جو چند افراد سے لے کر قوم، ملک، ملت اور پوری دنیا کے غم کو سمونے کی اہلیت رکھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر یہ کہا جائے تو زیادہ افضل ہو گا کہ قومی وملّی نغمہ دورِ جدید کے اردو شعرا کے لیے ایسا درخشندہ ستارہ ہے جس کی روشنی

پوری دنیا میں پھیل رہی ہے اور پاکستانی شعرا اس روشنی کی بدولت نہ صرف قومی و ملکی اور ملّی بلکہ عالمی دنیا کے مظلوم عوام کی دادرسی بھی ملّی نغمہ میں کر رہے ہیں۔

مندرجہ بالا حقائق کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان کا جس جگہ جنم ہوتا ہے یعنی جو ماماتا اس کو جنم دے اور جس زمین پر وہ گرتا سنبھلتا پرورش پاتا ہے اس کی محبت خون میں شامل ہو کر پورے جسم میں سرایت کر جاتی ہے اور سانسوں کی طرح روانی کے ساتھ چلنے لگتی ہے۔ ہر انسان کو اپنی مادرِ گیتی کا ذرہ ذرہ جان و مال سے بڑھ کر عزیز ہوتا ہے۔ وہ اپنی دھرتی میں بسنے والے دریا، ندیاں، نالے، جنگلات حتیٰ کہ ہر چیز کی عزت و حرمت کرنا لازمی سمجھتا ہے اور دھرتی ماں کی حفاظت کی خاطر حیات نچھاور کرنا عین سعادت سمجھتا ہے جبکہ ایک قومی شاعر جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہو کر وطن کی محبت میں نغمے الاپتا ہے۔ وہ وطن کی ہر شے کو گلابوں جیسی مہکِ خوشبودار، فضاؤں میں کھنکتی پائل جیسی مسرور اور عاشق کا معشوق کو شدت سے دیکھنے جیسے حسین نظاروں سے تشبیہ دینے لگتا ہے۔ اس لیے ایک قومی شاعر کے لیے مادرِ وطن سے سچا لگاؤ قومی و ملّی نغمہ کا بنیادی عنصر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ایک مسلم اور غیر مسلم قومی شاعر میں بھی فرق ہوتا ہے۔ قومی شاعر تو کسی بھی قوم سے ہو سکتا ہے جس کو انگریزی میں National Poet کہا جاتا ہے لیکن پاکستان یا اسلام سے وابستہ قومی و ملّی شاعر ملک و قوم کا نغمہ الاپتے ہوئے دائرہ اسلام سے خارج از مکان موضوعات و جملوں کو استعمال کرنے سے اجتناب کرتا ہے کیونکہ اسلام میں مقدس ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے جبکہ اس کے بندوں میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ احترام کے سب سے اونچے درجے پر فائز ہیں۔ ایک مسلمان قومی و ملّی شاعر اپنے ملک سے محبت ضرور کرتا ہے لیکن وہ غیر مسلموں کی طرح وطن کو مقدس خیال نہیں کرتا۔ وہ وطن سے محبت بھی احکام الٰہی سمجھ کر کرتا ہے کیونکہ ایک اسلامی و مسلم ریاست کے دفاع میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا دراصل خدائے الٰہی کی خوشنودی حاصل کرنا ہے لہٰذا اس کی حب الوطنی اسلامی اصولوں کے منافی نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ اس ماماتا کی پوجا کرتا ہے۔

دوسری اہم بات یہ کہ اسلامی اصولوں میں قوم و ملک کو عالمی انسانی حقوق پر فضیلت حاصل نہیں ہے بلکہ اسلام انسان تو کیا حیوانوں کے حقوق کا خیال رکھنے کا بھی حکم دیتا ہے اس لیے ایک اسلامی ریاست اپنے ملک و قوم کے فائدے کی خاطر عالمی انسانی حقوق کی پامالی کی اجازت نہیں دیتی جیسا کہ آج کی جدید اور ترقی یافتہ سمجھی جانے والی امریکی اور یورپی اقوام کے ہاں نظام مروج ہے۔ جنھوں نے عالمی وسائل پر قبضہ جمانے کے لیے افغانستان، عراق، شام، فلسطین، چیچنیا، کشمیر اور برما جیسے علاقوں میں انسانیت کا سودا وہاں کے وسائل کے ساتھ کیا ہے۔

ایک ملّی نغمہ نگار بنیادی طور پر امن و آشتی کے قصیدے لکھتا ہے اور ہر چیز کو گل و یاسمین کا مظہر گردانتا ہے لیکن جب وہ ناانصافیوں اور جبر و استبداد کی ہجو سرائی کرنے لگے تو اس کی قلم کی نوک سے چنگاریاں پھوٹنے لگتی ہیں اور اس کے شعر تلواروں اور نیزوں کا کام دیتے ہیں جس کی تصدیق ایوب صابر کی نظم ”شعر نغمہ بھی ہے تلوار بھی ہے“ سے ہوتی ہے۔ اقتباس ہے:

صرف پیرایۂ اظہار نہیں ۔۔۔ شعر نغمہ بھی ہے تلوار بھی ہے

بزم میں ساز ہے آواز ہے یہ ۔۔۔ رزم میں برسرِ پیکار بھی ہے

امن کے دن ہوں تو پیغام حیات

جنگ چھڑ جائے تو یلغار بھی ہے

(شعر نغمہ بھی ہے تلوار بھی ہے، دیپ جلے لہو لہو)

شاعری صرف گل و رخسار کی گھاتوں کا نام نہیں بلکہ حقیقی شاعر وہ ہے جس کو انسانیت کا احساس ہے یہی وجہ ہے کہ کبھی کسی شاعر کا ایک شعر بھی قانون و اخلاقیات کی ان گنت کتابوں پر بھاری پڑ جاتا ہے کیونکہ شاعر شعر و سخن کے ذریعے دلوں کو مسخر کر کے انقلاب کی روح پھونک دیتا ہے جبکہ قانون و انصاف کو لاگو کرنے والے ادارے صرف خارجی عوامل تک ہی محدود ہوتے ہیں اور وہ دلوں کو فتح نہیں کر سکتے لیکن ایک حقیقت پسند شاعر میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ تاریخ کا رخ موڑ سکے۔ دنیا کی تاریخ میں اس کی کئی مثالیں بھی موجود ہیں اور برصغیر کی تاریک کا رخ موڑنے والے بھی ایک شاعر یعنی علامہ اقبال کی جادواں شخصیت تھی جنھوں نے ایک خواب کو حقیقت کا روپ دے کر برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

قدیم اردو شاعری میں ملّی جذبات پائے جاتے ہیں لیکن اس وقت شخصی حکمرانی کے باعث شاعری کا رخ بھی ملّی کی بجائے قومی اور شخصی تھا۔ شخصی حکمرانی اور مسلمانوں کے زوال سے ملّی شاعری کا آغاز ہوا اور تحریک سید بریلویؒ شہید کے زیر اثر مومن کی جہادیہ مثنوی میں ان جذبات کا باقاعدہ آغاز ملتا ہے جبکہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے فوراً بعد تمام مذاہب کے شعرا کا زیادہ تر رجحان آزادی کی طرف تھا جس سے وطنی قومی شاعری کو فروغ حاصل ہوا لیکن کچھ اہل علم و دانش نے ژرف نگاہی سے مسلمانوں کے مستقبل کے مسائل کو بھانپتے ہوئے مسلمانوں کو علیحدہ قومیت کا راستہ دکھایا جو تمام عالم اسلام کی ملّی وحدت کا راستہ تھا جن میں سرسید احمد خاں پیش پیش تھے جبکہ شاعری میں مولانا الطاف حسین حالی کی ”مدوجزر اسلام“ چند نظموں سے بڑھ کر ایک کتاب کی صورت میں ملّی شاعری کا اولین کارنامۂ عظیم ہے۔

ملّی شاعری کو جس شخصیت سے بام و عروج حاصل ہوا وہ علامہ اقبالؒ ہیں۔ علامہ اقبال ایک نظریاتی شخصیت کے حامل انسان تھے شاید اسی لیے ان کے سیاسی تفکرات ارتقائی مرحلوں میں طے ہوئے۔ ابتدا میں وہ خالص قوم پرست محب وطن شاعر کی صورت میں جلوہ گر ہوئے لیکن یورپ میں تعلیم کے دوران وہ مغرب کی مادہ پرستی اور کھوکھلی تہذیب کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے اوران کی فکر نے ایک نیا سیاسی رخ اختیار کیا۔ وہ وطن پرستی کے محدود دائرے سے نکل کر ملت اسلامیہ کے ترجمان اور ناصح بن کر سامنے آئے۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
یقین محکم ، عمل پیہم ، محبت فاتحِ عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں (طلوع اسلام، بانگ درا)

علامہ اقبال یورپ سے واپسی پر قومیت اور وطنیت کے محدود دائرے کو توڑ کر عالم انسانیت کو بین الاقوامیت کے نغمے سنانے لگے۔ انھوں نے ہندوستانیوں کی آنکھوں پر وطنی تعصب کی پٹی اتار کر بین الاقوامی انسانی معاشرے کی تلقین کی، ایک ایسا معاشرہ جس کی بنیاد محمد مصطفی ﷺ نے رکھی تھی۔ امتہ الکریم اقبال کی قومی وملّی شاعری کے بارے لکھتی ہیں کہ اقبال ایک عظیم شاعر تھے اس لیے ان کی قومیت کا تصور بھی محدود نہیں رہا بلکہ وہ ساری انسانیت کے لیے ہو گیا"(۳) غرضیکہ ملّی نغمہ نگاری کی روایت میں علامہ اقبال کا مقام اولیٰ ہے۔ انھوں نے ملّی نغموں کے جس اسلوب کی بنیاد ڈالی، اس اسلوب کی ان کے بعد آنے والے شعرا نے بھی پیروی کی سعی کی لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ ملّی نغموں کو جو مقام و مرتبہ اقبال سے حاصل ہوا وہ کسی اور شاعر سے نہ مل سکا یعنی اگر یہ بھی کہا جائے کہ ملّی نغموں میں اقبال کا مقام لاثانی حیثیت رکھتا ہے تو اس میں کچھ مبالغہ آرائی نہ ہو گی۔

نظریۂ پاکستان اسی ملّی جذبے کا عملّی ظہور تھا جس کے تحت مسلمان دنیا میں جہاں بھی ہوں وہ ایک الگ ملت ہیں اور غیر مسلم کے ساتھ کسی صورت مشترک نہیں ہو سکتے۔ اس فلسفہ کو لے کر اسلاف نے آگ اور خون کے دریا سے گزر کر قیام پاکستان تک کٹھن ترین راستہ طے کیا۔ کیونکہ ۱۸۵۷ء میں اقتدار چھن جانے سے برصغیر میں مسلم ثقافت اور تہذیب و تمدن کے مٹ جانے کا خطرہ درپیش تھا جس کے پیش نظر اسلاف کی طویل کوششوں سے ایک الگ مملکت پاکستان کی صورت میں حاصل ہوئی۔ پاکستان ایک نظریاتی ریاست کے طور پر معرض وجود

میں آیا تھا لیکن افسوس کہ ہم نے جغرافیائی سرحدوں پر تو پہرے بٹھا دیئے لیکن نظریاتی سرحدوں کو نظر انداز کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا نظریاتی ورثہ بکھرتا چلا گیا۔

نظریہ پاکستان اسلامی ثقافت کی روح ہے اور اس سے انحراف اپنی ثقافت کا انکار ہے۔ تقسیم برصغیر اور حصول پاکستان کا مقصد اسلامی اصولوں کی پاسداری اور اس کی تہذیب و ثقافت کی حفاظت کرنا تھا۔ ملک تو حاصل ہو گیا لیکن نظریہ پاکستان جو دراصل نظریہ اسلام تھا، بہت پیچھے رہ گیا۔

جب آزادی کا سورج طلوع ہوا تو اپنے ساتھ فرقہ وارانہ فساد کی وجہ سے خوشیوں کے شادیانے بجانے کی بجائے غم والم کے نغمے لایا جس نے ملّی نغموں کو ایک نیا رخ عطا کیا۔ یہ نیا موضوع فیض احمد فیض کے "یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر" سے سیاسی و سماجی شعور کی پختگی سے شروع ہوا اور شعرا کی کثیر تعداد کو ہم خیال بنالیا۔ ہجرت کے فسادات کی قیامت کچھ تھمی تھی کہ خدائے برحق نے قوم سے ان کا قائد چھین لیا جس کے بعد سازشوں کے جال بچھے اور سند اقتدار کے لیے حقوق پر شب خون مارے گئے جس سے ملّی نغموں میں مزاحمتی ادب نے جنم لیا۔ اس تمام صورت حال سے قوم کافی مایوس ہو گئی تو اس وقت بھی کچھ قومی و ملّی شعرا ایسے تھے جو قوم کے زخموں پر مرہم رکھ رہے تھے اور پاکستان کو ایک بڑی نعمت سمجھتے ہوئے اس کی قدر و قیمت کا احساس بتلا رہے تھے۔ آزادی کی اولین عید الفطر کے موقع پر اہل پاکستان کو آزادی کی قدر و قیمت اور اس کے تقاضے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے نظم "آزادی کی اولین عید الفطر" میں حفیظ جالندھری فرماتے ہیں:

آزادی کے معنی ہیں　　نفس کے اوپر جبر شدید
امن و امان و صلح و صفا　　آنحضرتؐ کی ہے تاکید
غیر بھی اپنے بن جائیں　　اب وہ دکھاؤ خلق حمید
دنیا بھر میں پھیلاؤ　　احکام قرآن مجید

(آزادی کی اولین عید الفطر، چراغ سحر)

پاکستان بنانے کا مقصد عالمی اسلامی وحدت قائم کرنا تھا لیکن افسوس کہ ملک میں سیاسی عدم استحکام کی بدولت ملکی وحدت بھی خطرے میں پڑ گئی۔ قومی یک جہتی اور اتحاد کے جذبات کی بجائے لسانی، علاقائی، مقامی اور مہاجر کے میلانات نے قبضہ جما لیا حالانکہ قائد اعظم صوبائی و لسانی سیاست کے مخالف تھے اور انھوں نے ہمیشہ قومی وحدت کی تلقین کی لیکن جب قائد اعظم نہ رہے تو قومی وحدت کا شیرازہ بکھرنے لگا اور سیاست دان ملکی وقار کے بجائے ذاتی مفادات کو ترجیح دینے لگے۔

اس صورت حال میں وہ شعرا جو پاکستان کو مدینہ کی طرز پر ایک اسلامی فلاحی ریاست دیکھنے کے لیے پر امید تھے اور اسلامی نظام کی طرح عدل اور مساوات قائم ہونے کے متمنی تھے، ان کے جذبات کو شدید دھچکا لگا اوران کے لہجے میں کرب اور تلخی کے جذبات پیدا ہو گئے، طاہرہ نیر کے بقول" اس ذہنی اضطراب اور بے اطمینانی کا سبب وہ غیر متوازن سیاسی حالات تھے جن کے باعث مخصوص سماجی و فکری روایات نہ تو منضبط ہونے پائیں اور نہ ہی ان کا گزشتہ تسلسل بر قرار رہ سکا۔ ارباب اختیار کے منفی رویے ایک طرف ذہنی و فکری زیاں کاری کا باعث بنے اور دوسری طرف سماجی زندگی کا تانا بانا بکھر کر رہ گیا۔"(۴) جس سے شعرا میں مایوسی، بے چینی، قنوطیت جیسی صورت حال پیدا ہو چلی تھی کہ قدرت کی طرف سے قوم کو متحد ہونے کا ایک بہترین موقع میسر آیا یعنی ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ نے پاکستانی قوم کو یکجا کر دیا اور مایوسی کے بادل چھٹ گئے۔ پوری قوم کی طرح شعرا بھی ذاتی عناد ترک کر کے ملکی سلامتی میں اپنا کردار نبھانے کو پیش پیش ہو گئے اور مجاہدین کے ہمراہ ان کے قلم بھی تلوار بن گئے۔ شعرا نے ملّی نغمے لکھ کر پوری قوم کے جوش و جذبہ کو دوچند کر دیا۔ ان نغموں نے قوم کا جمود توڑ کر سوئی ہوئی قوم کو بیدار کیا۔ مرزا ادیب لکھتے ہیں:

> "قلم سے پیار کے گیت جھڑتے ہیں جن میں چاندنی راتوں کی ٹھنڈک اور پیار کے پھولوں کی بوباس ہوتی ہے۔ جب دھوئیں کے کالے بادل، بھیانک بادل، چاند اور ستاروں کو اپنے دامن میں چھپالیں اور جب زندگی کی طرف موت کے سائے تیزی کے ساتھ بڑھنے لگیں تو قلم زندہ رہتا ہے۔ ایسے ماحول میں قلم پیار کے گیتوں سے، محبت کے نغموں سے، ماں کی لوریوں سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے اور پے در پے آگ کے شعلے اگلنے لگتا ہے۔ وہ شعلے جن سے قوم و ملک کی رگوں میں آتشیں لہریں سرایت کر جاتی ہیں۔" (۵)

۱۹۶۵ء کا معرکہ پاکستانی قوم میں اتحاد و یگانگت کے لحاظ سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ثابت ہوا جس میں شعرا نے مختصر دورانیے میں وطن کو بہت کچھ دیا۔ یہ آزادی کے بعد پہلا موقع تھا جب قوم ایک نئے حوصلے اور عزم کی پختگی سے مستحکم ہوئی اور ان کے دلوں اور ذہنوں کو شعرا کے کلام سے امید کی ایک نئی کرن نظر آئی جس کی مدد سے عوام النّاس قوم کو نئے مقاصد، آرزوؤں اور امنگوں کا نیا روپ ملا اور وطن عزیز کو نئی بلندیوں تک پہنچانے میں مصمم نظر آئے۔ زہرا نگاہ جنگ کے دوران پاکستانی قوم کی تخلیقی صلاحیتوں کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> "جنگ کے سترہ دنوں میں ہر آدمی نے کچھ نہ کچھ سوچا تھا۔ شاید زندگی میں پہلی مرتبہ ہر چھوٹے بڑے نے سوسائٹی اور ملک کے اجتماعی خاکے پر سنجیدگی

سے نظر ڈالی تھی۔ خلوص نیت سے اپنے ایمان، اپنے بچوں کے مستقبل، قوم کی محبت، عظمت اور وقار کو قوم کے اجتماعی معیار پر جانچا تھا۔ ان سترہ دنوں میں زندگی کا ہر بلند نظریہ ان کے دماغوں میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا۔" (۶)

پاکستانی فوج اور عوام کی طرف سے لڑی جانے والی یہ جنگ درحقیقت حق و باطل کا معرکہ تھی جس نے ثابت کر دیا کہ جنگیں صرف اسلحہ اور فوج کی عددی اکثریت سے نہیں لڑی جاتیں بلکہ اس کے لیے جذبات میں خلوص اور جذبہ حب الوطنی ہونا ازحد ضروری ہے۔

مِلّی نغموں کی روایت میں سانحہ سقوط ڈھاکہ ایک پر آشوب صورت میں جلوہ گر ہوا کیونکہ اس میں ایک طرف تو ملک ٹوٹنے کا غم تھا جبکہ دوسری طرف بھارتی فوج کے آگے ہتھیار ڈالنے جیسی ہزیمت بھی اٹھانا پڑی تھی۔ اس دوران مِلّی نغمہ نگار ایک طرف ماتم کداہیں تو دوسری طرف اپنی قوم کو حوصلہ بھی دیتے ہیں۔ یہ صورت حال بہت کرب آمیز تھی جس نے پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیا لیکن قومی و مِلّی شعرانے اپنا قومی فریضہ نبھاتے ہوئے قوم کی نبض دیکھ کر علاج کرنے کی کوشش کی بقول قاسم یعقوب "جنگ اور زندگی کی خواہش دو ایسی سرحدیں ہیں جن کی تقسیم خون کی ندی کرتی ہے۔ آج کے دور میں جنگ نے ہماری زندگیوں کو حیران کن حد تک متاثر کیا ہے۔ ہمارے شب و روز، ہماری اقتصادیات اور ہماری زبان تک جنگ اور اس کے مضمر اثرات سے بچ نہیں پاتی۔ ادب کا بڑا حصہ بھی براہ راست اور بالواسطہ جنگ سے اثر انداز ہو رہا ہے۔"(۷)

عسکری پس منظر میں سیاچین، کارگل اور سانحۂ پشاور کے تناظر سمیت مِلّی نغموں کا کثیر سرمایہ موجود ہے جس کو اب تک عسکری شاعری، قومی شاعری اور مِلّی شاعری سے بڑھ کر باقاعدہ کوئی نام حاصل نہیں ہوا۔ صرف گائے جانے والے نغمات کو ہی مِلّی نغمہ کہا گیا حالانکہ کوئی بھی صنف اپنا ایک علیحدہ وجود اس وقت سے ہی رکھتی ہے جب وہ تخلیق کے دائرے میں داخل ہوتی ہے۔ اس میں چاہے غزل ہو، حمد ہو یا گیت۔ جس طرح دیگر تمام اصناف سخن کسی مخصوص نام کے لیے گائے جانے کی محتاج نہیں ہیں اسی طرح مِلّی نغمہ بھی اس وقت سے باقاعدہ ایک علیحدہ صنفی حیثیت منوانے پر مُصِر نظر آتا ہے جب سے یہ تخلیق کے دائرے میں داخل ہوا ہے کیونکہ جس طرح کوئی شاعر غزل، حمد، قصیدہ یا مرثیہ لکھنے کے لیے ارادہ کرتا ہے اسی طرح مِلّی نغمہ بھی شاعر کی پسند اور اظہار کا مرہون منت ہے نہ کہ موسیقار اور گلوکار کی گائیکی کا۔

مِلّی نغموں نے نہ صرف قوم کے عسکری جذبات کی ترجمانی کی ہے بلکہ اس نے اجتماعی طور پر قوم کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ اس میں لہلہاتے کھیت، حسین وادیاں، دلکش برف پوش پہاڑوں کے مناظر، قومی

رہنماؤں کی وفات کا غم، حکمرانوں کی بے حسی، آمر کا جبر و استبداد یا غریب الحال عوام کی زبوں حالی سمیت تمام قومی امور شامل ہیں۔ اسی طرح بین الاقوامی طور پر مسلم امہ کے مسائل، مسلم علاقوں پر غاصب فوجوں کا قبضہ اور ظلم و ستم، کھیل کے میدان، سیاست کے اکھاڑے، حتیٰ کہ قوم کے ہر پہلو کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

اس قدر وسیع موضوعات اور مضبوط روایت رکھنے والی قومی سطح کی صنف سخن کو اصناف ادب میں اُس کا مقام نہ دینا نہ صرف قومی جذبات کے ساتھ زیادتی ہے بلکہ اردو زبان، اردو ادب اور ایک ہر دل عزیز صنفِ سخن کی ترویج کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے مترادف ہے۔

اگر فنی لحاظ سے دیکھا جائے تو ملّی نغمہ دوسری موضوعاتی اصنافِ سخن کی طرح فنی پہلوؤں کے تمام تقاضے پورا کرتا ہے۔ ہیئتی اور اسالیب کے تنوع سے اس کی وسعت اور قدر و اہمیت میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔

حرف آخر، اگر یہ کہا جائے کہ ملّی نغمہ موجودہ عہد کی اردو شاعری کی مروّجہ موضوعاتی اصنافِ سخن سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے، تو بے جا نہ ہو گا۔

## حوالہ جات

۱۔ مرزا ادیب۔ "قلم کے سپاہی"۔ مشمولہ، ماہنامہ ماہ نو۔ کراچی: جلد ۱۸، شمارہ ۱۰، اکتوبر ۱۹۶۵ء۔ ص ۳۰
۲۔ مظفر عباس، ڈاکٹر۔ اردو میں قومی شاعری۔ لاہور: گوہر پبلی کیشنز، س ن۔ ص ۲۵۱
۳۔ امتہ الکریم۔ اقبال کی قومی شاعری۔ حیدر آباد: دائرہ الیکٹرک پریس، ۱۹۸۳ء۔ ص ۵۹
۴۔ طاہرہ نیر، ڈاکٹر۔ اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۹ء۔ ص ۱۸۱
۵۔ مرزا ادیب۔ قلم کے سپاہی۔ ص ۲۹۔۳۰
۶۔ زہرا نگاہ۔ جنگ ترنگ۔ کراچی: دی انٹر سروسز پریس لمٹیڈ، ۱۹۶۷ء۔ ص ۴
۷۔ قاسم یعقوب۔ اردو شاعری پر جنگوں کے اثرات۔ کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۵ء۔ ص ۲٦٦

# مآخذ و مصادر

# کتابیات

## (الف)　　شعری مجموعے / دواوین / انتخاب / کلیات


* آزاد، محمد حسین۔کلیات آزاد۔(مرتبہ محمد علی خالد صدیقی)۔دہلی:انجمن ترقی اردو۔س،ن

* احمد ریاض۔موج خون۔لاہور:الجدید،۱۹۶۱ء

* احمد فراز۔جاناں جاناں۔اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء

* ایضاً۔شب خون۔اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء

* احمد ندیم قاسمی۔ندیم کی نظمیں۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء

* ادا جعفری۔موسم موسم۔کراچی:اکادمی بازیافت،۲۰۰۲ء

* ادریس صدیقی۔مرتب؛جاگ رہا ہے پاکستان۔کراچی:اردو اکیڈمی،سندھ،۱۹۶۶ء

* اسلم انصاری۔منتخب کلیات اسلم انصاری۔اسلام آباد:نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۱۶ء

* افتخار عاف۔جہانِ معلوم۔اسلام آباد:پورب اکادمی،۲۰۱۳ء

* اقبال،علامہ۔کلیات اقبال اردو۔اسلام آباد:نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۱۷ء

* ایضاً۔کلیات اقبال فارسی۔لاہور:شیخ غلام علی اینڈ سنز،۱۹۸۱ء

* اکبر الہ آبادی،سید۔کلیات اکبر الہ آبادی۔لکھنؤ:نامی پریس،۱۹۳۰ء

* اکرام۔مرتب؛نوائے پاک۔کراچی:ادارہ مطبوعات پاکستان،۱۹۵۱ء

* اکرم باجوہ۔تکبیر کا رنگ للکار ہوا۔لاہور:نظمینہ پبلی کیشنز،۲۰۱۶ء

* الطاف علی بریلوی،سید۔مرتب؛علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں۔کراچی:اکیڈمی آف ایجوکیشن ریسرچ،۱۹۷۰ء

* امید فاضلی۔پاکستان زندہ باد۔کراچی:رائٹر اکادمی،۱۹۸۸ء

* امین ضیا،محمد۔مدیر؛شمالی علاقے کا اردو ادب(حصہ نظم)۔گلگت:حلقہ ارباب ذوق،جاوید پرنٹر،س۔ن

* اے عزیز۔مسلم خوابیدہ اٹھ، بیدار ہو ، تیار ہو۔کوہاٹ:ادارہ ادب وسائنس،س۔ن
* بشریٰ سعید۔مرتب؛رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو۔فیصل آباد:شمع بکس،۲۰۱۶ء
* بشیر فاروق۔تیرا پاکستان ہے یہ میرا پاکستان ہے۔کراچی:احمد برادرز پرنٹرز،ناظم آباد،۱۹۸۶ء
* پروین شاکر۔ماہِ تمام۔دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۱۹۹۵ء
* ثاقب لکھنوی،ذاکر حسین۔دیوان ثاقب۔لکھنؤ:نظامی پریس،۱۹۳۶ء
* جاوید انور۔بھیڑئیے سوئے نہیں۔لاہور:قوسین پبلشرز،۲۰۰۹ء
* جعفر بلوچ۔بر سبیل سخن۔لاہور:مکتبۂ تعمیر انسانیت،۲۰۰۶ء
* جعفر زٹلی۔زٹل نامہ(کلیات جعفر زٹلی)۔(مرتبہ رشید حسن خان)۔نئی دہلی:انجمن ترقی اردو ہند،۲۰۱۱ء
* جلیل عالی،یوسف حسن۔مرتبین؛پاکستانی ادب ۲۰۰۲ء۔اسلام آباد:اکادمی ادبیات،۲۰۰۳ء
* جون ایلیا۔گویا۔لاہور:الحمد پبلی کیشنز،۲۰۱۷ء
* چکبست،برج نرائن۔صبح وطن۔الہ آباد:انڈین پریس لمٹیڈ،۱۹۲۷ء
* حافظ امرتسری۔میرا سوہنا پاکستان۔ہما عظیم پبلشرز،لاہور،۱۹۹۷ء
* حالی،خواجہ الطاف حسین۔دیوانِ حالی۔(مرتبہ رانا خضر سلطان)۔لاہور:بک ٹاک،۲۰۰۵ء
* حبیب جالب۔کلیات حبیب جالب۔لاہور:طاہر سنز پبلشرز،۲۰۱۰ء
* حسرت موہانی،مولانا۔کلیاتِ حسرت۔(مرتبہ رانا خضر سلطان)۔لاہور:بک ٹاک،۲۰۰۶ء
* حسن رضوی۔کبھی کتابوں میں پھول رکھنا۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۷ء
* حسن شوقی۔دیوان حسن شوقی۔(مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی)۔کراچی:انجمن ترقی اردو،۱۹۷۱ء
* حفیظ تائب۔تعبیر(قومی و مِلّی منظومات)۔لاہور:القمر انٹر پرائزرز،۲۰۰۳ء
* حفیظ جالندھری۔کلیاتِ حفیظ جالندھری۔(مرتبہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا)۔نئی دہلی:فرید بکڈپو لمٹیڈ،۲۰۰۸ء
* خالد علیم۔بغداد آشوب۔لاہور:اقدام پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء
* خورشید ربانی۔مرتب؛ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح۔اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۶ء
* خوشی محمد ناظر۔نغمہ فردوس۔لاہور:مکتبہ فانوس،۱۹۹۲ء

* راشد حمید، ڈاکٹر۔ مرتب؛جاوداں اقبال۔اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۷ء

* رشید امجد، ڈاکٹر۔ مرتب؛پاکستانی ادب ۱۹۴۷ء....۲۰۰۸ء(انتخاب شاعری)۔اسلام آباد:اکادمی ادبیات، ۲۰۰۹ء

* رئیس امروہوی۔قطعات ،جلد اول و دوم۔کراچی:اخبار جہاں پبلیکیشنز،۱۹۶۹ء

* زہرا نگاہ۔ مرتب؛جنگ ترنگ۔کراچی:دی انٹر سروسز پریس لمٹیڈ،۱۹۶۷ء

* زیدی، علی جواد۔ مرتب؛قومی شاعری کے سو سال۔ لکھنؤ:اترپردیش اردو اکادمی،۲۰۱۰ء

* ساغر صدیقی۔کلیات ساغر صدیقی۔لاہور:علم و عرفان پبلشرز،۲۰۱۲ء

* سبط حسن۔ مرتب؛آزادی کی نظمیں۔نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۲۰۰۶ء

* سرمد بخاری، سید ممتاز علی۔نقش بول اٹھے۔لاہور:عزیز پبلشرز،۱۹۹۴ء

* سرور بارہ بنکوی۔سنگ آفتاب۔کراچی:رحمن پبلشرز، س۔ن

* سرور جہاں آبادی۔ مرتب؛انتخاب کلام سرور جہاں آبادی۔علی گڑھ:انجمن ترقی اردو(ہند)،۱۹۶۶ء

* سودا، مرزا محمد رفیع۔کلیات سودا (حصہ اول و دوم)۔لکھنؤ:مطبع نول کشور،۱۹۳۲ء

* سوز، بشیر احمد۔ مرتب؛ہزارہ میں مِلّی شاعری۔راولپنڈی:ادبیات ہزارہ، حرف اکادمی،۲۰۰۷ء

* سیماب اکبر آبادی، علامہ۔قائد کی خوشبو۔(مرتبہ مظہر صدیقی)۔کراچی:سیماب اکادمی پاکستان،۱۹۸۶ء

* شان الحق حقی۔ مرتب؛نشیدِ حریت۔کراچی:ادارہ مطبوعات پاکستان،۱۹۶۴ء

* شاہنواز مہیسر۔ مرتب؛شجاعت کے تارے وطن کے سپاہی۔اسلام آباد:دی بکس،۲۰۰۴ء

* شبلی نعمانی، مولانا۔کلیات شبلی اردو۔(مرتبہ سید سلیمان ندوی)۔اعظم گڑھ:دار المصنفین شبلی اکیڈمی یوپی، ۲۰۰۷ء

* شورش کاشمیری۔الجہاد و الجہاد۔لاہور:چٹان پبلشرز،۱۹۹۴ء

* صائمہ خیری۔میری نظمیں میرے گیت۔کراچی:نوید پرنٹنگ پریس۔۱۹۸۶ء

* صوفی تبسم، غلام مصطفی۔سو بار چمن مہکا (کلیات صوفی تبسم)۔لاہور:الحمد پبلی کیشنز،۲۰۱۳ء

* ضمیر جعفری، سید۔قریۂ جان ۔راولپنڈی:اپنا ادارہ،۱۹۸۸ء

* ایضاً۔ گنر شیر خان۔اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،۱۹۹۷ء

* ایضاً۔من مندری۔اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،۱۹۹۶ء

* طفیل ہوشیار پوری۔میرے محبوب وطن۔لاہور:احسان اکادمی،۱۹۶۶ء

* ظفر علی خان،مولانا۔کلیات مولانا ظفر علی خان۔لاہور:الفیصل ناشران،۲۰۱۱ء

* عالی، جمیل الدین۔جیوے جیوے پاکستان۔کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن،۱۹۷۶ء

* علی سردار جعفری۔کلیات جعفری،جلد اول۔نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۲۰۰۴ء

* علی مظہر رضوی۔مرتب؛قومی نظمیں۔لاہور:شعبۂ مطبوعات، محکمہ اطلاعات،س۔ن

* عماد اظہر۔موجود۔فیصل آباد:ہم خیال پبلشرز،۲۰۰۲ء

* غالب،مرزا اسد اللہ خان۔دیوانِ غالب۔کراچی:ثناء پبلی کیشنز،۲۰۰۹ء

* ایضاً۔کلیات غالب فارسی،حصہ اول۔(مرتبہ ڈاکٹر سید تقی عابدی)۔نئی دہلی:غالب انسٹی ٹیوٹ ایوانِ غالب مارگ،س۔ن

* غلام نبی خیال۔مرتب؛فغانِ کشمیر۔اسلام آباد:اکادمی ادبیات،۱۹۹۹ء

* فرزانہ ناز۔ہجرت مجھ سے لپٹ گئی ہے۔شہر ندارد۔ پیپر کمیونیکیشن سسٹم،۲۰۱۷ء

* فیض احمد فیض۔نسخہ ہائے وفا۔لاہور:مکتبہ کارواں،س۔ن

* قائم،چاند پوری۔کلیات قائم، جلد دوّم۔(مرتبہ اقتدا حسن)،لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۶۵ء

* قتیل شفائی۔گجر۔لاہور:نیا ادارہ،۱۹۵۶ء

* قمر یزدانی۔زندہ و پائندہ باد۔لاہور:نذیر سنز پبلشرز،۲۰۱۳ء

* قیوم ملک۔مرتب؛قومی نظمیں۔کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن،۱۹۷۵ء

* قیوم نظر۔قلب و نظر کے سلسلے۔لاہور:سنگ میل پبلشرز،۱۹۸۷ء

* کوکب، تفضّل حسین۔مؤلف؛فغانِ دہلی۔یوپی:نورنگ کتاب گھر،۲۰۰۷ء

* ماجد صدیقی۔شاد باد منزل مراد۔کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن،۱۹۷۵ء

* ماہر القادری۔کلیات ماہر۔(مرتبہ ڈاکٹر عبد الغنی فاروق)۔لاہور:القمر انٹر پرائزز،۱۹۹۴ء

* مجید امجد۔کلیات مجید امجد۔(مرتبہ ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا)۔لاہور:الحمد پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء

* منصور احمر۔ڈاکٹر۔کوئی خود کو ڈھونڈتا ہے۔راولپنڈی:نواب سنز پبلی کیشنز،س۔ن

* منیر شکوہ آبادی۔انتخاب کلام منیر شکوہ آبادی۔(مرتبہ ریاض الدین)۔لکھنؤ:اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۲ء

* منیر نیازی۔ایک اور دریا کا سامنا(کلیات)۔اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء

* مومن،مومن خان۔کلیاتِ مومن ، جلد دوّم۔لاہور:مجلس ترقی ادب،۱۹۶۴ء

* میر تقی میر۔کلیاتِ میرتقی میر۔(مرتبہ عبادت بریلوی)۔لاہور:اردو دنیا،۱۹۵۸ء

* ن م راشد۔کلیات راشد۔لاہور:ماورا پبلشرز،س۔ن

* ناصر کاظمی۔کلیات ناصر کاظمی۔لاہور:القا پبلیکیشنز،۲۰۱۷ء

* ناہید قمر،ڈاکٹر۔زندگی کے حاشیے پر۔اسلام آباد:پورب اکادمی،اگست ۲۰۱۶ء

* نصرتی،ملا۔علی نامہ۔(مرتبہ عبدالمجید صدیقی)۔حیدرآباد:اعجاز پرنٹنگ پریس،۱۹۵۹ء

* نظیر اکبر آبادی۔انتخاب کلیات نظیر اکبر آبادی۔(مرتبہ سید جلال الدین احمد جعفری زینبی)۔الہ آباد: انوار احمدی پریس،س ن

* نوید ظفر۔مرتب؛بچوں کے گیت۔اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۱۹۹۶ء

* واصف علی واصف۔شب چراغ۔لاہور:کاشف پبلی کیشنز،س۔ن

* ولی دکنی۔کلیات ولی۔(مرتبہ سید نورالحسن ہاشمی)۔لکھنؤ:نظامی پریس،۱۹۸۲ء

* ہارون الرشید تبسم،ڈاکٹر۔ارمغان وطن۔جہلم:بک کارنر،۲۰۱۶ء

* [مرتب ندارد]۔آزادی کے ترانے۔لاہور:جنگ پبلشرز،۱۹۸۹ء

* [مرتب ندار]۔دیپ جلے لہو لہو۔پشاور:ادارہ علم وفن،پاکستان،۱۹۸۰ء

## (ب) تحقیقی و تنقیدی کتب


* آغا اشرف۔جہادِ پاکستان۔لاہور:مکتبہ القریش،۱۹۸۶ء

* آفتاب احمد،ڈاکٹر۔ن م۔راشد شاعر اور شخص۔لاہور:ماورا پبلشرز،۱۹۸۹ء

* ابن حنیف۔دنیا کا قدیم ترین ادب۔ملتان:کاروان ادب،۱۹۸۲ء

* احمد خان،سرسید۔رسالہ اسباب بغاوت ہند۔(مرتبہ ڈاکٹر فوق کریمی)۔دہلی:انجمن ترقی اردو،۱۹۸۵ء

* احمد رضا خان بریلوی،مولانا۔مترجم؛کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن۔لاہور:پاک کمپنی،۲۰۰۱ء

* احمد سعید۔حصولِ پاکستان۔لاہور:الفیصل ناشران و تاجران کتب،۱۹۸۹ء

* اخلاق دہلوی،علامہ۔شمیم بلاغت۔دہلی:انجمن ترقی اردو،۱۹۶۸ء

* ادیب،مسعود حسن رضوی۔ہماری شاعری.... معیار و مسائل۔اسلام آباد:پورب اکادمی،۲۰۱۵ء

* ارسطو۔بوطیقا۔(مترجمہ جمیل جالبی)۔اسلام آباد:نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۱۶ء

* ارشاد علی خان۔جدید اصولِ تنقید۔اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،۲۰۰۰ء

* اسٹالن۔قوم اور قومیت۔لاہور:مکتبۂ فکر و دانش۔س۔ن

* اشتیاق احمد۔مرتب؛کلچر....منتخب تنقیدی مضامین۔کراچی:فضلی بک سپر مارکیٹ،۲۰۰۷ء

* اشتیاق حسین قریشی،ڈاکٹر۔برصغیر پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ۔(مترجمہ بلال احمد زبیری)۔
کراچی:کراچی یونیورسٹی،۱۹۸۳ء

* **ایضاً**۔نظریۂ پاکستان کے تاریخی،سیاسی اور معاشرتی پہلو۔لاہور:نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن۔
۱۹۹۹ء

* اشرف کمال،ڈاکٹر۔تاریخ اصناف نظم و نثر۔کراچی:سٹی بک پوائنٹ،۲۰۱۷ء

* اشرف،ڈاکٹر محمد خان۔پاکستان: قومی سلامتی کے مسائل۔لاہور:گنج شکر پریس،۲۰۰۹ء

* اظہر،سید اشتیاق۔سید الاحرار۔کراچی:حسرت موہانی میموریل ٹرسٹ،۱۹۹۸ء

* افضل حق قریشی۔مرتب؛اقبال کا فکر و فن۔لاہور:منیب پبلیکیشنز،۱۹۷۷ء

* اکرم اکرام،ڈاکٹر سید محمد۔اقبال اور مِلّی تشخص۔لاہور:بزمِ اقبال،۱۹۹۸ء

* اکرم، شیخ محمد۔موجِ کوثر۔ طبع دوم،لاہور:فیروز سنز،۱۹۶۶ء
* البیرونی،ابوریحان۔البیرونی کا ہندوستان۔(مرتبہ قیام الدین)۔(مترجمہ عبدالحئی)۔لاہور:یو پبلشرز، ۲۰۰۵ء
* الہدیٰ،احمد رمیض۔اقوام عالم ان کے قومی پرچم اور ترانے۔لاہور:مولوی شوکت پریس،۲۰۱۲ء
* امتہ الکریم۔اقبال کی قومی شاعری۔حیدرآباد:دائرہ الیکٹرک پریس،۱۹۸۳ء
* انور سدید،ڈاکٹر۔اردو ادب کی تحریکیں۔کراچی:انجمن ترقی اردو،۲۰۱۳ء
* ایڈورڈ سعید۔ثقافت اور سامراج ۔(مترجمہ یاسر جواد)۔اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۲۰۰۹ء
* ایم۔آر شاہد۔شہیدانِ وطن۔لاہور:الفیصل ناشران،۲۰۱۶ء
* ایوب صابر،ڈاکٹر۔تصور پاکستان ۔اسلام آباد:نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۰۴ء
* بنگلوری، محمود خان محمود۔تاریخ سلطنت خداداد (میسور)۔دہلی:ہمالیہ بک ہاؤس،۱۹۷۰ء
* تاثیر،ڈاکٹر محمد دین۔اقبال کا فکر و فن۔(مرتبہ افضل حق قریشی)۔لاہور:منیب پبلی کیشنز،۱۹۷۷ء
* تاراچند،ڈاکٹر۔تمدن ہند پر اسلامی اثرات۔(مترجمہ محمد مسعود احمد)۔لاہور: مجلس ترقی ادب،۲۰۱۰ء
* تبسم کاشمیری،ڈاکٹر۔اردو ادب کی تاریخ ....ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۹ء
* تنویر بخاری ساحر۔جنگ نامے تے لوک گیت۔لاہور:ایور نیو بک پیلس،س۔ن
* توصیف تبسم،ڈاکٹر۔جنگِ آزادی کا مجاہد شاعر(امیر اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی)۔اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۰۶ء
* جاوید اقبال،ڈاکٹر۔اسلام اور پاکستانی تشخص ۔(مترجمہ سید قاسم محمود)۔لاہور:اقبال اکادمی،۲۰۱۲ء
* جاوید اقبال،ڈاکٹر۔مرتب؛شذرات فکر اقبال۔(مترجمہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی)۔لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۷۳ء
* جمیل جالبی،ڈاکٹر۔پاکستانی کلچر۔اسلام آباد:نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۰۸ء
* ایضاً۔تاریخ ادب اردو(جلد اول و دوم)۔لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۹۴ء
* ایضاً۔مرتب؛دیوان حسن شوقی۔کراچی:انجمن ترقی اردو،۱۹۷۱ء
* ایضاً۔معاصر ادب۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۱ء

* جمیل یوسف۔حفیظ جالندھری۔اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،پاکستان،۲۰۱۱ء
* جیلانی کامران۔قومیت کی تشکیل اور اردو زبان۔اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۱۹۹۲ء
* ایضاً۔قائد اعظم اور آزادی کی تحریک۔لاہور:مجلس ترقی ادب،۱۹۹۰ء
* چیڑ جی،بابو بنکم چندر۔آنند مٹھ۔(مترجمہ ڈاکٹر گوکلچند نارنگ)۔میرٹھ:چودھری شیوناتھ سنگھ،شانڈلیہ،۱۹۲۳ء
* حافظ محمد جوناگڑھی۔مترجم؛تفسیر ابن کثیر۔لاہور:مکتبہ قدوسیہ،۲۰۰۶ء
* حالی،خواجہ الطاف حسین۔حیاتِ جاوید۔نئی دہلی:ترقی اردو بیورو،۱۹۹۰ء
* ایضاً۔مقدمہ شعرو شاعری۔لاہور:پاپولر پبلشنگ ہاؤس،۱۹۸۴ء
* حسن ریاض،سید۔پاکستان ناگزیر تھا۔کراچی:کراچی یونیورسٹی،۱۹۸۴ء
* حسن نظامی،خواجہ۔مرتب؛غدر کی صبح شام۔دہلی:کارکن مشائخ بک ڈپو،۱۹۲۶ء
* حسین احمد مدنی،مولانا۔تحریک پاکستان کا حقیقی پس منظر۔لاہور:مکی دارالکتب،۱۹۹۵ء
* حفیظ صدیقی،ابوالاعجاز۔اصناف ادب۔لاہور:سنگت پبلشرز،۲۰۱۶ء
* ایضاً۔کشاف تنقیدی اصطلاحات۔اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۱۹۸۵ء
* خالد علوی،ڈاکٹر۔نظریۂ پاکستان۔اسلام آباد:دعوت اکیڈمی،بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی،۲۰۱۵ء
* خلیفہ عبدالحکیم۔مقالاتِ حکیم،جلد سوم۔(مرتبہ شاہد حسین رزاقی)۔لاہور:ادارہ ثقافتِ اسلامیہ،۱۹۶۹ء
* خلیل طوقار،ڈاکٹر۔ڈاکٹر محمد کامران۔مرتبین؛محمد اقبال اور محمد عاکف دو عہد ساز شاعر۔
لاہور:ماورا پبلشرز،۲۰۱۸ء
* خورشید ربانی۔حسرت موہانی ...شخصیت اور فن۔اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۱۷ء
* ذوالفقار،ڈاکٹر غلام حسین۔اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پسِ منظر۔لاہور:سنگِ میل پبلی
کیشنز،۲۰۰۸ء
* رشید احمد۔مسلمانوں کے سیاسی افکار۔لاہور:ادارہ ثقافت اسلامیہ،۲۰۰۸ء
* رشید امجد،ڈاکٹر۔پاکستانی ادب... رویے اور رجحانات۔اسلام آباد:پورب اکادمی،۲۰۱۰ء
* ایضاً۔مرتب؛مزاحمتی ادب اردو۔اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان،۱۹۹۵ء

* رعنااقبال۔جمیل الدین عالی شخصیت اورفن۔اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۸ء
* رفیع الدین ہاشمی،ڈاکٹر۔اصناف ِ ادب۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء
* ایضاً۔مرتب؛اقبالیات کے سو سال ...منتخب مضامین۔لاہور:اقبال اکادمی،۲۰۱۲ء
* روبی،احمد عقیل۔علم و دانش کے معمار۔اسلام آباد:نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۱۵ء
* ایضاً۔یونان کا ادبی ورثہ۔لاہور:الوقار پبلی کیشنز،۲۰۰۰ء
*زاہدچودھری۔پاکستان کی سیاسی تاریخ،جلد ۳ "پاک بھارت تنازعہ اور مسئلہ کشمیر کا آغاز"۔لاہور:ادارہ مطالعہ تاریخ،۱۹۹۹ء
*زکریا،ڈاکٹرخواجہ محمد۔تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند،جلدششم۔لاہور:پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۱۴ء
* زیدی،علی جواد۔مرتب؛اردو میں قومی شاعری کے سو سال۔لکھنؤ،اترپردیش اردواکادمی،۱۹۸۲ء
* زیدی،نظیر حسین۔مولانا ظفر علی خان ...احوال و آثار۔لاہور:مجلس ترقی ادب،۱۹۸۶ء
* ساجد امجد،ڈاکٹر۔اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات۔لاہور:الوقار پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء
* ساحر،تنویر بخاری۔جنگ نامے تے لوک گیت۔لاہور:ریورنیوبک پیلس،س ن
* سبط حسن۔پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء۔کراچی:مکتبہ دانیال،۲۰۱۷ء
* ایضاً۔سخن در سخن۔کراچی:مکتبہ دانیال،۲۰۱۶ء
* سعید پرویز۔حبیب جالب شخصیت اور فن۔اسلام آباد:اکادمی ادبیات،۲۰۰۹ء
* سکسینہ،رام بابو۔تاریخ ادب اردو۔(مترجمہ مرزامحمد عسکری)۔نئی دہلی:بزم خضرراہ،۲۰۰۰ء
* سلام سندیلوی،ڈاکٹر۔ادب کا تنقیدی مطالعہ۔لاہور:میری لائبریری،۱۹۶۴ء
*سلمان،محمد منصورپوری۔تحریک آزادی ہند میں مسلم علما اور عوام کا کردار۔دیوبند:کتب خانہ نعیمیہ، ۲۰۰۴ء
* سوز،بشیر احمد۔مرتب؛ہزارہ میں قومی و مِلّی شاعری۔راولپنڈی:ادبیات ہزارہ،حرف اکادمی،۲۰۰۷ء
* شاکر،ڈاکٹرامجد علی۔دو قومی نظریہ...ایک تاریخی جائزہ۔لاہور:جمعیت پبلی کیشنز،۲۰۱۵ء

* شبلی نعمانی۔شعر العجم،جلد اول۔اعظم گڑھ:معارف پریس،۱۹۵۱ء
* شجاع نواز۔بے نیام تلواریں۔کراچی:ویلکم بک پورٹ،۲۰۱۰ء
* شمس الرحمان فاروقی،ڈاکٹر۔شعر شور انگیز،جلد اول۔نئی دہلی:قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۶ء
* شمیم احمد۔ اصناف سخن اور شعری ہیئتیں۔بھوپال:انڈیا بک امپوریم،۱۹۸۱ء
* شیر محمد گریوال۔قیام پاکستان کے بنیادی محرکات۔لاہور:مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،۱۹۸۶ء
* صابر ارشاد عثمانی۔مولانا محمد علی جوہر...حیات و خدمات۔اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۲۰۰۷ء
* صادق زاہد۔قیام پاکستان کا مقدمہ ...تاریخ کی عدالت میں۔جلد دوم،لاہور:ندا پبلیکیشنز، ۲۰۰۳ء
* صالحہ عابد حسین۔خواجہ الطاف حسین حالی۔نئی دہلی:نئی بک ٹرسٹ انڈیا،س ن
* صدیق الرحمان قدوائی۔مرتب؛معرکۂ عظیم۔نئی دہلی:غالب انسٹی ٹیوٹ،۲۰۰۸ء
* صدیق سالک۔میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا۔لاہور:الفیصل ناشران،۲۰۰۹ء
* طارق سعید۔اسلوب اور اسلوبیات۔لاہور:نگارشات پبلشرز،۱۹۹۸ء
* طاہر القادری،ڈاکٹر۔دہشت گردی اور فتنہ خوارج۔لاہور:منہاج القرآن پبلیکیشنز،۲۰۱۰ء
* طاہرہ نیر،ڈاکٹر۔اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار۔کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۹ء
* طاہرہ،ڈاکٹر قرۃ العین۔صہبا اختر... شخصیت اور فن۔اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۱۰ء
* ظفر محمود۔جوش ملِّیح آبادی ...شخصیت اور فن۔نئی دہلی،ترقی اردو بیورو،۱۹۸۹ء
* ظہیر قندیل۔معرکہ بڈھ بیر کا ہیرو۔حسن ابدال:کیڈٹ کالج حسن ابدال،۲۰۱۷ء
* ظہیر،سید ظہیر الدین دہلوی۔مرتب؛داستان غدر۔لاہور:میسرز پبلشرز یونائٹڈ لمیٹڈ،۱۹۵۵ء
* ظ۔انصاری،ابوالفیض سحر۔مرتب؛خسرو شناسی ۔نئی دہلی:قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۲۰۱۰ء
* عابد حسین،سید۔قومی تہذیب کا مسئلہ۔علی گڑھ:انجمن ترقی اردو ہند،۱۹۵۵ء

* عابد علی عابد، سید۔ اسلوب۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱ء
* ایضاً۔ البیان۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۹ء
* عاصم، محمد نواز۔ قومی سانحات اور اصل حقائق۔ (مترجمہ محمد ارشد ملک)۔ کراچی: روزنامہ سائبان اسپیشل، ۲۰۱۷ء
* عالی، جمیل الدین۔ جیوے جیوے پاکستان۔ کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۷۶ء
* عبادت بریلوی، ڈاکٹر۔ جدید شاعری۔ علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، س۔ن
* ایضاً۔ روایت کی اہمیت۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۵۳ء
* عبد الحق، ڈاکٹر مولوی۔ نصرتی۔ کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۱ء
* عبد الحمید ندوی، ڈاکٹر۔ عہد نبوی ﷺ کی شاعری۔ بھٹکل: مجلس صحافت و نشریات، ۲۰۱۲ء
* عبد الحئی، مولانا حکیم سید۔ گل رعنا۔ لاہور: کتاب سرائے، ۲۰۱۶ء
* عبد الرحمن، مولوی۔ مرآۃ الشعر۔ (تدوین و تحقیق ڈاکٹر ظہور احمد اظہر)۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۵ء
* عبد اللہ، ڈاکٹر سید محمد۔ اشارات تنقید۔ لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء
* ایضاً۔ اردو ادب کی ایک صدی۔ دہلی: چمن بک ڈپو، س ن
* عبید اللہ قدسی۔ آزادی کی تحریکیں۔ لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۰۱۴ء
* عدیل عباسی، قاضی محمد۔ تحریک خلافت۔ نئی دہلی: ترقی اردو بورڈ، ۱۹۷۸ء
* عرفان طارق۔ امن کی تلاش ...ضرب عضب تک۔ اسلام آباد: ایم ٹی ایم پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء
* عزیز احمد۔ برصغیر میں اسلامی جدیدیت۔ (مترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی)۔ لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۸۹ء
* عسکری، محمد حسن۔ انسان اور آدمی۔ الہ آباد: اسرار کریمی پریس، ۱۹۷۶ء
* عشرت رحمانی۔ چھ ستمبر...ایک تحقیقی و نفسیاتی جائزہ۔ لاہور: اشرف پریس، ۱۹۶۶ء
* عقیل، ڈاکٹر معین الدین۔ تحریکِ آزادی میں اردو کا حصہ۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء
* علی سردار جعفری۔ ترقی پسند ادب۔ دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۲۰۱۳ء

* غلام السیدین-علی گڑھ کی علمی تحریک۔علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی،۱۹۳۱ء
* فتح محمد ملک-احمد ندیم قاسمی ..... شاعر اور افسانہ نگار-لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۱ء
* ایضاً-تحریکِ آزادی کشمیر...اردوادب کے آئینے میں-لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۱ء
* ایضاً-ن م۔ راشدسیاست اور شاعری-اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء
* فرمان فتح پوری،ڈاکٹر-اردو کی منظوم داستانیں-کراچی:انجمن ترقی ادب،۱۹۷۱ء
* فضل حق،علامہ محمد خیر آبادی-آزادی کا منشور-(مترجمہ عبدالشاہد خان شیروانی)-لاہور:عکس پبلی کیشنز،
۲۰۱۸ء
* قاسم یعقوب-اردو شاعری پر جنگوں کے اثرات-کراچی:سٹی بک پوائنٹ،۲۰۱۵ء
* قاسم،غفورشاہ-پاکستانی ادب..... ۱۹۴۷ءسے تاحال-لاہور:بک ٹاک،۱۹۹۵ء
* قدرت اللہ شہاب-شہاب نامہ-لاہور:سنگ میل پبلشرز،۱۹۹۸ء
* قرۃ العین حیدر-آگ کا دریا-دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۱۹۸۹ء
* قیصر جہاں-اردو گیت-نئی دہلی:مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،۱۹۷۷ء
* کشفی،سید محمد ابوالخیر-اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر-اسلام آباد:نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۷ء
* گوپی چند نارنگ،ڈاکٹر۔ ہندوستان کی تحریک آزادی اوراردو شاعری-لاہور:سنگ میل پبلشرز، ۲۰۰۵ء
* گیان چند،ڈاکٹر۔ ادبی اصناف-گاندھی نگر:گجرات اردو اکادمی،۱۹۸۹ء
* لارڈ ہٹسگز-شاہ عالم ثانی کے عہد کا دربار-(مترجمہ نصیب اختر)-کراچی:ادب منزل،۱۹۶۷ء
* مبارک علی،ڈاکٹر-گمشدہ تاریخ-لاہور:فکشن ہاؤس،۲۰۰۵ء
* محب الحسن-تاریخِ ٹیپو سلطان-(مترجمین حامد اللہ افسر،عتیق صدیقی)-نئی دہلی:قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان،۲۰۱۰ء

* مجاور حسین، سید۔اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر۔لکھنؤ:اترپردیش اردواکادمی، ۲۰۰۴ء
* محبوب ظفر۔احمد فراز.....شخصیت اور فن۔اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۱۶ء
* محمد حیات خان سیال۔مرتب؛گلاب کے پھول۔لاہور:مکتبہ میری لائبریری،۱۹۷۸ء
* محمد صدیق قریشی۔جنگِ آزادی کے مسلم مشاہیر۔لاہور:مقبول اکیڈمی،۱۹۹۵ء
* محمد عثمان۔فکرِ اسلامی کی تشکیل نو۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۱ء
* محمد کاظم۔عربی ادب کی تاریخ۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء
* محمود الرحمن،ڈاکٹر۔قائد اعظم اور اردو۔اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،۱۹۹۶ء
* مختار مسعود۔آوازِ دوست۔لاہور:مکتبہ تعمیر انسانیت،۲۰۱۷ء
* مرتضیٰ انجم۔جنگی معرکے۔لاہور:خزینہ علم وادب،۲۰۰۴ء
* مظفر عباس،ڈاکٹر۔اردو میں قومی شاعری۔لاہور:گوہر پبلیکیشنز،س ن
* مودودی،ابوالاعلیٰ۔مسئلہ قومیت۔جمال پور:مکتبہ جماعت اسلامی،۱۹۶۷ء
* میاں،مولانا سید محمد۔علماءِ ہند کا شاندار ماضی، جلد ۲۔ دہلی:الجمعیت پریس،۱۹۵۷ء
* ناشاد،ڈاکٹر ارشد محمود۔اردو غزل کا تکنیکی، ہیئتی اور عروضی سفر۔لاہور:مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء
* نجم الغنی،مولوی۔بحر الفصاحت(حصہ اول تا ہفتم)۔(مرتبہ سید قدرت نقوی)۔لاہور:مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۷ء
* نریندر ناتھ،ڈاکٹر ویرمنی۔اردو نظموں میں قومیت اور وطنیت۔اندور:مالوہ پبلی کیشنز،۲۰۰۱ء
* نورالحسن ہاشمی،ڈاکٹر۔دہلی کا دبستان شاعری۔لکھنو:ادارہ فروغ اردو،۱۹۶۵ء
* نوری،ڈاکٹر محمد فخر الحق۔آزادی کی گونج۔لاہور:پولیمر پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء
* ایضاً۔مطالعۂ راشد(چند نئے زاویے)۔فیصل آباد:مثال پبلشرز،۲۰۱۰ء
* نہرو،جواہر لعل۔میری کہانی۔جلد دوم،دہلی:مکتبہ جامعہ،۱۹۵۰ء

* وزیر آغا،ڈاکٹر-اردو شاعری کا مزاج-لاہور: مجلس ترقی ادب،۲۰۱۶ء

* ولیم نائٹس-شباب لکھنؤ-(مترجمہ محمد احد علی) لکھنؤ: شام اودھ،۱۸۹۹ء

* ویاس-مہا بھارت-(مترجمہ نعیم احسن خان)-لاہور: نگارشات،۱۹۹۹ء

* ہنسراج رہبر-ترقی پسند ادب..... ایک جائزہ-دہلی: آزاد کتاب گھر، س ن

* یونس کمال لودھی-پاکستانی قومی پرچم اور ترانہ-اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۱۶ء

## (ج) غیر مطبوعہ تحقیقی مقالات

* اعجاز احمد-اردو ادب اور کشمیر-مقالہ برائے پی ایچ-ڈی (اردو)-لاہور: اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۹ء

* خالد جاوید احمد-اردو شاعری پر سقوط ڈھاکہ کے اثرات-مقالہ برائے ایم فل (اردو)-اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۱۹۹۴ء

* طلعت رحمان-قیام پاکستان کے بعد عسکری شاعری-مقالہ برائے ایم اے (اردو)-لاہور: اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۹۷ء

* عنبرین تبسم شاکر-جدید اردو نظم میں سیاسی شعور-مقالہ برائے پی ایچ-ڈی (اردو)-اسلام آباد: نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، ۲۰۱۰ء

* محمد رمضان-۱۹۶۵ءکی جنگ اور اردو شاعری-مقالہ برائے پی ایچ-ڈی (اردو)-بہاول پور: دی اسلامیہ یونیورسٹی، ۲۰۰۹ء

* محمود الرحمن، سید-جنگِ آزادی کے اردو شعرا-مقالہ برائے پی ایچ-ڈی (اردو)-جامشورو: جامعہ سندھ، ۱۹۷۹ء

* منظور احمد طاہر-اردو رزمیہ شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ-مقالہ برائے پی ایچ-ڈی (اردو)-اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء

* وہاب، مہر اختر-اردو میں اسلامی ادب کی تحریک-مقالہ برائے ایم فل (اردو)-اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۴ء

## (د) رسائل و جرائد


* آہنگ(ماہنامہ)۔ کراچی: جون ۱۹۹۹ء

* آہنگ(ماہنامہ)۔ کراچی: جولائی ۲۰۱۷ء

* ادبیات( سہ ماہی)۔ اکادمی ادبیات پاکستان۔ اسلام آباد: بین الاقوامی ادب نمبر ا۔ جلد ۹، شمارہ ۳۵۔۳۶، بہار۔ گرما، ۱۹۹۶ء

* ایضاً۔بین الاقوامی ادب نمبر ۲۔ جلد ۹، شمارہ ۳۷۔۳۸، خزاں۔ سرما، ۱۹۹۶ء

* ایضاً۔بین الاقوامی ادب نمبر ۳۔ جلد ۱۰، شمارہ ۳۹۔۴۰، بہار۔ گرما، ۱۹۹۷ء

* ایضاً۔بین الاقوامی ادب نمبر ۴۔ جلد ۱۰، شمارہ ۴۱۔۴۲، خزاں۔ سرما، ۱۹۹۷ء

* ایضاً۔بین الاقوامی ادب نمبر ۵۔ جلد ۱۱، شمارہ ۴۳۔۴۴، بہار۔ گرما، ۱۹۹۸ء

* ایضاً۔بین الاقومی ادب نمبر ۶۔ جلد ۱۱، شمارہ ۴۵۔۴۶، خزاں۔ سرما، ۱۹۹۸ء

* ایضاً۔احمد ندیم قاسمی نمبر۔شمارہ نمبر ۱۰۸، جنوری تا جون ۲۰۱۶ء

* تکبیر۔ کراچی: جلد ۲۰، شمارہ ۳۷۰۔۵ تا ۱۱ ستمبر ۱۹۹۷ء

* فنون۔لاہور: اکتوبر ۱۹۶۵ء

* فنون۔لاہور: فروری، مارچ ۱۹۶۶ء

* قلم قبیلہ(سہ ماہی)۔ کوئٹہ: جلد ۳، شمارہ ا، جنوری تا مارچ ۱۹۹۳ء

* ماہ نو(ماہنامہ)۔ کراچی: جلد ۱۸، شمارہ ۱۰، اکتوبر ۱۹۶۵ء

* معیار۔ (ششماہی) اسلام آباد: شعبۂ اردو، کلیہ زبان وادب، بین الاقومی اسلامی یونیورسٹی، شمارہ ۱۱، جنوری۔جون ۲۰۱۴ء

* ہلال(ہفت روزہ)۔ راولپنڈی: جلد ۸، شمارہ ۴۴۔۷ جنوری، ۱۹۷۲ء

* ایضاً۔ جلد ۲۷، نمبر ۴۷۔۴۸۔ ۱۴ مارچ ۱۹۸۹ء

* ایضاً۔ جلد ۲۶، نمبر ۲۶۔ ۱۴ اکتوبر، ۱۹۸۹ء

* ایضاً۔ جلد ۳۴، نمبر ۳۴ تا ۳۸۔ ۱۹۹۸ء

* ایضاً۔ جلد ۳۵، شمارہ ۲۶ تا ۲۸۔ ۱۹۹۹ء

* ایضاً۔ جلد ۳۵، نمبر ۴۷۔ ۳۰ مئی تا ۵ جون، ۱۹۹۹ء

* ہلال (ماہنامہ)۔ راولپنڈی: جلد ۴۵، شمارہ ۱۲، جون ۲۰۰۹ء

* ایضاً۔ جلد ۵۱، شمارہ ۷، جنوری ۲۰۱۵ء

* ایضاً۔ جلد ۵۱، شمارہ ۸، فروری ۲۰۱۵ء

* ایضاً۔ جلد ۵۱، شمارہ ۹، مارچ ۲۰۱۵ء

## (ہ) روزنامے

* پاکستان۔ لاہور: ۳ جنوری، ۲۰۱۵ء

* جنگ۔ ملتان: ۲۹ اگست، ۲۰۱۶ء

* نوائے وقت۔ لاہور: ۲۰ اپریل، ۲۰۱۵ء

* نوائے وقت۔ لاہور: ۱۴ اگست، ۲۰۱۵ء

## (و) لغات / دائرۃ المعارف

* ابوالفتح عزیزی، مولانا۔ مفتاح اللغات۔ کراچی: محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب، س۔ن

* احمد دہلوی، سید۔ فرہنگ آصفیہ۔ لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۱۰ء

* جمیل جالبی، ڈاکٹر۔ قومی انگریزی اردو لغت۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۲ء

* فیروزالدین، مولوی۔ فیروز اللغات اردو۔ لاہور: فیروز سنز، ۲۰۱۲ء

* قاسم محمود، سید۔ شاہکار اسلامی انسائیکلو پیڈیا۔ لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۱۳ء

* وارث سرہندی۔ علمی اردو لغت۔ لاہور: علمی کتاب خانہ، س ن

* وحید الزماں کیرانوی، مولانا۔ القاموس الجدید۔ دہلی: مکتبہ اشاعت القرآن، ۱۹۷۹ء

* [مرتب ندارد] اردو لغت (تاریخی اصولوں پر)۔ کراچی: اردو لغت بورڈ، ۲۰۰۷ء

English Books/Dictionaries

⁕ Abdul Hamid. *Muslim Separatism in India*. Lahore: Oxford University Press, 1971.

⁕ Aziz Ahmad. *Studies in Islamic Culture in Indian Environment*. Karachi: Civil Military Press, 1970.

⁕ Fareed S Jafri. *The Sprit of Pakistan*. Karachi: Ansari Publishing House, 1951

⁕ Ishtiaq Hussain Quraishi. *The Struggle for Pakistan*. Karachi: University of Karachi, 1965.

⁕ Safdar Mehmood. *A Politics Study of Pakistan*. Lahore: Sheikh Mohammad Ashraf, 1972.

⁕ *Encyclopedia Britannica*. U.S.A. William Benton 2006.

⁕ *Oxford English Dictionary*. London. Oxford University Press.

Websites

⁕ http//www.wikipidea.com

⁕ http//www.rekhta.com

# اشاریہ

# اشخاص

# اماکن

## کتب و رسائل